متاعِ فکر ونظر

''فکری مباحث، عصر حاضر میں پیدا ہونے والے سماجی و شرعی مسائل، عالم اسلام کی صورتِ حال اور اس کے اسباب، نیز ہندوستان میں مسلمانوں کو درپیش ملی وسماجی واقعات کا تجزیہ اور فکری پہلو سے ابھرنے والے مسائل کے بارے میں اسلامی تصورات کی توضیح سے متعلق وہ مضامین جو ۲۰۱۰ء- ۲۰۱۴ء کے دوران شمع فروزاں کالم کے تحت شائع ہوئے ہیں، آسان وعام فہم زبان اور سادہ اسلوب ہیں''۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

شعبہ نشر واشاعت: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

طبع اول ۲۰۱۵ء — ۱۴۳۷ھ

نام کتاب	:	متاعِ فکر و نظر
تالیف	:	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
صفحات	:	۴۲۱
قیمت	:	
ناشر	:	المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

ملنے کے پتے:

- ھدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد (تلنگانہ)
- مکتبہ نعیمیہ، دیوبند، سہارنپور (یوپی)

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین

عناوین

پیش لفظ

راقم الحروف اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہر جمعہ کو ''شمع فروزاں'' کے عنوان سے ایک کالم لکھتا ہے، جس میں موجودہ دور میں پیش آنے والے مذہبی، سیاسی، اخلاقی، ملکی اور بین ملکی، ملی اور قومی مسائل پر اسلامی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، ان مضامین کا سلسلہ ۱۹۹۸ء سے جاری ۲۰۰۹ء تک طبع ہونے والے مضامین کی دس جلدیں مختلف ناموں سے شائع ہو چکی ہیں۔ ۲۰۱۰ء سے ۲۰۱۴ء تک کے مضامین دو جلدوں میں شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ ان میں سے دوسری جلد ہے۔

اس میں کچھ فکری مباحث، کچھ نئے مسائل پر اصلاحی اور فقہی گفتگو، ملی وقومی مسائل اور عالم اسلام کی صورتِ حال سے متعلق مضامین اکٹھا کئے گئے۔ اس کی ترتیب اور کمپوزنگ کے سلسلہ میں عزیزی گرامی قدر مولانا مبین احمد فلاحی خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں، اور جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ کے فاضل ہیں، انہوں نے المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد سے علوم القرآن میں اختصاص کیا اور اب روزنامہ منصف حیدرآباد میں خدمت انجام دے رہے ہیں، نیز اس کے مقبول عام جمعہ ایڈیشن ''مینارۂ نور'' کے مرتب ہیں، اس کے علاوہ ان مضامین کی تلاش اور مکرر چھپنے والے مضامین کو الگ کرنے میں عزیزان مولوی محمد عمران فلاحی اور مولوی محمد اکرم رشید رحمانی (ساکنان گجرات) کی بھی بڑی کاوشیں ہیں، اللہ تعالیٰ ان تمام عزیزوں کو بے حد اجر خیر عطا فرمائے اور ان کی خدمتوں کو قبول فرمائے۔

دعا ہے کہ ان مضامین کی گذشتہ مجموعوں کو اللہ تعالیٰ نے جو مقبولیت عطا فرمائی ہے، اسی طرح اس کو بھی پذیرائی حاصل ہو۔

خالد سیف اللہ رحمانی

۲۸ر محرم الحرام ۱۴۳۷ھ
۱۱ر نومبر ۲۰۱۵ء

دعوتِ فکر

مقاصد شریعت نامی کتاب کے بارے میں

اس کائنات کا نظام تغیر اور مسلسل تغیر پر مبنی ہے، علامہ اقبالؒ کے بقول ؎

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں

یہ تبدیلیاں جیسے کائنات کی اشیاء میں ہوتی رہتی ہیں، اسی طرح انسان کے حالات میں بھی، ان ہی تبدیلیوں کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مال و دولت، علم و دانش اور قوت و اقتدار کسی ایک گروہ کے ہاتھ میں ہمیشہ نہیں رہتا؛ بلکہ اس میں بھی مسلسل تبدیلیوں کا عمل جاری رہتا ہے، قرآن مجید نے اسی کو کہا ہے: ﴿وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ (آل عمران: ۱۴۰) اور ایسا ہونا ضروری بھی تھا؛ کیونکہ اگر ایک قوم یا ایک خاندان مسلسل بہتر حالت میں ہو تو اس میں بندگی کے بجائے اپنی خدائی کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے، وہ کمزور قوموں کو اس طرح روندنے لگتی ہے، جیسے ہاتھی چیونٹیوں کے بل کی پرواہ نہیں کرتا، وہ اپنی سوچ کو پوری دنیا پر جبر کے ساتھ نافذ کرنا چاہتا ہے، انسانوں کو غلام بنانے اور ان سے پرستش کرانے میں اسے لذت محسوس ہوتی ہے، دنیا کی مختلف قومیں یہ رویہ اختیار کر چکی ہیں، خود ہندوستان کم و بیش دو سو سال تک برطانوی استعمار کے جور و ظلم کا شکار رہا ہے۔

یہی حال دولت کا ہے اور موجودہ سرمایہ دارانہ نظام اس کی واضح مثال ہے، جس میں دنیا کی دولت کے بڑے حصہ پر چند افراد کا قبضہ ہے، کچھ لوگ تو وہ ہیں، جن کو اپنی اتھاہ اور بے شمار دولت کا علم بھی نہیں، اور بے شمار لوگ وہ ہیں، جو بنیادی ضروریاتِ زندگی کے لئے پریشان ہیں؛ یہاں تک کہ اسی دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں، جو فاقوں سے دوچار ہیں، علم و دانش کا بھی یہی حال ہے، ہندوستان میں ہزاروں سال برہمنوں نے علم پر اپنی اجارہ داری قائم رکھی، یہاں تک کہ دوسری قوموں کو انہوں نے اس کا بھی حق نہیں دیا کہ وہ علم حاصل کریں؛ بلکہ ان کے لئے یہ قانون بھی بنا کہ اگر وہ علم کی کوئی بات سنیں، تو ان کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈالدیا جائے، آج بھی مغرب نے علم و تحقیق پر ایک خاص حد تک اپنی اجارہ داری قائم رکھی ہے، یہ مشرقی ملکوں کو اپنی مشینریز اور بیش قیمت ہتھیار فروخت کرتے ہیں؛ لیکن اس بات پر تیار نہیں ہوتے کہ اپنی ٹکنالوجی میں بھی انہیں شامل کریں اور

مسلمان اور عالم اسلام سے تو خاص طور پر اس سلسلہ میں امتیاز برتا جاتا ہے۔

پھر انسان کی نفسیات یہ ہے کہ جب کوئی گروہ جنگ کے میدان میں شکست کھا جاتا ہے اور اقتدار سے محروم ہوتا ہے تو اس سے وہ نہ صرف زر وزمین کی جنگ ہارتا ہے؛ بلکہ اس کی سوچ میں بھی تبدیلی آنے لگتی ہے، اور ایسے واقعات وحالات میں عموماً تین قسم کا ردِعمل سامنے آتا ہے، کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں، جن کو یہ شکست انتہائی نفرت اور غضب میں مبتلا کر دیتی ہے، انہیں فاتح قوم کی ہر چیز بری لگتی ہے، ان کی تہذیب وثقافت، ان کی زبان، یہاں تک کہ ان کے پروان چڑھائے ہوئے علوم و افکار، دوسرا گروہ ہے، جو احساسِ خود شکستگی سے دوچار ہو کر مرعوب ہو جاتا ہے، اس کو اپنی ہر چیز کمتر اور فاتحین کی ہر چیز بہتر معلوم ہوتی ہے، وہ اپنی ہزیمت اور پسماندگی کا صحیح تجزیہ کرنے سے محروم ہوتے ہیں، اس کی مثال عالم اسلام میں اتاترک مصطفی کمال پاشا، نیز مصر وشام وغیرہ کے حکمران ہیں، جنہوں نے اسلامیت ومشرقیت کو اپنی ہاری ہوئی جنگ کا قصوروار سمجھا، یہاں تک کہ ترکی میں پہلے سے مروج ٹوپی کی بجائے ''ہیٹ'' پہننے کا حکم دے دیا گیا، اور مصر کے بعض چوٹی کے اہل علم کہنے لگے کہ ڈاڑھی اسلامی شعار نہیں ہے؛ بلکہ یہ عربوں کی قدیم ثقافت کا حصہ ہے، اور اسی حیثیت سے رسول اللہ ﷺ نے ڈاڑھی رکھی تھی، تیسرا گروہ ان دونوں کے درمیان ہے، جو نہ اتنی نفرت کرتا ہے کہ فاتح کی اچھی چیز بھی اسے بُری لگنے لگے، اور نہ اس میں ایسا احساسِ کمتری ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہر چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھے اور فاتح قوم کے سامنے گدائی کا کشکول بڑھائے۔

گذشتہ چار سو سال سے مغرب کی صنعتی ترقی اور عالمِ اسلام کے حکمرانوں کی ان ترقیات کی طرف سے غفلت، نیز باہمی خانہ جنگی کی صورت حال نے پورے عالمِ اسلام اور امتِ مسلمہ کو جس پسپائی سے دوچار کیا، اس کے نتیجہ میں خاص طور پر ان ملکوں میں جہاں استعماری طاقتوں نے اپنے اقتدار کا تخت بچھایا، یہی صورت حال پیش آئی، ہندوستان میں بھی برطانوی سامراجیت کے داخل ہونے کے بعد مسلمانوں میں تین قسم کے گروہ پیدا ہوئے، ایک گروہ انگریزوں سے ایسی نفرت رکھتا تھا کہ انہیں ان کا چہرہ دیکھنا بھی گوارہ نہیں تھا، مظفر نگر کے ایک درویش صفت بزرگ عالمِ دین کا واقعہ متعدد لوگوں نے نقل کیا ہے کہ مسجد اور مندر کا مقدمہ ایک انگریز مجسٹریٹ کے اجلاس پر تھا، اس نے کوشش کی کہ ہندو اور مسلمان دونوں فریق کسی ایک شخص کی ثالثی پر متفق ہو جائیں اور دونوں فریق ان

کے فیصلے کو قبول کرلیں، بالآخر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں گروہوں کا ان بزرگ پر اتفاق ہوگیا؛ لیکن انہوں نے عدالت میں حاضر ہونے کی یہ شرط رکھی کہ میں انگریز کا منہ نہیں دیکھوں گا، مجسٹریٹ نے اس شرط کو منظور کرتے ہوئے ان کو دعوت دی اور پس پردہ رہ کر ان کا بیان سنا —— یہ بظاہر ایک واقعہ ہے؛ لیکن اِس سے اُس مزاج کی نشاندہی ہوتی ہے، جو حالات کے ردِعمل کی وجہ سے اس وقت ایک گروہ میں پیدا ہوگیا تھا؛ چنانچہ اسی کے نتیجہ میں ایک تعداد انگریزی زبان پڑھنے تک کی مخالف تھی۔

دوسرا گروہ وہ تھا، جو یورپ کی ہر چیز کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے تیار تھا، وہ مغربی علوم اور مغربی تہذیب و افکار کے فرق کو محسوس نہیں کرسکا؛ چنانچہ ہندستان کی ایک مشہور شخصیت نے جدید علوم کی تعلیم کے لئے ایک اہم ادارہ قائم کیا، جو کالج سے یونیورسٹی بنا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندستان کے مسلمانوں پر یہ ان کا ایسا احسان ہے، جسے کبھی بھلایا نہیں جاسکتا، ان کا مقصد مسلمانوں کو تعلیمی اور معاشی اعتبار سے اونچا اٹھانا تھا اور وہ اپنے مقصد میں پوری طرح مخلص تھے؛ لیکن وہ بھی مرعوبیت اور احساسِ کمتری سے آزاد نہیں رہ سکے، انہوں نے مغربی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی ثقافت کی طرف بھی مسلمانوں کو دعوت دینی شروع کردی، اور مغرب کے مادی افکار کے سامنے بھی سر جھکاتے گئے، انہوں نے کہا کہ فرشتہ اور شیطان کی کوئی حقیقت نہیں، انسان کے اندر نیکی اور برائی کی جو صلاحیتیں پائی جاتی ہیں، یہی فرشتے اور شیطان ہیں، انہوں نے کہا کہ جنت اور دوزخ کا کوئی الگ وجود نہیں؛ بلکہ آرام اور تکلیف کے احساسات ہی جنت اور دوزخ ہیں، انہوں نے معجزات کا انکار کیا اور نبوت کو ایک کسبی منصب ٹھہرایا، یہ ان کی فکر ونظر کی محض چند جھلکیاں ہیں، ورنہ اس طرح کی کتنی ہی باتیں ان کی تفسیر اور دوسری کتابوں میں موجود ہیں، جو اسلام کے معتبر شارحین کی مسلّمات اور کتاب وسنت کی صراحتوں کے خلاف ہیں، یہ گروہ بڑی تعداد میں مسلمانوں میں رہا ہے اور اشتراکیت کے زوال کے بعد گو اس طبقہ میں کمی ہوئی ہے؛ لیکن عالمی سطح پر خاص کر مغربی ممالک میں بسنے والے مسلمان دانشوروں پر اس کی چھاپ اب بھی اچھی خاصی ہے۔

ہندوستان میں شروع ہی سے ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی رہی ہے، جو ان دونوں کے درمیان اعتدال کے راستہ پر تھے، نہ انہوں نے مغرب سے ایسی نفرت کی کہ ان کی ہر چیز کو شجرۂ ممنوعہ سمجھا جائے اور نہ ان سے ایسے مرعوب تھے کہ مغربی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب اور مغربی افکار

ونظریات کے سامنے بھی سر جھکادیں، ہندوستان میں علماء اور دینی شعور رکھنے والے دانشوروں کی غالب تعداد اسی مزاج کی حامل رہی ہے، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث ہیں اور عصری تعلیم کی یونیورسٹی جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھ رہے ہیں، اور مولانا محمد علی جوہر اور ان کے رفقاء کا گروہ ان کا دست وباز و بنا ہوا ہے۔

احساس کمتری اور مرعوبیت سے دو چار گروہ آج بھی عالم اسلام میں اور خود ہندوستان میں موجود ہے، ایسے لوگوں کو اگر حکومت کے دستر خوان سے کوئی لقمہ مل جائے تو ان کی مذہبی قدروں اور اخلاقی روایات سے بغاوت کا جذبہ دوآتشہ ہوجاتا ہے، ہندوستان میں اس وقت کئی نام نہاد دانشور اس بیماری کا شکار ہیں، دہلی میں بھی ایک قانون داں جو پہلے اقلیتی کمیشن کے چیرمین رہ چکے ہیں اور اب حکومت نے ان کے سامنے لا کمیشن کی ممبری کا نیا لقمہ ڈال دیا ہے، برابر شریعتِ اسلامی کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے رہتے ہیں، انہیں علماء سے ایسی نفرت ہے کہ اگر شاید یہ گروہ دن کو اجالا کہے تو وہ اس کو اندھیرا کہنے پر اصرار کرنے لگیں، ان کو وہ اسلام منظور نہیں، جو محمد رسول اللہ ﷺ لے کر آئے؛ بلکہ وہ اسلام مطلوب ہے، جس پر مغربی مفکرین کو کوئی اعتراض نہ ہو، چاہے اس کے لئے اس کی کتنی ہی تراش وخراش کیوں نہ کرنی پڑے۔

دانشور حضرات میں ایک گروہ ان مخلص مسلمانوں کا بھی ہے، جن کی پرورش مغربی ماحول میں ہوئی ہے، جن کا مطالعہ زیادہ تر مغربی مصنفین کا رہا ہے، یہاں تک کہ انہوں نے اسلامی علوم وافکار کو بھی بڑی حد تک مغرب کے اہل قلم کے واسطہ سے پڑھا ہے، مخلص ہونے کے باوجود غیر شعوری طور پر انہیں اسلام کے بعض ایسے احکام سے شرمندگی محسوس ہوتی ہے، جن کو مغربی مصنفین قدامت پرستانہ، غیر مہذب یا غیر انسانی قرار دیتے ہیں؛ چوں کہ اسلام سے ان کا مخلصانہ روحانی تعلق ہے؛ اس لئے وہ دین کی مخالفت تو نہیں کر سکتے؛ لیکن وہ چاہتے ہیں کہ دین وشریعت کی ایسی تعبیر کی جائے اور موجودہ حالات میں اس کو کسی نہ کسی طرح اس طور پر منطبق کیا جائے کہ مغرب کا شکوہ دور ہوجائے اور ان کو اعتراض کا موقع نہ ملے، اس طرز فکر کے حاملین میں بہت پڑھے لکھے اصحاب علم، اصحاب نظر اور اصحاب قلم موجود ہیں، عالمِ اسلام میں خاص کر مغرب میں آباد عرب فضلاء میں اس کا اثر زیادہ ہے، اور ادھر کچھ عرصہ سے یہ فکر برصغیر میں بھی دستک دے رہی ہے۔

اس گروہ کے افکار کا تجزیہ کیا جائے تو دو باتیں خاص طور پر قابل ذکر معلوم ہوتی اور ان کے اکثر اجتہادات کے پیچھے کارفرما نظر آتی ہیں: ایک یہ کہ کسی مسئلہ پر امت کا اجماع واتفاق ایسی دلیل نہیں ہے، کہ اس کے خلاف جانے کی گنجائش نہ ہو، نیز فقہاء کے ایسے شاذ اقوال جن کو امت میں قبولیت اور پذیرائی حاصل نہیں ہوئی کو قبول کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، اس میں بظاہر نہ قرآن کا انکار ہے، نہ حدیث کا، اور نہ سلف کے اجتہادات سے یکسر بے نیازی ہے؛ لیکن اگر اس تصور کی گہرائی میں جایا جائے تو اس سے نصوص کی ایسی تشریح وتوضیح کا دروازہ کھلتا ہے، جس میں الفاظ کے پیچ وخم اور منطقی موشگافیوں سے کام لے کر قرآن وحدیث کی عبارتوں کا ایسا مفہوم متعین کیا جائے، جو دین کے بنیادی مزاج ومذاق کے خلاف ہے۔

دوسری بنیادی بات جو اس فکر کے پیچھے کارفرما ہے، یہ ہے کہ احکامِ شریعت میں اصل اہمیت شریعت کے عمومی مقاصد کو حاصل ہے اور وہ ہیں: دین، جان، مال، نسل اور عقل کا تحفظ —— یہ بات بنیادی طور پر غلط نہیں؛ لیکن اصل مسئلہ عملی زندگی میں ان مقاصد کو منطبق کرنے کا ہے، سوال یہ ہے کہ اگر قرآن وحدیث میں کوئی حکم صراحت کے ساتھ موجود ہے، کسی امر کی بابت صحابہ اور سلف صالحین کا تعامل منقول ہے؛ لیکن آج ایک انسان کی عقل فیصلہ کرتی ہے کہ یہ حکم شریعت کے مذکورہ فلاں مقصد میں رکاوٹ ہے، تو کیا اس کی یہ سوچ قابلِ قبول ہوگی؟ یہ بہت بنیادی سوال ہے؛ کیوں کہ کل ہو کر ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ آج کی مصروف کاروباری دنیا میں پانچ وقت نماز پڑھنا مالی مفادات کے تحفظ میں رکاوٹ ہے؛ اس لئے یا تو اس کو محدود کرنا چاہئے یا اس کے اوقات بدلنے چاہئیں، اسی طرح شریعت کے مختلف احکام کے بارے میں ایسی تاویلات کی جاسکتی ہیں کہ اس کے بعد صرف اسلام کا نام ہی رہ جائے گا اور اس کی حقیقت گم ہو کر رہ جائے گی۔

پڑوسی ملک پاکستان میں ایک زمانہ میں ڈاکٹر فضل الرحمن اور مولانا شاہ جعفر پھلواریؒ وغیرہ نے اس طرح کے تصورات پیش کئے تھے، اور خود ساختہ صدر مملکت ایوب خاں مرحوم نے اس ناکردنی کو انجام دینے کے لئے ایک مستقل ادارہ ''ادارہ ثقافت اسلامیہ'' کی بنیاد رکھی تھی، پاکستان کے اہل علم نے اس پر سخت اعتراضات کئے جن میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ پیش پیش تھے، اس مخالفت کے نتیجے میں یہ تحریک تو دم توڑ گئی؛ لیکن عائلی قوانین کے

سلسلہ میں صدارتی آرڈیننس اب بھی برقرار ہے، جس میں کئی دفعات صریح طور پر شریعت اسلامی کے خلاف ہیں، ہندوستان میں بھی متعدد اہل قلم اپنی روشن خیالی کو پختہ کرنے کے لئے اردو انگریزی صحافت میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں، ان کے بارے میں کچھ لکھنا حقیقت میں اپنے الفاظ کو ضائع کرنا ہے، اور سطحیت کی وجہ سے یہ تحریریں اسی لائق ہوتی ہیں کہ انہیں نظر انداز کیا جائے۔

لیکن اس وقت میرے سامنے ایک بڑے فاضل، معروف مؤلف اور اسلامی اقتصادیات کے ماہر ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی نئی شائع شدہ تالیف ''مقاصد شریعت'' ہے، ان کی یہ کتاب پہلے پڑوسی ملک سے شائع ہوئی ہے اور جس ادارہ نے شائع کیا ہے، وہ وہاں کے متدین علمی حلقوں میں کچھ زیادہ معتبر نہیں سمجھا جاتا، ہندوستان میں ایک وسیع الاثر مذہبی تنظیم نے اسے شائع کیا ہے اور غالباً ناشرین کو فکری نقطۂ نظر سے اس کتاب کے کافی اختلافی ہونے کا اندازہ تھا؛ اس لئے انہوں نے اس کے حرف آغاز میں اس بات کی وضاحت کردی ہے کہ مؤلف کے نقطۂ نظر کو ادارہ کا نقطۂ نظر نہ سمجھا جائے؛ البتہ یہ بات قابل غور ہے کہ کیا کسی ذمہ دار ادارہ کی جانب سے —— جو ایک مقصد اور ہدف کے تحت کام کرتی اور اپنا مستقل نقطۂ نظر رکھتی ہو —— صرف اتنا سا لکھ دینا کافی ہے؟ اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے خلاف مختلف اہل علم کی خواہش اور بار بار کی یاد دہانی پر یہ حقیر اسی لئے قلم اٹھا رہا ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کی تحریر ہے، جن کا نام علم وتحقیق کی دنیا میں ایک معتبر نام ہے، جنہیں عالمی سطح کا ایوارڈ مل چکا ہے، اسلامی معاشیات میں جن کی خدمات قابلِ تحسین ہیں اور ان کی اس کتاب میں محض کسی جزوی مسئلہ پر گفتگو نہیں ہے؛ بلکہ یہ شریعت اسلامی کے بارے میں ایک ایسا دروازہ کھولتی ہے، جس کو بددین لوگ اپنا ہتھیار بنا سکتے ہیں، اور جس سے ہندوستان کے پس منظر میں مسلم پرسنل لا کے ذیل میں آنے والے قریب قریب وہ تمام مسائل زد میں آسکتے ہیں، جن میں حکومت اور نام نہاد دانشوروں کے نقطۂ نظر سے امت کے سوادِ اعظم کا اختلاف ہے۔

اس کتاب (مقاصد شریعت) میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب نے کچھ اصولی مسائل کو اٹھایا ہے اور کچھ فقہی جزئیات پر گفتگو کی ہے، اصولی مسائل میں ایک بحث یہ کی گئی ہے کہ عام طور پر قانون شریعت کے پانچ مقاصد بیان کئے جاتے ہیں، دین کی حفاظت، جان کی حفاظت، نسل کی حفاظت، مال کی حفاظت، اور عقل کی حفاظت؛ لیکن شریعت جن انسانی مصلحتوں کے لئے نازل کی گئی

ہے،ان کومحض ان پانچ مقاصد تک محدود کردینا درست نہیں ؛ بلکہ اور بھی بہت سی چیزیں مقاصد میں شامل ہیں، جیسے:انسانی عز و شرف، عدل و انصاف، ازالۂ غربت، سماجی مساوات وغیرہ، نیز ''حفاظت'' کے لفظ سے صرف منفی مصلحتوں کا اظہار ہوتا ہے،مثبت مقاصد کا نہیں، —— یہ بات ایک حد تک درست ہے،جن حضرات نے قوانین شریعت کے پانچ مقاصد بتائے ہیں،جیسے امام غزالیؒ، امام الحرمینؒ وغیرہ،انہوں نے اس زمانہ کے حالات اورضرورتوں کو مدنظر رکھا ہے؛لیکن غور کیا جائے اوران پانچوں مقاصد کے دائرہ کی وسعت کوسامنے رکھا جائے توآج جن چیزوں کو بنیادی حقوق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، وہ ان سب کو شامل ہے، جیسے: جان کی حفاظت میں انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی انسانی حیثیت اورشرافت بھی شامل ہے، مال کی حفاظت میں تقسیم دولت کا منصفانہ نظام اورسماجی ناانصافیوں کو دور کرنا بھی شامل ہے،اس طرح اسلامی قانون کے ماہرین نے وسیع ترمفہوم کے حامل پانچ ایسے عنوانات کا انتخاب کیا ہے، جوقریب قریب پوری انسانی زندگی کی دینی اوردنیاوی مصلحتوں کا احاطہ کرتے ہیں۔

اسی طرح فقہاء اسلام کا تصور یہ ہے کہ مضرت اورنقصان کو دور کرنے کی اہمیت منفعت کو حاصل کرنے سے بڑھ کر ہے؛اسی لئے بہت سے احکام کو منفی طور پر بیان کیا جاتا ہے،حالاں کہ وہ مثبت پہلو کو بھی شامل ہوتے ہیں،مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ مذہب کے معاملہ میں جبرواکراہ نہیں ہونا چاہئے تو ہم دوسرے لفظوں میں مذہبی آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں، جوایک مثبت پہلو ہے؛اس لئے گذشتہ فقہاء نے جوتعبیر اختیار کی ہے،اس کو ناقص اور نامکمل نہیں کہا جاسکتا؛لیکن اگر مزید تشریح وتوضیح کے لئے ان مقاصد کی فہرست بڑھادی جائے جوشرعی قوانین سے مطلوب ہیں تواس میں حرج نہیں ہے۔

البتہ قابل غور امر یہ ہے کہ مصنف کی تحریر سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ شریعت کے متعین احکام کے مقابلہ ان عمومی مقاصد کی اہمیت زیادہ ہے،یعنی اگر کوئی حکم قرآن وحدیث سے ثابت ہو؛ لیکن وہ کسی زمانہ میں شریعت کے ان مقاصد کے خلاف محسوس ہو، جوعلماء نے اپنے اجتہاد سے اخذ کئے ہیں توان احکام کو تبدیل کیا جاسکتا ہے؛چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> ''کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شریعت کا کوئی حکم کسی خاص حالت میں مقاصد شریعت کے خلاف نتائج کا حامل نظر آتا ہے،ایسا ہوتو نیا حکم ایجاد کیا جائے گا، جوشریعت کے

مقصد کے مطابق ہو' (مقاصد شریعت :ص:۲۱)

اگر اسلامی قانون کے بارے میں اس اصول کو مان لیا جائے تو اس کے مضمرات بہت خطرناک ہوں گے، مثلاً میراث میں بعض حالات میں مردوں کے مقابلہ عورتوں کو نصف حصہ دیا گیا ہے، اب ایک آواز اٹھ رہی ہے کہ شریعت کا ایک مقصد سماجی مساوات قائم کرنا بھی ہے، آج کل عورتیں بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کرتی ہیں، دولت کے حاصل کرنے میں دونوں کا رول برابر ہے؛ اس لئے بیٹا اور بیٹی، باپ اور ماں اور شوہر اور بیوی کے حق میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے، اسی طرح اگر کسی شخص کی صرف بیٹیاں ہوں تو بیٹیوں کا حصہ دینے کے بعد کچھ حصہ مرنے والے کے بھائی بہن کو بھی پہنچتا ہے، اب کہا جارہا ہے کہ اُس زمانہ میں مشترک خاندان کا تصور تھا اور انسان کی مالی ضروریات کی کفالت میں بھائیوں اور بہنوں کا بھی حصہ ہوا کرتا تھا؛ اس لئے انہیں میراث میں حصہ دیا گیا، آج کل ایسا نہیں ہوتا، اب سماجی مساوات کا تقاضا یہ ہے کہ جیسے بیٹے تنہا والدین کے پورے ترکہ کے مالک ہو سکتے ہیں، اسی طرح بیٹیاں بھی والدین کے پورے ترکہ کی مالک ہوں اور والدین کا ترکہ ان لڑکیوں کے چچاؤں، پھوپھیوں، ماموؤں اور خالاؤں کی طرف نہ جائے۔

اسی طرح کہا جاتا ہے کہ عدل وانصاف اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ہے، اور مرد کو طلاق کا حق دینا اور عورتوں کو اس سے محروم رکھنا انصاف کے خلاف ہے، ابتدائی عہد میں مرد شریعت کی حدود کے پابند تھے اور عورتیں تعلیم سے بے بہرہ تھیں؛ اس لئے اس طرح کا حکم دیا گیا، اب یا تو عورتوں کو بھی طلاق کا حق دینا چاہئے؛ کیوں کہ وہ تعلیم یافتہ اور باشعور ہیں اور تعلیم کی وجہ سے قوتِ فیصلہ کی حامل ہیں، یا پھر مردوں سے بھی یہ اختیار سلب کر لینا چاہئے، اور عدالت کو طلاق کا حق سونپ دینا چاہئے؛ کیوں کہ آج کل مرد خدا ناترسی کی وجہ سے طلاق کے معاملہ میں بہت زیادتی کرنے لگے ہیں۔

مصلحتوں کی بناء پر احکام شریعت میں تبدیلی کے مطالبہ کی یہ محض چند مثالیں ہیں اور یہ مثالیں فرضی نہیں ہیں؛ بلکہ یہ وہ باتیں ہیں جو تجدد پسند حضرات کی طرف سے اٹھائی جاتی ہیں، اگر اصولی طور پر یہ بات مان لی جائے کہ شریعت کے متعین جزوی احکام بھی عمومی مقاصد ومصالح کے تحت بدل سکتے ہیں تو یہ صرف پرسنل لا ہی تک محدود نہیں رہے گا؛ بلکہ تمام شعبہ ہائے قوانین پر اس کا اثر پڑ سکتا ہے، جو لوگ تجارتی مقاصد کے لئے لئے گئے قرضوں پر سود کو جائز قرار دیتے ہیں، وہ یہی کہتے ہیں کہ سود کی

حرمت کا مقصد غریبوں کے استحصال کو روکنا ہے اور تجارتی قرضوں میں یہ علت نہیں پائی جاتی ہے، اسی طرح یہ بات بھی کہی جارہی ہے کہ حج میں کثیر اخراجات صرف کرنے کے بجائے اسے ملی ترقی کے کاموں پر خرچ کیا جانا چاہئے، بازار کے اوقات کی رعایت کرتے ہوئے بغیر سفر کے بھی ظہر وعصر کو ایک ساتھ اور مغرب وعشاء کو ایک ساتھ ادا کرنے کی گنجائش ہونی چاہئے وغیرہ، غور کیجئے کہ اس طرح احکام شریعت میں تحریف وتبدیلی کا کتنا بڑا راستہ کھل جائے گا؟

یہ بات پیش نظر رکھنے کی ہے کہ شریعت کے منصوص احکام قرآن وحدیث سے صراحۃً ثابت ہیں اور شریعت کے مقاصد اور اس کی مصلحتیں اجتہاد واستنباط کے ذریعہ متعین کی گئی ہیں، جن میں غلطی کا احتمال ہے، ان مقاصد کو سماج میں پیش آنے والے مسائل وواقعات پر منطبق کرنا بھی قیاس و اجتہاد پر مبنی ہے، جس میں غلطی کا پورا پورا احتمال ہے، پھر مصلحتوں میں ٹکراؤ اور تصادم بھی پایا جاتا ہے، ایک ہی عمل بعض اوقات ایک مصلحت کو حاصل کرنے میں معاون ہوتا ہے اور دوسری مصلحت کے حاصل کرنے میں رکاوٹ، جیسے شراب کی تجارت معیشت کے تحفظ میں معاون ہے، آج شراب کی کمپنیاں مالی اعتبار سے مستحکم کمپنیاں شمار کی جاتی ہیں؛ لیکن یہی دین واخلاق کے لئے نقصان دہ ہے، صحت کے لئے تباہ کن ہے اور انسان کی عقل کو متأثر کرنے والی چیز ہے؛ اس لئے محض شریعت کے عمومی مقاصد کو قرآن وحدیث میں صراحت کردہ متعین احکام کے مقابلہ میں ترجیح دی جانے لگے تو نفس پرست طبیعتیں قانون شریعت کی کیا درگت بنائیں گی، یہ محتاج اظہار نہیں، اللہ تعالیٰ جزاء خیر عطا فرمائے فقہاء اسلف کو، کہ یہ اندیشے ان کی نگاہ میں تھے اور وہ فکر ونظر کے سلسلہ میں پیدا ہونے والے امکانی انحرافات پر نظر رکھتے تھے؛ اس لئے انہوں نے فتوی دینے کے اصول میں اس بات کو شامل کرلیا کہ محض فقہی قواعد کی بناء پر فتاوی نہیں دیے جاسکتے؛ کیوں کہ یہ فقہی قواعد شریعت کے عمومی مقاصد کو بیان کرتے ہیں اور یہ ایسے نہیں ہوتے ہیں کہ ہر جگہ ان کا اطلاق ہو، نیز ان میں آپس میں تعارض بھی پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا ایک اصولی موقف یہ ہے کہ ''اجتہاد کے اندر عقل ایک مؤثر کردار ادا کرتی ہے'' (ص: ۲۵) —— اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام میں عقل کو بڑی اہمیت دی گئی ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ شریعت کا کوئی حکم عقل ومصلحت کے خلاف نہیں ہوسکتا، ہندوستان کے ایک بڑے مفکر کے یہ

قول: ''قرآن اللہ تعالیٰ کا قول ہے اور کائنات اللہ تعالیٰ کا فعل، اور اللہ تعالیٰ کے قول وفعل کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں ہوسکتا''؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان کی دوسری صلاحیتوں کی طرح عقل بھی نقص اور کوتاہی سے خالی نہیں؛ اس لئے اس اصول کو بڑے ہی احتیاط کے ساتھ استعمال کرنے کی ضرورت ہے، ہر عہد میں مختلف گمراہ لوگوں نے عقل کے نام پر قرآن وحدیث کے صریح احکام کا انکار کیا ہے؛ اسی لئے اسلامی اعتقادات کے ماہرین — جن کو متکلمین کہتے ہیں — کے یہاں اس سلسلہ میں بڑی بحثیں ہوئی ہیں کہ اجتہاد اور احکام شریعت کی تشریح میں عقل کا کیا مقام ہے؟

اصل یہ ہے کہ کسی امر کا عقل کے خلاف ہونا اور بات ہے اور اس عقل سے ماوراء اور اس کی پہنچ سے اونچا ہونا اور بات ہے، اگر کوئی حکم دین کی معتبر دلیلوں سے ثابت ہو؛ لیکن ہماری عقل میں نہ آئے تو ہمیں سمجھنا چاہئے کہ بات تو وہی درست ہے جو قرآن وحدیث میں آئی ہے؛ لیکن ہماری عقل ہی نارسا ہے کہ وہ اس کو سمجھنے سے قاصر ہے؛ اسی لئے ہمارے یہاں بہت سے احکام ''تعبدی'' کہلاتے ہیں، یعنی ایسے احکام جن کی مصلحت سے ہم واقف نہیں ہیں اور اس واقفیت کے بغیر ہی ہمارے لئے ان پر عمل کرنا واجب ہے، غرض کہ احکام شریعت کے اخذ واستنباط میں عقل وفہم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا؛ لیکن جب کوئی بات واضح طور پر معتبر دلیلوں سے ثابت ہو تو وہاں قرآن وحدیث کے مقابلہ میں عقل کو فیصل نہیں بنایا جاسکتا۔

مصنف نے اس بات پر کافی زور دیا ہے کہ ''اجتہاد صرف علماء کا کام نہیں ہے، عام مسلمانوں کو بھی اجتہاد کے عمل میں شامل کیا جانا چاہئے، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اجتہاد کی ایک قسم علماء کے لئے مخصوص ہو'' (ص: ۲۷ - ۲۸) — مصنف کی یہ بات راقم الحروف کے لئے حیرت انگیز ہے، معاشیات میں علماء معاشیات کی بات معتبر مانی جاتی ہے، عوام کی نہیں، میڈیکل مسائل میں، میڈیکل ڈاکٹروں کی بات قبول کی جاتی ہے نہ کہ عام لوگوں کی، ملکی قانون کی تشریح میں عدالتوں کی تشریح معتبر ہوتی ہے نہ کہ عوام کی؛ لیکن بیچاری شریعت ایسی مظلوم ہے کہ ہر آدمی اس پر رائے دے سکتا ہے، اور ہر شخص اس کے بارے میں رائے زنی کا مجاز ہے، مصنف نے اس سلسلہ میں علامہ ابو اسحاق شاطبیؒ کی عبارت کا حوالہ دیا ہے؛ لیکن یہ محض غلط فہمی ہے، اجتہاد اصطلاح میں قرآن وحدیث، مماثلت (قیاس) اور مصلحت وغیرہ کی بنیاد پر احکام کے مستنبط کرنے کا نام ہے، اور اجتہاد کا محل ایسے مسائل

ہیں، جو یقینی دلیلوں سے ثابت نہ ہوں، یعنی یا تو ان کا ذریعۂ ثبوت یقینی نہ ہو یا قرآن وحدیث میں اس کے لئے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، وہ ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال رکھتے ہوں، یا قرآن و حدیث میں اس صورت مسئلہ کے بارے میں کوئی وضاحت نہ ہو اور دوطرح کی مماثلتیں اور مشابہتیں پائی جاتی ہوں، جو دوالگ الگ حکم کا تقاضا کرتی ہوں، یہ ہے اجتہاد کی حقیقت، اور اسلام کے اصول قانون پر لکھی گئی کتابوں میں پوری وضاحت وصراحت کے ساتھ اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

علامہ شاطبیؒ نے اجتہاد کو اس کے اصطلاحی مفہوم کے بجائے وسیع مفہوم میں استعمال کیا ہے، انہوں نے اجتہاد کی ایک شکل ''تحقیق مناط'' کو قرار دیا ہے، ''تحقیق مناط'' سے مراد یہ ہے کہ قرآن یا حدیث میں ایک حکم دیا گیا، اس حکم کی وجہ ظاہر کردی گئی یا اجتہاد کرنے والوں نے اپنے اجتہاد سے اسے متعین کردیا، اور اب یہ بات قرار پائی کہ جہاں جہاں بھی یہ وجہ پائی جائے گی، وہاں یہی حکم جاری ہوگا، جیسے شراب کو اس لئے حرام قرار دیا گیا ہے کہ وہ نشہ پیدا کرتی ہے، لہٰذا جو چیزیں نشہ پیدا کرنے والی ہوں گی، وہ حرام ہوں گی، — اب کسی زمانہ میں کوئی نئی چیز ایجاد ہو اور ایک شخص باضابطہ عالم دین تو نہیں ہو؛ لیکن وہ اس بات سے واقف ہو کہ فلاں چیز بھی نشہ آور ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس چیز سے بچے اور لوگوں کو بچائے؛ کیوں کہ جس سبب سے شریعت نے شراب کو حرام قرار دیا تھا، وہ واضح ہے اور یہاں بھی پایا جارہا ہے، اس کا نام ''تحقیق مناط'' ہے، اس میں اصطلاحی طور پر اجتہاد نہیں کیا جاتا؛ بلکہ فنی طور پر واقف ہونے کی وجہ سے اجتہاد کے ذریعہ جو حکم ثابت ہو چکا ہے، اس کو اس پر منطبق کیا جاتا ہے، اس کو آسان الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ''حکم شرعی کو قرآن وحدیث سے مستنبط کرنا علماء کا کام ہے؛ لیکن صورت مسئلہ سے واقفیت ماہرین کے ذریعہ بھی حاصل کی جاسکتی ہے؛ بلکہ بعض اوقات اس فن سے واقف معمولی تعلیم یافتہ لوگوں سے بھی'' یہ فقہی اصطلاح کے اعتبار سے اجتہاد نہیں ہے۔

اصطلاحات کا اختلاف کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہوتا؛ لیکن بعض دفعہ بدنیت لوگ اس کا غلط استعمال کر لیتے ہیں، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ بعض مسلم ممالک میں کہا جارہا ہے کہ پارلیمنٹ کے منتخب نمائندوں کو مجتہد تسلیم کرلیا جائے اور انہیں اجتہادی فیصلوں کی اجازت دی جائے، کچھ عرصہ پہلے ترکی سے خبر آئی تھی کہ ترکی حکومت قرآن وحدیث کی جدید اور عصری تعبیر وتشریح کے لئے ایک ادارہ کی

تشکیل کر رہی ہے، آج کل ممبران پارلیمنٹ کا علمی، اخلاقی اور دینی معیار کیا ہے؟ اور کسی قدر تبدیلی کے باوجود تر کی حکومت اسلامی تعلیمات کے بارے میں کیا فکر رکھتی ہے؟ یہ محتاج اظہار نہیں، اب اگر اجتہاد کے دائرہ کو وسیع کرنے کے لئے اس طرح کی بات قبول کر لی جائے جو مؤلف نے کہی ہے تو سوچئے کہ اس کا کتنا غلط استعمال ہوگا اور اسلام ہی کے نام پر اسلام کی کیسی تراش خراش ہوگی؟

چوں کہ عوام عربی زبان سے واقف نہیں ہیں، ایسے شائقین اجتہاد کے مجتہد بننے میں یہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے؛ اس لئے ڈاکٹر صاحب کا نقطۂ نظر ہے کہ اجتہاد کے لئے عربی زبان میں مہارت ضروری نہیں ہے، اور اس سلسلہ میں پھر وہی علامہ شاطبیؒ کی خصوصی اصطلاح یا تعبیر سے انہوں نے استدلال کیا ہے، یہ بات اس لحاظ سے درست ہے کہ احکام شریعت کے استنباط میں عربی زبان کا علم ضروری ہے، صورت مسئلہ سے واقف ہونے اور مستنبط شدہ حکم کو اس پر منطبق کرنے میں تعاون کے لئے عربی زبان سے واقفیت ضروری نہیں؛ لیکن جب آپ اس دوسری صورت کو اجتہاد کا نام دیں گے تو اس سے وہی غلط فہمی پیدا ہوگی، جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، بہر حال مصنف نے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے حق اجتہاد کے دعوی کو بار بار پیش کیا ہے اور ان کے نزدیک یہ طبقہ شرعی مسائل کے بارے میں بہ قول مؤلف: ''اپنی فکری توانائی اور مادی وسائل میں امت کے پرانے روایتی عناصر پر فوقیت رکھنے کے سبب نئے غور وفکر میں زیادہ حصہ لے سکتا ہے'' (ص: ۱۳۶) —— مؤلف کو اس بات سے بڑی ناراضگی ہے کہ ''نئے پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کی کوشش کو امت کے علماء اور فقہاء کا کام قرار دیا جائے اور باقی لوگوں کو اس بات پر قانع رکھا جائے کہ ان کا کام سمع وطاعت ہے'' وہ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

> ''یہ سوچ درست نہیں، اس کی پہلی غلطی یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کو ایک ایسے عمل میں شرکت سے محروم کرنا چاہتی ہے، جس میں حصہ لینا ان کا نہ صرف حق ہے؛ بلکہ ان کی ذمہ داری ہے'' (ص: ۱۶۵)

مصنف کی اس وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد میں حصہ لینا عام مسلمانوں پر بھی فرض ہے؛ اس لئے یہ ان کے ساتھ بڑی زیادتی ہے کہ اس کو ایک فرض کی ادائیگی سے باز رکھا جائے، نہ معلوم یہ فرضیت اور استحقاق کس آیت وحدیث سے ثابت ہے؟؟

ایک طرف تو مؤلف کے نزدیک دانشوروں کو اجتہاد کرنے کا حق حاصل ہے اور دوسری طرف اسلامی بینکنگ اور اسلامی معاشیات کے بارے میں مؤلف کا خیال ہے کہ اس پر معاشی ماہرین کو غور کرنا چاہئے کہ یہ علماء کے بس کی بات نہیں، یعنی اجتہاد کے لئے عربی زبان سے اور اسلامی علوم سے براہ راست واقفیت ضروری نہیں، مگر اسلامی معاشیات کے لئے انگریزی زبان اور علم معاشیات سے براہ راست واقفیت ضروری ہے، بہ قول مؤلف:

''ان کاموں کو صرف وہ لوگ انجام نہیں دے سکتے، جنہوں نے صرف دینی مدارس میں تعلیم پائی ہو، نہ یہ شریعہ اسکالرز کی اس نئی کھیپ کے بس کی بات ہے، جو اسلامی فائنانس کے طفیل پروان چڑھی ہے، اس میں ہر میدان کے تجزیہ والے، ہر اختصاص والے مردوں اور عورتوں، سب کے لئے کردار ادا کرنے کے کچھ کام ہیں'' (ص:۳۲۱)

مصلحت کی وجہ سے قرآن وحدیث میں مذکورہ احکام میں تبدیلی کے سلسلہ میں مؤلف نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس عمل سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تو مال غنیمت کو مجاہدین میں تقسیم کر دیا کرتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق کی مفتوحہ اراضی کو مجاہدین میں تقسیم کرنے کے بجائے بیت المال کی ملکیت باقی رکھا — مگر حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ عمل قرآن وحدیث سے ہٹ کر نہیں تھا؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''جو کچھ اللہ تعالیٰ نے بستی والوں سے اپنے رسول کو دلا لایا ہے، وہ اللہ، رسول، قرابت دار، یتیموں، مسکینوں اور مسافر کے لئے ہے؛ تاکہ تم (دولت) میں سے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتی رہے اور جو کچھ رسول تمہیں دے، اسے قبول کرلو اور جس سے منع کریں اسے چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سخت عذاب دینے والے ہیں'' (الحشر:۷)

آگے اللہ تعالیٰ نے مال غنیمت کے مزید مستحقین کا تذکرہ کرتے ہوئے آیت نمبر:۸ میں مہاجرین کا، آیت نمبر ۹ میں انصار کا اور آیت نمبر ۱۰ میں بعد میں آنے والوں: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاؤُوا مِنْ بَعْدِهِمْ﴾ کا ذکر کیا ہے، اس آیت سے جو بات واضح ہوتی ہے، وہ یہ کہ مال غنیمت کے سلسلہ

میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اختیار دیا تھا، اور اس کا عمومی مصرف آپ ﷺ کے قرابت دار، اہل بیت کے ضرورت مند، مہاجرین اور انصار اور بعد میں آنے والوں کو قرار دیا گیا، اور مصلحت یہ بتائی گئی کہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہ رہ جائے ۔۔۔ حضرت عمرؓ کا یہی استدلال تھا کہ مالِ غنیمت کی تقسیم سربراہ کی صوابدید پر ہے، یہ صرف مجاہدین کا حق نہیں، نیز اس میں مسلمانوں کی آنے والی نسلوں کا حصہ بھی ہے، اور آنے والے لوگوں کو اسی وقت اس سے فائدہ پہنچتا جب کہ اس کو بیت المال کی ملکیت بنایا جائے، نیز اگر صرف فوجیوں میں اس کی تقسیم ہوجاتی تو یہ مقصد بھی فوت ہوجاتا کہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہ رہ جائے۔

خود رسول اللہ ﷺ کا عمل یہ تھا کہ اموالِ منقولہ ۔۔۔ یعنی جانور، روپے پیسے وغیرہ ۔۔۔ سے تو آپ پانچواں حصہ بیت المال اور اپنی ضروریات کے لئے رکھ لیتے اور چار حصے مجاہدین میں تقسیم کردیتے، اور غیر منقولہ اموال یعنی زمین ومکان وغیرہ کی تقسیم اپنی صوابدید سے کرتے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں سب سے بڑی جائداد خیبر میں ملی، آپ ﷺ نے اس کا نصف حصہ اپنے تصرف میں رکھا اور نصف مسلمانوں میں تقسیم کردیا، جیسا کہ ابوداؤد وغیرہ کی روایت میں ہے، خیبر کے بعد فدک کی زمین قبضہ میں آئی، اسے آپ ﷺ نے اپنے تصرف میں رکھا، جس سے آپ ﷺ اپنی ضروریات پوری فرماتے تھے، اور مسافروں اور مہمانوں پر صرف کرتے تھے، مکہ اور طائف فتح ہوا، مگر ان کی اراضی مجاہدین میں تقسیم نہیں کی گئیں؛ اس لئے یہ سمجھنا کہ حضرت عمرؓ نے مصلحت کی بناء پر حضور ﷺ کے عمل کو ترک کیا ہو، قطعاً درست نہیں۔

اسی طرح ڈاکٹر صاحب کا استدلال ہے کہ ایک شخص نے زکوۃ دینے سے انکار کیا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اسے چھوڑ دیا؛ حالاں کہ حضرت ابوبکرؓ نے ایسے لوگوں سے جہاد کیا تھا؛ لیکن اگر غور کیا جائے تو دونوں کا عمل حضور ﷺ کی حدیث ہی پر مبنی ہے، اور ان میں کوئی تضاد نہیں ہے، حضور ﷺ کے زمانہ ہی میں ایک شخص نے زکوۃ دینے سے انکار کردیا تھا، آپ ﷺ نے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی، حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں ایک دو فرد کے انکار کا مسئلہ نہیں تھا؛ بلکہ پورا پورا قبیلہ انکار وبغاوت پر اترا ہوا تھا، اگر ان کے خلاف سخت رویہ اختیار نہیں کیا جاتا تو یہ آئندہ ایک فتنہ کی شکل اختیار کرلیتا، حضرت ابوبکر صدیقؓ کا عمل اس حدیث پر مبنی تھا، جس میں اس وقت تک

لوگوں سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے، جب تک وہ ایمان نہ لائیں، نماز قائم نہ کریں اور زکوۃ ادا نہ کریں، ''لوگوں'' کے لفظ سے اشارہ ہے جماعت کی طرف، اور قتال سے اشارہ ہے کسی گروہ کی مسلح مخالفت کی طرف؛ کیوں کہ قتال ایک طرفہ عمل نہیں ہے، دوطرفہ عمل ہے، عہد صدیقی میں یہی صورت حال پیش آئی کہ پورے پورے قبیلہ نے نہ صرف زکوۃ دینے سے انکار کر دیا؛ بلکہ مسلح سرکشی پر اتر آئے؛ اس لئے دونوں کا عمل نص ہی پر مبنی تھا، ایسا نہیں تھا کہ شریعت کے مصالح ومقاصد کی وجہ سے قرآن و حدیث کو چھوڑ دیا گیا ہو۔

بحیثیت مسلمان ہر شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ دین دوسری تمام ضرورتوں پر مقدم ہے؛ کیوں کہ یہ انسانیت کا مقصد وجود ہے؛ اسی لئے جن اہل علم نے شریعت کے مقاصد پر گفتگو کی ہے، انہوں نے بجا طور پر پہلے درجہ میں ''دین'' کو رکھا ہے؛ لیکن مجھے یہ بات عجیب محسوس ہوئی کہ مؤلف ایسی باتوں کو خصوصی اہمیت کے ساتھ نقل کرتے ہیں، جن میں کسی درجہ میں دین کی اہمیت کم ہوتی ہو، جیسے ایک موقعہ پر فرماتے ہیں:

> ''یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ روایتی فہرست کا ذکر کرتے وقت ابن تیمیہ نے......غزالی وغیرہ کی ترتیب کے برعکس دین کو اپنی فہرست میں آخری نمبر پر رکھا'' (ص:۳۱)

اسی طرح ایک اور موقعہ پر فرماتے ہیں:

> ''یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ شاہ صاحب نے مقاصد شریعت کی روایتی فہرست میں دین کی جگہ ملت کا لفظ استعمال کیا ہے'' (ص:۳۶)

نہ معلوم یہ بات مصنف کے نزدیک کیوں قابل توجہ اور دلچسپی کا باعث ہے؟

اب ایک نظر ہم عصر حاضر کے ارباب دانش کے ان اجتہادات پر ڈالتے ہیں، جن کا مصنف نے تائید وتحسین کے طور پر ذکر کیا ہے، ان میں سے کئی کا تعلق خواتین سے ہے؛ کیوں کہ مؤلف کے خیال میں مسلم سماج کا نقشہ کچھ اس طرح ہے کہ ''یہ کائنات مردوں کی آماجگاہ ہے، اور عورتیں مردوں کے لئے بنائی گئی ہیں'' (ص:۵۹)؛ چنانچہ لکھا گیا ہے:

> ''ہمارے زمانہ میں ہوائی جہاز اور ریل گاڑی مین جہاں سیکڑوں مسافر موجود ہوتے ہیں، عورت کو خطرہ محسوس نہ ہو تو محرم کے بغیر اس کے سفر کرنے میں کوئی حرج نہیں

ہے‘‘(ص:۷۹)

غور کیجئے کہ آج بھی جہازوں اورٹرینوں میں دست درازی اورعصمت دری کے کتنے واقعات پیش آتے ہیں؛ بلکہ اب تومنظم طور پرنشہ پلاکراورنشہ سونگھا کرایسے جرائم کئے جاتے ہیں،جن سے ماضی میں لوگ نا آشنا تھے،ان حالات میں کیا یہ اجتہادشریعت کی اس روح کے مطابق ہے، جوعورتوں کی عفت وعصمت کے تحفظ کے سلسلہ میں انتہائی احتیاط چاہتی ہے؟ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بھی اور اس سے پہلے بھی لوگ بڑے بڑے قافلوں کی صورت میں سفرکرتے تھے اوراپنے اپنے قبیلہ کے تحفظ کے سلسلہ میں ان میں موجودہ دور کے مقابلہ زیادہ حساسیت تھی؛لیکن رسول اللہ ﷺ نے شرکاءسفر کی کثرت کوکافی نہیں سمجھا، یہاں تک کہ خود حجۃ الوداع کے لئے ایک خاتون نے اجازت چاہی؛لیکن محرم کے نہ ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ نے اس کوشرکت کی اجازت نہیں دی،سوچئے کہ عہدنبوی ﷺ کا ماحول زیادہ پُرامن تھا یا آج کا ماحول؟— رسول اللہ ﷺکواس کا بخوبی اندازہ تھا کہ مستقبل قریب میں امن وامان کی فضاءقائم ہوجائے گی، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی کہ ایک بوڑھی عورت صنعاءیمن سے شام تک کا سفر پورے امن کے ساتھ تنہا طے کرے گی؛لیکن پھربھی آپ نے تاکیدفرمائی کہ کوئی عورت محرم کے بغیرطویل سفرنہ کرے،اگراس حکم کی اہمیت نہ ہوتی اوراس میں تبدیلی کی گنجائش ہوتی،توآپ ﷺفرماتے کہ طویل سفرمیں اگرخطرات ہوں تب محرم کاساتھ ہوناضروری ہے، ورنہ نہیں؛لیکن آپ ﷺ نے ایسانہیں فرمایا کیوں کہ احکام عمومی حالات کے تحت دے جاتے ہیں اور وہ حالات آج بھی تیزرفتارسواریوں،ٹرینوں اور جہازوں وغیرہ میں بھی موجودہیں۔

اسی طرح کاایک اجتہادیہ ہے کہ جہاں مسلمانوں اورغیرمسلموں کے درمیان سیاسی جھگڑے نہ ہوں، امن وامان کی فضا ہو، وہاں اگربیوی مسلمان ہوجائے اورشوہراہل کتاب میں سے عیسائی یا یہودی ہوتواس کا نکاح باقی رہے گا؛ بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بھی کہا گیا ہے کہ مغرب کی مسلمان اقلیت کواختیاردیناچاہئے کہ وہ اپنی بیٹیوں کوعیسائی ویہودی مردوں کے ساتھ شادیاں کرنے کی اجازت دیں‘‘(ص:۱۷۸)—غور کیجئے کہ قرآن وحدیث نے یہ بات واضح کردی ہے کہ— سوائے اس کے کہ مسلمان مرد یہودی یاعیسائی عورت سے نکاح کرسکتا ہے—مسلمان اورغیرمسلم کے درمیان نکاح کرنے یانکاح کے باقی رہنے کی کوئی اورصورت نہیں ہوسکتی،اورجن فقہاءکی آراءکوامت

نے قبول کیا ہے، قریب قریب ان سب کا اس پر اتفاق ہے؛ بلکہ فقہاء نے تو مسلمان مرد کے کتابی عورت سے نکاح کو بھی پسند نہیں فرمایا ہے، حضرت عمرؓ نے تو اس سلسلہ میں باضابطہ حضرت حذیفہ ؓ کو منع فرمایا تھا، کیا اس فکری انحراف کو اجتہاد کہا جا سکتا ہے؟

ان ہی اجتہادات میں یہ بھی ہے کہ ''عورت کے مناصب حکومت پر فائز ہونے میں کوئی حکم شرعی مانع نہیں ہے، ان مناصب میں صدر مملکت کا عہدہ بھی شامل ہے''— اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کا کیا معنی رہ جائے گا کہ ''جو قوم اپنی باگ وڈور عورت کے حوالہ کردے وہ ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتی'': ''لن يفلح قوم ولّوا أمرهم امرأة'' (بخاري، باب كتاب النبي ﷺ إلى كسرى وقيصر، حدیث نمبر: ۴۰۷۳)— ڈاکٹر صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں:

> ''یہاں تک کہ بعض ایسے طور طریقے بھی رواج پا گئے، جو اسوۂ نبوی کے سراسر خلاف تھے، مثلاً عورتوں و مردوں کا ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا، عورتوں کو سلام نہ کرنا یا اس کے سلام کا جواب نہ دینا، عورتوں کو مساجد میں نہ آنے دینا وغیرہ، یہ مقامی عرف وعادات تھے، جنہیں دانستہ یا نادانستہ مسلم معاشرہ نے بھی اپنا لیا'' (ص: ۱۹۳)

گویا عورتوں اور مردوں کے اختلاط میں کوئی حرج نہیں ہے، اجنبی مرد وعورت ایک دوسرے کے ساتھ اٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا کر سکتے ہیں، اگر اسلام کا یہی مزاج ہوتا تو نماز میں آگے مردوں کی، درمیان میں بچوں کی اور پیچھے عورتوں کی صف کیوں رکھی جاتی؟ عورتوں کو کیوں حکم دیا جاتا کہ وہ راستہ میں ایک کنارہ سے چلا کریں، بیچ سے نہ چلیں؟ کیوں ارشاد ہوتا کہ ان کا گھر میں نماز پڑھنا مسجد میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے؟ خلفاء راشدین کی مجلس شوریٰ میں ان کو کیوں نہ شامل رکھا جاتا؟ ازواج مطہرات کو اپنے گھروں میں محدود رہنے کا کیوں حکم دیا جاتا؟ ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ (الاحزاب: ۳۳)— اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ مغربی معاشرہ نے جب مردوں اور عورتوں کے اختلاط کو درست قرار دیا تو اس کے اخلاقی اثرات کیا مرتب ہوئے؟ کیا ہم اِس امت کو اسی سطح پر لے جانا چاہتے ہیں؟

مصنف کا خیال ہے کہ ''عورتوں کا سر ڈھکنا محض ایک رواجی عمل تھا، کوئی شرعی حکم نہیں ہے''، ان کا مشورہ یہ بھی ہے کہ ''اس سلسلہ میں مسلمانوں کو مغربی ملکوں سے محاذ آرائی نہیں اختیار کرنی

چاہئے'' (دیکھئے: ۱۹۴ - ۱۹۵) — حدیثوں میں صراحت موجود ہے کہ جوان عورتوں کا چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا کوئی اور چیز نظر نہیں آنی چاہئے، نیز چہرے کے پردہ کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے، وہ بھی اس صورت میں کہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہو؛ لیکن سر کے قابل ستر ہونے پر اجماع و اتفاق ہے، قرآن مجید میں ''جلباب'' (گھونگھٹ) اور ''خمار'' (اوڑھنی) کے استعمال کا حکم دیا گیا ہے، یہ ظاہر ہے کہ سر کو شامل ہے، مصنف کا خیال ہے کہ ''اوڑھنی صرف سینے پر ڈالنے کے لئے ہے''؛ حالاں کہ یہ اس لفظ کی متوارث تشریح کے خلاف ہے اور اگر سر پہ اوڑھنی بھی نہ ہو اور چہرے کا پردہ بھی نہ ہو تو عورتوں کے اسلامی اور مغربی لباس میں فرق ہی کیا باقی رہ جاتا ہے؟ — پھر یہ سمجھنا کہ فلاں مسئلہ پر مغرب سے محاذ آرائی نہ ہونی چاہئے؛ تاکہ تعلقات میں ہم آہنگی پیدا ہو، اپنے آپ کو دھوکے میں ڈالنا ہے؛ کیوں کہ مغرب کو ہر طرح کی اسلامی شناخت سے نفرت ہے، اور قرآن مجید نے یہود و نصاری کی نفسیات کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے، کہ جب تک تم ان کے طور طریقے کو قبول نہ کرلو، وہ تم سے راضی نہیں ہو سکتے: ﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ (البقرۃ: ۱۲۰)

یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ کسی مسئلہ میں شاذ و نامقبول قول کا مل جانا دشوار نہیں، مگر جس کو امت کے معتبر فقہاء نے رد کر دیا ہو، وہ قابل قبول نہیں ہوتا؛ اسی لئے امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ جس نے علماء کے شاذ اقوال کو لیا، وہ دین کے دائرہ ہی سے باہر ہو گیا: ''**من أخذ بنوادر العلماء خرج من الإسلام**'' اور سلیمان تیمی نے فرمایا کہ اگر تم ہر عالم کی رخصت کو جمع کرتے جاؤ گے تو تم میں سارا شر جمع ہو جائے گا: ''**إن أخذت برخصة كل عالم اجتمع فيك الشر كله**'' **(الموافقات: ۴/ ۱۷۰)**

مصنف کے خیال میں اسرائیل کے خلاف فلسطینیوں کی وہ کاروائی جس کے علاوہ ان کے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے، دہشت گردی ہے، (ص: ۲۸۷) — اسی طرح مصنف کی رائے کا حاصل یہ ہے کہ کہ نیوکلیئر اسلحہ اور دوسرے خطرناک ہتھیاروں سے مسلمانوں کو یکطرفہ طور پر دستبرداری اختیار کر لینی چاہئے، (ص: ۲۹۵) اب غور کیجئے کہ مسلمانوں کے پاس اسلحہ سازی کی ٹکنالوجی ہی کس معیار کی ہے؟ اور ان کو منصوبہ بند طور پر غلام بنا کر رکھنے کی کوشاں قومیں کس طرح عالم اسلام کے خلاف تیاریاں کر رہی ہیں؟ کہ کئی عرب ممالک مل کر چھوٹے سے اسرائیل کا مقابلہ نہیں کر سکتے، ان حالات

میں کیا مسلمانوں کو اس قسم کا مشورہ دیا جاسکتا ہے، اور قرآن مجید میں جو حتی المقدور دفاع کے لئے تیار رہنے کا حکم دیا گیا ہے: ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾ (الانفال: ٦٠) کیا یہ مشورہ اس سے ہم آہنگ ہے؟

غرض کہ یہ کتاب مجموعی طور پر یہ تأثر دیتی ہے کہ دنیوی مصلحتوں کے لئے قرآن وحدیث کے صراحت کردہ احکام میں بھی تبدیلی ہوسکتی ہے؛ حالاں کہ فقہاء کے یہاں یہ تسلیم شدہ اصول مانا گیا ہے کہ جو مسائل قرآن و حدیث میں مصرح ہوں، ان کے مقابلہ میں کوئی مصلحت معتبر نہیں ہوگی: **''المشقة والحرج إنما يعتبر ان من موضع لا نص فيه, وأما مع النص بخلافه فلا''** (**الأشباه والنظائر مع غمز البصائر**: ۱/۲۷۱) —— اس کتاب سے مجموعی طور پر یہ ذہن بنتا ہے کہ کسی زمانہ کے عرف ورواج کی بنیاد پر بعض نصوص کو ترک کیا جاسکتا ہے؛ حالاں کہ ہمارے فقہاء کے یہاں عرف ورواج معتبر ضرور ہے؛ لیکن قرآن وحدیث کے مقابلہ میں نہیں: **''ولا اعتبار للعرف المخالف للنص''** (**نشر العرف**: ص: ۱۱۴) —— بعض ایسی باتیں جن کا قرآن وحدیث میں حکم دیا گیا ہے، ان کے بارے میں مصنف کا نقطۂ نظر ہے کہ وہ عربوں کے رواج اور ان کے عرف پر مبنی ہیں اور وہ ہر دور میں واجب العمل نہیں، اگر اس بات کو مان لیا جائے تو پھر معاشرتی مسائل سے متعلق اسلام کی اکثر تعلیمات پر خطِ نسخ پھیرا جاسکتا ہے، اور مصنف کا رجحان ایسے اجتہادات کی طرف ہے، جو مغرب کے تصورِ آزادی سے ہم آہنگ ہو، چاہے وہ کتاب وسنت اس تشریح کے خلاف ہو، جس کو امت کے سوادِ اعظم نے قبول کیا ہے، اس سے فکری انحراف کا وسیع راستہ کھلتا ہے۔

ایک صاحبِ نظر، صاحبِ علم اور دینی حلقہ سے مربوط، نیز اسلامی نظامِ معیشت کی ترجمان شخصیت کی جانب ایسے افکار کا ظہور ہمیں علامہ اقبال کے اس شعر کی یاد دلاتا ہے:

جلوہ اش مارا زما بیگانہ کرد
ساز مارا از نوا بیگانہ کرد
از دل ما آتش دیرینہ برد
نور و نارلا اِلٰہ از سینہ برد
اجتہاد اندر زمان انحطاط

قوم را برہم ہمی پیچد بساط
و اجتہاد عالمان کم نظر
اقتداء بر رافتگاں محفوظ تر

(اس ''مغرب'' کے جلوہ نے ہم کو ہم سے ہی بیگانہ کر دیا ہے، اس نے ہمارے ساز کو آواز سے محروم کر دیا ہے، ہمارے دلوں سے قدیم آگ کو بجھا دیا ہے، اور لا إلہ کی روشنی اور حرارت سینوں سے رخصت ہوگئی ہے، زمانۂ انحطاط میں اجتہاد قوم کو منتشر کر دیتا اور اس کی بساط کو لپیٹ کر رکھ دیتا ہے، کم نظر عالموں کے اجتہاد کے مقابلہ گذرے ہوئے لوگوں کی پیروی ہی زیادہ محفوظ طریقہ ہے)

تکفیر میں احتیاط

جس قوم کی فکر زندہ ہو اور اپنے عقیدہ سے اس کا رشتہ استوار ہو، اسے آسانی سے شکست نہیں دی جاسکتی؛ البتہ اگر وہ آپس میں دست وگریباں ہوجائیں اور ایک دوسرے کی عزت وآبرو سے کھیلنے لگیں تو ان کو زیر کرنا چنداں دشوار نہیں ہوتا، ایک چُنی ہوئی مربوط دیوار کو ہٹانے میں دشواری پیش آتی ہے؛ لیکن بکھری ہوئی اینٹوں کو اٹھالے جانا دشوار نہیں ہوتا، وہ قدموں سے روندی جاتی ہے اور پامال ہوتے رہنا ہی اس کا مقدر ہوتا ہے، اسلام دشمن طاقتیں اس وقت مسلمانوں کے بارے میں یہی دوہرا نسخہ استعمال کررہی ہیں، وہ ایک طرف مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے اور اسلام کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا کرنے کی کوشش میں ہیں؛ تاکہ اپنے مذہب اور تہذیب سے اس امت کا رشتہ کٹ جائے؛ لیکن انہیں اندازہ ہے کہ وہ ایک حد تک ہی اس میں کامیاب ہوسکتی ہیں، مسلمان خون کی ندیوں سے گذر سکتا ہے، رسوائی اور بے عزتی کے زخم سہہ سکتا ہے اور فقر وافلاس کی مار کو برداشت کرسکتا ہے؛ لیکن وہ اس بات کو قبول نہیں کرسکتا کہ متاع ایمان سے محروم رہے؛ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے تمہارے بارے میں شرک کا اندیشہ نہیں ہے؛ بلکہ میں تمہارے بارے میں مال کے فتنہ کا خوف رکھتا ہوں (**صحیح البخاري، کتاب الجنائز، باب الصلاۃ علی الشھید، حدیث نمبر: ۱۲۵۸، صحیح مسلم، کتاب الفضائل، حدیث نمبر: ۴۲۴۸**)۔

لیکن ان قوتوں کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگیا ہے کہ مسلمانوں کے اندر اختلاف کی بیج بآسانی بوئی جاسکتی ہے؛ چنانچہ مغرب نے عالم اسلام میں نسلی اختلاف کو اپنے شباب پر پہنچا دیا ہے، دوسری طرف اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمانوں میں مذہبی اختلافات کو خوب ابھارا جائے اور مختلف مذہبی گروہوں کو ایک دوسرے کے خلاف اکسایا جائے، ہندوستان میں بھی اس کی پوری کوشش ہورہی ہے اور سنگھ پریوار کے لوگ چاہتے ہیں کہ غیر محسوس طور پر مسلمانوں کو بانٹ دیا جائے؛ تاکہ وہ سیاسی طور پر بھی بے وزن ہوجائیں اور حقیقی مسائل کی طرف سے ان کا ذہن ہٹ جائے۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے یوپی کے شہر مرادآباد میں ایک جلسہ ہوا، جلسہ میں ایک مکتب فکر کے لوگوں

نے دوسرے مسلک ومشرب کے حامل گروہوں پر نہ صرف تنقید کی؛ بلکہ یہ بھی کہا کہ اصل میں وہی دہشت گردی کا سرچشمہ ہیں، بظاہر ایسا لگتا ہے کہ ایک آدھ مقررین نے یہ بات کہی ہوگی؛ لیکن الیکٹرانک میڈیا اور انگریزی کے پرنٹ میڈیا نے اس بات کو کچھ اس طرح پیش کیا کہ گویا جلسہ کا بنیادی موضوع ہی یہ تھا، اسی طرح کا بیان مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمی کو بڑھاتا ہے، مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسی سازشوں سے باخبر رہیں اور خواہ فکر ونظر کا کتنا بھی اختلاف ہو، اپنے دشمنوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دیں۔

یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ مذہبی اختلافات کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں، کہ اس اختلاف نے اگر شدت اور بے اعتدالی کی راہ اختیار کر لی تو دلوں کے فاصلوں کو پاٹنا اور لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا آسان نہیں ہوتا؛ کیوں کہ اس اختلاف کو دین کی خدمت سمجھ کر اور آخرت کی کامیابی تصور کر کے بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے اور شدت پسند لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم جتنا زیادہ شدت کا مظاہرہ کریں گے، اتنے ہی زیادہ اجر وثواب کے مستحق ہوں گے، یہاں تک کہ ایک دوسرے کی تکفیر کی جاتی ہے، ایک دوسرے کو 'فرقۂ ناریہ' کہا جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ خود اہل سنت میں بعض دبستان فقہ دوسرے دبستان فقہ کے امام کے پیچھے نماز پڑھنے کے جائز ہونے نہ ہونے پر بحث کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شریعت میں ایمان لانا سب سے آسان عمل ہے، کوئی بھی شخص جو اللہ تعالیٰ کی توحید، رسول اللہ ﷺ کی رسالت، اور آخرت پر یقین کا اظہار کرے، وہ ایمان کے دائرہ میں آگیا، جیسے ہی اس نے زبان سے توحید ورسالت کی شہادت دی، اس پر مسلمانوں کے احکام جاری ہوں گے؛ یہاں تک کہ اس کے دل میں جو کچھ ہے، اسے کھرچ کر دیکھنے کا بھی ہمیں حق نہیں ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''الإیمان أن تؤمن باللہ وملائکتہ وبلقائہ ورسلہ وتؤمن بالبعث'' (صحیح البخاري، کتاب الإیمان، باب: سوال جبریل علیہ السلام النبي ﷺ عن الإیمان والإسلام والإحسان وعلم الساعۃ، حدیث نمبر: ۵۰)
>
> ''ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی ملاقات پر، اس کے رسولوں پر اور دوبارہ اٹھائے جانے پر یقین رکھو''

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں کچھ لوگ منافق تھے، جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے؛ لیکن بہ باطن وہ مسلمان نہیں تھے، حضور ﷺ نے ان کے ساتھ مسلمانوں ہی کا سا معاملہ فرمایا، آپ ﷺ کو من جانب اللہ ان کے اسماء بتا دیئے گئے تھے، اس کے باوجود آپ ﷺ نے عام صحابہ ﷢ پر اس کو آشکارا نہیں فرمایا؛ تا کہ کہیں لوگ ان کے ساتھ کلمہ گو ہونے کے باوجود وہ برتاؤ نہ کرنے لگیں، جو کسی مسلمان کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا، ایمان لانا جتنا آسان ہے اور مسلمان ہونے کا حکم لگانا جتنا سادہ اور سہل ہے، کسی شخص کو دائرۂ ایمان سے باہر قرار دینا اسی قدر نازک بات ہے، اور اس میں نہایت احتیاط برتنے کا حکم ہے، جب تک کسی شخص کے کفر کا یقین نہ ہو جائے، اس پر کافر ہونے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"إذا كفر الرجل أخاه فقد باء بها أحدهما" (صحيح مسلم، كتاب الإيمان، كتاب الإيمان، باب بيان حال الإيمان، حديث نمبر: ۲۲۴، ۲۲۵)

"جب کوئی شخص مسلمان کو کافر کہتا ہے تو یہ کفر اسی کی طرف لوٹ کر آجاتا ہے"

اسی لئے فقہاء نے تکفیر کے سلسلہ میں بڑی احتیاط کا حکم دیا ہے؛ چنانچہ معروف حنفی فقیہ علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کے کافر ہونے کا فتویٰ نہیں دیا جائے، جس کے کافر ہونے میں اختلاف ہو، اگرچہ کوئی ضعیف روایت ہی کیوں نہ ہو؛ اس لیے کہ کفر بہت سنگین چیز ہے۔ (رسم المفتي: ص: ۱۹۰، مطبوعہ زکریا، دیوبند)

اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کا ایک دلچسپ واقعہ بھی قابل ذکر ہے، جسے علامہ ابن نجیم مصریؒ نے نقل کیا ہے:

"امام ابوحنیفہؒ سے ایک شخص کے بارے میں پوچھا گیا، جس نے کہا تھا کہ مجھے جنت کی امید نہیں، جہنم کا خوف نہیں، اللہ کا ڈر نہیں، مردار کھاتا ہوں، قراءت اور رکوع، سجدے کے بغیر نماز پڑھ لیتا ہوں، اَن دیکھی چیزوں کی گواہی دیتا ہوں، حق کو ناپسند کرتا ہوں اور فتنہ کو پسند کرتا ہوں، آپ کے شاگردوں نے کہا: اس شخص کا معاملہ تو بڑا مشکل ہے، امام صاحب نے فرمایا: یہ شخص اللہ سے امید رکھتا ہوگا نہ کہ جنت سے، اور اللہ سے ڈرتا ہوگا نہ کہ دوزخ سے، اس بات کا خوف نہیں رکھتا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس

پر ظلم کریں گے، مچھلی اور ٹڈی کھاتا ہوگا، نماز جنازہ پڑھتا ہوگا، اللہ کے ایک ہونے کی گواہی دیتا ہوگا، موت کو ناپسند کرتا ہوگا جو کہ حق ہے، مال واولاد سے محبت کرتا ہوگا، جو قرآن کے بیان کے مطابق فتنہ ہیں، پوچھنے والا شخص کھڑا ہوا، اس نے آپ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ علم سے معمور ظرف ہیں'' (الاشباہ و النظائر مع الحموی: ۳/ ۳۶۸، باب الفن السابع، الحکایات والمرسلات)

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کلمۂ شہادتین کے پڑھنے سے انسان اسلام کے دائرہ میں آتا ہے، اور عملی زندگی میں اس کے مسلمان ہونے کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھے، کعبۃ اللہ کو قبلہ تسلیم کرے اور مسلمانوں کا ذبیحہ حلال سمجھے، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے:

''من صلى صلاتنا، واستقبل قبلتنا، وأكل ذبيحتنا، فذلك المسلم الذي له ذمة الله وذمة رسوله، فلا تخفروا الله في ذمته'' (صحيح البخاري، كتاب الصلاة، باب فضل استقبال القبلة، حدیث نمبر: ۳۹۱)

''جس نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی، ہمارے قبلہ کا استقبال کیا اور ہمارے ذبیحہ کو کھایا وہ مسلمان ہے، اس کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا عہد ہے''

اسی حدیث کو بنیاد بنا کر امام عبدالوہاب شعرانی نے اپنی معروف کتاب ''الیواقیت والجواہر'' میں گمراہ فرقوں پر گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

''مذاہب اسلامیہ میں سے کسی کو بھی کافر قرار نہیں دیا جائے گا، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے ہماری طرح نماز پڑھی، قبلہ کا استقبال کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا، تو اس کو وہ حقوق حاصل ہوں گے، جو ہمیں حاصل ہیں، اور اس پر وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو ہم پر ہیں'' (الیواقیت والجواہر: ۲/ ۱۲۵، مبحث: ۵۸)

اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ صحابہ کے اخیر دور میں ہی ان مختلف فرقوں کا ظہور ہو چکا تھا، جن کو راہِ حق سے منحرف سمجھا گیا؛ لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کو کافر کہنے میں یا ان پر کفر کا حکم لگانے میں احتیاط سے کام لیا، سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد میں خوارج کا ظہور ہوا، یہ اس عہد

کے صحابہ ؓ کے ان دونوں گروہوں کی تکفیر کرتے تھے، جو حضرت علی ؓ کے ساتھ تھے یا ان کے مخالف تھے؛ لیکن حضرت علی ؓ نے ان پر کفر کا حکم لگانے میں احتیاط برتی؛ البتہ فرمایا کہ اگر وہ فساد مچائیں گے تو ہم ان سے جہاد کریں گے، پھر آپ ؓ نے ان سے جہاد فرمایا، اور جہاد میں فتح یاب بھی ہوئے؛ لیکن مفتوحین اور ان کے اموال کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کیا جو غیر مسلموں کے ساتھ کیا جاتا ہے، یعنی آپ نے ان کی خواتین کو باندی اور ان کے مال کو مالِ غنیمت کا درجہ نہیں دیا۔

بعد کے فقہاء کے یہاں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں، اہلِ سنت والجماعت کی معتزلہ اور مرجیہ نامی فرقوں سے بڑی کشمکش رہی ہے، اس کشمکش نے بعض اوقات اربابِ اقتدار کو بھی متاثر کیا اور حکومت کے سہارے فریقِ مخالف کو تکلیف پہنچانے کی کوششیں بھی کی گئیں؛ لیکن معتزلہ اور مرجیہ کو صریحاً کافر کہنے سے احتیاط برتی گئی، اسی طرح خود اہل سنت میں اشاعرہ، ماتریدیہ اور حنابلہ کے درمیان خاصے اعتقادی اختلافات رہے ہیں، اور اس کا اثر حدیث نقل کرنے والے راویوں سے متعلق محدثین کی آراء پر بھی پڑا ہے؛ لیکن ایک دوسرے کی تکفیر سے ہر ایک نے اجتناب کیا؛ چنانچہ امام عبد الوہاب شعرانی نے معتزلہ، نجاریہ، روافض، خوارج اور مشبہہ وغیرہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ سب مسلمان ہیں، ان پر کفر کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، اس سلسلہ میں انہوں نے شیخ ابوطاہر قزوینی کے حوالہ سے کہا ہے: ''وہ بلا شبہ حضور ﷺ کی امت اجابت میں ہیں؛ لہٰذا ان کو کافر کہنا ظلم وتعدی کی بات ہے'' (حوالہ سابق)، امام ابوالحسن اشعری کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے اپنی وفات کے وقت کہا:

''تم لوگ مجھ پر گواہ رہو کہ میں اہل قبلہ میں سے کسی کو بھی گناہ کی وجہ سے کافر قرار نہیں دیتا؛ اس لیے کہ میں ان سب کو دیکھتا ہوں کہ ایک ہی معبود کی طرف رخ کرتے ہیں اور اسلام ان سب کو شامل ہے'' (**الیواقیت للشعراني**: ۲/۱۲۶، مبحث: ۵۸)

امام شافعیؒ کا قول منقول ہے کہ جو لوگ مخالف ظاہر تاویل کرتے ہیں، ان کے اس گناہ کی وجہ سے انہیں کافر قرار نہیں دیا جاسکتا (**الیواقیت للشعراني**: ۲/۱۲۶، مبحث: ۵۸)، اسی طرح شوافع قریب قریب اس بات پر متفق ہیں کہ خوارج کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ (دیکھئے: **الصواعق المحرقة**: ص: ۱۵۲، **لابن الحجر الهیثمی**) علامہ ابن عابدین شامیؒ خوارج کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''جمہور تابعین اور علماء اہل حدیث کے نزدیک خوارج کا حکم باغیوں کا سا ہے......

اور بعض علماء حدیث ان کو کافر قرار دیتے ہیں..... علامہ ابن منذر کا بیان ہے کہ میں کسی فقیہ کو نہیں جانتا، جس نے ان کو کافر قرار دینے کے سلسلے میں علماء حدیث کی موافقت کی ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ خوارج کے کافر نہ ہونے پر فقہاء کا اجماع ہے اور ''محیط'' نامی کتاب میں ذکر کیا گیا ہے کہ بعض فقہاء اہل بدعت میں سے کسی کو کافر قرار نہیں دیتے اور بعض ان لوگوں کو کافر قرار دیتے ہیں جو اپنی بدعت میں کسی دلیل قطعی کی مخالفت کے مرتکب ہوں، اس رائے کو مصنف نے اکثر اہل سنت کی طرف منسوب کیا ہے؛ لیکن پہلی روایت زیادہ صحیح ہے (یعنی کافر نہ قرار دیئے جانے کی)، یہ فقہاء مجتہدین کا کلام نہیں، دوسروں کا کلام ہے اور ان کے کلام کا اعتبار نہیں، مجتہدین سے وہی بات منقول ہے جو ہم نے ذکر کی ہے اور علامہ ابن منذر مجتہدین کی آراء سے زیادہ واقف ہیں'' (ردالمحتار: ۶ / ۴۱۳)

علامہ شامیؒ نے اسی پس منظر میں کئی جگہ روافض کے بارے میں اہل سنت کا نقطۂ نظر یہی نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شیعہ حضرت علیؓ کے خدا ہونے کے یا قرآن مجید میں تحریف کے قائل نہیں ہیں، ان کو کافر نہیں کہا جائے گا۔ (دیکھئے: ردالمحتار: ۳/ ۲۹۳، ۶/ ۴۱۳)

فقہاء نے یہ بات بھی لکھی ہے کہ جس بات کے کفر ہونے پر اتفاق نہ ہو، اس کی بنیاد پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جا سکتا، چنانچہ علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

''کسی ایسے مسلمان پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا، جن کے کلام کا بہتر مفہوم بن سکتا ہو، یا اس کے کفر میں اختلاف ہو، چاہے اس سلسلہ میں فقہاء کا ضعیف قول ہی کیوں نہ ہو'' (درمختار مع الرد: ۴ / ۲۲۴)

شیخ عبد القادر اسفرائنی نے اہل سنت اور اہل سنت کے دائرہ سے باہر کے لوگوں کے مسلمان ہونے اور نہ ہونے کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ (دیکھئے: الفرق بین الفرق: ۱/ ۱۲ – ۱۱) قادیانیوں کا معاملہ الگ ہے، رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے میں یہ بات شامل ہے کہ آپ ﷺ کے آخری نبی ہونے پر ایمان ہو اور وہ آپ ﷺ کو آخری نبی نہیں مانتے؛ بلکہ مرزا غلام احمد قادیانی کو ختم نبوت کا تاج پہنانا چاہتے ہیں؛ اس لئے وہ کافر ہیں اور ان کا دائرہ ایمان سے باہر ہونا پوری امت کے

نزدیک متفق علیہ ہے۔

اس سلسلہ میں ایک حدیث زبان زدخاص وعام ہے اور اسے کفر واسلام کی بنیاد سمجھا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہودیوں کے اکہتر یا بہتر فرقے ہوئے اور نصرانیوں کے بھی؛ لیکن میری امت کے تہتر فرقے ہوجائیں گے (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۵۹۶)، اس طرح کی روایتیں مختلف کتبِ احادیث میں متعدد صحابہ سے منقول ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے تہتر فرقوں میں سے ایک فرقہ 'ناجی' ہوگا اور باقی دوزخی ہوں گے، اہلِ علم نے اس پر بھی بحث کی ہے کہ تہتر فرقوں سے کون مراد ہیں؟ ان میں چھ بنیادی فرقوں کا ذکر کیا گیا ہے، جو مسئلۂ تقدیر یا عظمتِ صحابہ یا دین میں اعمال کی اہمیت کے بارے میں اہلِ سنت کے نقطۂ نظر سے اختلاف رکھتے ہیں، پھر ان کی بارہ بارہ شاخیں ہیں، (دیکھئے: تلبیس ابلیس، ص: ۱۶۹) یہ فرقے عام طور پر ناپید ہو چکے ہیں، صرف روافض یعنی اہل تشیع موجود ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرقہ ناجیہ کی تعریف اس گروہ سے کی ہے جو آپ ﷺ کے اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریقہ پر ہو، یہی راہ ہے جو اہل سنت والجماعت نے اختیار کی ہے، جس میں 'سنتِ نبوی' دین وشریعت کی اساس ہے اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم 'بشمول اہل بیت' کی عظمت تسلیم شدہ ہے اور ان کی نقل کی ہوئی باتوں پر اعتماد واعتبار عقائد واعمال کے سلسلہ میں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں؛ اسی لیے انہوں نے اپنے لیے 'اہل سنت والجماعت' کا لقب اختیار کیا ہے، یعنی وہ گروہ جو رسول اللہ ﷺ کی سنت اور جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریقہ پر قائم ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ بقیہ فرقے کیا اسلام کے دائرہ سے باہر ہیں؟ کیا ان کے دوزخی ہونے کا مطلب ان کا کافر ہونا اور ہمیشہ ہمیش کے لیے جہنم رسید ہونا ہے؟ اگر علماء ان نکات پر غور کریں تو شاید مذہبی معاملات میں اس درجہ کی شدت پیدا نہ ہو، جو اس وقت پائی جاتی ہے، حضور ﷺ کے ارشاد سے واضح ہے کہ یہ سب کے سب گروہ آپ ﷺ کی امت ہی کے دائرہ میں ہوں گے، ان کا شمار آپ ﷺ کی امتِ اجابت میں اور امت مسلمہ میں ہوگا، علامہ خطابی نے اسی حدیث سے یہ بات اخذ کی ہے کہ ان فرقوں میں سے کوئی اسلام سے خارج نہیں قرار دیا جائے گا؛ اس لیے کہ حضور ﷺ نے ان سب کو اپنی امت میں شامل فرمایا ہے اور اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن وحدیث کی کسی بات کی تاویل کرتا ہے تو گو وہ تاویل درست نہ ہو، پھر بھی وہ ملتِ اسلامیہ کے دائرہ سے باہر نہیں ہوگا۔

اسی سے دوسرا نکتہ بھی واضح ہو گیا کہ ان فرقوں کے جہنمی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ ہمیشہ ہمیش کے لیے دوزخی ہیں؛ بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان حضرات کو نجاتِ اولیں حاصل نہیں ہوگی؛ بلکہ وہ اپنے گناہوں کی سزا پا کر پھر جنت کے مستحق ہوں گے؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کی امتِ اجابت میں سے ہر شخص مآل کار جنت میں داخل ہوگا، اس کو اس بات سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ متعدد روایتوں میں اس کے برعکس یہ الفاظ آئے ہیں کہ میری امت کے ستر سے زیادہ فرقے ہو جائیں گے، یہ سب کے سب جنتی ہوں گے سوائے ایک فرقہ کے، اور وہ زندیقوں کا گروہ ہے (**الموضوعات لابن الجوزی: ۱/۲۶۷**)

جہاں متعدد اہل علم نے اس کو موضوع و بے اصل قرار دیا ہے، وہیں اس روایت کو ابن نجار، دیلمی اور حاکم جیسے محدثین نے نقل کیا ہے، نیز یہ روایت مسند فردوس میں بھی آئی ہے اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح یعنی معتبر قرار دیا ہے، (کشف الخفاء: ۱/۱۶۷، حدیث نمبر: ۴۴۶) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ وغیرہ اس حدیث کے راوی ہیں، اہلِ علم نے اس تضاد کو دور کرتے ہوئے جو بات کہی ہے، وہ یہ کہ پہلی حدیث میں جنتی ہونے سے مراد شروع سے جنتی ہونا ہے اور دوسری حدیث میں مراد انجام کار جنت میں داخل ہونا ہے۔ (کشف الخفاء: ۱/۱۶۷، حدیث نمبر: ۴۴۶)

پس تہتر فرقوں والی روایت جو واعظین و مقررین کی زبان زد ہیں، جس کو امت کے درمیان فرقہ بندی کو فروغ دینے اور اختلاف کو گہرا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اگر اس کے الفاظ کی گہرائی میں جھانک کر دیکھا جائے، تو اس میں افتراق کے بجائے اتحاد کا، نفرت کے بجائے محبت کا اور تکفیر میں بے احتیاطی کے بجائے احتیاط و اعتدال کا سبق موجود ہے، کاش، ہمارے واعظین و خطباء، علماء و مشائخ اور مذہبی قائدین اس پہلو پر توجہ دیں!

حد یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت جو اس حقیر کے اندازہ کے مطابق پوری دنیا میں ۹۰ فیصد مسلمان آبادی کی نمائندگی کرتے ہیں، جن کے درمیان فقہی اختلافات اور بعض غیر اہم فکری اختلاف ہیں، ان میں ایسی شدت اختیار کی جاتی ہے کہ وہ بھی ایک دوسرے کی تکفیر پر کمر بستہ ہیں، اور بحث کی جاتی ہے کہ ایک دبستان فقہ کے ماننے والوں کے لئے کیا دوسرے دبستان فقہ سے تعلق رکھنے والے

امام کی اقتدا جائز ہے؟ حالانکہ فروعی مسائل میں اختلاف صحابہ کے دور میں بھی تھا؛ لیکن وہ اس سلسلے میں کسی تأمل کے بغیر ایک دوسرے کی اقتداء کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ عباسی دور میں بعض معتزلہ امامت کرتے تھے اور ائمہ اہل سنت ان کی اقتدا میں نماز ادا کیا کرتے تھے۔ علامہ ابن حزم ظاہریؒ نے خوب لکھا ہے کہ اس طرح کی بحث سب سے پہلے خوارج نے پیدا کی ہے، ورنہ صحابہ اور خیار تابعین کے یہاں اس کا کوئی تصور نہیں تھا۔ (رسالۃ الامامۃ ص ۱۲۳) بلکہ علامہ ابن تیمیہ نے امام احمد سے نقل کیا ہے کہ بعض دفعہ جائز امور میں اپنے نقطۂ نظر پر عمل کرنے کے بجائے مسلمانوں میں الفت پیدا کرنے کے لئے دوسرے نقطۂ نظر پر عمل کر لینا چاہئے (رسالۃ الالفۃ: ۴۸)

علامہ ابن تیمیہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ عبادات میں مختلف طریقے — جیسے اذان میں ترجیع کرنا اور نہ کرنا، اقامت کے کلمات کو دوہرے طور پر کہنا یا اکہرے طور پر، عیدین کی تکبیرات زوائد کی تعداد، رکوع سے پہلے یا رکوع کے بعد دعاء قنوت — وہ مسائل ہیں، جن میں دو مختلف طریقے مشروع ہیں، اور کوئی طریقہ مکروہ نہیں، اس لئے ان میں ہمیشہ ایک ہی طریقہ کا التزام کرنے سے بہتر ہے کہ بعض دفعہ ایک طریقہ پر اور بعض دفعہ دوسرے طریقہ پر عمل کر لیا جائے (دیکھئے: مجموع الفتاوی ۲۴/ ۲۴۲ اور اس کے بعد)

اس لئے موجودہ حالات میں خاص کر علماء ومشائخ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے مسلکی اختلافات کو اپنے مدرسوں اور اپنی خصوصی مجلسوں تک محدود رکھیں، اظہار اختلاف میں معتدل لب و لہجہ اختیار کریں، عوام کے درمیان اصلاحی باتوں پر توجہ دیں، منکرات کی شناعت ان پر واضح کریں اور بے حیائی کو روکنے کی ترغیب دیں، جس کی اس وقت سخت ضرورت ہے، ایسی باتیں نہ کریں، جس سے عام مسلمانوں میں انتشار پیدا ہو اور ہمارے دشمن اس سے فائدہ اٹھالیں؛ ورنہ اس ملک میں ہمارے لئے نہ صرف جان و مال اور عزت وآبرو کا تحفظ دشوار ہو جائے گا؛ بلکہ ہمارے لئے دین و ایمان کی حفاظت بھی مشکل ہو جائے گی:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندی مسلمانو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اسلام میں بنیادی حقوق کا تصور

خالق کائنات نے اپنی اس دنیا کو بے شمار مخلوقات کا مسکن بنایا ہے، ایک سے ایک طاقتور، خوبصورت اور مختلف صلاحیتوں کے حامل حیوانات اس دنیا میں بستے ہیں، ان کے مفادات میں باہم ٹکراؤ بھی پایا جاتا ہے، ایک محدود جنگل سے سب کو اپنا چارہ حاصل کرنا ہے اور ایک ہی چشمہ سے مختلف جانوروں کو پانی لینا ہے؛ لیکن یہ بات نہیں سنی گئی کہ مفادات کا یہ تصادم ان کے درمیان باہمی جنگ وجدال کا باعث بن گیا ہو، مثلاً ایک علاقہ کے گھوڑوں نے اپنی فوج بنا کر دوسرے علاقہ کے گھوڑوں پر ہلہ بول دیا ہو، اس کے نتیجہ میں سینکڑوں گھوڑوں کی جان چلی گئی ہو اور بہت سے زخمی ہوگئے ہوں، ایسا کوئی واقعہ دنیا میں پیش نہیں آیا؛ بلکہ یہ کیفیت دو مختلف جانوروں کے درمیان بھی پیش نہیں آئی، ایسا نہیں ہوا کہ جنگل کے شیروں نے مل کر اپنا ایک لشکر ترتیب دیا ہو اور اجتماعی طور پر ہرنوں پر ٹوٹ پڑے ہوں؛ تاکہ اس جنگل سے ان کا صفایا کر دیا جائے؛ لیکن عجیب بات ہے کہ انسانوں کی بستی میں یہ واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور کم وبیش ہر روز پیش آتے ہیں، انسان دوسرے انسان کو نقصان پہنچانے کے لئے اللہ تعالیٰ کی عطا فرمائی ہوئی فطری طاقت ہی کو کافی نہیں سمجھتا؛ بلکہ اپنے ہم جنسوں کو ہلاک کرنے کے لئے تباہی وبربادی کے نئے نئے ہتھیار بھی بناتا ہے، دوسرے انسانوں کو نقصان پہنچا کر اور تکلیف دے کر اسے بے حد خوشی ہوتی ہے اور فاتحانہ جذبات سے سرشار ہوکر وہ اپنی طاقت اور غلبہ کا اعلان کرتا رہتا ہے، آج پوری دنیا میں ہلاکت خیز ہتھیاروں کی بہتات، انسان کی بہترین ذہانتوں کا اس تخریبی کام میں خرچ ہونا، قدرت کے انمول وسائل کو اس انسانیت سوزی کی صفت میں صرف کرنا اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ہلاک کر دینے کی ٹکنالوجی کو فروغ دینا اس کی واضح مثال ہے۔

غالباً اسی لئے آج جانوروں کے حقوق، ماحولیات کے تحفظ، نباتات کے بقاء اور زمین وفضا میں موجود قدرت کے اَن دیکھے خزانوں کے تحفظ کی بجائے یا اس سے بڑھ کر انسانی حقوق کی ادائیگی اور انسانیت کے تحفظ پر گفتگو کرنا ایک مجبوری بن گئی ہے؛ تاکہ عقل وشعور کی دولت سے مالا مال، سمندر

کی تہوں کو فتح کرنے والی اور فضاؤں میں تیرتے ہوئے سیاروں پر کمندیں ڈالنے والی اس مخلوق کو آداب انسانیت سکھائے جائیں اور انھیں بتایا جائے کہ قدرت کی دی ہوئی بہترین صلاحیتوں کو وہ تخریب کی بجائے تعمیر میں اور ضرر رسانی کی بجائے نفع رسانی میں استعمال کرے۔

اسلام کا تصور یہ ہے کہ انسان اس کائنات کی سب سے اشرف و افضل مخلوق ہے: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ﴾ (الاسراء:۷۰) خدا نے بہترین تخلیقی ڈھانچہ سے اس کو نوازا ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ (التین:۴) تخلیقی ڈھانچہ کی طرح اخلاقی کمالات کے اعتبار سے بھی انسان کو سب سے اونچا بنایا گیا ہے؛ چنانچہ خیر البشر حضرت محمد ﷺ کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ (القلم:۴) اسے علم و تحقیق کی نعمت اور اختراع و ایجاد کی صلاحیت سے نوازا گیا ہے: ﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ (العلق:۵) پوری کائنات اس کی خدمت کے لئے ہے اور وہ اس کا مخدوم ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ (البقرۃ:۲۹) اسی لئے کائنات کی تمام چیزیں اس کے لئے مسخر ہیں: ﴿سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ (لقمان:۲۰) وہ اس کائنات میں حاکم کے درجہ پر ہے اور تمام مخلوقات اس کی رعایا کے درجہ میں ہیں، اسی کو قرآن مجید میں 'خلافت' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے: ﴿اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً﴾ (البقرۃ:۳۰) اس لئے اس کے حقوق کو خاص اہمیت حاصل ہے؛ چنانچہ قرآن وحدیث میں کائنات کی دوسری موجودات کے حقوق کے بارے میں بہت کم کہا گیا ہے اور اللہ اور اس کے رسول کے بعد سب سے زیادہ کائنات کی جس ہستی کے حقوق ذکر کئے گئے ہیں، یا جن پر زور دیا گیا ہے وہ بنی نوع انسان ہیں، انسان کے عمومی حقوق پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور قرابت و تعلق کے مختلف پہلوؤں سے خاص خاص لوگوں کے حقوق بھی واضح کئے گئے ہیں، نیز اسلام نے انسان کے بنیادی حقوق کو نسلی، جغرافیائی، لسانی اور مذہبی سرحدوں سے بالاتر رکھا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی تاریخ جتنی قدیم ہے اس کے حقوق کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے، قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ حقوقِ انسانی کو تلف کرنے کا جو پہلا واقعہ اس روئے ارض پر پیش آیا، وہ یہ تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں 'قابیل' نامی شخص نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا، جس کا نام 'ہابیل' تھا، اس واقعہ کا ذکر بائبل میں بھی آیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس واقعہ کے سلسلہ میں فرمایا کہ جب بھی

کوئی شخص قتل کا مرتکب ہوتا ہے تو قاتل کے گناہ میں قابیل کو شریک رکھا جاتا ہے؛ کیوں کہ اس نے گناہ اور ظلم کے اس طریقہ کی بنیاد رکھی ہے (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۰۳) اس سے انسانی حقوق کی اہمیت کا اشارہ ملتا ہے کہ اسلام کی نظر میں ایک انسان کی حق تلفی دراصل پوری انسانیت کے ساتھ حق تلفی ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے ایک شخص کو قتل کیا اس نے گویا پوری انسانیت کو قتل کیا اور جس نے ایک شخص کی زندگی بچائی، اس نے گویا پوری انسانیت کی زندگی بچائی: ﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ (المائدۃ: ۳۲) انسانی حقوق کی اہمیت کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ اسلام میں خالقِ کائنات کی تمام تر عظمت کے باوجود حقوق کے باب میں بہ مقابلہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کے، انسانوں کے حقوق کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، پیغمبر اسلام ﷺ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے حقوق تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کردیں؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ بے حد رحیم وکریم ہیں؛ لیکن انسانوں کے حقوق معاف نہیں کئے جائیں گے اور انسان کو اس کی سزا مل کر رہے گی، (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۴۲۰) اس میں مسلمان اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہیں؛ بلکہ آپ ﷺ نے صاف ارشاد فرمایا کہ اگر کسی غیر مسلم شہری کے ساتھ زیادتی روا رکھی گئی تو قیامت کے دن میں اس کی طرف سے فریق بن کر کھڑا ہوں گا: ’’... أنا حجیجه یوم القیامة‘‘۔ (أبوداود، حدیث نمبر: ۳۰۵۲)

آج دنیا میں ’انسانی حقوق‘ کا جو نعرہ ہر سو بلند کیا جارہا ہے، مغرب کی طرف سے اس کی تاریخ کو بہت مختصر کرکے اور اسلامی تاریخ کو نظر انداز کرکے انقلاب فرانس کے بعد ۱۷۹۱ء میں سترہ دفعات پر مشتمل اعلامیہ کو اس سلسلہ کی پہلی کوشش قرار دیا جاتا ہے اور اس کوشش کا اوجِ کمال ۱۰ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ کی طرف سے پاس ہونے والے ۳۰ر دفعات پر مشتمل انسانی حقوق کے چارٹ کو سمجھا جاتا ہے، جس پر اُس وقت اڑتالیس ممالک نے دستخط کئے تھے اور بعد کو بتدریج بہت سے دوسرے ممالک نے بھی اس کو قبول کیا، یہ یقیناً ایک اہم قدم تھا؛ لیکن یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ یہیں سے انسانی حقوق سے متعلق جدوجہد کا آغاز ہوا ہے۔

انسانی حقوق کا یہ منشور دراصل مغرب کے لئے ایک مجبوری تھی؛ کیوں کہ بیسویں صدی کا ابتدائی حصہ انسانی خوں آشامی کے لئے نہایت تکلیف دہ اور ناقابل فراموش زمانہ رہا ہے، جس میں

معلوم تاریخ کی دو بڑی لڑائیاں ہوئیں، جو'جنگ عظیم' کے نام سے یاد کی جاتی ہیں، اس جنگ نے نئی دنیا امریکہ سے لے کر مشرقِ بعید جاپان تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور جنگ کا یہ عفریت اس وقت تک آسودہ خاطر نہیں ہوا جب تک کہ اس نے لاکھوں انسانوں کے خون سے اپنی تشنہ لبی کو دور کرنے کا سروسامان نہ کرلیا، کہا جاتا ہے کہ کوئی بھی شئ جب اپنی انتہاء کو پہنچ جاتی ہے تو مائل بہ زوال ہونے لگتی ہے؛ چنانچہ جب یہ جنگی جنون اپنی نہایت پر پہنچ گیا اور انسانیت بلبلا اُٹھی تو درندگی کی اسی شب تاریک سے آدمیت کی ایک کرن طلوع ہوئی، مختلف ممالک میں انسانی حقوق سے متعلق قانون سازی کا عمل شروع ہوا اور دنیا بھر کے سنجیدہ اور انصاف پسند لوگوں نے آواز اُٹھائی کہ کچھ ایسے بنیادی انسانی حقوق ہونے چاہئیں، جن کا احترام جنگ و امن ہر دو حالتوں میں ضروری ہو، بالآخر یہ خواب اس طرح شرمندۂ تعبیر ہوا کہ ۱۰؍دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کا منشور مرتب کرنے اور پاس کرنے میں کامیابی حاصل کی، مگر اب بھی یہ منشور عملاً ایک کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا؛ کیوں کہ رکن ممالک اول تو اس منشور پر دستخط کرنے اور نہ کرنے کے معاملہ ہی میں آزاد ہیں، دوسرے یہ منشور کسی فرد کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس سلسلہ میں اپنے مقدمہ کو بین الاقوامی عدالت میں لے جاسکے، تیسرے بڑی طاقتیں کھلے عام اس معاہدہ کو پامال کرتی ہیں اور کوئی ان کے گریبان تھام نہیں سکتا، زیادہ تر کمزور ممالک پر ظلم وزیادتی اور مداخلت کے لئے ان قوانین کو ذریعہ بنایا جاتا ہے، انصاف کے یہ دوہرے پیمانے عملاً انسانی حقوق کی پاسداری کے نام پر انسانی حقوق کے اتلاف کا سبب بنے ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی حقوق کا بنیادی تصور اور اس کی تفصیلات دنیا کی معلوم تاریخ میں سب سے پہلے محمد رسول اللہ ﷺ اور شریعت محمدی کے ذریعہ دنیا کو ملی ہیں، اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو انسانی حقوق کے سلسلہ میں اسلامی تصورات کی بنیاد چار باتیں ہیں:

اول یہ کہ انسان پنی ذات سے شرافت وتکریم کا مستحق ہے: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ﴾ (الاسراء: ۷۰) اس تکریم کا تقاضہ ہے کہ اس کی جان کی حفاظت ہو، خواہ اس کا تعلق کسی بھی جنس، مذہب یا علاقہ سے ہو، یہاں تک کہ اگر وہ مجرم بھی ہو اور اس کا جرم اس درجہ کا نہ ہو، جس کی وجہ سے وہ واجب القتل ہوجائے تو اس کی جان قابل حفاظت ہے — اس تکریم کا تقاضہ اس کے مال کی حفاظت

ہے، تمام انسانوں کا مال یکساں قابل احترام ہے، زور زبردستی اور دھوکہ دے کر کسی کا مال حاصل کرنا جائز نہیں، یہاں تک کہ دشمنوں کا بھی نہیں: ﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ (البقرۃ: ۱۸۸) انسانی تکریم ہی کا پہلو یہ ہے کہ اس کو ارادہ و اختیار کی آزادی ہو اور جب تک اس کا عمل دوسروں کے لئے نقصاندہ نہ ہو، اس کو اپنی رائے کے مطابق عمل کرنے کی آزادی ہو، یہاں تک کہ قرآن دین ومذہب کے بارے میں بھی دنیوی زندگی میں اسے فیصلہ کا اختیار دیتا ہے: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (البقرۃ: ۲۵۶) اور ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ (الکافرون: ۶) انسانی تکریم ہی میں یہ بات شامل ہے کہ انسان کی عزت وآبرو کا تحفظ ہو، کسی انسان کی نسبی شناخت کو متاثر کرنے کی کوشش نہ کی جائے؛ اسی لئے اسلام کی نظر میں زنا نہایت سنگین جرم سمجھا گیا ہے، ان پہلوؤں کا احاطہ کرنے کے لئے شریعت اسلامی کے ماہرین نے لکھا ہے کہ شریعت کے تمام احکام کے بنیادی مقاصد پانچ ہیں: دین کی حفاظت، جان کی حفاظت، مال کی حفاظت، نسل کی حفاظت اور عقل کی حفاظت، ان پانچوں مقاصد کی حیثیت مرکزی عنوان کی ہے اور ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے جو اُمور مطلوب ہوں، وہ سب اسلام میں مطلوب ہیں اور غور کیا جائے تو یہ پانچ مقاصد تمام بنیادی انسانی حقوق کا احاطہ کرتے ہیں۔

دوسرا بنیادی تصور انسانی وحدت و مساوات کا ہے، قرآن نے یہ تصور پیش کیا کہ شرافت و کرامت کے لئے اتفاقات کو بنیاد نہیں بنایا جاسکتا؛ بلکہ اس کی بنیاد اکتسابات ہے، یعنی انسان کا کسی خاص خاندان میں پیدا ہونا، کسی خاص رنگ ونسل کا حامل ہونا اور کسی خاص علاقہ سے متعلق ہونا وغیرہ، اتفاقی چیزیں ہیں، اس میں انسان کے کسب اور اس کی کوشش کا دخل نہیں ہے؛ اس لئے یہ باتیں وجہ فضیلت نہیں بن سکتیں، انسان کا عمل اور اس کا کردار وجہ فضیلت ہے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **''لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لأبیض علی أسود ولا لأسود علی أبیض إن أکرمکم عند اللہ أتقاکم''** (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۲۳۹۱) قرآن نے اس بات کو بھی واضح کردیا کہ تمام انسانیت کی پیدائش ایک ہی ماں باپ کے ذریعہ ہوئی ہے؛ اس لئے نسلی اعتبار سے وہ ایک ہی جڑ کی شاخیں اور ایک ہی درخت کی ٹہنیاں ہیں، نیز مرد وعورت بھی ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں اور بہ حیثیت انسان ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا

رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ (النساء:۱)

تیسری چیز 'وحدت قانون' ہے، یعنی جب تمام انسان ایک ہیں تو اللہ کے احکام بھی ان سبھوں کے لئے ایک ہی ہیں، کسی خاص سبب کے بغیر دو افراد واشخاص کے درمیان قانون اوراس کی تنفیذ میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا، خواہ انسان کا تعلق کسی بھی نسل سے ہو، وہ حاکم ہو یا محکوم، مرد ہو یا عورت اور سرمایہ دار ہو یا غریب ومزدور، ملک کے قوانین کا اطلاق ان پر مساوات وبرابری کے ساتھ ہوگا، رسول اللہ ﷺ کو اس کا اس قدر پاس ولحاظ تھا کہ جب فاطمہ نامی ایک قریشی خاتون کی سزا کے بارے میں بعض صحابہ نے سفارش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس کی جگہ فاطمہ بنت محمد ہوتی تو ان پر بھی یہی سزا جاری ہوتی (بخاری، حدیث نمبر: ۳۹۶۵) نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل پر اسی لئے اللہ کا عذاب آیا کہ وہ غریبوں پر تو قانون کو نافذ کرتے تھے اور مال داروں اور سماج کے معزز لوگوں کو قابل عفو سمجھتے تھے۔ (مسلم، حدیث نمبر: ۴۴۱۰)

چوتھے انسانی حریت کا تصور ہے، اسلام کا ایک بنیادی تصور یہ ہے کہ تمام انسان اپنی اصل کے اعتبار سے آزاد ہیں، انھیں کوئی غلام نہیں بنا سکتا، اس سلسلہ میں وہ تاریخی جملہ قابل ذکر ہے، جو ایک صحابی رسول نے رستم یونان کے دربار میں کہا تھا کہ ہم اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ اللہ کے بندوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر صرف خدا کی بندگی میں داخل کریں—— انسانی آزادی کا یہ تصور اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا، جب تک انسان کو سوچنے، فکر کرنے اور اپنی رائے کو ظاہر کرنے کی اجازت حاصل نہ ہو، قرآن وحدیث میں بہت سے مواقع پر نہی عن المنکر یعنی برائیوں کو روکنے کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے؛ بلکہ اس کا حکم دیا گیا ہے، اس میں یہ بات شامل ہے کہ انسان جس بات کو غلط سمجھے اس پر تنقید کرے اور شائستہ حدود میں اس کے خلاف احتجاج کرے۔

بنیادی انسانی حقوق کے سلسلہ میں پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات کو اگر کوئی شخص ایک جگہ دیکھنا چاہے تو حجۃ الوداع کا خطبہ اس کے سامنے ہونا چاہئے، یہ خطبہ انسانی حقوق کا بنیادی اور اولین منشور ہے، جس میں انسانی مساوات، جرم وسزا میں یکسانیت، انسانی زندگی کا احترام، معاشی استحصال کی ممانعت، مال وجائداد کا تحفظ، ہر شخص کی دوسرے کے جرم سے براءت، عورتوں کے حقوق، غلاموں کے حقوق اور سیاسی مساوات کا واضح اعلان واظہار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام انسانی حقوق کی پاسداری کا نقیب وترجمان ہے اور بالخصوص ایک تکثیری معاشرہ میں تمام گروہوں کے ساتھ مساویانہ اور منصفانہ سلوک کی اس نے تعلیم بھی دی ہے اور مسلمانوں نے اس کا عملی نمونہ بھی پیش کیا ہے، خود رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں 'میثاق مدینہ' جس میں مسلمان، مشرکین اور یہود شامل تھے، اس کی بہترین مثال ہے؛ اسی لئے جب انسانی حقوق کی بحث عالمی سطح پر ایک اہم موضوع بن گئی اور اسے انسانیت کے لئے مغرب کا بہت بڑا عطیہ سمجھا جانے لگا، نیز یہ غلط فہمی بھی پیدا کی گئی کہ گویا اسلام انسانی حقوق کے بارے میں بخل وناانصافی سے کام لیتا ہے، تو مختلف اہل علم نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا، جس میں شیخ محمد الغزالی کی ''حقوق الإنسان وأحكام الشريعة الإسلامية'' ڈاکٹر صبحی محمصانی کی ''أركان حقوق الإنسان'' ڈاکٹر قطب محمد قطب کی ''الإسلام وحقوق الإنسان'' ڈاکٹر فتح دریبی کا مقالہ ''أصول حقوق الإنسان في التشريع الاسلامي'' ڈاکٹر محمد احمد مفتی کی ''حقوق الإنسان في الفكر السياسي والإسلامي'' احمد جمال عبدالعال کی ''حقوق الإنسان الإسلام'' اور محمد عمارہ کی ''الإسلام وحقوق الإنسان، ضرورات لا حقوق'' نیز مشہور صاحب نظر فقیہ ڈاکٹر محمد زحیلی کی ''حقوق الإنسان في الإسلام'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان تحریروں کے علاوہ المجلس الاسلامی کی طرف سے یونسکو میں ۱۹؍ستمبر ۱۹۸۱ء کو ادارہ کے جنرل سکریٹری سید سالم عزام نے حقوقِ انسانی کا عالمی اسلامی چارٹ ''الإعلام الإسلامي العالمي لحقوق الإنسان'' بھی پیش کیا، جسے تمام دینی حلقوں کی طرف سے قبول کیا گیا، یہ اعلامیہ ۲۳؍دفعات پر مشتمل ہے اور اپنی جامعیت کے اعتبار سے اسلامی پس منظر میں بنیادی انسانی حقوق کو واضح کرتا ہے۔

جمہوریت اور اسلام

اس میں شبہ نہیں کہ موجودہ جمہوری نظام میں متعدد باتیں ایسی شامل ہیں، جو اسلام کے مزاج کے خلاف ہیں، سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں قانون کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے؛ چوں کہ اللہ تعالیٰ انسان کے خالق ہیں؛ اس لئے اسی کو حق ہے کہ وہ اپنے بندوں کے لئے قانون بنائے اور حلال وحرام کے احکام متعین کرے، قرآن نے اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والوں کو ''کافر'' (المائدہ: ۴۴) ''ظالم'' (المائدہ: ۴۵) اور ''فاسق'' (المائدہ: ۴۷) قرار دیا ہے، قرآن نے متعدد مواقع پر احکام شریعت کو بیان کرنے کے بعد تنبیہ کی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدیں ہیں، ان سے آگے نہیں بڑھنا: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ (البقرۃ: ۲۲۹، نیز دیکھئے: طلاق: ۱، مجادلہ: ۴) قرآن نے اس بات کو بھی صراحت سے کہا ہے کہ حکمراں کو اللہ کے دئے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ کرنا چاہئے، عوام کی خواہشات کی پیروی نہیں کرنی چاہئے: ﴿فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ﴾ (المائدۃ: ۴۸)۔

البتہ جن امور کے بارے میں شریعت نے صراحتاً یا اشارۃً کوئی حکم نہیں دیا ہے، ان میں ایک مسلمان ملک کی پارلیمنٹ قانون سازی کرسکتی ہے، اسی طرح انتظامی قوانین بھی ملک کی مجلس شوری بناسکتی ہے، بہ شرطیکہ وہ شریعت کے مزاج و مذاق اور اسلامی کی بنیادی تعلیمات کے مغائر نہ ہو، ظاہر ہے کہ اس وقت غیر مسلم ممالک ہی نہیں؛ بلکہ مسلم اکثریت ممالک میں بھی صورت حال یہ ہے کہ ان کے دستور میں قرآن وحدیث اور شریعت اسلام کو بالاتر قانون تسلیم کرنے کی بجائے انسان کے خود ساختہ قانون کو اصل بنایا گیا اور اکثر جگہ اس قانون جاہلیت کی حفاظت کے لئے فوج کے ہاتھ میں ڈنڈا دے کر انہیں تیار رکھا گیا ہے، کسی مسلمان کے لئے اس سے بڑھ کر بدنصیبی اور کیا ہوسکتی ہے؟

اسلام میں حکمرانی کا ایک اصول یہ ہے کہ کسی کے لئے خود اقتدار طلب کرنے کی اجازت نہیں، رسول اللہ ﷺ نے واضح فرمایا کہ خدا کی قسم! جو شخص عہدۂ ومنصب کا طلبگار رہوگا خواہ اس کو طلب کرے یا اس کا لالچی ہو، ہم اسے وہ ذمہ داری سپرد نہیں کریں گے: ''إنا لا نولي هذا علی من سأله ولا من

حرص علیه" (صحیح البخاري، کتاب الأحکام، باب مایکره من الحرص علی الإمارة، حدیث نمبر: ۷۱۴۹) ایک اور ارشاد میں ہے کہ جو شخص کسی عہدہ کا طلبگار ہو وہ میرے نزدیک تم میں سب سے زیادہ خیانت کرنے والا ہے: "إن أخونکم عندنا من طلبه" (أبو داؤد، کتاب الخراج، باب ما جاء في طلب الإمارة، حدیث نمبر: ۲۹۳۲) آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جب طلب اور خواہش پر کوئی عہدہ دیا جاتا ہے تو اس میں اللہ کی مدد شامل حال نہیں ہوتی اور جب بغیر کسی طلب کے آدمی کو عہدہ ملتا ہے تو ایسے شخص کی منجانب اللہ مدد ہوتی ہے: "یا عبد الرحمن بن سمرة! لا تسأل الإمارة، فإنک إن أوتیتها عن مسألة وکلت إلیها، وإن أوتیتها من غیر مسألة أعنت علیها۔۔۔" (صحیح البخاري، کتاب الأیمان والنذور، باب قول اللہ۔۔۔، حدیث نمبر: ۶۶۲۲، ۶۷۲۲، ۷۱۴۶، ۷۱۴۷)۔

جمہوری نظام میں لوگوں کو خود امیدوار بننا پڑتا ہے اور پھر اسے عوام سے ووٹ بھی مانگنا پڑتا ہے، انتخابی قوانین کچھ اس طرح ہیں کہ اگر کوئی شخص اس سے بچنا بھی چاہے تو بچ نہیں سکتا، اس نظام نے سیاست دانوں میں ایسا مزاج پیدا کر دیا ہے کہ وہ مجلس قانون ساز کی رکنیت ہی نہیں؛ بلکہ مختلف عہدوں کی طلب میں بھی کوئی حیا محسوس نہیں کرتا، سیاست میں اخلاقی قدروں کو ختم کر دینے میں اس پہلو کا بھی بڑا دخل ہے۔

موجودہ جمہوریت کی تیسری خرابی یہ ہے کہ اس میں عوامی نمائندوں کے انتخاب میں صرف مقدار کو اہمیت دی گئی ہے، معیار کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے، ایک شخص کتنا بھی کندۂ ناتراش ہو، چور، لٹیرا، قاتل اور ڈاکو ہو؛ لیکن اگر اسے اکثریت حاصل ہوگئی تو وہ حکومت کرنے کا مستحق ہے، اس صورت حال نے جمہوری نظام کو بے حد نقصان پہنچایا ہے اور جمہوریت سے لوگوں کا اعتماد اٹھتا جارہا ہے، چند سال پہلے یوپی کے الیکشن میں بڑی تعداد ایسے کامیاب امیدواروں کی تھی، جن پر پولیس کیس تھا اور پولیس نے بیان دیا کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ پہلے ہم ان کے تعاقب میں پیچھے پیچھے رہتے تھے اور اب ان کی حفاظت کے لئے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں، یہی حال کم وبیش پورے ملک میں ہے، ظاہر ہے جب حکمراں اخلاق وکردار کے اعتبار سے اس سطح پر ہیں تو وہ قوم کی کیا خدمت کریں گے، اسلامی نقطۂ نظر سے ایسے شخص کو ذمہ داری سونپی جائے گی، جس میں مفوضہ کام کی صلاحیت بھی ہو اور امانت و

دیانت بھی ہو؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِيْنُ﴾ (القصص:۲۶) قرآن نے ایک اصولی بات کہی ہے کہ امانتیں ان لوگوں کے سپرد کی جائیں، جو اس کے اہل ہوں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰى اَهْلِهَا﴾ (النساء:۵۸) اور اسلام میں امانت کا تصور بہت وسیع ہے، امانت صرف یہی نہیں ہے کہ کسی کے پاس کوئی چیز بہ طور امانت کے رکھ دی جائے؛ بلکہ عہدے اور ذمہ داریاں بھی امانت ہیں، حضرت یوسف علیہ الصلاۃ والسلام نے جب عوامی فلاح اور دعوت دین کے لئے مواقع کے حصول کی غرض سے بادشاہ مصر سے خواہش کی کہ انہیں حکومت کے شعبۂ مالیات پر ذمہ دار بنادیا جائے تو اپنی اہلیت کو ظاہر کرتے ہوئے فرمایا: میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور باخبر بھی: ﴿قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ﴾ (یوسف:۵۵) محافظ ہونے سے دیانت کی طرف اشارہ ہے اور علیم سے علم وآگہی کی طرف۔

پس کسی بھی ذمہ داری کو سپرد کرنے کے لئے دو باتیں بنیادی طور پر ضروری ہیں، ایک امانت و دیانت، دوسری اپنے شعبے سے متعلق علم وآگہی اور مہارت، عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر اور انجینئر جن سے چند افراد کی خدمت متعلق ہے، ان کے لئے تو تعلیم ضروری قرار دی گئی ہے؛ لیکن پارلیمنٹ کا ممبر ہونے کے لئے تعلیم اور ڈگری ضروری نہیں، اگر کسی شخص کا اخلاقی ریکارڈ اچھا نہ ہو تو اسے ملازمت کے لئے قبول نہ کیا جائے اور پہلے سے ملازم ہو تو معطل کر دیا جائے؛ لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں پوری قوم کی تقدیر دے دی گئی ہے، ان کے لئے اخلاق و کردار کی گراوٹ کوئی رکاوٹ نہ ہو، ظاہر ہے کہ ان حالات میں ملک میں کرپشن بڑھے گا، جرم ولاقانونیت کا دور دورہ ہوگا، اور انصاف کو داغدار و شرمسار ہونا پڑے گا، یہ وہ بنیادی مفاسد ہیں، جو موجودہ جمہوریت کا حصہ بن گئے ہیں، اگر جمہوریت کو ان مفاسد سے پاک کر دیا جائے تو یہ اسلام کے نظام خلافت سے بڑی حد تک ہم آہنگ نظام حکومت ہوگا، مسلم ممالک میں ان مفاسد کو دور کرتے ہوئے جمہوریت کو اسلام سے ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے۔

بعض حضرات کو یہ غلط فہمی ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے جو حکمراں ہوں وہ زندگی بھر کے لئے حکمراں ہوگا؛ جیسا کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم پوری زندگی منصب خلافت پر فائز رہے؛ لیکن یہ کچھ ضروری نہیں، قرآن میں یا حدیث میں یہ حکم نہیں آیا کہ جسے سربراہ بنایا جائے وہ ہمیشہ کے لئے سربراہ ہو، اس کا تعلق لوگوں کے انتظامی مصالح اور اتفاق رائے سے ہے، حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور علی

ﷺ اخلاق وکردار اور دیانت وامانت کی اس بلند چوٹی پر تھے کہ اگر اللہ نے ان کے لئے اس سے زیادہ عمر لکھی ہوتی، تب بھی ان سے بڑھ کر خلافت کا کوئی مستحق نہیں ہوتا؛ لیکن اگر ہر شخص کو یہ مقام دے دیا جائے تو وہ 'امیر' کی بجائے 'آمر' بن جاتا ہے اور اقتدار کا نشہ اسے عدل وانصاف کے راستے سے ہٹا دیتا ہے،، پوری تاریخ اس پر شاہد ہے۔

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی مسلم تنظیموں میں سربراہ کا عہدہ محدود مدت کے لئے ہوتا ہے اور ان تنظیموں میں علماء اور ارباب افتاء بھی شامل ہیں، اسی طرح جب پڑوسی ملک پاکستان کی بنیاد پڑی تو وہاں دستور کے بنیادی خدوخال کے سلسلہ میں جن امور پر مسلمان علماء وفقہاء کا اتفاق ہوا، ان میں یہ بھی تھا کہ صدر مملکت محدود مدت کے لئے ہوں گے؛ لہٰذا فسق وفجور کے غلبہ کی وجہ سے موجودہ دور میں کسی شخص کو زندگی بھر کے لئے حکمراں بنایا جائے، یہ امت کے مفاد میں نہیں ہے اور اس کے نتائج اس وقت عالم اسلام میں دیکھے جاسکتے ہیں کہ غریب عوام تو نمک روٹی سے بھی محروم ہیں اور ارباب اقتدار کی دولت بلینیوں ڈالر ہے اور اسے بھی دوسرے ملکوں میں چھپا کر رکھا گیا ہے، گویا اس طرح اپنے ملک کو دہرا نقصان پہنچایا جارہا ہے۔

جو غیر مسلم ممالک ہیں اور وہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، ظاہر ہے کہ ان حکومتوں سے یہ مطالبہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے یہاں قانون شریعت کو نافذ کریں؛ لیکن امیدواروں کے لئے اخلاق وکردار کا ایک معیار متعین کرنا ایسی بات ہے کہ کوئی بھی معقول انسان اس سے انکار نہیں کرسکتا — رہ گیا جمہوریت اور مذہب کا باہمی تعلق تو مسلم ملکوں میں کتاب وسنت کو حکومت کا بنیادی دستور بنایا جاسکتا ہے اور شریعت اسلامی میں اس بات کی صلاحیت ہے کہ وہ ہر عہد کی ضرورت کو پوری کرے؛ لیکن وہاں بھی غیر مسلم بھائیوں کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی؛ اس لئے کہ قرآن مجید نے صاف کہہ دیا ہے کہ دین کے معاملہ میں جبر ودباؤ کی گنجائش نہیں: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ (البقرۃ: ۲۵۶) اور اس رویہ کو پسند نہیں کیا گیا ہے کہ کسی گروہ کو ایمان لانے پر مجبور کیا جائے: ﴿اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ (یونس: ۹۹) اس لئے جیسے مسلمان غیر مسلم اکثریت ملکوں میں اپنے لئے مذہبی آزادی چاہتے ہیں اور یقیناً یہ ان کا حق ہے، اسی طرح مسلم اکثریت ممالک میں غیر مسلموں کا بھی یہ حق ہے، اور انہیں یہ حق ملنا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ سماج کا نظامِ حکومت سے گہرا تعلق ہے، ہم اس مسئلہ پر زبان بند کر کے اور آنکھیں چرا کر گذر نہیں سکتے؛ بلکہ ضروری ہے کہ علماء موجودہ دور کے لئے قابل عمل سیاسی نظام پر غور و فکر کریں اور یہ فکر غیر مسلم اکثریت ممالک کے لئے بھی ہو اور مسلم اکثریت ممالک کے لئے بھی؛ تا کہ مسلمانوں کے سامنے ایک لائحۂ عمل رہے، اگر مسلمانوں کے سامنے کوئی واضح طریقۂ کار نہیں رہے گا تو وہ مغربی سازشوں کا شکار ہو کر رہ جائیں گے اور حکمرانوں کا چہرہ تو تبدیل ہو جائے گا؛ لیکن بنیادی کردار میں کوئی قابل لحاظ فرق واقع نہیں ہوگا، اس وقت عرب ممالک میں اپنے ڈکٹیٹر قائدین کے خلاف آزادی کا جو غیر معمولی جذبہ پیدا ہوا ہے، ایسے موقع پر علماء کی خاموشی اور پہلو تہی ان کے مقام و مرتبہ کے مغائر ہے اور یہ اپنے فریضۂ منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی ہے۔

جمہوریت کی لہر — اسلامی نقطۂ نظر

اس وقت عالم عرب میں صورت حال یہ ہے کہ تیونس سے احتجاج کی جو چنگاری سلگی وہ آتش فشاں بن چکی ہے، پہلے تیونس کے ڈکٹیٹر حکمراں کو اپنا ملک چھوڑ کر بھاگنا پڑا، پھر یہ آگ مصر پہنچی اور مصر کے نامبارک آمر 'حسنی مبارک' قصر اقتدار چھوڑنے پر مجبور ہوئے، اب اس وقت الجزائر، لیبیا، یمن اور بحرین میں بھی احتجاج کی آگ بجھائے نہیں بجھ رہی ہے، ان تمام ملکوں میں اور ان کے علاوہ اکثر عرب ممالک میں ایسے حکمراں ہیں، جن میں سے بعض اپنے آپ کو بادشاہ تو نہیں کہتے؛ لیکن بدترین ڈکٹیٹر شپ عوام پر مسلط کئے ہوئے ہیں، اور انھوں نے پوری زندگی کے لئے اپنے حق میں گویا اقتدار کا رجسٹریشن کرالیا ہے، یا تو اللہ تعالیٰ ان کے عوام پر رحم کھاتے ہوئے ان کو اٹھالیں یا خود عوام انہیں اکھاڑ پھینکیں، خدا سے بے خوف اور اقتدار کے حریص ان حکمرانوں کو اس کے سوا کوئی اور چیز تخت اقتدار سے سبکدوش ہونے پر آمادہ نہیں کر پاتی۔

یہ لوگ اپنی ضرورت اور مجبوری کے لحاظ سے کبھی قومیت کا نعرہ لگاتے ہیں اور کبھی اسلام کا دم بھرتے ہیں؛ لیکن حقیقت میں یہ سب مغرب کے غلام بے دام ہیں، ان کو اسلام سے جس قدر خوف اور نفرت ہے، شاید ہی کسی اور سے ہو، جب بھی کوئی گروہ ان کے ظلم و جور کے خلاف آواز اٹھاتا ہے، یہ اس کو مذہبی بنیاد پرستی اور اسلامی انتہا پسندی کا نام دے کر مغربی آقاؤں کی تائید حاصل کرتے ہیں اور انصاف کے طلبگار ناقدین کے خلاف غیر انسانی سلوک کے لئے اس کو وجہ جواز بناتے ہیں، ان کے نفاق کا حال یہ ہے کہ وہ اسٹیج پر تو اسرائیل کے خلاف الفاظ کے گولے داغتے ہیں اور اندورنی طور پر اسرائیل سے مراسم بھی قائم رکھتے ہیں؛ یہاں تک کہ ان ملکوں کے راز ہائے دروں بھی اسرائیل سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

اس موقع پر بعض لوگوں کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ اس وقت عوام کی طرف سے جمہوریت کا جو مطالبہ کیا جارہا ہے یہ غیر اسلامی ہے؛ اس لئے اس کی تائید نہیں کی جانی چاہئے، کہ اولاً تو آمریت اور بادشاہت کا اسلام سے بدرجہ اولی کوئی تعلق نہیں، یہ حضرت ابوبکر ﷛ وعمر ﷛ کی سنت

نہیں؛ بلکہ قیصر وکسری کی سنت ہے؛ اس لئے اگر جمہوریت کو بہر صورت اسلام کے خلاف ہی سمجھا جائے تب بھی یہاں دو خلافِ اسلام نظام کا مقابلہ ہے؛ اس لئے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ان دو میں سے نسبتاً کمتر درجہ کی برائی کیا ہے؟ آمریت میں ظالم حکمراں کا ہاتھ تھامنے کے لئے کوئی قانون موجود نہیں ہوتا، ظلم وناانصافی کے ہاتھ لمبے ہوتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب یہ کیفیت حد سے گذر جاتی ہے تو خانہ جنگی کی شکل پیدا ہوجاتی ہے اور زمین میں فساد کی لہر اٹھنے لگتی ہے؛ حالاں کہ زمین میں فساد مچانے کو اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے: ﴿وَلَاتُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَاِصْلَاحِهَا﴾ (الاعراف:۵۶،۸۵) اور ظلم اللہ کو سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے، اس کے برخلاف جمہوریت میں حکمرانوں پر تنقید کا اور ان کے خلاف انصاف کا دروازہ کھٹکھٹانے کا موقع باقی رہتا ہے اور ووٹ کے ذریعہ پُر امن انقلاب لایا جاسکتا ہے؛ اس لئے حکمراں کو بھی حدود سے تجاوز کرنے کی ہمت نہیں ہوتی اور عوام کو بھی احتجاج اور بغاوت پر مجبور ہونا نہیں پڑتا۔

یہ تو داخلی سلامتی کا پہلو ہے، دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ جب کسی ملک میں عوامی حکومت ہوتی ہے، امراء انتخاب کے ذریعہ اقتدار کا سفر طے کرتے ہیں تو اس پر دوسرے ممالک اپنی پالیسیاں مسلط کرنے کے لئے دباؤ نہیں ڈال سکتے، اسے یہ کہنے کا موقع رہتا ہے کہ ہمارے عوام اسے قبول نہیں کریں گے، اس کی مثال ہندوستان اور امریکہ کا نیوکلیر معاہدہ ہے، جس میں امریکہ بعض تبدیلیاں چاہتا تھا؛ لیکن ہندوستان نے اسے قبول نہیں کیا؛ اس لئے کہ ہندوستان کی عوام ایسی شرطوں کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھی، دوسری طرف پڑوسی ملک کے سابق ڈکٹیٹر پرویز مشرف کی صورتحال تھی کہ امریکہ نے جو کچھ کہا وہ اسے قبول کرتے گئے اور ایسا لگتا تھا کہ امریکہ رکوع کے لئے کہے گا تو یہ سجدہ میں گر پڑیں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جو حکومت عوام کی مرضی پر مبنی نہیں ہو؛ بلکہ ان پر زبردستی مسلط کردی گئی ہو، اس کے لئے رائے عامہ کا عذر کوئی معنی نہیں رکھتا؛ کیوں کہ یہاں رائے عامہ کا وجود ہی نہیں ہوتا؛ اسی لئے عالم اسلام میں عموماً اور عالم عرب میں خصوصاً مغربی طاقتیں چاہتی ہیں کہ یہاں جمہوریت بحال نہ ہو، مغرب شطرنج کے مہروں کی طرح اپنے پسندیدہ افراد کو اقتدار کی بساط پر بٹھائے رکھے اور ان سے اپنی مرضی کے کام لیتا رہے؛ یہاں تک کہ ان کی داخلہ اور خارجہ پالیسی بھی اپنے مغربی آقاؤں کی ہدایت پر طئے کی جائے۔

یہ گفتگو تو اس پس منظر میں ہے کہ جمہوریت اسلام کے مغائر ایک جداگانہ نظام ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت کی کوئی ایک ہی شکل متعین نہیں اور اس کو اسلام کے سانچہ میں ڈھالا جانا آسان ہے، جمہوریت میں یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ تنہا ایک شخص کو فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہیں، فیصلے عوام کے منتخب نمائندوں کے مشوروں سے کئے جائیں گے، یہ اس تعلیم کے عین مطابق ہے، جو قرآن مجید نے دی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ (الشوریٰ: ۳۸) رسول اللہ ﷺ کو وحی کے ذریعہ ہدایت ملتی تھی اور علم معصوم سے آپ کا رشتہ جڑا ہوا تھا؛ اس لئے آپ کو مشورہ کی ضرورت نہیں تھی؛ لیکن امت میں مشورہ کی سنت کو جاری رکھنے اور اس کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی اپنے رفقاء سے مشورہ کرنے کا حکم دیا: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ (آل عمران: ۱۵۹) حضرت عمر ؓ کا ارشاد ہے کہ اسلام میں جو خلافت مطلوب ہے، وہ شورائی نظام کے بغیر ناقابل تصور ہے: **"لا خلافة إلا عن مشورة"** (**سنن النسائی الکبری، کتاب الرجم، باب تثبیت الرجم**، حدیث نمبر: ۷۱۵۱، ۷۱۵۴، **مصنف ابن أبي شيبة، كتاب المغازي**، حدیث نمبر: ۳۷۰۴۲)۔

جمہوریت میں حکمراں کا انتخاب رائے عامہ سے ہوتا ہے، اسی طرح حضرت ابوبکر ؓ کا انتخاب ہوا، حضرت ابوبکر ؓ کے بعد صحابہ کے مشورہ سے حضرت عمر ؓ کی نامزدگی ہوئی، حضرت عثمان غنی ؓ کا انتخاب بھی عام مشورہ سے ہوا، یہاں تک کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف ؓ نے اس سلسلہ میں مستورات سے بھی مشورہ فرمایا، حضرت علی ؓ بھی رائے عامہ سے منتخب ہوئے؛ یہاں تک کہ جن لوگوں نے ان سے اختلاف کیا، ان کو بھی آپ کی خلافت سے اختلاف نہیں تھا، قاتلان خلیفۂ مظلوم حضرت عثمان غنی ؓ کے قصاص کے سلسلہ میں اختلاف تھا؛ اس لئے ایک شخص بطور خود اپنی طاقت سے حکمراں بن جائے، یا باپ کے بعد بیٹا زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے، اسلام اس کا قائل نہیں؛ چنانچہ حضرت عمر ؓ نے فرمایا: جو مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر اپنے اقتدار کی طرف یا کسی اور کی طرف دعوت دے تو تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ اسے قتل نہ کرو: **"من دعا إلى إمارة نفسه أو غيره من غير مشورة من المسلمين فلا يحل لكم أن لا تقتلوه"** (**مصنف عبد الرزاق، كتاب المغازي، باب بيعة أبي بكر---**، حدیث نمبر: ۹۷۵۹)، یعنی ایسا شخص اس لائق ہے کہ

اسے قتل کر دیا جائے، جمہوری نظام میں عوام یا تو خود امراء کا انتخاب کرتے ہیں یا ان کے منتخب نمائندوں کے ذریعہ انتخاب ہوتا ہے؛اس لئے یہ طریقہ اسلام کے تصور خلافت سے قریب تر ہے!

جمہوری نظام میں حکمراں کے خلاف تنقید کی جاسکتی ہے اور احتجاج کا عوام کو حق حاصل ہوتا ہے، یہ عین اسلام کے مزاج کے مطابق ہے، قرآن وحدیث میں جس چیز کو' نہی عن المنکر' یعنی برائی کو روکنے سے تعبیر کیا گیا ہے، اس میں یہ بات شامل ہے کہ حکومت کے غلط فیصلوں اور غلط پالیسیوں کے خلاف آواز اٹھائی جائے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کی برائی کے اظہار کو پسند نہیں فرماتے سوائے اس کے کہ کسی پر ظلم ہوا ہو: ﴿ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ﴾ (النساء: ۱۴۸) اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سب سے افضل جہاد ظالم فرمانروا کے سامنے انصاف کی بات کہنا ہے: **"أفضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر"** (**أبو داؤد، كتاب الملاهي، باب الأمر والنهي، حدیث نمبر:۴۳۴۶، جامع الترمذی، حدیث نمبر:۲۳۲۹**)۔

جمہوری نظام ہمارے لئے یہ گنجائش فراہم کرتا ہے کہ اگر حکومت ماورائے دستور کوئی کام کرے اور کسی بات کا حکم دے تو اسے قبول نہ کریں؛ کیوں کہ دستور پر عمل کرنا ایک حکمراں کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا ضروری عوام کے لئے ہے، اسلام کا تصور بھی یہی ہے کہ اسلامی حکومت کی اطاعت ایسی ہی چیزوں میں ہے جو شریعت سے ٹکراتی نہ ہوں، جو احکام شریعت اور دوسرے لفظوں میں اسلامی حکومت کے بنیادی دستور سے متصادم ہوں اُن کی اطاعت کرنا نہ واجب ہے نہ جائز؛ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **"لا طاعة في معصية الله، إنما الطاعة في المعروف"** (**مسلم، كتاب الإمارة، باب وجوب طاعة الأمراء في غير معصية وتحريمها في المعصية، حدیث نمبر:۴۸۷۱، أبو داؤد، كتاب الجهاد، باب في الطاعة، حدیث نمبر:۲۶۲۷**)۔

جمہوریت کے لئے لا دینیت ضروری نہیں، جیسا کہ مصطفی کمال اتاترک نے ترکی میں کیا؛ بلکہ حقیقت میں جمہوریت عوامی رائے کے احترام پر مبنی ہے، خواہ یہ رائے مذہب کے حق میں ہو یا اس کے خلاف، دنیا کے اکثر ملکوں میں اسی تصور کے ساتھ جمہوریت قائم ہے، اگر مسلم ملکوں میں جمہوری نظام قائم ہو تو ووٹ کی طاقت سے وہاں پُر امن طور پر انقلاب آسکتا ہے اور قانون شریعت کو نافذ کیا جاسکتا ہے؛ اس لئے مسلم ملکوں میں اس وقت جو تحریکیں اٹھ رہی ہیں، وہ مزاج شریعت کے مغائر نہیں

ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مسلم ملکوں میں جمہوریت کے قیام سے عوام کو حکمرانوں کے استبداد سے نجات ملے گی، ملک کی آمدنی عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ ہوگی، مغربی ممالک کی عالم اسلام میں مداخلت کا دروازہ بند ہوگا، اسلام سے تعلق رکھنے والی جماعتوں کو کام کرنے اور اسلامی کاز کو اوپر اٹھانے کا موقع فراہم ہوگا، خدا کرے جن مسلم ممالک میں عوام آمریت کے جور واستبداد کی چکی میں پیسے جا رہے ہیں، وہاں آزادی کی صبح طلوع ہو اور غلامی کی شب تاریک کا پردہ تار تار ہو جائے اور آزاد فضا میں انہیں شریعت اسلامی کو نافذ کرنے کی توفیق میسر ہو۔

مسلم ممالک کی دولت کا بے محل استعمال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرب قیامت کی علامتوں میں سے اس کا بھی ذکر فرمایا ہے کہ لوگ بلند و بالا عمارتیں بنائیں گے اور اس پر فخر کریں گے، آج پوری دنیا میں اس کا عملی مظاہرہ ہو رہا ہے، مختلف ممالک بلند ترین ٹاورس تعمیر کرنے کی ریس میں ہیں، بعض جگہ تو یہ واقعی ایک ضرورت ہے، جہاں زمینی رقبہ کم ہے اور آبادی زیادہ ہے، یا شہر چھوٹا ہے، دریاؤں کی کمی کی وجہ سے مختلف شہروں کا بسانا دشوار ہے اور شہروں کی طرف آبادی کا بہاؤ بہت زیادہ ہے، ایسے مواقع پر بلند و بالا عمارتیں ایک حد تک ضرورت بن جاتی ہیں، جاپان، ہانگ کانگ اور تائیوان وغیرہ میں شاید اسی لئے اونچی بلڈنگوں کا خیال مقبول ہوا؛ لیکن زیادہ تر ملکوں میں جذبۂ مسابقت اور سیاحت کے مواقع کو بڑھانے کا خیال اس کے پیچھے کارفرما ہے۔

مسلم ممالک میں اس پر کم توجہ دی گئی ہے؛ لیکن ملیشیا پہلا مسلم ملک ہے جس نے بلند قامت ٹاور کی تعمیر کی ہے، اس کا ایک خوش کن پہلو یہ ہے کہ اس نے یہ مہم خود اپنی ٹکنالوجی سے سر کی ہے، خلیج کی ایک ریاست متحدہ عرب امارات میں شامل چھوٹی سی مملکت دبئی ہے، اس کو خلیج عرب کا سنگاپور اور تہذیبی اعتبار سے اسے عالم عرب کا یورپ بھی کہہ سکتے ہیں، تجارتی اعتبار سے اس نے بڑی ترقی کی ہے، دبئی میں کچھ ہی عرصہ پہلے ''برج الخلیفہ'' کی تعمیر عمل میں آئی ہے، جو ۸۲۸ میٹر بلند ہے اور اس وقت یہ دنیا کی سب سے بلند عمارت ہے، اس سے پہلے تائیوان کے تائی پی ٹاور کو سب سے اونچی عمارت ہونے کا اعزاز حاصل تھا، جس کی بلندی ۶۰۱ میٹر ہے، برج الخلیفہ کی تعمیر کے بعد یہ دوسرے نمبر پر آگیا، اب مکہ مکرمہ میں عین خانۂ کعبہ کے سامنے ''مکہ ٹاور'' کی تعمیر بھی مکمل ہو چکی ہے، جس کی بلندی ۶۰۱ میٹر ہے اور جس پر سونے کی کلس لگائی گئی ہے، یہ اب بلندی کے اعتبار سے دوسرے نمبر پر ہے، مغرب اور مشرق بعید کے ممالک میں جو بلند عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں، وہ اُن کی اپنی ٹکنالوجی سے ہے؛ اس لئے فنِ تعمیر کے اعتبار سے یقیناً ان کو داد دی جاسکتی ہے؛ لیکن بیچارے ان عرب ممالک کے پاس ہر چیز مانگی ہوئی ہے، یہ تو کار، بس، ٹرین کوچ اور بہت معمولی معمولی چیزیں بھی باہر سے برآمد

کرنے پر مجبور ہیں، یہاں تک کہ سڑکوں کی تعمیر میں بھی بیرونی انجینیرس اور ورکرس کے بغیر ان کی گاڑی ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی، کھانے کی معمولی سے معمولی چیزیں، پہننے کے کپڑے، علاج کے لئے دوائیں سب کچھ باہر کی مصنوعات ہیں، اس صورت حال کے ساتھ جب بلند وبالا عمارت کا شوق کیا جاتا ہے تو بے ساختہ زبان پر آتا ہے:

کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
تمنّاؤں میں الجھایا گیا ہوں

مغربی طاقتوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ انہیں حقیقی میدان جد و جہد سے ہٹا کر بے فائدہ آرزوؤں میں الجھا دیا ہے، اور آنکھوں کو بھانے والے لا حاصل کھلونے دے کر انہیں بہلا رکھا ہے، اس طرح قدرت کی طرف سے انہیں جو دولت عطا ہوئی ہے، انہیں خود اُن کے ہاتھوں سے ضائع کرایا جارہا ہے، عرب ملکوں کے پاس جو کثیر سرمایہ تھا، اس کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے بہترین وسائل کو تعلیم و تحقیق کے کام میں خرچ کرتے، سائنس وٹکنالوجی میں اپنا قدم آگے بڑھاتے، اپنی زبان کو پوری دنیا میں پھیلاتے، اسلام کی دعوت واشاعت کی خدمت کرتے، ذرائع ابلاغ کے میدان میں آگے بڑھتے اور یہودیوں کی اجارہ داری کو ختم کرتے، اس طرح وہ دنیا کے نقشے پر ایک ترقی یافتہ صنعتی ملک کی حیثیت سے ابھرتے اور عالمی سطح پر ان کا ایک وزن محسوس کیا جاتا۔

مگر افسوس اور صد بار افسوس! کہ اس جہت سے عالم اسلام اور عالم عرب کی صورت حال نہایت گئی گذری ہے، اگر شرح خواندگی کو دیکھا جائے تو امریکہ جیسے بڑے ملک کے یہاں ننانوے فیصد کی شرح ہے، اسرائیل کی شرح ستانوے فیصد سے زیادہ ہے؛ لیکن چھوٹے چھوٹے عرب ممالک —— جہاں گھر گھر خواندگی کو پہنچا دینا چنداں دشوار نہیں تھا—— کی شرحِ خواندگی بھی نمایاں طور پر کم ہے، جیسے کویت کی ترانوے فیصد، بحرین کی چھیاسی فیصد اور سعودی عرب کی تراسی فیصد اور غریب مسلمان ملکوں کی صورت حال تو اور بھی گئی گذری ہے کہ پاکستان میں شرح خواندگی پچاس فیصد اور بنگلہ دیش میں قریب اڑتالیس فیصد ہے—— اگر سرٹیفکٹ کے استحقاق پر مبنی تعلیم، گریجویشن، ماسٹر ڈگری اور پی ایچ ڈی کا تقابل کیا جائے، تب تو عالم اسلام اور عالم عرب کی صورت حال ناقابل بیان حد تک افسوسناک ہے، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے،

آخر وہ مسلمان اور عرب ہی تو تھے جنہوں نے صدیوں دنیائے علم پر حکمرانی کی، سائنسی ترقی میں اہم کردار ادا کیا اور اسپین کو علم وتحقیق کا دارالخلافہ بنادیا، جہاں سے یورپ نے روشنی حاصل کی اور مختلف شعبوں میں نئی نئی ایجادات کو وجود بخشا، آج بھی امریکہ، یورپ اور دوسرے مغربی ملکوں میں مسلمان و عرب ماہرین اور سائنسداں علم وتحقیق کے سفر میں آگے بڑھ رہے ہیں اور نمایاں مقام حاصل کررہے ہیں، اصل کمی حکومتوں کی ہے کہ اپنے وسائل تعلیم وتحقیق کے راستہ میں خرچ کرنے کی بجائے بے فائدہ چیزوں — جیسے کھیل، تفریحی مقامات کو ترقی دینا، شہر کو خوبصورت بنانا، تعیش کے زیادہ سے زیادہ وسائل فراہم کرنا — میں ملک کا قیمتی سرمایہ اور قدرت کا دیا ہوا بہترین اثاثہ خرچ کیا جارہا ہے، دنیا میں ایک سوٹاپ یونیورسٹیاں شمار کی گئی ہیں، ان میں چھیاسٹھ صرف امریکہ میں ہیں، کناڈا اور برطانیہ جیسے کم آبادی والے ملکوں میں سات سات یونیورسٹیاں ہیں، تائیوان جیسے چھوٹے سے ملک میں چار اور سنگاپور جیسے نہایت چھوٹے ملک میں ایک یونیورسٹی ہے؛ لیکن پورے عالم اسلام میں — جو ستاون ملکوں کا احاطہ کرتا ہے — اور پورا عالم عربی — جو بائیس ملکوں کو شامل ہے — میں ان میں سے ایک بھی یونیورسٹی نہیں ہے، اس کے بعد دوسو اعلیٰ معیار کی یونیورسٹیاں سمجھی جاتی ہیں، عالم عربی میں ان میں سے ایک بھی یونیورسٹی نہیں ہے، اس کے بعد پانچ سو دنیا کی بڑی یونیورسٹیوں کا درجہ ہے، جنوبی کوریا جیسے چھوٹے اور معاشی وسائل سے محروم ملک میں بھی اس شمار میں آنے والی دو یونیورسٹیاں ہیں؛ لیکن بائیس عرب ملکوں میں صرف ایک یونیورسٹی ہے جو اس شمار میں آتی ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے وسائل جن میدانوں میں خرچ ہونے چاہئے ان میں کس قدر کم خرچ کئے جاتے ہیں، اس کے برخلاف ایسے میدانوں میں عالم اسلام کے وسائل خرچ ہورہے ہیں، جن کا حقیقی فائدہ مغربی ماہرین کو لوٹتا ہے اور انہیں اعلیٰ تنخواہیں اور زندگی کی بہترین سہولیات فراہم ہوتی ہیں۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ عالم عرب کی دفاعی قوت اتنی معمولی ہے کہ ان میں سے ہر ایک اسرائیل سے خوف زدہ ہے، وہ بلند و بانگ زبانی دعوے تو کرسکتے ہیں؛ لیکن فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم کے جواب میں کوئی عملی اقدام نہیں کرسکتے، جس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان ملکوں میں جو حکومتیں موجود ہیں، وہ عوامی تائید پر مبنی نہیں ہیں؛ اس لئے انہیں خوف ہے کہ اگر انہوں نے کوئی طاقتور فوج بنائی تو وہ خود ان کے خلاف علَم بغاوت نہ بلند کردیں، ذرائع ابلاغ کی صورت حال یہ ہے کہ پورا

میڈیا یہودیوں کے ہاتھ میں ہے، وہ مسلمانوں یا عربوں کی جوتصویر کھینچتا ہے، پوری دنیا اس کوتسلیم کرتی ہے،صنعتوں کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کے قدرتی وسائل صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ملکوں کو چلے جاتے ہیں؛ کیوں کہ یہ سوئی سے لے کر جہاز تک کم وبیش ہر چیز خریدنے پر مجبور ہیں، اگر یہ اپنے وسائل کوان میدانوں میں خرچ کرتے تو ایک باعزت قوم کی حیثیت سے دنیا میں سر اٹھا کر رہنے کے لائق ہوتے؛ لیکن دین سے دوری اور اسلام کے عہد زرّیں کی روایتوں سے انحراف نے انہیں اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ آج عالمی اداروں اور بین الاقوامی فیصلوں میں ان کا کوئی وزن نہیں ہے۔

قرآن مجید کا اٹھارواں پارہ سورہ مؤمنون سے شروع ہوتا ہے، اس سورت کی ابتدائی نو آیات میں اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کی مطلوبہ اہم صفات کا ذکر کیا ہے، جن میں سے دوسرے نمبر پر فرمایا گیا: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ﴾ (المؤمنون: ۳) یعنی وہ لغو باتوں سے گریز کرنے والے اور بچنے والے ہوتے ہیں، لغو کا ایک معنی مشہور مفسر علامہ فخر الدین رازی نے بتایا ہے کہ ایسی جائز چیزیں جس کی انسان کو ضرورت نہ ہو: ''المباح الذي لا حاجة إليه'' (مفاتیح الغیب: ۱۱/ ۳۴۶) غالباً یہ اس لفظ کی سب سے بہتر تشریح ہے، بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو فقہی اعتبار سے جواز کے دائرے میں آتی ہیں، اگر کسی مفتی سے اس کے بارے میں دریافت کیا جائے تو وہ شرعی محرمات کے نہ ہونے کی وجہ سے جائز ہونے ہی کا فتوی دے گا؛ لیکن وہ لغو میں داخل ہوتی ہیں، مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ ایسی باتوں سے اپنے آپ کو بچائے، اگر لغو کا ارتکاب انفرادی طور پر ہو تو اس کا نقصان بھی انفرادی ہوتا ہے اور اگر قومی سطح پر ایسے کام کئے جائیں تو نقصان بھی اجتماعی ہوتا ہے اور پوری ملت اسلامیہ کو اس کے خسارہ میں شریک ہونا پڑتا ہے۔

آج بہت سی ایسی صورتیں ہمارے سماج کا حصہ بن چکی ہیں جو انفرادی واجتماعی حیثیت سے لغو کے دائرے میں ہیں، جیسے مکانات کی تعمیر میں تزئین وآرائش کا بڑھتا ہوا رجحان، نت نئے ڈیزائن کے فرنیچرس سے گھروں کو آراستہ کرنا اور بار بار اُن کو بدلتے رہنا، درس گاہوں کی عمارت کی تعمیر میں بھی تعلیم سے زیادہ ظاہری ٹیپ ٹاپ کا خیال، کپڑوں میں نئے نئے ڈیزائن اور بار بار اُن کی خریداری، گاڑیوں کے مختلف ماڈل اور قابل استعمال اچھی گاڑیوں کو فروخت کرکے نئی گاڑیاں خریدنے کا رجحان، دعوتوں میں حد سے گذرا ہوا تنوع، یہاں تک کہ اب مذہبی پروگراموں میں بھی اس کو ضروری

سمجھا جانے لگا ہے، غرض کہ اگر سماج میں افراد واشخاص کی سطح پر دیکھا جائے، بہت کم اصحابِ ثروت ہوں گے، جو واقعی لغو سے اعراض کے اس قرآنی حکم پر عمل کرتے ہوں۔

قومی سطح پر صورتِ حال اس سے بھی زیادہ خراب ہے، آج حکومتیں کھیلوں پر اتنا خرچ کر رہی ہیں کہ اگر بیماروں کے علاج اور بے مکانوں کے لئے سر چھپانے کی جگہ فراہم کرنے کے لئے یہ رقم خرچ کی جائے تو شاید ترقی پذیر ملکوں میں کوئی مریض علاج سے اور کوئی غریب مکان سے محروم نہ رہنے پائے، عوامی نمائندوں کو جو غیر معمولی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں، یہ خود ''لغو'' کی اعلیٰ مثال ہے، تعلیمی اداروں، ہسپتالوں، مسافر خانوں، بوڑھوں اور لاوارثوں کے لئے آسرا گھروں کی تعمیر کے لئے حکومتوں کے پاس پیسہ نہیں ہے؛ لیکن سرکاری تقریبات اور شہروں کی تزئین وآرائش کے لئے پانی کی طرح روپے بہائے جاتے ہیں۔

مسلم حکومتوں کو خاص طور پر اور افراد واشخاص کو اپنی اپنی سطح پر اور خود ہمارے ملک کو بھی اس بارے میں غور کرنا چاہئے کہ ہمارے وسائل، ہماری صلاحیتیں اور ہماری مہارتیں انسانیت کے لئے مفید مقاصد کی بجائے کہیں بے فائدہ اور لغو کاموں میں تو خرچ نہیں ہو رہی ہیں اور ہم بحیثیت مسلمان یہ بھی سوچیں کہ دولت وثروت کہیں اللہ کے دربار میں ہمیں جوابدہ تو نہیں بنا دے گی؟؟

قرآن مجید اور اہل مغرب کا عناد

انسان کے گرد ایک وسیع اور متنوع کائنات پھیلی ہوئی ہے، اس میں انسان کی راحت، قلبی و جسمانی سکون اور عیش وعشرت کی بے شمار چیزیں موجود ہیں، جو نگاہوں کو بھاتی ہیں، دلوں کو لبھاتی ہیں اور انسان کی نہ تھمنے والی خواہشات اور غیر محدود شہوات کو دعوت عیش دیتی رہتی ہے؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ ساری چیزیں انسان کے لئے مفید، نفع بخش اور کارآمد نہیں ہیں، بہت سی چیزیں وہ ہیں جو انسان کے لئے مہلک ہیں، عقل کے لئے مضرت رساں ہیں، اخلاق کے لئے تباہ کن ہیں، انسان اس کی ظاہری خوبصورتی کو دیکھ کر اس کی طرف لپکنا چاہتا ہے؛ لیکن اس کے اندر جو مضرت رکھی ہوئی ہے، وہ اس سے نابلد ہے، بعض دفعہ انسان ایک شئی کی مضرت سے واقف ہوتا ہے؛ لیکن خواہشات کے دبیز پردے اسے اندھا بنا دیتے ہیں اور وہ چشم بینا رکھنے کے باوجود نابینا ہو جاتا ہے، اس کے کان ہوتے ہیں، مگر وہ سچائی کو سننے سے قاصر ہیں، وہ احساسات کی نعمت سے سرفراز ہوتا ہے؛ لیکن بے حسی اس کے حواس پر غالب آجاتی ہے۔

اسی لئے انسان خواہ کتنا بھی عقلمند ہو اسے ایک ایسے ہادی کی ضرورت ہے، جو ان ساری کمزوریوں سے ماوراء ہو، اور وہ ہے اس خدا کی ذات، جس نے کائنات کو بھی پیدا کیا ہے اور انسان کو بھی، وہ صرف خالق ہی نہیں ہے؛ بلکہ اس پوری کائنات کا مدبر و منتظم یعنی رب العالمین بھی ہے، انسان کے لئے اس کے سوا کون ہادی ہوسکتا ہے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت کا انتظام فرمایا، اس مقصد کے لئے اپنی کتابیں بھیجیں اور ان کتابوں کی تشریح کے لئے اپنے انبیاء و رسل بھیجے، نیز اللہ کی طرف سے اترنے والے ہدایت ناموں کا سب سے مکمل اور آخری ایڈیشن قرآن مجید کی صورت میں نازل ہوا، اس کتاب کا بنیادی موضوع بھی انسانیت کی ہدایت ہے؛ اسی لئے قرآن پاک کو کہیں ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ (البقرۃ: ۲) اور کہیں ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ (البقرۃ: ۱۸۵، آل عمران: ۴) کہا گیا —— اب قیامت تک انسانیت کی ہدایت اس کی دنیا و آخرت کی کامیابی اور فلاح و صلاح اللہ کی اسی کتاب سے متعلق ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک موقعہ پر قرآن مجید کا نہایت جامع تعارف

کراتے ہوئے فرمایا:

''یہ اللہ کی کتاب ہے، جس میں گذرے ہوئے لوگوں کی سچی خبریں ہیں، مستقبل کی پیشین گوئیاں ہیں، تمہاری زندگی کے لئے احکام ہیں، یہ قول فیصل ہے، اس میں ہنسی مذاق کی کوئی بات نہیں ہے، جو تکبر کی وجہ سے اسے چھوڑے گا، اللہ اسے ٹکڑے کردے گا، اور جو اس کتاب کے بجائے کہیں اور ہدایت تلاش کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے ہدایت سے محروم کردے گا، یہ اللہ کی مضبوط ڈوری ہے، یہ نصیحت اور حکمت سے مامور کلام ہے، یہ سیدھا راستہ ہے، یہ وہ کتاب ہے کہ جس کے ذریعہ خواہشات کج روی اختیار نہیں کرسکتیں اور جس کے ذریعہ زبانیں دھوکہ نہیں دے سکتیں، اہل علم ودانش کبھی اس سے سیر نہیں ہوسکیں گے اور بار بار پڑھے جانے کے باوجود کبھی اس کلام میں پرانا پن پیدا نہیں ہوگا، اس کی نادر باتیں ختم نہیں ہوں گی، یہ وہ کلام ہے کہ جب جنوں نے اسے سنا تو بول پڑے: ''ہم نے ایک عجیب کلام کو سنا ہے، جو ہدایت کا راستہ بتاتا ہے؛ لہٰذا ہم اس پر ایمان لاتے ہیں، جو قرآن کریم کے مطابق کہے گا، وہ سچا ہے، اور جو اس پر عمل کرے گا، وہ اجر پائے گا، جو اس کے مطابق فیصلہ کرے گا، وہ انصاف کرے گا اور جو اس کی طرف دعوت دے گا، اس کی دعوت سیدھے راستہ کی طرف ہوگی'' (سنن الترمذی، باب ماجاء فی فضل القرآن، حدیث نمبر: ۲۹۰۶)

واقعہ ہے کہ اس سے بہتر قرآن مجید کا تعارف نہیں ہوسکتا اور کیوں کر ہو کہ یہ خود حامل قرآن کی زبان حق ترجمان سے اس کا تعارف ہے، اس ارشاد نبوی میں اس بات کی صراحت ووضاحت ہے کہ اب انسانیت کی فلاح وہدایت قیامت تک قرآن مجید سے وابستہ ہے اور دوسری تمام مذہبی کتابوں سے ہدایت کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔

پھر جیسا کہ مذکور ہوا جو مذہب، جو کتاب اور جو شخصیت انسانیت کے لئے حقیقی ہادی ہوگی، وہ ممکن نہیں کہ انسان کی تمام خواہشات کو قبول کرلے، جیسے ایک محبت رکھنے والا باپ اپنے نونہال کی ہر ضد کو قبول نہیں کرتا اور اسے ایسی باتوں سے بچانے کی کوشش کرتا ہے، جو اس کو غلط راستہ پر لے جائیں، جیسے ایک ہمدرد معالج مریض کو ایسی غذاؤں سے بعض اوقات منع کرتا ہے، جو اس کو بے حد

مرغوب ہوں اور اسے کڑوی دواؤں کے گھونٹ بھی پلاتا ہے؛ تاکہ وہ شفایاب ہو جائے، اسی طرح انسانیت کا حقیقی رہبر، اس کا بہی خواہ اور اس کا مورث وغم خوار اس بات کو گوارہ نہیں کر سکتا کہ انسان خود اپنی خواہش کا غلام بن جائے، وہ سوار نہ ہو؛ بلکہ سواری ہو، وہ راکب نہ ہو؛ بلکہ مرکب ہو، خواہشات کی لگام اس کے ہاتھ میں نہ ہو؛ بلکہ اس کی لگام خواہشات کے ہاتھ میں ہو؛ اسی لئے آج مغرب کی مادہ پرست اور عیش ولذت کی پرستار دنیا کو قرآن مجید سے خوف معلوم ہوتا ہے۔

قرآن مجید اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ انسان ایسا بندۂ نفس بن جائے کہ جانور بھی اسے دیکھ کر شرمندہ ہوں، وہ زنا اور بدکاری کو 'محبت' کا خوبصورت نام دے، وہ ہم جنسی کو آزادی کا عنوان قرار دے، وہ انسان کی صحت و اخلاق کو برباد کر دینے والی منشیات پر کوئی رکاوٹ نہ لگائے، وہ عریانیت اور بے لباسی کو انسانی فطرت قرار دے، وہ غریبوں کا استحصال اور سرمایہ داروں کے جبر واستبداد کو جائز ٹھہراتے ہوئے سود کو معیشت کی ناگزیر ضرورت سمجھے، افسوس! کہ دنیا کے دوسرے مذاہب نے مادیت کے اس سیلاب اور لذتیت کے اس طوفان کے آگے ہتھیار ڈال دیا ہے؛ حالاں کہ ان تمام برائیوں کو تقریباً ہر مذہب نے منع کیا ہے، عیسائیوں نے پادری کے سامنے اعتراف گناہ کے ایسے فرضی طریقہ کو رواج دیا کہ مجرم کے ضمیر میں اپنی غلطیوں پر پشیمانی اور احساس ندامت کا جو کانٹا چبھ سکتا تھا، وہ بھی نکل جائے؛ تاکہ انسان کے لئے خواہشات کی بندگی اور شہوات کی غلامی میں کوئی کھٹک ہی باقی نہ رہے اور وہ ہر طرح کی بے لطفی سے آزاد ہو کر گناہ کا ارتکاب کرے؛ اس لئے دنیا کے دوسرے مذاہب یا مذہبی کتابوں سے مادیت پرستی کا کوئی ٹکراؤ باقی نہیں رہا؛ البتہ قرآن مجید آج بھی اس راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے، اس میں انقلاب پیدا کرنے کی غیر معمولی صلاحیت، دلوں کو فتح کرنے کی بے پناہ طاقت، دماغ کو مطمئن کرنے کی استعداد، اثر آفرینی، عقل سے ہم آہنگی، فطرت انسانی سے مطابقت اور انسانی ضروریات اور مصالح سے موافقت ہے، یہ ایسا چراغ عالم تاب ہے کہ اس کی لَو کبھی دھیمی نہیں ہوتی اور یہ ایسا بادۂ ایمان انگیز ہے کہ جس کا نشہ ہزار ابتلاؤں اور آزمائشوں کے باوجود کافور نہیں ہوتا، اسی حقیقت نے آج مغرب کے ایک حق ناشناس گروہ کو اسلام کی عداوت پر آمادہ کر رکھا ہے۔

قرآن مجید پر مغرب کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کو تشدد پر ابھارتی ہے وہ اس کتاب کو ماننے والے دوسرے مذہب کے لوگوں سے نفرت کرتے ہیں؛ حالاں کہ قرآن

مجید نے ایک انسان کے قتل کو تمام انسانیت کا قتل قرار دیا ہے اور ایک انسان کے بچانے کو تمام انسانیت کا بچانا: ﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ (المائدۃ:۳۲)(المائدۃ:۳۲)(المائدۃ:۳۲) قرآن نے صاف کہا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں کسی جبر و دباؤ کی گنجائش نہیں: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ (البقرۃ:۲۵۶) قرآن کثیر مذہبی سماج کے لئے اصولی بات کہتا ہے کہ ہر ایک کو اپنے اپنے منہج اور طریقہ کے مطابق زندگی گذارنی چاہئے اور دوسرے کے معاملات میں دخل نہ دینا چاہئے: ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ (الکافرون:۶) قرآن نے صاف کہا ہے، جو غیر مسلم مسلمانوں پر ظلم نہ کریں اور انہیں ان کے گھر بار سے محروم کرنے کی کوشش نہ کریں، ان کے ساتھ بہتر سلوک کرنا چاہئے: ﴿لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ (الممتحنة:۸) وہ صلح کو بہترین طریقہ قرار دیتا ہے: ﴿وَالصُّلْحُ خَيْرٌ﴾ (النساء:۱۲۸) قرآن اعلان کرتا ہے کہ تمام بنی نوع انسان شریف اور قابل احترام ہیں: {وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ} (الإسراء:۷۰) قرآن نے کسی بھی مذہب کی عبادت گاہ کو منہدم کرنے یا اس پر غاصبانہ قبضہ کرنے کو ناپسند کیا ہے، ﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا﴾ (الحج:۴۰) اسی لئے تاریخ عالم میں مسلمانوں نے ہمیشہ اپنے زیر اقتدار غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ بہترین سلوک روا رکھا ہے، ان سب کے باوجود قرآن کو تشدد اور نارواداری کی داعی کتاب قرار دینا کتنی بڑی زیادتی ہے؟ یہ محتاج بیان نہیں۔

آج اگر پوری دنیا میں شدت پسندی اور دہشت پسندی کا جائزہ لیا جائے تو ایسے تمام واقعات کا رشتہ مغربی طاقتوں سے ملتا ہے، دنیا میں ہلاکت خیز ہتھیاروں کی صنعت کو کس نے وجود بخشا، آج تک کی تاریخ میں ایٹم بم کا استعمال کس ملک نے کیا ہے؟ عراق کی فوج امریکہ میں داخل ہوئی یا عراق کی امریکہ میں؟ افغانستان پر بارود امریکہ اور اس کے حلیفوں نے برسایا، یا امریکہ اور اس کے حلیفوں پر افغانستان نے؟ غزہ کو کس نے ایک بڑے انسانی قید خانہ میں تبدیل کر رکھا ہے اور کس نے کئی بار فلسطینیوں کا قتل عام کیا ہے؟ کس نے بوسنیا میں منظم طور پر بے قصور انسانوں یہاں تک کہ معصوم

نونہالوں کے مذبح سجائے ہیں؟ یہ سب تو موجودہ دور کے واقعات ہیں، جنہیں موجودہ نسل کی آنکھوں نے دیکھا ہے، اگر ماضی کی تاریخ کو الٹا جائے تو وہ اس سے بھی زیادہ خوں چکاں ہوگی، سچائی یہ ہے کہ مغرب کی تاریخ کو جہاں سے پڑھئے ایک حقیقت پسند اور منصف مزاج قاری کا دل آواز دے گا:

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لیکن صہیونی اور صلیبی طاقتوں نے بڑی آسانی سے مظلوم کو ظالم کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا ہے اور قرآن مجید پر تہمت اندازی کرتے ہوئے اسے تشدد کا معلّم قرار دیا جارہا ہے، امریکہ کے ایک چرچ نے ۹/۱۱ کو قرآن مجید کو نذر آتش کرنے کا تکلیف دہ اعلان کیا ہے، ایسے موقع پر ایک طرف قرآن مجید سے نفرت وعداوت کے پس منظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے، جس کا ذکر کیا گیا، دوسری طرف مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ اس دن کو قرآن مجید کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کا دن بنائیں، غیر مسلم بھائیوں کے گھر گھر قرآن مجید کا ترجمہ پہنچائیں، قرآن کی انسانیت نواز تعلیمات پر مبنی لٹریچر تیار کریں اور اسے مقامی زبانوں میں شائع کریں؛ تاریکی کا علاج یہی ہے کہ چراغ جلا دیا جائے، جب روشنی پھیلے گی تو تاریکیاں خود بخود چھٹ جائیں گی اور جب سچ انسان کے سامنے روشن اور بے غبار ہوکر آجائے گا تو جھوٹ کے لئے کوئی پناہ گاہ باقی نہیں رہے گی!!

❁

اسلامی شناخت پر غاصبانہ قبضہ

(قادیانیوں کا اسلامی اصطلاحات کو استعمال کرنا)

ہر ملک کا ایک قومی جھنڈا ہوتا ہے، یہ جھنڈا اس قوم کے لئے فخر وعظمت کے نشان کی حیثیت رکھتا ہے، ہمارے ملک کا ترنگا جھنڈا موجود ہے، اور جھنڈوں سے متعلق باضابطہ قوانین موجود ہیں، قومی جھنڈے کی اہانت بہت بڑا جرم ہے، اس کے لئے باضابطہ قوانین مقرر ہیں، ہندوستان میں ہر سیاسی جماعت بلکہ بعض مذہبی جماعتوں نے اپنے لئے جھنڈوں کی وضع مقرر کی ہے، جن سے ان کی پہچان متعلق ہے؛ لیکن یہ جماعتیں قومی جھنڈوں کو اپنے جھنڈے کے طور پر استعمال نہیں کرسکتیں، یہ جھنڈا پوری قوم کی نمائندگی کرتا ہے نہ کہ کسی ایک گروہ کی، بظاہر اس میں کوئی نقصان نظر نہیں آتا کہ کوئی اور گروہ اس جھنڈے کو اپنی پہچان کے طور پر استعمال کرنے لگے، نہ اس سے ہماری معیشت کو کوئی نقصان ہے، نہ اس سے ہمارے دفاع کو کوئی خطرہ ہے، نہ ہمارے سیاسی استحکام کو کوئی جوکھم ہے اور نہ دوسرے قومی مفادات کا بظاہر کوئی نقصان ہے؛ لیکن ان سب کے باوجود جھنڈوں کا غیر مجاز استعمال نہ صرف ممنوع ہے؛ بلکہ قابل سرزنش جرم بھی ہے۔

آخر ایسا کیوں ہے؟ —— اسی لئے نا کہ اس کی حیثیت، علامت اور پہچان کی ہے اور جب کوئی شخص اپنی پہچان بناتا ہے تو ایک طرح وہ اس کی ملکیت ہوجاتی ہے، اسی اصول پر ایجادات کے رجسٹریشن کا قانون ہے، اور ادبی حقوق کو ایک پراپرٹی کی حیثیت دی گئی ہے، ایک کمپنی دوسرے کمپنی کا نام استعمال نہیں کرسکتی، ایک دواساز دوسرے دواساز کے فارمولہ کو بعینہ نہیں لے سکتا، ایک ناشر دوسرے ناشر کی کتاب نہیں چھاپ سکتا اور ایک صنعت کار دوسرے صنعت کار کے نمونہ پر وہی چیز بنانے کا حق نہیں رکھتا، تجارت وصنعت میں تو یہ تحفظ معاشی مفادات کے لئے کیا جاتا ہے؛ لیکن جو لوگ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے نزدیک مذہب کی اہمیت معیشت سے بھی زیادہ ہوتی ہے؛ اس لئے وہ فطری طور پر ان چیزوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، جس سے ان کی مذہبی شناخت متعلق ہے، جیسے کسی کا گھر گورنمنٹ منہدم کردے تو اس سے وہ اس درجہ رنجیدہ نہیں ہوتا، جتنا اس بات سے اس کی

مسجد، مندر یا چرچ کو منہدم کر دیا جائے؛ کیوں کہ اس کے گھر سے صرف مالی نفع ونقصان متعلق ہوتا ہے اور عبادت گاہ سے اس کے جذبات جڑے ہوئے ہیں۔

یہ حقیر اس پہلو پر ایک خاص پس منظر میں گفتگو کر رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ ابھی کچھ عرصہ پہلے ریاست آندھرا پردیش کے وقف بورڈ نے ایک تاریخی فیصلہ دیتے ہوئے کہا کہ قادیانی مسلمان نہیں ہیں؛ اس لئے وہ مسلمانوں کی مسجدوں کے متولی نہیں ہو سکتے، افسوس کہ مسلمانوں کی کئی مسجدوں پر آندھرا پردیش، پنجاب اور مختلف علاقوں میں قادیانی قابض ہیں، یہ ایک ایسا فیصلہ ہے جو پوری طرح انصاف اور اصول کے مطابق ہے، اگر ایک مسلمان مندروں اور مٹھوں کا متولی نہیں ہوسکتا، ایک ہندو مسجدوں کا ذمہ دار نہیں ہوسکتا تو قادیانی مذہب پر یقین رکھنے والوں کے لئے بھی یہ بات کیسے روا ہوسکتی ہے کہ وہ مسجدوں کے متولی ہو جائیں، خاص کر ایسی صورت حال میں کہ ہندو، عیسائی اور عام غیر مسلم تو ہدایت سے محروم ہیں اور کافر ہیں؛ لیکن قادیانی کافر ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کے باغی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نبوت کے مقابلہ مرزا غلام احمد قادیانی پر ختم نبوت کے مدعی بھی ہیں؛ اس لئے ان کی گمراہی دوسرے غیر مسلموں سے بڑھ کر ہے، وہ صرف غیر مسلم ہی نہیں ہیں؛ بلکہ اسلام اور شریعت محمدی کے دشمن اور معاند بھی ہیں۔

وقف بورڈ کے اسی فیصلہ کے پس منظر میں مسلمانوں نے سرکاری انتظامیہ سے مطالبہ کیا ہے کہ قادیانیوں کی عبادت گاہ کو ''مسجد'' کا نام دینے سے منع کیا جائے اور انہیں ایک حد تک کامیابی بھی ملی کہ حیدرآباد میں ان کی مرکزی عبادت گاہ سے پولیس نے ''مسجد'' کا لفظ مٹا دیا، مسلمانوں کا مطالبہ یہ بھی ہے کہ وہ مذہبی علامت کے طور پر کلمۂ طیبہ ''لا إله إلا الله محمّد رسول الله'' کا استعمال نہ کریں؛ کیوں کہ اس کلمہ سے مسلمانوں کی شناخت متعلق ہے، اس پر حسب توقع قادیانی حضرات کی طرف سے بڑی آہ وواویلا کی جارہی ہے، انصاف کی دہائی دی جارہی ہے اور آندھرا پردیش ہائی کورٹ میں وقف بورڈ کے خلاف رٹ پٹیشن بھی دائر کی گئی ہے۔

سوچئے! اگر کچھ ہندو بھائی مندر بنائیں اور اس کا نام ''جامع مسجد دہلی'' یا ''مکہ مسجد حیدر آباد'' رکھ دیں یا کچھ مسلمان مسجد بنائیں اور اس کو ہندوؤں کے کسی مقدس مقام کا نام دے دیں، کیا مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے یہ بات قابل قبول ہوگی؟ —— ہرگز نہیں؛ کیوں کہ اس طرح ان کی

شناخت متاثر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، قادیانیوں کا اپنی عبادت گاہ کو مسجد کہنا اور کلمہ طیبہ کو اپنا کلمہ قرار دینا اسی انداز کا عمل ہے، جس سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہے۔

پھر اس میں دھوکہ کا پہلو بھی ہے، اگر کوئی شخص سور کا گوشت بیچے اور گاہکوں پر واضح کر دے کہ یہ سور کا گوشت ہے تو اس میں حرج نہیں، یہ اس کا ذاتی فعل ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص خنزیر کے گوشت کو بکرے کا گوشت بتا کر فروخت کرے تو یقیناً یہ ایک زبردست دھوکہ ہے اور کسی کے لئے بھی قابل قبول نہیں، قادیانیوں کا طرز عمل بالکل یہی ہے، وہ مسلمانوں کو کافر کہتے ہیں اور اپنے آپ کو کافر ہونے کے باوجود مسلمان قرار دیتے ہیں، وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی نہیں مانتے، مرزا غلام احمد قادیانی کو آخری نبی مانتے ہیں؛ لیکن کلمہ ''لا إله إلا الله محمّد رسول الله'' پڑھتے ہیں، یہ واضح طور پر مسلمانوں کے ساتھ دھوکہ ہے، آج قادیانیوں کی طرف سے دیہات وقصبات اور شہر کے مسلم علاقوں اور تعلیمی اعتبار سے پسماندہ محلوں میں ارتداد کا فتنہ پھیلایا جارہا ہے، اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، مسجد کے نام سے اپنی عبادت گاہیں تعمیر کرتے ہیں، کلمہ طیبہ پڑھ کر لوگوں کو مسلمان ہونے کا یقین دلاتے ہیں، یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول اور خاتم النبیین مانتے ہیں؛ حالاں کہ یہ محض دھوکہ اور دروغ گوئی ہے، اسی سے سادہ لوح مسلمان دھوکہ کھا جاتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی مسلمانوں کی بہت سی جماعتوں میں سے ایک جماعت ہے۔

قادیانیوں کے کلمہ طیبہ پڑھنے کی حقیقت یہ ہے کہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کو بعینہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تسلیم کرتے ہیں؛ چنانچہ خود مرزا صاحب اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''جب کہ میں بروزی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور بروزی رنگ میں تمام کمالات محمدی مع نبوت محمدیہ کے میرے آئینہ ظلیت میں منعکس ہیں تو پھر کون سا الگ انسان ہوا جس نے علاحدہ طور پر نبوت کا دعویٰ کیا؟ (ایک غلطی کا ازالہ، ص:۱۰)

اس طرح کی بات مرزا صاحب نے متعدد مقامات پر لکھی ہے اور قادیانیوں کے ہاں یہ تصور ایسا راسخ ہے کہ قادیانی شعراء نے کثرت سے مرزا غلام احمد کے لئے مدحیہ اشعار میں اسے دھرایا ہے، یہاں صرف دو اشعار نقل کئے جاتے ہیں:

*پہلی بعثت میں محمد ہے تو اب احمد ہے
تجھ پر اترا ہے قرآن رسول قدنی
*حقیقت کھلی بعث ثانی کی ہم پر
کہ جب مصطفی میرزا بن کے آیا

گویا جب قادیانی حضرات کلمہ طیبہ پڑھتے ہیں تو محمد رسول اللہ میں محمد سے مرزا غلام احمد قادیانی کو مراد لیتے ہیں، یہ ایسی باتیں نہیں ہیں جو کسی مسلمان کی طرف سے ان پر تھوپی جارہی ہیں؛ بلکہ خود مرزا غلام احمد قادیانی کے لڑکے اور قادیانی مذہب کے ایک خلیفہ مرزا بشیر احمد کا بیان ہے:

''ہاں حضرت مسیح موعود (مرزا قادیانی) کے آنے سے (کلمہ کے مفہوم میں) ایک فرق ضرور پیدا ہوگیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسیح موعود (مرزا قادیانی) کی بعثت سے پہلے تو ''محمد رسول اللہ'' کے مفہوم میں صرف آپ سے پہلے گذرے ہوئے انبیاء شامل تھے، مگر مسیح موعود (مرزا قادیانی) کی بعثت کے بعد ''محمد رسول اللہ'' کے مفہوم میں ایک اور رسول کی زیادتی ہوگئی؛ لہٰذا مسیح موعود کے آنے سے نعوذ باللہ ''لا إله إلا الله محمّد رسول الله'' کا کلمہ باطل نہیں ہوتا؛ بلکہ اور بھی زیادہ شان سے چمکنے لگتا ہے''

غرض کہ قادیانی حضرات پڑھتے تو ہیں وہی کلمہ جو مسلمان پڑھتے ہیں؛ لیکن ان کی مراد عام مسلمانوں سے مختلف ہوتی ہے؛ لہٰذا یہ بات بالکل واضح ہے کہ قادیانیوں کا اپنی عبادت گاہ کو مسجد سے موسوم کرنا اور کلمہ طیبہ کو اپنا کلمہ قرار دینا کھلا ہوا دھوکہ اور مسلمانوں سے ان کی پہچان چھیننے کی کوشش ہے اور اس پر ان کا احتجاج کرنا بالکل معقول اور منصفانہ ہے، قادیانیوں کو چاہئے کہ وہ صاف طور پر واضح کردیں، ہم مسلمان نہیں ہیں اور اس دین کی پیروی نہیں کرتے، جس کو لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے؛ بلکہ ہم ایک الگ مذہب کے ماننے والے ہیں، جس کی بنیاد مرزا غلام احمد قادیانی نے رکھی ہے، ہم قرآن کو آخری کتاب نہیں مانتے؛ بلکہ مرزا غلام احمد کی کتابوں کو آخری الہامی کتاب مانتے ہیں، وہ اپنی عبادت گاہوں کو مسجد کا نام نہ دیں اور اپنے عقیدہ کے مطابق کلمہ طیبہ کی جگہ کوئی دوسرا کلمہ وضع کرلیں تو مسلمانوں کو ان پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا، جیسے کسی مسلمان کو ہندو کے ہندو ہونے، عیسائی کے عیسائی ہونے اور سکھ کے سکھ ہونے پر کوئی اعتراض نہیں، اس بات کے واضح ہوجانے کے باوجود

کہ قادیانیت ایک الگ مذہب ہے، اگر کوئی شخص مرتد ہوتا ہے اور حق سے منہ پھیر کر باطل کا راستہ اختیار کرتا ہے تو مسلمانوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں؛ کیوں کہ گمراہی کے واضح ہونے کے باوجود اگر کوئی گمراہی کا راستہ اختیار کرے تو اس کی گمراہی دینِ حق کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی اور نہ اسلام کو ایسے گمراہوں کی کوئی حاجت ہے!

علماء اور ارباب اقتدار

دین حق اور شریعت اسلامی اپنی مکمل اور آخری شکل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ انسانیت تک پہنچ چکا ہے؛ اس لئے قیامت تک اس دین کو بے آمیز طریقہ پر محفوظ رہنا ضروری ہے، خود اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ (الحجر:۹) قرآن کی حفاظت میں ''الفاظ قرآنی'' کی حفاظت تو داخل ہے ہی ''معانی قرآن'' کی حفاظت بھی شامل ہے، قرآن مجید کے درست معانی اور اس کی صحیح تشریحات علماء کی ذمہ داری ہے؛ اس لئے منجانب اللہ ہر عہد میں علماء سے دو طرح کی خدمتیں لی گئی ہیں: ایک یہ کہ ان کو ایسی علمی بصیرت عطا کی گئی کہ وہ الفاظ قرآنی کی بے جا تشریحات اور احکام شریعت کی ناحق تأویلات کے فتنہ سے امت کو بچائیں، دوسرے: اسلام کی تعلیمات کو حکومت کے اثرات اور اس کی مداخلت سے محفوظ رکھیں؛ کیوں کہ حکومتیں اکثر مذاہب پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں، ہندو مذہب اور عیسائیت اس کی واضح مثالیں ہیں، مسلم حکومتیں بھی ایسے ناپاک عزائم سے پاک نہیں رہی ہیں؛ لیکن چوں کہ اللہ تعالیٰ کو اسلام کی حفاظت مقصود تھی؛ اس لئے ہمیشہ ایسی کوششیں ناکام و نامراد رہی ہیں۔

علماء اسلام اس سلسلہ میں اتنے حساس واقع ہوئے تھے کہ جو راویان حدیث شاہی دربار کا چکر لگاتے، اہل علم کو ان کی روایت قبول کرنے میں تأمل ہوتا تھا، اور جو فقہاء حکومتوں کے زیر اثر ہوتے، اصحاب علم کی بارگاہ میں ان کے فتاویٰ کو قبولیت و پذیرائی حاصل نہیں ہوتی، بڑے بڑے اہل علم کو سرکاری عہدوں کی پیش کش کی گئی؛ لیکن انہوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ہمیشہ امراء و سلاطین کی ہمنشینی کو علماء و مشائخ کے لئے ناپسند کیا گیا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''علماء اللہ کے بندوں پر اس کے رسولوں کے بعد ذمہ دار ہیں، جب تک سلاطین کے ساتھ ان کا ملنا جلنا نہ ہو، اگر انہوں نے ارباب اقتدار سے اختلاط رکھا تو اللہ کے رسولوں کے ساتھ خیانت کی؛ لہٰذا ایسے لوگوں سے بچ کر اور دور دور رہو'' (احیاء العلوم: ۱/۱۰۱) ایک اور روایت میں ہے کہ بدترین علماء وہ ہیں جو امراء (ارباب اقتدار) کے پاس آمد و رفت رکھتے ہیں اور بہترین امراء وہ ہیں جو علماء کے پاس

آتے جاتے ہیں (حوالہ سابق) ایک اور روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ جس نے حکمراں کے پاس آمد و رفت رکھی، وہ فتنہ میں مبتلا ہوا ''من أتی السلطان أفتتن'' (احیاء العلوم بحوالہ ابوداؤد وغیرہ) ایک اور روایت میں ہے کہ تم پر ایسے امراء اور ذمہ دار آئیں گے، جن کی بعض باتیں اچھی ہوں گی اور بعض بری، تو جس نے ان کی بری بات پر نکیر کی، اسے تو نجات مل گئی اور جس نے صرف دل میں برا محسوس کیا، وہ بھی بچ گیا؛ لیکن جو اس کی باتوں پر راضی رہا اور اس کی پیروی کی تو اللہ تعالیٰ اسے محروم کر دیں گے۔ (احیاء العلوم: ۱/۱۰۰، بحوالہ مسلم)

اسی لئے علماء نے ہمیشہ اربابِ حکومت اور اہلِ اقتدار کے پاس علماء کے آنے جانے کو ناپسند کیا ہے، امام غزالیؒ نے اسے ''علماء سو'' یعنی خراب علماء کی علامتوں میں سے ایک علامت بتایا ہے، علامہ ابن جوزی نے اپنی مشہور کتاب ''تلبیس ابلیس'' میں لکھا ہے کہ شیطان کے اہل علم کو متأثر کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اربابِ اقتدار کے پاس ان کی آمد و رفت بڑھ جائے اور وہ ان کے ساتھ مداہنت کا رویہ اختیار کرنے لگیں۔ (تلبیس ابلیس: ۱۳۹) مشہور فقیہ سفیان ثوریؒ کہا کرتے تھے کہ جہنم میں ایک وادی ہے، جس میں وہ علماء داخل کئے جائیں گے جو اربابِ اقتدار کے یہاں آمد و رفت رکھا کرتے تھے، سعید بن المسیبؒ سے منقول ہے کہ جب تم کسی عالم کو دیکھو کہ وہ اصحابِ حکومت کے یہاں اکثر جاتا رہتا ہے تو اس سے بچ کے رہو، اس لئے کہ وہ چور ہے، امام اوزاعیؒ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس عالم سے زیادہ کوئی شخص ناپسند نہیں، جو کسی صاحب اقتدار کے یہاں آنا جانا رکھتا ہو، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے حضرت سلمہؓ سے کہا: تم اربابِ اقتدار کے دروازے پر جاؤ گے تو تم جتنا ان سے دنیا حاصل کرو گے، اس سے زیادہ وہ تم کو تمہارے دین سے محروم کر دیں گے۔ (احیاء العلوم: ۱/۱۰۱)

ظاہر ہے کہ یہ ہدایات اس صورت میں ہیں جب کہ علماء اور مشائخ اپنی اغراض و ضرورتوں یا مناصب اور عہدوں کے لئے اربابِ اقتدار تک پہنچیں اور ان کو ان کی غلطیوں پر ٹوکنے کی ہمت نہ پاتے ہوں، اگر کوئی عالم امت مسلمہ کے کسی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ اربابِ حکومت تک پہنچتا ہے تو وہ اس میں داخل نہیں ہے؛ بلکہ ایسے لوگوں سے امت کو نفع پہنچتا ہے، اسلامی تاریخ میں اس کی بہترین مثال امام ابو یوسفؒ اور مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ ہیں، امام ابو یوسفؒ نے عہدِ عباسی میں عہدۂ قضا قبول فرمایا اور اسلامی تاریخ کے پہلے قاضی القضاۃ بنے؛ لیکن

انہوں نے ہمیشہ اس عہدہ کو اسلام کے فروغ، مسلمانوں کی خیر خواہی اور حکومت کی اصلاح کے لئے استعمال کیا، انہوں نے حکمت و مصلحت کے ساتھ اربابِ اقتدار کو دین سے جوڑے رکھا، اسی طرح مجدد الف ثانیؒ کے زہد و تقوی اور علم و فضل سے مشہور مغل بادشاہ جہانگیر متأثر ہوا، مگر انہوں نے اس تعلق کو کسی عہدہ کے حصول کے لئے استعمال نہیں کیا؛ بلکہ اکبر کے دور میں جو بد دینی اور الحاد سلطنت کا جز بن گیا تھا اور اسلامی شعائر کو تہہ و بالا کرنے کی جو سازش کی گئی تھی، اپنے اثر کے ذریعہ اس کا سد باب فرمایا، نہ کبھی کوئی عہدہ قبول فرمایا اور نہ کوئی مادی سہولت حاصل کی۔

عام طور پر علماءِ حق کے تعلقات ان کی حق پسندی کی وجہ سے حکومتوں سے خراب ہی رہے، سعید بن جبیرؒ حجاج بن یوسف کے حکم پر اس طرح ذبح کر دیئے گئے جیسے جانور کو ذبح کیا جاتا ہے؛ لیکن ثابت قدمی میں کوئی فرق نہیں آیا، امام ابو حنیفہؒ نے عباسیوں کے اصرار کے باوجود عہدۂ قضا قبول نہیں کیا، اس ثابت قدمی پر کوڑے بھی کھائے اور آخر جام شہادت نوش کیا، امام احمد بن حنبلؒ ایسی آزمائش سے گذرے، جس کی مثال کم ملے گی کہ ان کی پیٹھ کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا، جو زخم سے محفوظ ہو اور جس پر کوڑے نہ برسائے گئے ہوں، امام بخاریؒ ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہوتے رہے اور آخر اس حال میں ان کی وفات ہوئی کہ زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ کر دی گئی تھی، سفیان ثوریؒ نے اربابِ اقتدار کی قربت سے بچنے کے لئے اپنے اوپر جنون کی سی کیفیت طاری کر لی تھی، سلفِ صالحین کا حال یہ تھا کہ وہ اربابِ اقتدار کی قربت کو ایسی نظر سے دیکھتے تھے کہ گویا یہ آگ ہے جو ان کے دین و ایمان کو خاکستر کر دے گی۔

انہوں نے دین کی عظمت اور علم کے وقار کو کبھی سرنگوں نہ ہونے دیا، امام مالکؒ کا مسجدِ نبوی میں درسِ حدیث ہوتا تھا اور پوری اسلامی مملکت میں آپ کے درس کی شہرت تھی، اس وقت عباسی خلیفہ کی طرف سے اس خواہش کا اظہار کیا گیا کہ امام صاحب دونوں شہزادوں کو مؤطا امام مالک کا درس دیں، امام مالکؒ نے خوش اسلوبی کے ساتھ معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ اس علم کا آغاز آپ کے گھر سے ہوا ہے، یہ مناسب نہیں کہ آپ ہی کے ذریعہ اس علم کی بے توقیری ہو، علم ایسی چیز ہے کہ اس کے پاس آیا جاتا ہے، علم کسی کے پاس نہیں جاتا؛ چنانچہ امین الرشید اور مامون الرشید خود درسگاہ میں حاضر ہوئے اور انہوں نے امام مالکؒ سے کسبِ فیض کیا، امام بخاریؒ سے بخارا کے گورنر نے خواہش کی کہ وہ

گورنر ہاؤس میں آ کر شہزادوں کو حدیث کی تعلیم دیں؛لیکن امام بخاریؒ نے اسے قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ میں اس علم کو بادشاہوں کے دروازہ پر رسوا نہیں کرسکتا ''**لا أذل هذا العلم على أبواب السلاطين**'' شیخ سعید حلبی دمشق کی جامع مسجد میں درس دے رہے تھے اور تکلیف کی وجہ سے پاؤں پھیلائے ہوئے تھے،شام کے گورنر ابراہیم پاشاہ (جس کی سفاکیت اور خونریزی مشہور تھی) کو خیال ہوا کہ میں بھی جا کر شیخ کا درس سنوں؛ چنانچہ وہ مسجد میں سامنے ہی سے داخل ہوا،شیخ نے اپنا پاؤں نہیں سمیٹا، یہ بات آدابِ شاہی کے خلاف تھی،شیخ کے شاگرد دم بخود تھے کہ شاید اب شیخ کی شہادت ہوگی یا انہیں ذلیل ورسوا کیا جائے گا؛لیکن گورنر پر ایسا رعب طاری ہوا کہ وہ کچھ کہے بغیر واپس ہوگیا، پھر اس نے اشرفیوں (سونے کے سکہ) کی ایک بڑی مقدار اپنے غلام کے ذریعہ شیخ کی خدمت میں بھیجی اور درخواست کی کہ اس کا یہ نذرانہ قبول کرلیا جائے،شیخ نے واپس کردیا اور ایک ایسا تاریخی جملہ کہا، جو آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہے،اور جو ہر عالم دین کے لئے نقشِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ پاؤں وہی پھیلاتا ہے جو ہاتھ پھیلانا نہ جانتا ہو:''**الذي يمد رجله لا يمد يده**''۔

شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی مقبولیت اور محبوبیت اپنی بلندی پر ہے کہ جلال الدین خلجی (جو خود بھی دیندار بادشاہ تھا) نے بارہا شیخ سے ملاقات کی خواہش کی؛ یہاں تک کہ امیر خسرو کو اس کے لئے واسطہ بھی بنایا؛لیکن آپ کبھی بادشاہ کی ملاقات پر راضی نہیں ہوئے،نہ خود بادشاہ کے یہاں گئے اور نہ بادشاہ کو اپنے دولت خانہ پر باریابی کی اجازت دی،جلال الدین خلجی کے بعد علاء الدین خلجی بادشاہ ہوئے، انہوں نے بھی حاضری کی اجازت چاہی؛لیکن آپ کا جواب تھا کہ آنے کی حاجت نہیں ہے،میں غائبانہ دعا کرتا ہوں اور غائبانہ دعاء بہت مؤثر ہوتی ہے،ایک بار جب سلطان نے زیادہ اصرار کیا تو فرمایا کہ اس فقیر کے گھر میں دو دروازے ہیں،بادشاہ ایک دروازہ سے آئے تو میں دوسرے دروازے سے باہر چلا جاؤں گا (تاریخ دعوت وعزیمت: ۳؍۸۴) محمد تغلق نے شیخ نظام الدین اولیاء کے خلیفہ شیخ قطب الدین منور کو تکلیف پہنچانی چاہی؛لیکن اس پر قادر نہ ہوسکا،آخر بادشاہ نے ایک لاکھ تنکے (اس زمانہ کا چاندی کا سکہ) بھجوائے،شیخ نے قبول کرنے سے معذرت کر لی، پھر سلطان نے پچاس ہزار قبول کرنے کی خواہش کی،شیخ نے اسے بھی قبول نہ کیا،اخیر میں بات جب دو ہزار تک پہنچی تو فرمایا کہ درویش کو دو سیر چاول، دال اور ایک دان (اُس زمانہ کا کم مقدار سکہ) کا گھی کافی ہے؛لیکن اپنے مخلصین کے

کہنے پر اسے قبول کر لیا کہ کہیں بادشاہ درپئے آزار نہ ہوجائے اور اسی وقت اہلِ حاجت میں تقسیم کر دیا۔شاہ نظام الدین اولیاءؒ کے ایک راسخ العقیدہ مرید مولانا فخر الدین زرّاوی تھے،سلطان محمد تغلق جیسے ظالم بادشاہ نے جب خواہش کی کہ وہ کچھ نصیحت کریں تو مولانا نے کہا کہ غصہ دبایا کرو، بادشاہ نے پوچھا: کونسا غصہ؟ مولانا نے فرمایا: درندوں والا غصہ، جوتمہاری عادت اور طبیعت میں داخل ہے،اس سخت جملہ پر بادشاہ کوایسا غصہ آیا کہ چہرہ کا رنگ بدل گیا؛مگر کچھ کہہ نہیں پایا۔(بزمِ صوفیہ:۳۷۶)

اس کے برخلاف جن لوگوں نے اربابِ اقتدار کی قربت اختیار کی، انہوں نے زیادہ تر دین وامت کونقصان پہنچایا، ہندوستان کا مشہور بادشاہ اکبر علماء کا بڑا معتقد تھا؛لیکن مخدوم الملک ملاعبداللہ سلطان پوری اورصدر الصدور ملاعبدالنبی کی باہمی کشاکش اورحرص وجاہ کی طلب نے بادشاہ کی نظر میں ان کا مقام گرادیا تھا؛یہاں تک کہ ان حضرات نے بادشاہ کی خوشنودی کے لئے حج کے ساقط ہونے کا فتوی دے دیا، زکوۃ سے بچنے کے لئے حیلہ کو جائز قرار دے دیا، اوران کے آبائی قبرستان سے سونے سے بھرے ہوئے صندوق برآمد ہوئے، جوانہوں نے اپنی دولت کو چھپانے کے لئے دفن کررکھے تھے،ان حضرات کی آپسی لڑائی کے نتیجہ میں ملا مبارک اوران کے بیٹے فیضی اور ابوالفضل دربارِ اکبری میں شامل ہوئے، جوعلم وقابلیت کے اعتبار سے نادرۂ روزگارلوگ تھے؛لیکن دولت کی حرص اوراقتدار کی قربت نے انہیں اس مقام پر پہنچادیا کہ انہوں نے اکبرکوگمراہ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی،اوران کی مدد سے شعائر اسلام کی ایسی اہانت کی گئی کہ ہندوستان کی تاریخ میں شاید کسی غیر مسلم سے بھی ایسا نہ ہوا ہو۔

علماء چونکہ دین کے شارح بھی ہیں اورامت کے داعی و مصلح بھی؛اس لئے اگران کا کردار بے داغ نہ رہ پائے تو یہ امت کے لئے سب سے زیادہ نقصان کا باعث ہے، ماضی قریب میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دارالعلوم دیوبند اوردارالعلوم کے واسطہ سے اربابِ مدارس کے لئے جو بنیادی اصول مقرر فرمایا،ان میں سے ایک یہ ہے کہ ''حکومت سے کوئی تعاون قبول نہیں کیا جائے گا'' یادش بخیر! ہم لوگوں کی طالبِ علمی کے زمانہ میں دارالعلوم دیوبند کے لئے سابق وزیراعظم محترمہ اندرا گاندھی نے سالانہ ایک لاکھ روپیئے کی پیشکش کی تھی اور دارالعلوم کا سالانہ بجٹ بھی اس کے قریب قریب تھا؛لیکن دارالعلوم کے مہتمم حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ نے یہ کہہ کرمعذرت فرمادی کہ ہمارے بزرگوں نے اس سے منع کیا ہے، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی جنگ آزادی کے سورماؤں

میں سے تھے اور اسی جدو جہد میں انہیں مالٹا میں قید و بند کی زندگی بھی گذارنی پڑی؛ لیکن جب ملک کے آزاد ہونے کے بعد انہیں اعلیٰ ترین سرکاری اعزاز پیش کیا گیا تو انہوں نے اسے قبول کرنے سے معذرت کردی، مقصد یہ تھا کہ علماء ومشائخ اور دینی ادارے حکومتوں کے احسان سے سبکبار رہیں۔

افسوس کہ عالم اسلام ہو یا ہمارا ملک، علماء و مدارس کا یہ کردار بتدریج ختم ہوتا جارہا ہے، ان کا ایک طبقہ ایوان اقتدار تک رسائی کے لئے کوشاں ہوتا ہے، اگر اپنی طاقت کے بل پر وہ سیاست میں حصہ لیں تو اور بات ہے؛ لیکن یہ کوشش اس کے باوجود ہوتی ہے کہ وہ ایک سیکولر جماعت کا حصہ ہیں اور انہیں معلوم ہے کہ انہیں اپنے ضمیر کی آواز کو پارٹی کی پالیسی کے سامنے دبانا ہوگا، سیاسی لوگوں کی طرح وہ بھی اس بات کے لئے کوشاں رہتے ہیں کہ حکومت انہیں کسی عہدہ پر نامزد کردے، ایسے حالات میں علماء اور مشائخ کے لئے امت کے دوسرے اہل افراد کو آگے بڑھانا اور خود ان کی رہنمائی کرنا زیادہ مفید ہوسکتا ہے، خانقاہوں کا امتیاز استغناء تھا؛ لیکن اب بعض اوقات حکومت وقت کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے میں ان کا قدم دوسروں سے آگے ہوجاتا ہے، جن ریاستوں میں دینی مدارس نے حکومت سے الحاق کو قبول کیا ہے، ان اداروں کی صورتحال روزِ روشن کی طرح واضح ہے، حاضری کا غلط اندراج، جو طلبہ داخل نہیں ہیں امتحان دلانے کے لئے ان کی حاضری کی خانہ پری، امتحان کے درمیان چوری اور ممتحن سے نمبرات بڑھوانے کی کوشش، ڈیوٹی نہ کرنے کے باوجود تنخواہوں کا حصول، اور پھر ان کاموں کے لئے جھوٹ، دھوکہ اور رشوت کا لین دین، کون سی برائی ہے جو عملاً چند اداروں کو مستثنیٰ کرکے اس نظام میں موجود نہیں ہے؟ اور اب تو ائمہ مساجد بھی حکومت سے تنخواہیں حاصل کرنے کے لئے بے قرار ہیں، کیا ایسے علماء وائمہ اور مدارس ومساجد سے اس بات کی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اس ملک میں اسلام کا بقا اور تحفظ کا فریضہ انجام دیں گے اور ملی مفادات کے لئے بہ وقت ضرورت حکومتوں کے مقابلہ سینہ سپر ہوجائیں گے؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس طرح کچھ مسلمانوں کو روزگار حاصل ہوجاتا ہے؛ لیکن سوال یہ ہے کہ مدارس کا مقصد کیا ہے؟ دوسری تعلیم گاہوں کی طرح بہتر روزگار کی فراہمی یا اسلام کی حفاظت واشاعت؟ یہ ایک نبوی مشن کا حصہ ہیں یا دوسرے اداروں کی طرح صرف کسبِ معاش کی مشین ہیں؟؟

یہی صورتِ حال عالمِ اسلام میں دیکھنے کو ملتی ہے، مصر میں پچاس سال سے زیادہ ملحد اور بے

دین طبقہ برسر اقتدار رہا اور اب بھی ہے؛ لیکن جامع ازہر جیسے باوقار ادارہ کے سربراہ اعلیٰ حکومت کے ہر فیصلہ پر مہر تصدیق ثبت کرتے رہے، ابھی چند دنوں پہلے وہاں کے سابق مفتی اعظم نے فتوی دے دیا کہ فوجی بغاوت کے خلاف جو شخص احتجاج کرے، وہ قتل کئے جانے کا مستحق ہے، شام کے مفتی اعظم بھی اب تک بشار الاَسد کے حق میں فتوی دیتے رہے ہیں، یہی حال کم وبیش دوسرے مسلم اور خاص کر عرب ملکوں کا رہا ہے کہ سرکاری طور پر جن لوگوں کو فتویٰ دینے کی خدمت سپرد کی جاتی ہے، انہیں حکومت کی موافقت ہی میں فتوی دینا پڑتا ہے، اور گورنمنٹ کے چشم وابرو کے اشارہ پر کام کرنا ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ ارباب اقتدار سے قربت کا نتیجہ ہے!

اس لئے یہ پہلو ایک لمحۂ فکر یہ ہے کہ علماء، مشائخ، مذہبی قائدین اور مذہبی اداروں کو کس طرح حکومت کے اثر سے محفوظ رکھا جائے اور انہیں یہ بات سمجھائی جائے کہ وہ عام لوگوں کی طرح نہیں ہیں، وہ مسلمانوں کے لئے قبلہ نما کا درجہ رکھتے ہیں، وہ راہ رو نہیں ہیں، وہ مشعل راہ ہیں، اگر وہ حکومتوں کی زلفوں کے اسیر ہو جائیں، اور متاعِ دنیا کے حاصل کرنے کی دوڑ میں جا پڑیں تو یہ ان کے بنیادی مقصد سے بے وفائی اور اپنے خالق سے اور امتِ مسلمہ سے بدعہدی کے مترادف ہوگا، خاص کر ہندوستان جیسے ملک میں پوری گہرائی کے ساتھ اس پر غور کرنا ضروری ہے اور وقت کا تقاضا ہے، ورنہ—— ہزار بار خدا نخواستہ—— اسلام کی حفاظت کا یہ آخری قلعہ بھی اپنے مقصد میں ناکام ہو کر رہ جائے گا۔ وباللہ التوفیق۔

علماء واہل دین کے لئے لمحۂ فکریہ!

(مذہبی طبقہ کو لالچ دینے کی کوشش)

اگر ہم گذشتہ چند صدیوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ صلیبی جنگوں کے خاتمہ کے بعد ایک دور ایسا گذرا، جب عیسائی دنیا پستی اور تنزلی کے دلدل میں پھنسی رہی، پھر جب اس وقت کی ترقی یافتہ قوم امت مسلمہ سے علم کی روشنی اسپین کے راستہ یورپ تک پہنچی تو مغرب نے ایک نئی کروٹ لی اور اس کی بیداری صنعتی ترقی کے اس عظیم واقعہ کی شکل میں ظاہر ہوئی، جس کا تسلسل اب تک جاری ہے، مغرب کی مادی اور علمی ترقی نئی نئی منزلین فتح کررہی ہے اور مسلسل آگے کی طرف جاری ہے اور مسلمانوں کے ادبی اور علمی زوال کی داستان بھی دراز سے دراز تر ہوتی جارہی ہے، اس ترقی کا سہارا لے کر ایک نئی صلیبی جنگ استعماریت کی شکل میں شروع ہوئی، جس نے ایشیا وافریقہ اور خاص کر عالم اسلام کے بڑے حصے کو فتح کرتے ہوئے اسے اپنی نوآبادی بنالیا، یہ استعماریت آخر اس وقت تک جاری رہی، جب تک خلافت عثمانیہ کا سقوط نہ ہوگیا اور عالم اسلام کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کامیاب نہ ہوگئی۔

اس کے بعد آہستہ آہستہ مسلم ممالک کو آزادی نصیب ہوئی؛ لیکن اکثر و بیشتر یہ نام نہاد آزادی تھی، ان کے گلے میں غلامی کا ایسا طوق پہنایا گیا، جو آنکھوں کو نظر نہ آئے؛ لیکن وہ صرف جسم ہی کی غلامی نہ ہو؛ بلکہ دل ودماغ کی بھی غلامی ہو، جس میں ایک قوم خود اپنے بارے میں فیصلہ کرتی ہوئی نظر آئے؛ لیکن اس کی حیثیت اس جہاز کی ہو جسے ریموٹ کے ذریعہ کنٹرول کیا جاتا ہے، اسی دور میں کارل مارکس نے کمیونزم کا صور پھونکا اور دنیا کے دو بڑے ممالک — روس، چین — اس نئے فلسفۂ حیات اور نظام معیشت پر ایمان لے آئے، کمیونزم سرمایہ داری کے خلاف اعلان جنگ تھا، اب دنیا میں فکری اعتبار سے تین فریق بن گئے، مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام، مشرق کا اشتراکی نظام اور اسلام، اگرچہ ان دونوں نظام ہائے حیات کو اسلام سے بغض تھا؛ لیکن چوں کہ عالم اسلام اپنی پستی اور کمزوری کی وجہ سے کمزور دشمن شمار کیا جاتا تھا؛ اس لیے اصل سرد جنگ مغربی قوتوں اور اشتراکیت کے حامل مشرقی

ملکوں کے درمیان قائم رہی،اس سے ایک توازن قائم تھا،بغض وعناد رکھنے کے باوجود یہ دونوں بڑی طاقتیں مسلم ملکوں کواپنا ہم نوا رکھنا چاہتی تھیں،اور چوں کہ سرمایہ دارانہ نظام کے حامل مما لک مذہب کی بالکل نفی نہیں کرتے تھے؛اس لیے کمیونسٹ ملکوں کے مقابلہ میں عالم اسلام اور مسلمان مغربی قوتوں سے زیادہ قریب رہے،مغربی اقوام نے بھی یہ رویہ رکھا کہ وہ علی الاعلان کمیونزم کے خلاف تو بولتے تھے اور اپنے ذرائع ابلاغ کو بھی ان کے خلاف خوب خوب استعمال کرتے تھے؛لیکن اسلام اور مسلمانوں کو براہ راست نشانہ بنانے میں کسی قدر رعایت سے کام لیتے تھے۔

کمیونزم کی بنیاد ایسے اصولوں پر تھی، جو پوری طرح فطرت سے متصادم تھے؛اس لیے صرف ستر سال کے اندر ہی اس کی جائے پیدائش ہی اس کا مدفن بن گیا، اس نظام کا سب سے بڑا نمائندہ ملک اور دوسری سوپر طاقت ''روس'' خود اپنی وحدت کو بچا نہیں سکا اور اس کے ٹکرے ہوگئے،اب دنیا میں دو ہی تصورات باقی رہ گئے،ایک اسلام،دوسرے مغربی تہذیب اور مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام،دشمن کا مقابلہ کرنے اور کسی فکر کے تحفظ میں دوطرح کے لوگوں کا اہم کردار ہوتا ہے،ایک: حکومتوں کا،جن کے پاس فوجی طاقت ہوتی ہے،جن کے پاس مادی وسائل ہوتے ہے، جو زر وزمین کی مالک ہوتی ہیں، جوٹکنالوجی کی حامل ہوتی ہیں،اس کو وجود میں لانے اور ترقی دینے کا کام انجام دیتی ہے اور اس کے لیے وسائل فراہم کرتی ہیں،دوسرے: وہ لوگ جو اس فکر کے ترجمان اور اس کے شارح ہوتے ہیں، جو فکری اعتبار سے اس کا دفاع کرتے ہیں، جو اپنی زبان اور قلم کے ذریعہ عوام کو اس سے وابستہ رکھتے ہیں،کسی بھی فکر کے بقا اور کسی بھی نظام کے دوام واستحکام کے لئے ان دونوں طبقوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے،ایک کے پاس فولاد کی طاقت ہوتی ہے،دوسرے کے پاس علم کا ہتھیار ہوتا ہے،ایک نوک شمشیر سے میدان سر کرتا ہے،دوسرا زبان وقلم سے،ایک زمین کو فتح کرتا ہے اور دوسرا دل ودماغ کو۔

چنانچہ اب مشرق ومغرب کی پوری طاقت اسلام،مسلمان اور عالم اسلام کی طرف متوجہ ہے،مسلم حکومتوں کو زیر کرنے میں انھیں کچھ زیادہ دشواری پیش نہیں آئی؛ کیوں کہ خلافت عثمانیہ کے ختم ہونے کے بعد پورے عالم اسلام میں کوئی ایسی طاقت باقی نہیں رہی، جو مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے،ان کو مزید کمزور کرنے کے لئے،دو خصوصی تدبیریں اختیار کی گئیں،ایک

یہ کہ ان کے زیارہ سے زیادہ ٹکرے کردیے گئے، اتنے چھوٹے چھوٹے مما لک بنادیے گئے کہ بعض شہر بھی ان میں سے بعض ملکوں سے بڑے ہوں گے، اس طرح ان کی طاقت ٹوٹ گئی، قدرتی وسائل بٹ گئے، افرادی وسائل کم ہوگئے اور یہ بھی کوشش کی گئی کہ ان ملکوں کو پروانہ آزادی دیتے ہوئے سرحدوں کا اختلاف باقی رکھا جائے، اس اختلاف کے ذریعہ ان کے درمیان نفرت کی بیج بوئی گئی اور اسے مسلسل پروان چڑھایا گیا، آج اکثر مسلم مما لک کی یہی صورت حال ہے، سعودی عرب اور کویت اور سعودی عرب اور یمن کے درمیان سرحد کا اختلاف موجود ہے، قطر اور بحرین کے درمیان جھگڑا ہے، کویت کو عراق سے اور متحدہ عرب امارات کی ایران سے لڑائی ہے، مصر اور سوڈان کے درمیان اختلاف ہے، خود سوڈان میں عرب اور غیر عرب قبائل کے درمیان نزاع ہے، فلسطین کی چھوٹی سی نامکمل حکومت کے دو حصے بنے ہوئے ہیں، شام اور ترکی کو ایک دوسرے سے بغض ہے، کرد، عراق، ترکی اور شام سے نبرد آزما ہے، پاکستان اور افغانستان کے درمیان کدورتیں ہیں، بنگلہ دیش میں حکومت اور اپوزیشن کے درمیان معرکۂ کارزار گرم ہے، غرض شرق بعید کے دو تین مسلم ملکوں کو چھوڑ کر تمام ہی مسلم مما لک اپنے مسلمان پڑوسی ملکوں سے یا ملک کے اندر دو طبقے ایک دوسرے سے برسر جنگ ہیں۔

دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ مسلم مما لک کو حقیقی جمہوریت سے دور رکھا گیا؛ تاکہ وہاں ایسے لوگ نہ آجائیں، جو اسلام پسند ہوں اور مغربی تہذیب کے مقابلہ شریعت اسلامی کو نافذ کرنا چاہتے ہوں؛ اسی لئے انگلی پر گنے جانے والے تین چار مسلم مما لک کو چھوڑ کر تمام ملکوں میں دو طرح کے حکمراں تخت اقتدار پر مسلط ہیں، ایک وہ جو خاندانی بادشاہت کے نمائندہ ہیں، وہاں ایک خاندان کو ملک کے عوام اور اس کے وسائل کا مالک سمجھا جاتا ہے، وہ پیدائشی طور پر حکمراں ہوتا ہے، اس کی زبان قانون ہوتی ہے، عوام کی نہ حکومت میں شرکت ہوتی ہے اور نہ ان کی رائے کو کوئی اہمیت دی جاتی ہے، ہاں، اگر اس حکمراں کے اندر ذاتی طور پر اللہ کا خوف، دین کی عظمت اور اپنے عوام کی محبت ہے تو اس کا رویہ بہتر ہوتا ہے؛ لیکن چوں کہ یہ کسی نظام کا نتیجہ نہیں ہے؛ بلکہ ایک شخص کے انفرادی اخلاق و اوصاف کا اثر ہے؛ اس لئے اس میں دوام و استمرار باقی نہیں رہتا —— دوسرے قسم کے مما لک وہ ہیں، جہاں کسی فوجی جنرل نے اقتدار پر قبضہ کیا، پھر وہ ڈکٹیٹر بن گیا اور اس کے بعد یہ ڈکٹیٹر شپ اس کی نسلوں میں منتقل ہوتی رہی، عوام کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ جمہوری طور پر ان سے نجات پاسکیں، ان کے لئے

نجات کی دو ہی صورتیں ہیں: یا تو کوئی فوجی یا ظلم وستم سے عاجز شخص تشدد کے ذریعہ اس کا خاتمہ کردے، یا اللہ تعالیٰ اس کو اٹھالے، ان ملکوں کا حال بھی پہلی قسم کے ملکوں سے مختلف نہیں؛ بلکہ زیادہ بُرا ہے، ان دونوں کی طرح کی حکومتوں میں مغربی طاقتوں نے اپنی سازشوں کے ذریعہ اس بات کی کامیاب کوشش کی ہے کہ یہ اصحاب اقتدار ان کا کھلونا بن کر رہیں، وہ نام کے مسلمان ہوں؛ لیکن پوری طرح مغربی افکار، مغربی تہذیب اور مغربی طرز حیات کے نمائندہ ہوں، ان کی زبان حق بولنے سے خاموش رہے، اس کو ٹکنالوجی سے محروم رکھ کر بنا بنایا سامان فراہم کیا جائے، ان کے وسائل سے بھر پور فائدہ اٹھایا جائے اور پھر قرض دے کر ان پر احسان جتایا جائے، ان کے ذریعہ عوام پر ظلم وستم کئے جائیں، جو لوگ اسلامی اور شریعت اسلام کا نام لیتے ہیں، انہیں دبایا جائے اور شرمناک سزائیں دی جائیں، وہ اپنی عوام کے مالک ومختار ہوں اور مغربی آقاؤں کے غلام، آج کم وبیش پورا عالم اسلام اسی صورت حال سے دوچار ہے۔

اس طویل عرصے میں مغرب کی مسلسل سازشوں اور ستم انگیزیوں کے باوجود مسلم ممالک میں بھی اور مسلم اقلیتی ممالک میں بھی جن لوگوں نے ملت اسلامیہ کو اسلام سے جوڑے رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے اور ان کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت کی آگ کو بجھنے سے بچایا ہے، وہ وہی طبقہ ہے جو زبان وقلم کے ذریعہ اسلامی افکار کی ترجمانی کرتا ہے اور اخلاق ومحبت کی تلوار سے لوگوں کے دلوں کو فتح کرتا ہے، یہ طبقہ علماء اور دینی تحریکات کا ہے، مغرب کے استعماری دور میں ہی مسلمانوں میں اسلامی تحریکات وجود میں آنے لگیں اور انہیں فروغ حاصل ہوتا رہا، ان تحریکات کو فکر کا سرمایہ فراہم کرنے والا طبقہ علماء کا ہے، خلافت کے خاتمہ کے بعد کسی سرکاری اعانت کے بغیر اس طبقہ نے مسلمانوں کا دین سے رشتہ استوار کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے، وہ نقش لازوال ہے، ورنہ نہ معلوم کتنے مسلمان ارتداد کا شکار ہو چکے ہوتے، دہریت اور الحاد پورے پورے ملک کو اپنے قبضہ میں لے لیتی، اسلامی شعائر کے بارے میں مسلمانوں کی دینی غیرت ختم ہو چکی ہوتی اور شریعت اسلامی سے ان کا رشتہ پوری طرح ٹوٹ چکا ہوتا، جیسے عیسائی معاشرہ میں کچھ لوگ اتوار کو چرچ چلے جاتے ہیں اور جیسے ہندو سماج میں کچھ افراد مندروں میں پہنچ کر نذر ونیاز پیش کر دیتے ہیں اور کچھ خاص خاص تہواروں کو دھوم دھام سے انجام دے لیتے ہیں، یہی حال مسلمانوں کا ہو گیا ہوتا؛ کہ ان میں جو لوگ مذہبی ہوتے وہ جمعہ اور

عیدین میں شرکت کر لیتے اور کبھی کبھار مسجد چلے جاتے، ان کی عائلی زندگی، ان کی معیشت اور زندگی کے دوسرے مسائل میں شریعت کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

علماء نے ہمیشہ اپنی بساط بھر امت مسلمہ کو دین سے جوڑے رکھنے اور اسلام کو اللہ کی زمین پر نافذ کرنے کی کوشش کی؛ چوں کہ ان کی یہ کوشش حکمراں طبقہ کے عیش وعشرت کے منصوبوں میں خلل انداز ہوتی تھی؛ اس لئے زیادہ تر وہ اپنے اپنے عہد کے حکمرانوں کے معتوب ہی بنے رہے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے تو قرنِ اول میں نذرانۂ شہادت پیش کر دیا تھا، امام ابوحنیفہؒ کو بنو امیہ اور بنو عباس دونوں زمانوں میں حکمراں شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے، دونوں حکومتوں میں انہیں کوڑوں سے مارا گیا، قید کی سزا سے بھی دو چار ہوئے، یہاں تک کہ زہر کا پیالہ پلا کر انہیں شہید کیا گیا، امام مالکؒ کو عباسی حکمراں منصور کے زمانے میں ستر (۷۰) کوڑے لگائے گئے اور اس طرح ان کی مشکیں کسی گئیں کہ ہاتھ بازو سے اکھڑ گئے، امام احمد بن حنبلؒ عباسی حکمراں مامون، معتصم اور واثق تینوں کے زمانہ میں ایسی شدید آزمائش سے گذرے کہ تاریخ عزیمت میں شاید اس کی مثال مل سکے، جس شخص نے امام احمدؒ پر کوڑے برسائے خود اس کا بیان ہے کہ میں نے امام احمدؒ پر اس سختی کے ساتھ اسی (۸۰) کوڑے برسائے کہ اگر اس طاقت کے ساتھ میں ہاتھی پر کوڑوں کی بارش کرتا تو وہ بھی چیخ اٹھتا اور یہ بارش مدتوں امام احمد بن حنبل پر ہوتی رہی؛ لیکن پائے استقامت میں کوئی تزلزل نہیں آیا، امام بخاریؒ کا آخری زمانہ اس حال میں گذرا کہ زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو چکی تھی، سعید بن جبیرؒ کو اس طرح ذبح کر دیا گیا جیسے جانور کو ذبح کیا جاتا ہے؛ لیکن حجاج بن یوسف کا جبر وظلم ان کو ذرا بھی خوفزدہ نہ کر سکا، ابن السکیت کی حق گوئی پر عباسی خلیفہ متوکل نے ان کی زبان کھینچوالی اور زبان کے ساتھ ساتھ ان کی روح بھی پرواز کر گئی، خود ہندوستان میں راہِ عزیمت میں علماء کی استقامت کی ایک وسیع تاریخ رہی ہے، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے اکبر کی دین بے زاری کے خلاف علم اصلاح بلند کیا اور پھر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ گوالیار میں قید وبند کی صعوبتیں بھی اٹھائیں، مغل حکمرانوں کے دور میں مختلف علماء ومشائخ حق گوئی کے جرم میں شہید کر دئے گئے، کسی کو قتل کر دیا گیا، کسی کو ہاتھی کے قدموں تلے روند دیا گیا، کسی کو دیوار میں چن دیا گیا اور کوئی جلا وطن کر دیا گیا، ہندوستان کی جنگِ آزادی —— جس میں علماء نے اسلام کی حفاظت کے لئے حصہ لیا —— میں بے شمار

علماء شہید کردئے گئے، دلی کے مضافات میں ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں سرراہ درختوں پر پھانسی دے دے کر عبرت کے لئے علماء واہل دین کی لاشیں لٹکا کر رکھی گئیں، سید احمد شہید کی تحریک میں شامل کتنے ہی علماء صادق پورنے جام شہادت نوش کیا اوران کے گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، شاملی میں بڑے بڑے علماء نے سر بہ کف ہوکر برطانوی فوج کا مقابلہ کیا؛ لیکن کوئی چیز ان کی ثابت قدمی کومتأثر نہیں کرسکی۔

آزمائش کا ایک دوسرا رنگ بھی ہوتا ہے اور وہ ہے مال ومتاع کی لالچ دے کر کسی کو اس کی فکر سے ہٹادینا اوراس کو اس کے مشن سے روک دینا، امام احمد بن حنبل کے بارے میں منقول ہے کہ عباسی حکمراں متوکل نے جب پچھلے مظالم کی تلافی کے لئے امام احمد کے پاس ۲۰؍ ہزار سکے بھیجے اور ایک دوسرے موقع پر ایک لاکھ درہم بھیجے تو امام احمد نے معذرت کردی اور فرمایا کہ یہ آزمائش اس آزمائش سے بڑھ کر ہے: "**هذا أمر أصعب عليّ من ذلك، ذلك فتنة الدين وهذا فتنة الدنيا**" محدثین وفقہاء ہوں یا اکابر صوفیاء جیسے خواجہ حسن بصری، شیخ عبدالقادر جیلانی، مشائخ ہند میں خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، خواجہ فریدالدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیاء، شیخ شرف الدین یحیٰ منیری – رحمہم اللہ – وغیرہ ان سب کے حالات دیکھئے، یہ بادشاہوں اور حکمرانوں سے اوران کی طرف سے ملنے والے مناصب اور نذرانوں سے اس طرح بھاگتے تھے، جیسے انسان آگ سے بھاگتا ہے۔

موجودہ حالات میں مغربی طاقتوں کی کوشش یہ ہے کہ کسی طوراس طبقہ کی لگام کسی جائے، انہیں حق گوئی سے باز رکھا جائے، غلط تاویل اور جھوٹی توجیہ کے ذریعہ مغربی افکار اور لادینی تہذیب پر ان سے مہر لگوائی جائے، اور یہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے، ہلاکو خان نے جب بغداد کو پوری طرح قابو میں کرلیا تو اس نے اس زمانے کے بعض نام نہاد ضمیر فروش علماء سے یہ فتوی صادر کرانے میں کامیابی حاصل کرلی کہ 'عادل کافر بادشاہ' ظالم مسلمان بادشاہ سے بہتر ہے اوراس غلط فتوی کو اس نے اپنے لئے مہر تصدیق بنایا، مغرب نے اپنی اس سوچ کو روبہ عمل لانے کے لئے دوطریقۂ کار اختیار کئے، ایک طریقہ ان ملکوں میں جہاں مسلمان حکمراں ہیں یا جہاں آمرانہ نظام ہے، وہاں ظلم اور دباؤ کا ہتھیار استعمال کیا جاتا ہے اور حسبِ ضرورت کچھ ترغیب وتحریص کا، اِس وقت اس کی زندہ مثال عرب ممالک ہیں، خاص کر مصر،

جہاں شیخ الازہر اور مفتی اعظم سے مغرب کے منشا کے مطابق بیانات دلوائے جاتے ہیں، جہاں مساجد سے ان ائمہ کو معزول کردیا گیا ہے، جو حقیقت میں اسلامی فکر کے ترجمان ہیں اور ایسے لوگوں کو اس اہم ذمہ داری پر فائز کیا گیا ہے، جن کو اس عہد کا 'منافق' کہا جاسکتا ہے، ان سے کس طرح کا کام لیا جارہا ہے اور لیا جانے والا ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہاں ائمہ مساجد کے لئے جو تربیتی ورکشاپ رکھے جارہے ہیں، ان میں انہیں ترغیب دی جارہی ہے کہ وہ عوام کو بتائیں کہ اسرائیل ہمارا پڑوسی ہے اور پڑوسی کے بڑے حقوق ہوتے ہیں، چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم، اور چاہے اس کا سلوک اچھا ہو یا بُرا؛ اس لئے اسرائیل جو بھی کرے؛ لیکن ہمیں پڑوسی ہونے کی حیثیت سے اس کے ساتھ بہتر سلوک کرنا چاہئے۔

جو جمہوری ممالک ہیں، جہاں دستوری طور پر کسی کو اپنے ضمیر کے خلاف مجبور نہیں کیا جاسکتا، وہاں مال ومتاع اور عہدہ ومنصب کی لالچ دے کر زبان وقلم پر مہر لگانے کی کوشش کی جارہی ہے، ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے اور یقیناً جمہوریت ایک نعمت ہے، نیز مسلم آبادی کے اعتبار سے دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے، اور اس ملک کی خصوصیت علماء ومشائخ، دینی جماعتوں، تحریکوں اور تنظیموں، نیز دینی تعلیمی اداروں کی کثرت ہے؛ اس لئے یہاں ایک طرف دباؤ کی پالیسی اختیار کی جارہی ہے، مدارس، ان کے طلبہ وفضلاء، دینی تحریکوں سے وابستہ نوجوانوں اور مذہبی شخصیتوں پر انتہا پسندی، بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے الزامات لگائے جارہے ہیں اور دوسری طرف ان کے سامنے متاعِ مال وزر کی پیش کش بھی کی جاری ہے، کبھی کہا جاتا ہے کہ حکومت ائمہ مساجد کو معقول تنخواہیں دے گی، مساجد حکومت کے یہاں اپنا رجسٹریشن کرالیں، کبھی مدارس کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ گورنمنٹ کے قائم کئے ہوئے بورڈ میں شامل ہوجائیں، اس طرح اساتذہ کو اونچی تنخواہیں فراہم کی جائیں گی، کبھی حکومت کے غیر اہم مناصب دے کر تالیف قلب کی جاتی ہے، بہ حیثیت مجموعی ان تمام کوششوں کا بنیادی مقصد اس طبقہ کی زبان کو بند کرنا اور ان کی جد وجہد کو محدود کرنا ہے، جن کا بنیادی مشن اسلام کی اشاعت وحفاظت ہے اور یہ سب کچھ صرف حکومتِ ہند کا منصوبہ نہیں ہے؛ بلکہ یہ ایک عالمی منصوبہ ہے جس کے تانے بانے امریکہ اور اسرائیل میں بنے گئے ہیں۔

یہ حالات علماء ومشائخ، دینی مدارس وجامعات اور دینی جماعتوں سے وابستہ حضرات کے لئے

لمحۂ فکر یہ ہیں کہ کیا ان کا مقصد زندگی صرف روٹی کے ٹکڑے حاصل کرنا ہے، جس طور پر بھی حاصل ہوجائیں، یا وہ اس سے اعلیٰ وارفع مقصد کے لئے کام کررہے ہیں، وہ انبیاء کے وارث ہیں، جو اجرت کے لئے نہیں، اجر کے لئے کام کرتے تھے، وہ اس کائنات میں خدائی مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں یا مادیت کے پرستار، یہ وقت ہے کہ علماء سر جوڑ کر بیٹھیں، اس مسئلہ پر غور کریں، اپنے سلف کے راستہ پر خود کو ثابت قدم رکھیں، دین کے فروغ کو اپنی متاع حیات بنانے کا عہد کریں اور اس بات کا عزم مصمم کریں کہ نہ فولاد وآہن کی طاقت اظہار حق کے معاملہ میں انہیں خوف زدہ کرسکے گی اور نہ سیم وزر کی لالچ انہیں اپنا اسیر بنا سکے گی کہ بہ حیثیت مسلمان ہمارا جینا اور مرنا سب اللہ کے لئے ہے:

﴿اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

❁

آ، تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے؟

(مسلمان فرماں رواؤں کی عیش پرستی)

رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں اعداء اسلام کے ساتھ جو معرکہ آرائیاں ہوئیں، ان میں غالباً سب سے سخت معرکہ 'غزوۂ احزاب' کا تھا، اس غزوہ میں تمام اسلام دشمن طاقتیں یکجا ہوگئی تھیں، اس میں مکہ کے مشرکین بھی تھے، قبیلۂ بنوغطفان کے جاں باز بھی ان کے دوش بدوش تھے اور مسلمانوں کے بغلی دشمن یہود بھی اس نازک وقت میں کھل کر مسلمانوں کی مخالفت میں سرگرم ہو گئے تھے، اس طرح بیس ہزار کا لشکر جرار مدینہ کی اس مختصر آبادی کا محاصرہ کئے ہوا تھا، جو محض دوڈھائی ہزار نفوس پر مشتمل تھی، یہ بڑا نازک وقت تھا؛ اسی لئے مسلمانوں نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے ایرانیوں کے طریقۂ جنگ کے مطابق ایک گہری اور وسیع خندق کھودی، سامنے کی طرف سے یہ خندق تھی اور پشت کی طرف سے پہاڑ تھے؛ تاکہ دشمن مسلمانوں تک پہنچ نہ سکیں، تقریباً بیس دنوں مسلمان محاصرہ کی حالت میں رہے۔

جنگ کے موقع پر یہ بات ضروری ہوتی ہے کہ فوجیوں کو غذائی رسد اور ضروری سہولتیں حاصل رہیں، تبھی وہ پوری قوت اور جوش وولولہ کے ساتھ حملہ کر سکتے ہیں اور اپنے دفاع کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں؛ لیکن صورت حال یہ تھی کہ یخ بستہ کر دینے والی ٹھنڈک اور اس کے ساتھ ساتھ غذا کی نہایت قلت تھی، غذائی صورت حال یہ تھی کہ راوی نقل کرتے ہیں:

”یؤتون بِملإ کفی مِن الشعیرِ فیصنع لهم بإ □ ِهالة سنِخة توضع بین یدی القومِ والقوم جِیاع وهِی بشِعة فِی الحلقِ ولها رِیح منتِن“ (صحیح البخاری، کتاب المغازي، باب غزوة الخندق وهو الأحزاب، حدیث نمبر:۳۷۹۱)

”صحابہ کے پاس دو مٹھی جولایا جاتا، مزہ اتری ہوئی بدبودار چربی کے ساتھ اس کو ان کے لئے پکایا جاتا، جو لوگوں کے سامنے رکھ دیا جاتا، درانحالیکہ وہ بھوکے ہوتے“

مگر کیا مجال تھی کہ کبھی زبان پر شکوہ آئے، احتجاج ہو، یا بطور الحاح والتجاء ہی رسول اللہ ﷺ کے

سامنے عرض مدعا کیا جائے، وہ ہمیشہ صبر وقناعت کا پیکر بن کر رہتے اور ہر حال میں ان کی زبان اللہ تعالیٰ کے شکر وسپاس سے تر رہتی، معمولی ہتھیاروں سے چٹان کے پتھروں کو توڑنا اور خشک پتھریلی زمینوں کو کھودنا آسان بات نہیں تھی؛ لیکن صحابہ کا حال یہ تھا کہ پورے جوش وخروش کے ساتھ اپنا کام کئے جاتے، سخت جسمانی کام کرتے ہوئے، بعض اوقات لوگ نعرہ لگاتے اور نغمے گاتے ہیں، یہ بات ان کے لئے کام کو آسان بناتی ہے اور ان میں نیا جوش وولولہ بھر دیتی ہے، عربوں کے یہاں بھی اس کا رواج تھا، چنانچہ صحابہ اس موقع سے حوصلہ بڑھانے والے اشعار پڑھتے، ان اشعار کے لفظ لفظ سے رسول اللہ ﷺ سے ان کا عشق، اللہ کی قدرت پر بے پایاں یقین اور اللہ کے فیصلوں پر راضی رہنے کا جذبہ اور صبر وقناعت کا عزم مصمم ظاہر ہوتا ہے، آپ بھی ان ایمان افروز اشعار کو پڑھئے جن کو امام بخاریؒ نے اپنے مجموعۂ حدیث میں نقل کیا ہے:

نحن الذين بايعوا محمدا
على الجهاد ما بقينا أبدا

(صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب التحریض علی القتال، حدیث نمبر: ۲۸۴۳)

''جب تک ہم زندہ رہیں گے اس وقت تک کے لئے ہم نے محمد (ﷺ) کے ہاتھ پر بیعت کی''

والله لو لا الله ما اهتدينا
ولا تصدقنا ولا صلينا
فأنزلن سكينة علينا
وثبت الأقدام إن لا قينا
إن الألى قد بغوا علينا
إذا أرادوا فتنة أبينا

(حوالہ سابق، حدیث نمبر: ۴۱۰۴)

''خدا کی قسم! اگر اللہ ہمیں ہدایت سے نہ نوازتے تو ہم ہدایت نہیں پاتے اور نہ صدقہ دیتے اور نہ نماز پڑھتے، پس خداوندا! ہم پر سکینہ نازل فرمایئے اور جب ہمارا مقابلہ دشمن سے ہو تو ہمیں ثابت قدم رکھئے، ان لوگوں نے ہمارے خلاف زیادتی کی ہے،

جب انہوں نے فتنہ پیدا کرنا چاہا تو ہم نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا''۔

ایک طرف آپ ﷺ کے رفقاء پر فقر وفاقہ کی آزمائش ہے، دوسری طرف یہ جذبۂ سرفروشی اور جانبازی و جان نثاری بھی دوش بدوش ہے، اسی ماحول میں اسلام کا سورج جزیرۃ العرب کے افق پر طلوع ہوا، وہ بلندی کا سفر طے کرتا گیا، یہاں تک کہ اس کی کرنیں مشرق سے مغرب تک پھیل گئیں، اس پر ایمان لانے والوں کے ایک ہاتھ میں فولاد کی تلوار ہوتی تھی اور دوسرے ہاتھ میں اخلاق کی تلوار، ان کی زندگی میں اتنی سادگی اور قناعت تھی کہ انہیں متاعِ سیم وزر کی طرف دوڑنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، دنیا کے لوگ مال و دولت کے انبار کے ذریعہ اپنی شان وشوکت کے مصنوعی محل کھڑا کرتے ہیں؛ مگر ان کا رعب وجلال ان کی فقر ودرویشی میں پنہاں تھا، بڑے بڑے بادشاہوں کو ان سے گفتگو کا یارانہ ہوتا تھا؛ اسی لئے رسول اللہ ﷺ کو یہ خوف دامن گیر نہیں تھا کہ میری امت معاشی اعتبار سے پسماندہ ہوجائے گی اور اس فقر وپسماندگی کی وجہ سے اسے ذلت ورسوائی سے دوچار ہونا پڑے گا؛ بلکہ آپ کو ڈر اس بات کا تھا کہ یہ امت جدوجہد کے جذبہ سے محروم ہوکر عیش وعشرت میں مبتلا نہ ہوجائے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''خدا کی قسم! مجھے تم پر فقر ومحتاجی کا خوف نہیں ہے؛ لیکن میں تم پر جس بات کے بارے میں ڈرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ تم پر دنیا کی نعمتیں بچھادی جائیں گی، جیسے تم سے پہلوں کے لئے بچھادی گئی تھیں، پھر پچھلی قوموں کی طرح تم دنیا کے سلسلہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگو گے اور جیسے دنیا کی حرص نے انہیں غفلت اور لہولعب میں مبتلا کر دیا تھا، کہیں تم کو بھی غفلت ولہوولعب میں مبتلا نہ کر دے''
>
> **(بخاری، باب مایحذر من زھرۃ الدنیا والتنافس بھا، حدیث نمبر: ۶۴۲۵)**
>
> ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:
>
> ''مجھے اپنے بعد تمہارے شرک میں مبتلا ہوجانے کا اندیشہ نہیں؛ لیکن اس بات کا ڈر ہے کہ دنیا کی دولت میں تم ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کرو گے''
>
> (دیکھئے: بخاری، حدیث نمبر: ۶۴۲۵)

رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کی روشنی میں آج عمومی طور پر مسلمانوں کا اور خاص طور پر مسلمان

حکمرانوں کا حال دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اپنی امت کے بارے میں جس چیز سے ڈرتے تھے، آج امت مسلمہ عملی طور پر اسی مرض میں مبتلا ہے، گذشتہ ماہ ڈیڑھ ماہ سے عالم عرب میں آزادی اور جمہوریت کی جو لہر اٹھی ہے، اس نے زور زبردستی سے برسر اقتدار رہنے والے فرماں رواؤں کی نیند تو حرام کرہی دی ہے، ساتھ ہی ساتھ بعض ایسے واقعات سے بھی پردہ اٹھ رہا ہے، جو اقتدار کی دبیز اور مضبوط دیواروں کی اوٹ میں چھپے ہوئے تھے، جیسے تیونس کے آمر زین العابدین بن علی جب اپنے ملک سے فرار ہوئے تو اس طرح کہ سولہ ٹن سونے کی اینٹیں ان کے ساتھ تھیں، اس کے ساتھ مال و دولت کے اور جو خزانے لے جائے گئے ہوں گے، ان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، مصر کے سابق صدر حسنی مبارک کی بیوی اور بیٹے کئی لدے پھندے جہازوں کے ساتھ مصر سے بھاگے اور خود حسنی مبارک کی دولت کا اندازہ کیا جائے کہ وہ دو بلین ڈالر سے بھی زیادہ ہے، لیبیا کے صدر قذافی کی صورت حال یہ ہے کہ ان کی دوسری بیوی دوٹن سونا لے کر فرار ہو چکی ہیں، ان کی ایک محبوبہ جو یوکرین کی متوطن ہیں اور سایہ کی طرح ان کے ساتھ رہا کرتی تھیں، وقت کے تیور کو دیکھتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ وہ دولت کا ایک انبار لے کر اپنے وطن پہنچ چکی ہیں، پھر قذافی کی عیاشی اور عشرت آرائی کا حال یہ ہے کہ ان کے ساتھ دوسو جوان اور نوجوان خاتون باڈی گارڈ ہوا کرتی ہیں، شاید یہ مرد باڈی گارڈ ان کی حفاظت سے قاصر تھے، وہ جب بھی کہیں جاتے تو اس قافلہ کو اپنے ساتھ لے کر جاتے اور یوکرین کی محبوبہ نرس کے طور پر ان کے ساتھ رہتیں، دولت جمع کرنے اور دادِ عیش دینے کی قریب قریب یہی صورت حال اکثر عرب ملکوں میں ہے، جہاں فرماں رواؤں نے عوام کو اپنا غلام اور ملک کو اپنی ذاتی جائداد سمجھ لیا ہے، افسوس ناک بات یہ ہے کہ ان کی ہوس دولت کو پوری کرنے کے لئے ملک میں موجود بینک کافی نہیں ہوتے؛ اس لئے زیادہ تر مسلم حکمرانوں کے پیسے مغربی ممالک کے بینکوں میں محفوظ کئے گئے ہیں، ان ہی ملکوں میں انہوں نے سرمایہ کاری کررکھی ہے اور یہیں ان کے بڑے بڑے قصور و محلات واقع ہیں؛ اس لئے جب مغرب کے کٹ پتلی حکمرانوں کے خلاف ان کے ملک میں فضا بنتی ہے تو مغربی قوتیں مخالفین کی مدد کرتی ہیں اور ان کی طرف سے برپا کی جانے والی سورشوں کو تقویت پہنچاتی ہیں، ادھر ان کا تختِ اقتدار متزلزل ہوا، اُدھر ان کے کھاتے منجمد کردیئے جاتے ہیں اور ان کی ساری دولت پر قبضہ جمالیا جاتا ہے، ان کے بعض 'بے نامی' کھاتے بھی ہوتے ہیں، ایسی

صورت میں کوئی ان کے بارے میں پوچھنے والا بھی نہیں ہوتا۔

ایک طرف عالم اسلام کی یہ صورت حال ہے اور دوسری طرف ہمارے سامنے رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے ایک چھوٹے سے ملک جاپان کی مثال ہے، مورخہ ۱۱/مارچ ۲۰۱۱ء کو جاپان میں زبردست سونامی آئی، جس کی مثال صدیوں میں نہیں ملتی، یہ ایسی سونامی تھی کہ آٹھ میٹر بلند سمندر کی سرکش موجیں آبادی میں گھس پڑیں اور انہوں نے پوری آبادی کو دھو کر رکھ دیا، مکانات اس طرح گر پڑے کہ گویا بچوں کے کھیلنے کے مٹی کے گھروندے ہوں، کاریں اور بسیں ماچس کی ڈبیوں کی طرح سڑکوں پر بہنے لگیں، سمندری سونامی کے ساتھ ساتھ زمین میں بھی زلزلہ آ گیا، اس کے نتیجہ میں تین نیوکلیری ایکٹرا اڑ گئے اور اس کی تابکاری کے اثرات ایک وسیع علاقہ میں پھیل گئے، ایک ہی وقت میں اس قوم کو زلزلہ، سونامی اور نیوکلیر حادثہ سے گذرنا پڑا، لیکن اس قوم نے اپنی حوصلہ مندی، جدوجہد اور قربانی کے ذریعہ ان حادثات کا مقابلہ کیا، نہ دنیا کی دوسری قوموں کے سامنے ہاتھ پھیلایا نہ آہ وواویلا کی اور نہ پست ہمت ہوئے، جس پامردی کے ساتھ انہوں نے حالات کا مقابلہ کیا ہے، وہ یقیناً ایک مثال ہے، اور بجا طور پر پوری دنیا میں ان کی ان کوششوں کو داد دی جا رہی ہے، شاعر حقیقت شناس علامہ اقبالؒ نے خوب کہا تھا:

آ، تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس رباب آخر

یعنی جب کوئی قوم ترقی وعروج کا سفر طے کرتی ہے تو وہ تلواروں اور نیزوں سے مزین ہوتی ہے، وہ مشکل حالات کو برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے، وہ عیش وعشرت کے خاکوں میں رنگ بھرنے کی بجائے جدوجہد کے میدان میں آگے بڑھتی ہے، اور جب قوموں کے زوال وانحطاط کا زمانہ آتا ہے تو وہ عیش وعشرت کے نقشے بنانے لگتی ہے اور رقص وسرود سے اپنے دل کو بہلانے کی عادی ہوجاتی ہے، یہی وہ بات ہے کہ جس کا رسول اللہ ﷺ اندیشہ رکھتے تھے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جب کسی قوم میں خیانت اور بددیانتی پیدا ہوجاتی ہے تو وہ کم ہمت اور بزدل ہوجاتی ہے:
''ما ظهر الغلول في قوم إلا القى في قلوبهم الرعب'' (طبری، ص:۲۶۹۶)۔

اس وقت عالم اسلام کی صورت حال یہی ہے کہ اپنی قوم کے ساتھ حکمرانوں کا معاملہ بدترین

بد دیانتی کا ہے اور صہیونی وصلیبی طاقتوں کے مقابلوں شرمناک بزدلی اور کم حوصلگی کا، عام مسلمانوں کی بھی صورت حال یہ ہے کہ وہ علم وتحقیق، محنت اور جد وجہد میں پیچھے ہیں اور عیش پرستی میں آگے، دوسری قومیں ہمیں دیکھتی ہیں اور خندہ زن ہوتی ہیں کہ یہ لٹی پٹی اور ذلیل ورسوا کی ہوئی قوم اپنی محرومی اور کم نصیبی کو بھول کر کس طرح دادِ عیش دے رہی ہے؟ کاش، ہم اس طرزِ عمل میں تبدیلی لائیں، اپنے اندر حالات کا مقابلہ کرنے اور جد وجہد کے ذریعہ آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کریں اور عیش وعشرت کے نقشوں کو تج کر ایک باعزت اور آبرومند امت کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر اپنے آپ کو لانے کی کوشش کریں۔

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!

(اسلام کے خلاف مغرب کا معاندانہ رویہ)

امریکہ اپنے آپ کو دنیا میں سب سے بڑا سیکولر، جمہوریت پسند اور مذہب کے معاملہ میں رواداری کا حامل ملک قرار دیتا ہے؛ بلکہ اکثر اوقات بین الاقوامی قوانین کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دوسرے ملکوں کو بھی اس کا سبق پڑھاتا رہتا ہے اور جہاں اس کے مفاد کا تقاضہ ہو، وہاں داروغہ بن کر زور زبردستی کرتا ہے، ہر جگہ اس کی دلیل یہی ہوتی ہے کہ وہ انصاف اور رواداری قائم کرنا چاہتا ہے؛ لیکن ابھی چند دنوں پہلے یہ عجیب اور نہایت تکلیف دہ واقعہ پیش آیا کہ مسلمان جو عیسائیوں کے بعد دنیا کا سب سے بڑا مذہبی گروہ ہیں اور جو خود امریکہ میں سب سے بڑی اقلیت ہیں، امریکی فوج میں باضابطہ ان کے خلاف نفرت انگیز مواد پڑھایا جارہا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تعصب کو سرکاری سطح پر ہوا دی جارہی ہے، جس بات کا انکشاف ہوا وہ یہ کہ ۲۰۰۴ء سے ہی، ورجینا کے جوائنٹ فورسس اسٹاف کالج میں اس طرح کی تعلیم دی جارہی ہے، فوج کے انسٹرکٹر لفٹنٹ کرنل میتھیو ڈولے نے فوجیوں کو تربیت دیتے ہوئے مسلمانوں کے بارے میں کہا ہے کہ ''وہ ہر اس عمل سے نفرت کرتے ہیں، جو آپ سے منسوب ہے اور وہ آپ کے ساتھ اس وقت تک میل ملاپ نہیں کریں گے، جب تک آپ مغلوب نہ ہوجائیں''، اس بدبخت نے یہ بھی کہا کہ ٹوکیو، ہیروشیما اور ناگاساکی پر جو تباہ کن حملہ کیا گیا تھا، ویسا ہی حملہ مکہ اور مدینہ پر بھی کیا جاسکتا ہے، اگرچہ کہ بعض طلبہ کی شکایت اور ذرائع ابلاغ تک اس خبر کے پہنچ جانے کی وجہ سے امریکی جوائنٹ چیف آف اسٹاف نے اس کورس پر پابندی لگادی ہے اور ڈولے کو تدریسی خدمت انجام دینے سے روک دیا ہے؛ لیکن امریکی حکومت کس حد تک اس اقدام کے سلسلہ میں مخلص ہے؟ یہ کہنا مشکل ہے؛ کیوں کہ اکثر اس طرح کے واقعات مسلمانوں کو ٹٹولنے کے لئے پیش آتے ہیں، ان کی قوت برداشت دیکھی جاتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ مسلمانوں کے خلاف رسوا کن اور نامنصفانہ اقدام کئے جاتے ہیں۔

اس واقعہ کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ مسلمان اپنے برادران وطن کو حقیقی اسلامی تعلیمات پہنچانے سے

قاصر رہے ہیں، وہ دنیا کے مختلف ملکوں سے لاکھوں کی تعداد میں امریکہ و یورپ گئے ہیں، بحیثیت تارکین وطن انہوں نے اپنے اس نئے ملک کی خدمت بھی کی ہے، خود ذاتی طور پر انہیں غیر معمولی مادی منفعت حاصل ہوئی ہے، جو لوگ اپنے ملک میں ہزار دو ہزار روپے کما سکتے تھے، انہوں نے لاکھوں روپے کمائے، دنیا کی تمام آسائشوں سے بہرہ ور ہوئے، جہاں سے گئے، وہاں کثیر زرمبادلہ بھیجے اور اس سے ملک کی معیشت کو بھی تقویت حاصل ہوئی؛ لیکن افسوس کہ وہ یہ سبق بھول گئے کہ وہ ایک داعی امت ہیں، وہ اس لئے نہیں پیدا کئے گئے ہیں کہ کاسۂ گدائی لے کر ملکوں ملکوں جائیں اور سیم وزر کی بھیک حاصل کریں؛ بلکہ انہیں ایک بامقصد اور باکردار امت کی حیثیت سے دنیا میں بھیجا گیا ہے کہ وہ جہاں جائیں قلب وروح کی غذا لے کر جائیں، وہ مریضان دل کا علاج کریں اور انسانیت کے خدا سے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑنے کی کوشش کریں، وہ مادی ہوس کے نشہ میں بدمست؛ لیکن قلب کے سکون سے محروم انسانیت کو روحانی سربلندی کی سوغات پیش کریں، جو دین محمدی کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتی۔

اگر ان قوموں کے سامنے اسلام کی سچی تعلیمات پیش کی جاتیں تو انہیں معلوم ہوتا کہ اسلام معلوم تاریخ میں پہلا مذہب ہے، جس نے کثیر مذہبی سماج کے بارے میں رواداری کے اصول بتائے ہیں اور ان اصولوں کا تعلق صرف ان غیر مسلموں سے نہیں ہے جو مغلوب ہوں؛ بلکہ ان غیر مسلموں سے بھی ہے، جو غالب حیثیت میں یا برابر کی سطح پر ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں مسلمان مغلوب تھے؛ لیکن قرآن نے اس وقت بھی ایک کثیر مذہبی سماج کے لئے نقشہ کار پیش کیا، وہ یہ تھا کہ مختلف مذاہب پر یقین رکھنے والے اپنے اپنے طریقے پر قائم رہیں، کسی کے ساتھ جبر وتشدد روا نہ رکھا جائے: ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ (الکافرون: ٦) یہ رواداری اور عدم تشدد کی تعلیم ایک ایسے غیر مسلم گروہ کے ساتھ تھی، جو اس وقت غالب پوزیشن میں تھی۔

مدنی زندگی کے اوائل میں مسلمانوں اور یہودیوں کا موقف قریب قریب یکساں تھا، وہاں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش قدمی کرتے ہوئے مدینہ میں آباد مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے گروہوں کے درمیان معاہدہ کرایا، ان میں مسلمان بھی تھے، یہودی اور مشرکین بھی، مذہبی آزادی، ایک دوسرے کے معاملہ میں عدم مداخلت، رواداری، انسانی بنیادوں پر حسن سلوک اور مل جل کر دشمنوں کا مقابلہ کرنا، اس معاہدہ کا بنیادی منشور تھا، اسلام میں مسلم وغیر مسلم تعلقات غالب

اور مغلوب ہونے کے لحاظ سے نہیں ہے؛ بلکہ امن وامان اور باہمی معاہدات کے اعتبار سے ہیں، جو غیر مسلم بھائی مسلمانوں کے ساتھ پُر امن رویہ اختیار کریں، یا مسلمانوں کے ساتھ ان کا معاہدہ ہوتو مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان کے ساتھ بہتر رویہ اختیار کریں اور اس سے قطع نظر کہ وہ اسلام قبول کرتے ہیں یا نہیں، ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں، (البقرۃ: ۲۷۲) اسلام کی نظر میں ایسے غیر مسلم بھائیوں کی جان و مال مسلمانوں ہی کی طرح قابل احترام ہیں: ”**دمائهم كدمائنا وأموالهم كأموالنا**“ (نصب الرایہ: ۴/ ۳۶۹) یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کسی ایسے غیر مسلم کو قتل کر دیا، جس سے باہمی امن کا معاہدہ ہوتو وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا؛ حالاں کہ اس کی خوشبو چالیس سال کے فاصلہ سے محسوس کی جاسکتی ہے، (بخاری، عن عبد اللہ بن عمر، حدیث نمبر: ۳۱۶۶)

اسی طرح ان کی عزت و آبرو کی اہمیت وہی ہے، جو مسلمانوں کی ہے، سماجی زندگی میں باہمی تعلقات کی بنیاد پر جو مسائل پیش آتے ہیں، جیسے: مصیبت میں ایک دوسرے کی مدد، خوشی وغم میں شرکت، ایک دوسرے سے ملاقات ومصافحہ، عیادت وتعزیت، ایک دوسرے کو مدعو کرنا اور دعوت میں شریک ہونا، ان سب معاملات میں غیر مسلم بھائیوں کے وہی احکام ہیں، جو مسلمانوں کے لئے ہیں، فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے۔ (دیکھئے: فتاوی ہندیہ: ۵/ ۳۸۴) اسی طرح جو مسلمان کسی غیر مسلم ملک میں رہتے ہوں، ان کے لئے واجب ہے کہ وہ اس ملک کے مبنی برانصاف قوانین کا احترام کریں؛ اس لئے کہ کسی ملک کی شہریت حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے وہاں کے ملکی قوانین سے وفاداری کا عہد کیا ہے اور عہد کو پورا کرنا واجب ہے: ﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ﴾ (الاسراء: ۳۴)۔

غرض کہ عام طور پر فرقہ پرستوں کی طرف سے جو یہ تصور دیا جاتا ہے کہ مسلمان بحیثیت محکوم کے تو غیر مسلم کو قبول کر سکتے ہیں؛ لیکن اس حیثیت سے قبول نہیں کر سکتے کہ اقتدار میں غیر مسلم شامل ہوں یا اقتدار میں غیر مسلموں کو غلبہ حاصل ہو، اور مسلمان اس ملک میں تشدد پر اتر آتے ہیں، یہ درست نہیں ہے؛ بلکہ جو غیر مسلم بھائی مسلمانوں کے معاملہ میں پر امن رویہ اختیار کریں یا مسلمانوں کا ان سے امن وامان کا معاہدہ ہو —— اور جیسا کہ ذکر کیا گیا اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرتا ہے تو یہ بھی حکومت سے عہد کرنے میں شامل ہے —— ان کے ساتھ مسلمان شرعاً امن وامان

کے ساتھ رہنے، ایک دوسرے کی جان و مال اور عزت و آبرو کا احترام کرنے اور حکومت کے منصفانہ قوانین پر عمل پیرا رہنے کے پابند ہیں اور اگر ان کو کوئی بات غیر منصفانہ نظر آئے تب بھی قانون ملکی کی پابندی کا عہد جو انہوں نے کیا ہے، اس کے تحت ضروری ہے کہ وہ پُر امن احتجاج اور قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنے نظریہ کو پیش کرنے کی کوشش کریں۔

ہاں! یہ ضرور ہے کہ جو غیر مسلم بھائی مسلم اکثریت ملک میں رہتے ہیں، وہاں ان کی حفاظت و صیانت اور ان کے حقوق کے تحفظ کی مسلمانوں پر زیادہ ذمہ داری ہے اور اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی تاکید فرمائی ہے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کسی غیر مسلم رعایا کے ساتھ زیادتی کی، قیامت کے دن میں اس غیر مسلم کی طرف سے فریق بن کر کھڑا ہوں گا؛ بلکہ غیر مسلم رعایا کو نام ہی ''ذمی'' کا دیا گیا ہے، ''ذمہ'' کے معنی عہد کے ہیں، یعنی ایک ایسا شخص جس کی حفاظت کا تم عہد کر چکے ہو، افسوس کہ اس دور میں مسلمان معاشی ضرورتوں کے تحت جس ملک میں گئے، وہاں انہوں نے صرف پیسے کمانے اور زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کو اپنا نصب العین بنالیا، انہوں نے غیر مسلم بھائیوں تک اسلام کی عمومی تعلیمات کو پہنچانے اور غیر مسلموں سے متعلق اسلام کی منصفانہ ہدایات کو اجاگر کرنے کی کوشش نہیں کی، یہ کام علماء کو کرنا چاہئے تھا، مگر دوسرے ملکوں اور خاص طور سے برصغیر کے علماء جو امریکہ و یورپ گئے، وہ عام طور پر علمی اور فکری اعتبار سے اس سطح کے نہیں تھے کہ عالمی حالات کے تناظر میں ان مسائل کی اہمیت کو سمجھیں اور کتاب وسنت نیز فقہاء سلف کے اجتہادات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مغربی ممالک کے غیر مسلموں کو مطمئن کرسکیں، اکا دکا جو باصلاحیت افراد گئے، ان کی توجہ بھی صرف حصول معاش یا ابتدائی دینی تعلیم دینے پر رہی، حقیقت یہ ہے کہ ہمیں دوسروں کا شکوہ کرنے کے بجائے خود اپنا دامن بھی دیکھنا چاہئے اور اپنی ذمہ داریوں کو بھی اداء کرنا چاہئے۔

مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ کیا واقعی مغربی دنیا اپنے اس بدترین منصوبہ میں کامیاب ہوجائے گی؟ —— ان منصوبوں کو دیکھ کر بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک نئی جنگ عظیم قریب سے قریب تر ہوتی جارہی ہے اور شاید یہ وہی جنگ عظیم ہے، جس کی حدیثوں میں پیشین گوئی آئی ہے کہ فتنہ دجال ظاہر ہوگا، دجال مذہب کے اعتبار سے یہودی ہوگا اور دنیا کے بڑے حصہ پر یہودیوں کا اقتدار قائم

ہوجائے گا، یہودی دنیا میں عددی اعتبار سے ایک چھوٹی اقلیت ہیں؛ لیکن سائنس اور ٹکنالوجی میں انہوں نے پوری دنیا پر فتح حاصل کر لی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عیسائیوں اور دنیا کی دوسری طاقتوں کے سہارے اپنا تخت اقتدار بچھائیں گے اور خاص طور سے عیسائی دنیا ان کی سواری کا کام دے گی، ان کا نشانہ اسلام ہوگا، دجال کا اقتدار مادی طاقت کا اوج کمال ہوگا، مسلمان سمٹتے جائیں گے اور پھر ایک غیبی طاقت کا ظہور ہوگا، امام مہدی ظاہر ہوں گے اور حضرت مسیح آسمان سے اتارے جائیں گے، اب مادی طاقت اور غیبی طاقت کا مقابلہ ہوگا اور غیبی طاقت کو فتح حاصل ہوگی، یہ بات دن و رات کا مشاہدہ ہے کہ سارے مادی وسائل خدا کے غیبی وسائل کے سامنے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، جب طوفان آتا ہے، سونامی کی ستم خیز لہریں اُٹھتی ہیں، زمین پر زلزلے آتے ہیں اور ہوا کا طوفان کسی آبادی کو خس و خاشاک کی طرح اڑا کر رکھ دیتا ہے تو اس وقت سارے مادی وسائل عاجز ہوجاتے ہیں، شاید یہی صورت دجالی طاقت اور قیامت کے قریب ظاہر ہونے والی غیبی طاقت کی معرکہ آرائی میں پیش آئے گی، اور ان شاء اللہ حق کو فتح ہوگی اور پوری دنیا میں حق اور ہدایت کا بول بالا ہوگا۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حرمین شریفین کی حفاظت اس معرکہ میں بھی ہوگی، مدینہ منورہ کا ذکر تو کئی حدیثوں میں آیا ہے کہ دجال اس میں داخل نہیں ہو سکے گا، جب دجال ظاہر ہوگا تو اس زمانے میں مدینہ کے سات دروازے ہوں گے، ہر دروازے پر دو فرشتے ہوں گے، جو دجال اور اس کی فوج سے شہر کی حفاظت کریں گے (مستدرک حاکم، کتاب الفتن والملاحم، حدیث نمبر: ۸۶۲۷) ایک روایت میں ہے کہ ہر شہر میں دجال گھس جائے گا سوائے مدینہ کے، کہ اس کے دروازے تک پہنچنے کے بعد اسے واپس آنا پڑے گا، (طبرانی فی الاوسط، حدیث نمبر: ۱۰۷۴) مسلم شریف کی ایک روایت میں بھی یہ مضمون آیا ہے (دیکھئے: مسلم، کتاب الحج، حدیث نمبر: ۳۴۱۶) بعض احادیث میں مکہ اور مدینہ دونوں کا ذکر آیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دجال ہر شہر کو روند جائے گا سوائے مکہ اور مدینہ کے، کہ اس کے دروازے پر صف بستہ فرشتے موجود ہوں گے، جو شہر کی حفاظت کریں گے، (الاحکام الشرعیۃ الکبری، کتاب الفتن، باب ذکر الدجال: ۴/۱۷۵) اس لئے مغربی طاقتوں کو اِترانا نہیں چاہئے، اور انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ:

نور خدا ہے کفر کی حرکت پر خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اس خبر کا تیسرا المناک پہلو یہ ہے کہ اتنے غیر معمولی واقعہ پر بھی مسلمان حکومتوں کو کوئی جنبش نہیں ہوئی، مسلمان حکمرانوں نے ایک حرف احتجاج بھی نہیں کہا؛ حالاں کہ امریکہ کی معیشت عرب ملکوں کے سرمایہ پر قائم ہے، اس کی ٹکنالوجی کے لئے ایندھن خلیجی ملکوں سے آتا ہے، لاکھوں مسلمان تارکین وطن کے ذریعہ امریکہ کو افرادی وسائل مہیا ہوتے ہیں، سرد جنگ کے زمانہ میں بھی مسلم ملکوں کی بڑی تعداد امریکن بلاک میں شامل تھی؛ لیکن جرأت وحکمت کے فقدان، اپنے اقتدار کے قائم رکھنے کی فکر اور عوام کا سامنا کئے بغیر آمریت اور بادشاہت کو جاری رکھنے کی وجہ سے ان کی زبانیں گنگ ہیں، وہ پوری دنیا میں بے وزنی کے شکار ہیں اور تعداد کی کثرت کے باوجود ان کی مثال اس خس وخاشاک کی طرح ہے، جس کو پانی کی معمولی لہر بھی بہالے جاتی ہیں، جب تک عالم اسلام میں نظام حکومت نہیں بدلے گا، عوام اقتدار کا سرچشمہ نہیں بنیں گے، سیاسی استحکام پیدا نہیں ہوگا اور اسلامی اصولوں کے مطابق خلافت علی منہاج النبوۃ وجود میں نہیں آئے گی، اس وقت تک نہ تعلیم وٹکنالوجی کی ترقی ہوگی نہ آزادانہ خارجہ پالیسی بنائی جاسکے گی، اور نہ عالم اسلام میں وہ جرأت پیدا ہوسکے گی کہ وہ مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسائل کے بارے میں بات کرسکیں؛ کیوں کہ جب انسان خدا سے بے خوف ہوجاتا ہے تو مخلوقات کا خوف اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک، کوئی مسلمان اسامہ اور طالبان کے بارے میں ایک حرف خیر بھی نہیں کہہ سکتا؛ لیکن امریکی فوج کو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ پر حملہ کی تلقین کی جاسکتی ہے۔ **فیا أسفاہ، ویا عجباہ!**

پردہ کے خلاف مغربی ملکوں کی ناشائستہ مہم

قرآن مجید حضرتِ انسان کی ہدایت کے لئے اتاری جانے والی آخری کتاب ہے؛ اس لئے اس میں کائنات کی ابتداء اور انتہاء کے ساتھ ساتھ؛ بلکہ اس سے زیادہ واضح طور پر خود انسان کی ابتداء و انتہاء پر روشنی ڈالی گئی ہے، قرآن نے بتایا ہے کہ انسانی تخلیق میں ایسا نہیں ہوا کہ کسی ادنیٰ مخلوق نے ترقی کر کے انسان کا درجہ حاصل کرلیا ہو، رینگنے والے جانور کو بہ تدریج پاؤں نکل آئے ہوں اور انہوں نے بندر کی صورت اختیار کر لی ہو، پھر بندر آہستہ آہستہ انسان بن گیا ہو، جو لوگ انسان کے بارے میں اس طرح کی بات کہتے ہیں، وہ ایک خلافِ فطرت بات کا دعوی کرتے ہیں، فطرت کے نظام میں ارتقاء ضرور ہے؛ لیکن ارتقاء کا سفر اپنی بنیادی صفت کے ساتھ ہی طے ہوتا ہے، آم کا چھوٹا سا پودا بڑھتے بڑھتے تناور درخت بن جاتا ہے؛ لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ پہلے کھیرے اور ککڑی کی طرح زمین پر اس کی لتیں پھیلتی ہوں، پھر کسی دن لوگوں نے دیکھا ہو کہ آج اس نے انار کے درخت کی صورت اختیار کر لی ہے اور کچھ عرصہ بعد یہ دیکھ کر لوگ حیرت زدہ رہ گئے ہوں کہ وہ ایک تناور درخت بن چکا ہے اور آم کے خوبصورت، رسیلے اور میٹھے پھل بڑی تعداد میں اس کی شاخوں سے لٹکے ہوئے ہیں، اگر کوئی شخص ایسا دعوی کرے تو عجب نہیں کہ لوگ اس کے ذہنی توازن پر شبہ کرنے لگیں، مگر یورپ کے مشہور مفکر ڈارون نے انسانی وجود کے بارے میں یہی بات کہی ہے کہ انسان مختلف حیوانی صنفوں سے گذرتا ہوا انسان بنا ہے، اگر کم پڑھے لکھے دانشور نے یہ بات کہی ہوتی تو شاید اسے مالیخولیا کا مریض قرار دے دیا جاتا؛ لیکن چوں کہ اسے مغرب کے ایک بڑے مفکر نے کہا تھا، نیز اس فلسفہ کو مان لینے میں انسانی تخلیق کے لئے خدا کی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی اور یہ ایک طبعی، مادی عمل قرار پاتا تھا؛ اس لئے مغرب کے خدا بے زار فلسفہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایک عرصہ تک اس کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا۔

بہر حال قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسی کائنات سے کچھ مٹی جمع کی گئی، اس سے انسانی قالب تیار ہوا، اللہ تعالیٰ نے اس میں روح پھونک دی اور ایک چلتا پھرتا، دل و دماغ کی نعمت سے ہم کنار پہلا انسان تیار ہو گیا، جسے آدم (علیہ الصلاۃ والسلام) سے موسوم کیا گیا، پھر ان ہی

سے ان کا جوڑا حضرت حوا علیہا السلام کی شکل میں وجود پذیر ہوا، اس پہلے انسانی جوڑے سے انسانی پیدائش کا نظام شروع ہوا اور بے شمار مرد وعورت پیدا کئے گئے، اب قیامت تک ان کی پیدائش کا سلسلہ جاری رہے گا: ﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً﴾ (النساء:۱) بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا یہ عمل آسمان پر انجام پایا، پھر اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اس وقت ہم لوگ جس کائنات میں آباد ہیں، اسی خوبصورت اور خدا کی بے شمار نعمتوں سے مالا مال دنیا میں انسانوں کی بستی بسائی جائے، چوں کہ اس سے پہلے اس زمینی دنیا میں جنوں کا بسیرا رہ چکا تھا اور فرشتوں کو ان کی سرکشی اور زیادتی کا خاصا تجربہ تھا؛ اس لئے انہوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ جب انسان کی پیدائش کا مقصد آپ کی بندگی اور غلامی بجالانا ہے تو اس کے لئے تو ہم حاضر ہی ہیں، آپ انسان کو بھیجیں گے تو یہ بھی وہاں جنوں ہی کی طرح کا فساد مچائیں گے!

اللہ تعالیٰ کو انسان سے صرف بندگی ہی مقصود نہ تھی، اس کا امتحان بھی مقصود تھا کہ وہ پانی میں رہے؛ لیکن دامن کو بھیگنے نہ دے، اسے خواہشات کے سمندر میں اتارا جائے؛ لیکن وہ اپنے آپ کو بے قابو ہونے سے بچائے رکھے، اس کے لئے ایک ایسی مخلوق ضروری تھی، جس میں بندگی کا جذبہ بھی ہو اور سرکشی کی صلاحیت بھی، اور وہ خیر وشر دونوں کا مجموعہ ہو، فرشتے خدا کی عبادت تو کر سکتے تھے؛ لیکن وہ اس امتحان کے لائق نہیں تھے؛ کیوں کہ ان میں برائی اور نافرمانی کی صلاحیت ہی نہیں رکھی گئی تھی، ان کو خدا کی نافرمانی سے روکنا ایسا ہی ہوتا جیسے نابینا کو کسی چیز کے دیکھنے سے روکا جائے؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور فرشتوں کا ایک دلچسپ امتحان لیا، قرآن نے اس امتحان کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَي الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (البقرۃ:۳۱) ’’اللہ نے آدم کو تمام ناموں کا علم عطا فرمایا، پھر انہیں فرشتوں پر پیش کیا اور ارشاد فرمایا: اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ‘‘

آخر فرشتوں نے ان سوالات کا جواب دینے سے اپنی معذوری ظاہر کر دی اور عفو خواہی کرتے ہوئے عرض کیا کہ ہمارا علم آپ کی سکھائی ہوئی باتوں تک محدود ہے: ﴿قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾ (البقرۃ:۳۲) یہ گویا اس بات کا اظہار

تھا کہ ہمارا علم تقلیدی ہے، ہمارے اندر ایجاد و اجتہاد کی صلاحیت نہیں ہے، اس پورے واقعہ میں ایک قابلِ توجہ پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ''اسماء'' (ناموں) کا علم عطاء فرمایا، اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ کچھ چیزیں آپ کے سامنے رکھی گئیں اور اللہ کی طرف سے ان کے نام بتادیئے گئے جو آپ علیہ الصلاۃ والسلام کو از بر ہو گئے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اور ان کے واسطہ سے بنی آدم کو نام رکھنے کی صلاحیت عطا کی گئی؛ چنانچہ دنیا میں انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے، جو مختلف چیزوں کو الگ الگ ناموں سے موسوم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، شیر مختلف جانوروں کو کھاتا ہے؛ لیکن وہ انہیں کسی خاص نام سے متعین کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، ہاتھی مختلف نباتات کو اپنی غذا بناتا ہے؛ لیکن وہ مختلف پودوں کے الگ الگ نام نہیں رکھتا؛ لیکن انسان ہے کہ اس نے رائی سے لے کر پہاڑ اور چیونٹی سے لے کر ہاتھی تک ہر چیز کے نام رکھ رکھے ہیں۔

'نام' کو قرآن میں ''اسم'' سے تعبیر کیا گیا ہے، عربی زبان کے بعض ماہرین کا خیال ہے کہ یہ اصل میں ''وسم'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی علامت اور پہچان کے ہیں، نام کے لئے عربی زبان میں ایک اور لفظ عَلَم (ع اور ل پر زبر) کا بھی استعمال ہوتا ہے، اس کے بھی اصل معنی علامت اور پہچان ہی کے ہیں، گویا نام میں پہچان بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے، پہچان سے مراد وہ باتیں ہیں، جو کسی چیز کو دوسری چیزوں سے ممتاز کرتی ہیں، جیسے ہرن اور بکرے تقریباً ایک ہی سائز کے جانور ہیں؛ لیکن دونوں کی اپنی اپنی شناخت ہے؛ اس لئے ایسا نہیں ہوتا کہ انسان ہرن کو بکرا سمجھ لے اور بکرے کو ہرن، اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ اس کائنات میں زندگی گذارنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر چیز کی اپنی اپنی شناخت اور پہچان ہو اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں شناخت کی حفاظت کا جذبہ رکھا ہے۔

جب ہم کائنات میں غور کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس کائنات کے خالق و مالک نے تمام چیزوں کے ساتھ اس کی پہچان رکھی ہے، دنیا میں نہ جانے کتنے پہاڑ ہوں گے؛ لیکن ہر ایک دوسرے سے مختلف ہے، کوئی سرخ ہے، کوئی سیاہ اور کوئی سفید، کوئی پودوں سے ڈھکا ہوا اور کوئی بے آب و گیاہ، کوئی بہت اونچا اور کوئی اتنا نیچا کہ مٹی کا ایک ٹیلہ نظر آئے، اسی اختلاف اور تنوع سے ان کی پہچان متعلق ہے، سمندر بظاہر یکساں نظر آتے ہیں؛ لیکن ان میں بھی فرق ہوتا ہے، کسی میں بلا کا سکوت اور ٹھہراؤ

ہے اور کسی میں ہنگامہ خیز تموج، پانی کی رنگت اور درجۂ حرارت بھی یکساں نہیں، نباتات اور پودوں کی طرف آیئے تو ان میں بے حد تنوع ہے؛ لیکن ہر ایک کی الگ الگ پہچان، انسان کبھی آلو، پیاز اور آم، سیب کے درمیان دھوکہ نہیں کھاتا، ایسا ہوسکتا تھا کہ تمام پھل سیب کی طرح خوش رنگ ہوتے؛ لیکن کسی میں مزا آم کا ہوتا اور کسی میں جامن کا، مگر اس کائنات کے خالق نے ایسا نہیں کیا، یہی کیفیت جانوروں کی ہے، ہر جانور کی اپنی پہچان ہے اور پہلی نظر میں انسان ان کا ادراک کرسکتا ہے، خود انسان کو دیکھئے، ایک ہی ماں باپ کے چند بچے ہیں؛ لیکن ان کی صورتیں مختلف، آواز میں فرق، رنگ و روپ الگ، چال ڈھال بھی ایک دوسرے سے ممتاز، غرض کہ خدا نے اس کائنات کی فطرت میں پہچان اور شناخت کو رکھا ہے۔

چیزوں کی الگ الگ پہچان اللہ کی ایک بڑی نعمت ہے، اگر یہ پہچان نہ ہوتی اور فرض کیجئے کہ ایک شخص آم کے بجائے سیب کھانا چاہتا تو سوچئے کہ وہ اسے کس طرح تعبیر کرتا؟ ایک آدمی کو کاٹن کے کپڑے کے بجائے ریشم کے کپڑے کی ضرورت ہوتی تو وہ کس طور پر اس ضرورت کا اظہار کر پاتا؟ یہی حال زندگی کے تمام شعبوں کا ہے، غرض کہ اگر چیزوں کی پہچان گم ہوجائے اور ان کی شناخت باقی نہ رہے تو انسان کے لئے اس دنیا میں اپنی ضروریات کا پورا کرنا نہایت دشوار کام ہوجائے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرتِ آدم علیہ السلام کو چیزوں کا نام سکھایا، یہ گویا اس بات کا اشارہ ہے کہ اس دنیا میں بود و باش کے لئے چیزوں کی پہچان سے واقف ہونا اور ان کے الگ الگ نام رکھنا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر شناخت کے تحفظ کا جذبہ سب سے زیادہ رکھا ہے، اسے قبیلوں اور خاندانوں میں اسی لئے تقسیم کیا گیا ہے کہ اپنی اپنی شناخت کی نسبت سے وہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں: ﴿وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا﴾ (الحجرات: ۱۳) انسان اپنے اور اپنے بچوں کے نام رکھتا ہے، اپنے مقام کو اور بعض اوقات مکان کو بھی مختلف ناموں سے موسوم کرتا ہے، یہ سب اسی لئے ہے کہ اس کی اپنی ایک پہچان قائم ہو، وہ دکانوں اور کمپنیوں کے نام رکھتا ہے، اپنے کاروبار کے لئے ٹریڈ مارک مقرر کرتا ہے، قومی سطح پر ہر ملک کا الگ الگ جھنڈا ہوتا ہے اور وہ اس جھنڈا کو اپنے وقار کی علامت سمجھتا ہے، اگر کوئی شخص جھنڈے کی توہین کردے تو پوری قوم اس کو اپنی اہانت تصور کرتی ہے، ان سب کا تعلق انسان کے اسی جذبہ سے ہے کہ اس کی اپنی پہچان اور شناخت ہو، اگر کوئی عورت

بال مونڈا لے یا کوئی مرد کان اور ناک میں زیور پہن لے تو یہ بات ہر دیکھنے والے کے لئے حیرانی کا باعث ہوتی ہے؛ اس لئے کہ سماج کے تعامل اور رواج کے تحت لباس و پوشاک میں مردوں اور عورتوں کی الگ الگ پہچان ہے۔

انسان کے اندر ایک خاص جذبۂ حمیت اس مذہب کی نسبت سے پایا جاتا ہے، جس پر اس کا یقین ہو؛ اسی لئے ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنی اپنی پہچان عزیز ہوتی ہے، مسجدیں ہوں یا مندر اور چرچ، ہر ایک کا مقصد اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق خدا کی پرستش ہے؛ لیکن مسجد کے مینار اور چرچ پر لگی ہوئی صلیب دور سے دیکھنے والوں کو اپنی شناخت سے واقف کرا دیتی ہے، یہی حال دوسری عبادت گاہوں کا بھی ہے، لوگوں کو اس بات پر مجبور کرنا کہ وہ اپنی پہچان گم کردیں، ایک بربریت تو ہوسکتی ہے، عقلمندی نہیں ہوسکتی۔

اس وقت پورے مغرب میں نقاب اور حجاب کے خلاف ایک تحریک سی چل رہی ہے، اسکولوں میں طالبات اور معلمات پر پابندی لگائی جارہی ہے کہ وہ اس لباس کا استعمال نہیں کریں، ملازمین کو اس کا پابند کیا جارہا ہے اور اب پبلک مقامات پر بھی حیا کا یہ لباس پہننے کی ممانعت کردی گئی ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ سیکولرزم کے منافی ہے، اور اس سے مذہبی شناخت کا اظہار ہوتا ہے، مگر یہ بات پوری طرح واقعہ اور انصاف سے دور ہے، سیکولرزم کا مطلب یہ ہے کہ لوگ اپنی فکر پر قائم رہیں اور دوسروں کی فکر کا احترام کریں، نہ یہ کہ اپنے اپنے وجود کو گم کردیں اور کسی مذہبی گروہ کی کوئی پہچان باقی نہ رہے، مذہبی پہچان صرف لباس ہی سے متعلق نہیں ہوتی، ناموں سے بھی متعلق ہوتی ہے، عبادت گاہوں سے بھی اور زندگی کے مختلف مرحلوں میں انجام دیئے جانے والے اعمال سے بھی، اگر مذہبی پہچان ہونے کی بنیاد پر ان تمام چیزوں کو ختم کردیا جائے تو یہ کمیونزم تو ہوسکتا ہے، جس کی مخالفت میں مغرب پیش پیش رہا ہے، یہ سیکولرزم نہیں ہوسکتا، جس میں حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا؛ لیکن ہر شہری کو اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی ہوتی ہے۔

دوسرے: مذہبی شناخت کیا صرف مسلمانوں کو مٹانا مقصود ہے؟ یہودی اپنی مخصوص قسم کی ہیٹ اور کوٹ پہنیں، ان پر کوئی پابندی نہیں، عیسائی راہبات چہرہ چھوڑ کر پورے جسم کو چھپانے والا لباس استعمال کریں، اس پر کوئی اعتراض نہیں، سکھ حضرات اپنی ٹوپی اور کرپان کے ساتھ رہیں، اس میں کوئی

حرج نہیں؛ لیکن ساری آفت صرف مسلمانوں کے لئے ہے، کیا یہی منصفانہ رویہ ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ پردہ اسلامی شناخت نہیں؛ بلکہ نسوانی شناخت ہے، تمام مذاہب میں عورتوں کو ڈھکا چھپا لباس پہننے کا حکم دیا گیا ہے؛ کیوں کہ اس میں خواتین کا تحفظ ہے؛ لیکن یہ عجیب سیکولرزم ہے کہ جس میں عورت کے بے لباس ہونے میں تو کوئی رکاوٹ نہ ہو اور شرم وحیا کا لباس تار تار کر دینے کی ان کو پوری اجازت ہو؛ لیکن ان کا باپردہ رہنا قابل قبول نہ ہو، اس کو عورتوں کے استحصال کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟؟

اسلام کا تصور اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہر گروہ کو اپنی شناخت کی حفاظت کا حق حاصل ہے، نہ غیر مسلموں کو ان کے مذہبی اقدار پر عمل کرنے سے روکا جا سکتا ہے اور نہ مسلمانوں کے لئے یہ روا ہے کہ وہ اپنی پہچان گم کر دیں، پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کسی دوسری قوم کی مشابہت اختیار کی، گویا وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے، وہ ان ہی میں کا ایک فرد ہے: ''**من تشبه بقوم، فهو منهم**'' (**سنن ابی داؤد، كتاب اللباس، باب في لبس الشهوة، حديث نمبر: ۴۰۳۳**) اس کا مقصد تعصب و تنگ نظری نہیں ہے؛ بلکہ یہی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی پہچان قائم رکھنی چاہئے؛ اس لئے مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی شناخت کو باقی رکھیں، امن و امان کو قائم رکھتے ہوئے اس کی لڑائی لڑیں اور عام لوگوں کو معقولیت کے ساتھ اس کی حقیقت سمجھائیں، نیز سب سے اہم بات یہ ہے کہ خود اس پر عمل کریں؛ کیوں کہ صرف نظریہ کے ذریعہ کسی چیز کا تحفظ نہیں ہو سکتا، جب تک اس کے پیچھے عمل کی طاقت نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں بعض ادارے سکھوں کے لئے داڑھی کو مذہبی واجبات میں تصور کرتے ہیں اور مسلمانوں کے لئے نہیں، کاش! ہم پوری دردمندی کے ساتھ اس پہلو پر غور کریں!!

شہ رگ پر حملہ

(مساجد میں سرکاری دخل اندازی کی کوشش)

پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے جب مکہ میں دعوت دین کا کام شروع کیا تو مزاحمت کی مختلف صورتیں پیش آئیں، آپ چوں کہ ایک معزز اور طاقتور خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اور عرب کے قبائلی نظام کے مطابق پورا قبیلہ اپنے ایک ایک فرد کا تحفظ کیا کرتا تھا؛ اس لئے پہلے تو ان بے کس غلاموں پر تشدد کیا گیا، جنہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا، اور وہ مکہ کے سرکش اور اسلام کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے والے سرداروں کی غلامی میں تھے؛ جیسے: حضرت بلال، حضرت صہیب، حضرت یاسر، حضرت سمیہ، حضرت عمار رضی اللہ عنہم وغیرہ، جب اہل مکہ نے دیکھا کہ ایمان کا یہ نشہ کسی طرح اترتا ہی نہیں ہے تو اب انہوں نے دوسرے لوگوں کو بھی نشانہ بنانا شروع کردیا، خود رسول اللہ ﷺ کو بھی طرح طرح کے صدمے پہنچائے، آپ کے مکان کے دونوں جانب ابولہب اور عقبہ بن ابی معیط تھے، یہ در دولت کے اندر گھر کا کوڑا کرکٹ پھینک دیتے اور گھر کے سامنے بھی کچڑا ڈال دیتے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایذا رسانی کی کتنی نیچی سطح پر اتر آتے تھے۔

آخر جب ان کی یہ حرکتیں مسلمانوں کے پائے استقامت میں کوئی تزلزل پیدا نہیں کرسکیں تو اب انہوں نے اپنی سازش کا رخ تبدیل کرتے ہوئے ایک نئی چال چلی، قریش کے ایک سردار عتبہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر پیش کش کی کہ اگر آپ دولت چاہتے ہیں تو ہم تمام اہل مکہ مل کر آپ کے لئے دولت جمع کردیتے ہیں، یہاں تک کہ آپ مکہ کے سب سے مالدار شخص بن جائیں، اگر آپ کو یہاں کی کوئی خوبصورت لڑکی مطلوب ہو تو اس سے آپ کا نکاح کردیا جائے، اگر آپ بادشاہت چاہتے ہوں تو ہم سب مل کر آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلیتے ہیں، اور اگر آپ کو جن یا آسیب ہے تو ہم جھاڑ پھونک سے آپ کا علاج کرائیں گے، رسول اللہ ﷺ نے ان کی پوری بات سنی اور دریافت کیا کہ تم نے اپنی پوری بات کہہ لی؟ عتبہ نے کہا: ہاں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری بات بھی سنو، آپ نے کچھ اور کہنے کی بجائے حم سجدہ کی ۳۸ آیات تلاوت فرمائیں، جس چیز

میں سچائی ہوتی ہے انسان اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، آگ کی تصویر سے کوئی چیز گرم نہیں ہوسکتی؛ لیکن اگر حقیقی آگ ہوتو کوئی چیز اس کی آنچ سے گرم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی، قرآن مجید چوں کہ اللہ کی سچی کتاب ہے اور اس کا حرف حرف خالق کائنات کی طرف سے نازل ہوا ہے؛ اس لئے اس کوسن کر عتبہ کا دلِ سنگ دل بھی تھوڑی دیر کے لئے پگھل گیا اور انہوں نے جا کر اپنے رفقاء سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو کلام پڑھتے ہیں نہ وہ شعر ہے، نہ کہاوت اور جادو اس لئے بہتر ہے کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے؛ لیکن دوست احباب اس کو قبول کرنے کے روادار نہیں ہوئے اور الٹے عتبہ ہی کو کوسنے لگے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن حالات وواقعات سے گزرے وہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین تھے، یہ بات یقیناً قادر مطلق کی قدرت میں تھی کہ وہ ان مصیبتوں اور آزمائشوں سے گذارے بغیر اہل مکہ کے دلوں میں ایمان کا پودا لگادیتا اور ہجرت کے آٹھویں سال فتح مکہ کا جو عظیم الشان واقعہ پیش آیا اور پھر اہل مکہ ایمان لے آئے، وہ اسی دن پیش آ گیا ہوتا جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صفا کی پہاڑی پر چڑھ کر لوگوں کو ایمان کی دعوت دی تھی، مگر ایسا نہیں ہوا اور مختلف آزمائشوں سے گزرنے کے بعد جزیرۃ العرب کی گردنیں اسلام کے سامنے جھکائی گئیں، اور نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کرنوں سے ہر کچے پکے گھر کو روشن کیا گیا، غالباً اس کی مصلحت یہ تھی کہ امت کو جن حالات سے گزرنا ہے اور ابتلاؤں وآزمائشوں کی جن جن بھٹیوں میں تپایا جانا ہے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان سے گذار دیا جائے؛ تا کہ امت کے لئے اسوہ اور نمونہ رہے۔

غرض کہ اسلام کو روکنے کے لئے بنیادی طور پر دو راستے اختیار کئے گئے، ایک: خوف زدہ کرنے کا، دوسرے: لالچ دینے کا، ترہیب وتخویف کا اور تحریص وترغیب کا، یہی دونوں ہتھیار مسلمانوں کو راہ حق سے ہٹانے کے لئے ہر دور میں استعمال کئے جاتے رہے ہیں، اسلام اور مغرب کی جنگ جو صدیوں سے جاری ہے اگر چہ کہ مختلف ادوار پر مشتمل ہے؛ لیکن اس میں بنیادی طور پر یہی ہتھیار استعمال کئے گئے ہیں؛ البتہ جنگ کے میدان بدلتے رہتے ہیں، پہلے ایک دور صلیبی جنگوں کا رہا ہے، جو میدان کارزار میں لڑی گئی، اور یہ مسلمانوں کی فتح پر ختم ہوئی، اس کے بعد استعماری دور آیا، تین صدیوں تک عالم اسلام کی سائنس اور ٹکنالوجی سے غفلت اور مغرب کی اس میدان میں مسلسل پیش

قدمی کے نتیجہ میں اہل مغرب کو واضح طور پر فوجی برتری حاصل ہوگئی، اور انہوں نے پورے عالم اسلام؛ بلکہ پوری مشرقی دنیا کو اپنی غلامی کی زنجیر میں جکڑ لیا، بیسویں صدی میں یہ زنجیر کٹنی شروع ہوئی اورصورت حال یہ ہوئی کہ یا تو برطانیہ کے حدود اقتدار میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، یا یہ سورج ایسا غروب ہوا کہ اب برطانیہ کی جغرافیائی حدود ہندوستان کے ایک صوبہ کے برابر ہوں گی، اس کے بعد تیسرے دور کا آغاز ہوا، جس سے اس وقت دنیا گزر رہی ہے کہ انہوں نے ملک وزمین کو تو بظاہر چھوڑ دیا؛لیکن اپنے خیال کے مطابق اسلام کو شکست دینے کے لئے دوطریقے اختیار کئے، ایک یہ کہ انہوں نے حکومتوں کو اپنا غلام بنالیا، اوران کو ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ مسلمانوں پر جور وستم ڈھائیں اور اسلام کو رسوا کرنے کی کوشش کریں، یہ کام وہ غیر مسلم کا غلبہ رکھنے والی حکومتوں سے بھی لے رہے ہیں اوران سے بڑھ کر ان نام نہاد مسلم حکومتوں سے لیے ہیں، جہاں حکومت کو جابر بادشاہوں اور ظالم حکمرانوں سے پوچھے بغیر سانس لینے کی بھی اجازت نہیں، دوسری طرف انہوں نے فکری یلغار کا راستہ اختیار کیا ہے کہ بددیانت یہودی، عیسائی اور بے ضمیر نام نہاد مسلمان مصنفین سے اسلام کے خلاف جھوٹ لکھا یا جائے اورایک جھوٹ کو اس قدر دہرایا جائے کہ سادہ لوح لوگ اسے سچ سمجھنے لگیں۔

یہ منصوبہ بندی اتنی منظم اور طاقتور تھی کہ شاید کوئی اور قوم اس کا مقابلہ نہیں کر پاتی اور بحیثیت قوم انہوں نے اپنے آپ کو بدل لیا ہوتا؛لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس غیر معمولی مادی وفکری یلغار کے باوجود مسلمانوں نے اپنے دین وایمان کو محفوظ رکھا ہے؛ اگرچہ نوجوانوں کے ایک طبقہ کو اس نے دین حق کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا کر دیا ہے؛لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے بڑے طبقہ میں دین سے وابستگی میں اضافہ ہوا ہے، خاص کر نوجوان مرد وخواتین میں اسلام سے محبت اور بڑھ گئی ہے، اور پوری اسلامی تاریخ یہی رہی ہے کہ اس پودے کو جس قدر کاٹنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس کے برگ وبار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، یہ وہ چراغ نہیں کہ جلے اور بجھ جائے، یہ وہ چراغ ہے کہ جس قدر اس کو بجھانے کی کوشش کی جاتی ہے، اس کی لو اور تیز ہوتی جاتی ہے، ان مشکل حالات میں بھی مسلمانوں میں اسلام سے وابستگی باقی رہنے اور پوری قوت کے ساتھ اس رشتہ کے قائم رہنے کا سبب ''دینی مدارس'' اور ''مساجد'' ہیں، مدارس کے ذریعہ مسلمانوں میں مذہبی قیادت کی پیدائش کا تسلسل قائم ہے، اس کی وجہ سے کبھی امت میں کوئی خلا پیدا نہیں ہوا کہ مسلمانوں میں اب کوئی دین کا

راستہ بتانے والا نہیں رہا ہو، اس طرح مساجد کے ذریعہ عام مسلمانوں کی اصلاح کے مراکز قائم رہے اور ایسا نہیں ہوا کہ فکری اور تہذیبی ارتداد پر روکنے والی زبانیں گنگ ہوگئی ہوں۔

مغرب نے اس حقیقت کو محسوس کرلیا ہے، اسے اندازہ ہوگیا ہے کہ یہ دو سرچشمے وہ ہیں، جو مسلمانوں کی فکر ونظر کا سودا کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں؛ اسی لئے اب مغرب سے لے کر مشرق تک انہوں نے مدارس ومساجد کو اپنا نشانہ بنایا ہے، عالم اسلام میں مدارس کے نصاب تبدیل کردئے گئے، اصلاح وترقی کے نام پر جامع ازہر کا پورا نظام تعلیم بدل دیا گیا، اور طلبہ کی تربیت ان خطوط پر کی جانے لگی کہ ایک شخص علوم وفنون کا ماہر تو ہوجائے وہ قرآن وحدیث پر متأثر کن درس دے سکے اور کتابیں لکھ سکے؛ لیکن وہ دینی غیرت وحمیت سے محروم ہو، اس تربیت کا اثر مسلم ملکوں میں حکومت کے زیر اثر اداروں کے فضلاء میں بہ آسانی دیکھا جاسکتا ہے کہ وہاں کے مفتی اعظم حکومت کی ہر بات پر مہر تصدیق ثبت کرتے جاتے ہیں، مغرب سے اٹھنے والی ہر تحریک کو سند جواز فراہم کرنا، گویا ان کے فرائض میں داخل ہے، اگر کسی خلاف شرع عمل کی تائید وتقویت ممکن نہ ہو تو کم سے کم وہ خاموشی ضرور اختیار کرتے ہیں اور حکومت پر نکیر کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔

اسی طرح مساجد کو قابو میں رکھنے کے لئے وہاں سرکاری درسگاہوں کے فارغین کا تقرر کیا جاتا ہے، اور ان کی تربیت اسی انداز پر کی جاتی ہے کہ ان کے پاس سب کچھ ہو مگر ضمیر نہ ہو، وہ دینی غیرت وحمیت سے خالی ہوں، نہ دین کی رسوائی ان کو بے قرار کرے اور نہ خون مسلم کی ارزانی سے ان کے دل میں کوئی درد اٹھے، گذشتہ دنوں یہ بات سامنے آئی کہ ایک مسلم ملک کے بددین اور ظالم حکمراں نے ان لوگوں کو امام مقرر کیا گیا ہے، جن کی خصوصی تربیت کی گئی ہے اور اس تربیت میں یہ بات بھی شامل تھی کہ اسلام میں پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے، چاہے وہ جیسا بھی ہو، اسرائیل بھی ہمارا پڑوسی ہے؛ اس لئے ہمیں اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہئے، خواہ اس کا عمل کچھ بھی ہو، اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ عالم اسلام میں خود اسلام کو اجنبی بنادیا گیا ہے اور جو لوگ حقیقی مسلمان ہیں، ان کے لئے دار ورسن تیار رکھا گیا ہے، برصغیر کے مسلمانوں نے اپنا طریقہ یہ رکھا ہے کہ وہ خود ایک ایک پیسہ جمع کرکے مدارس اور مساجد کے نظام کو قائم رکھتے ہیں اور تعلیم کے ساتھ ساتھ ایسی فکری تربیت کرتے ہیں کہ چاہے ان کے بعض فارغین علمی استعداد کے اعتبار سے کم درجہ کے ہوں؛ لیکن ان کا قلب

و ذہن دینی حمیت کے جذبات سے معمور ہو۔

چنانچہ ان مدارس اور مساجد کو اپنی گرفت میں لینے کے لئے دوہری کوششیں کی جارہی ہیں، کبھی ان پر دہشت گردی کا الزام لگایا جاتا ہے، کبھی انہیں ملک کی سالمیت کے لئے خطرہ قرار دیا جاتا ہے، کبھی اساتذہ وطلبہ پر فرقہ وارانہ حملے کئے جاتے ہیں، کبھی مدارس کے ذمہ داران اور ائمہ مساجد کو جھوٹے الزام لگا کر ملزم کے کٹہرے میں کھڑا کیا جاتا ہے، یہ ہتھیار بار بار آزمائے گئے اور اب بھی آزمائے جارہے ہیں؛ لیکن نہ آج تک ان پر کوئی جرم ثابت ہوسکا اور نہ اہل مدارس اور ائمہ مساجد نے اپنے حوصلے ہارے؛ لیکن اب اس کے بعد دوسری کوشش لالچ دیکر اور مادی منافع کی ترغیب دے کر انہیں پھانسنے کی کوشش کی جارہی ہے، کبھی مدرسہ بورڈ قائم کرنے اور مدرسہ کے تعاون کرنے کی بات کہی جاتی ہے، بعض ریاستوں میں ایسے بورڈ قائم ہو چکے ہیں، جو مدارس ان سے ملحق ہوئے ہیں، وہ اپنے اصل مقصد سے اتنی دور جا چکے ہیں کہ ملت کے دردمند لوگ ان کی اپنی منزل کی طرف واپسی سے مایوس ہو چکے ہیں؛ لیکن بہر حال اب بھی ان مدارس کی کثیر تعداد موجود ہے جنہوں نے اپنے آپ کو حکومت کی مداخلت سے آزاد رکھا ہے اور سلف کے طریقہ کے مطابق توکل علی اللہ کو اپنا سرمایہ بنایا ہے، اب حکومت کی توجہ ان بچے کچے مدارس کی طرف ہے۔

مساجد کو بالواسطہ طور پر حکومت کی نگرانی میں لانے کی کوشش کا آغاز سابق وزیر اعظم جناب نرسمہاراؤ نے کیا تھا، جن کے کاندھوں پر بابری مسجد کی شہادت کا جرم عظیم ہے، اور جو کانگریس میں آر ایس ایس کے ایک وفا شعار سپاہی اور اس کے احکام کے تابع دار فوجی کی حیثیت سے شامل تھے، انہوں نے ائمہ کو حکومت کی جانب سے تنخواہ کی پیش کش کی اور جمیل الیاسی مرحوم کو اس سلسلہ میں آلۂ کار بنایا؛ لیکن یہ تحریک کامیاب نہیں ہوسکی، مگر اب اس کو دوبارہ زندہ کیا جارہا ہے، اس وقت میرے سامنے ایک مطبوعہ درخواست فارم ہے، جو چیف ایگزیکٹو وقف آندھرا پردیش کے نام سے ہے، اس میں امام ومؤذن اور مسجد کے نام کی جگہ خالی رکھی گئی ہے اور التجا کی گئی ہے کہ مجھے جو تنخواہ مل رہی ہے، وہ اخراجات کے لئے ناکافی ہے اور اتنی آمدنی میں گھر کی کفالت مشکل ہے؛ اس لئے مجھے اپنے تنخواہ کے رجسٹر میں شامل کر لیجئے اور مسجد کی انتظامی کمیٹی کو مطلع کرتے ہوئے کورٹ کے احکام کے مماثل تنخواہ کا اجراء کیجئے، معلوم ہوا ہے کہ یہ فارم لے کر گورنمنٹ کے کارندے مسجد مسجد گھوم رہے ہیں اور ائمہ

ومؤذنین نیز مسجد کمیٹیوں کو ترغیب دے رہے ہیں کہ وہ فارم کی خانہ پوری کریں۔

اگر ائمہ ومؤذنین نے حکومتوں سے تنخواہیں حاصل کرنی شروع کردیں تو یوں تو اس سے متعدد نقصانات ہوں گے، جیسے ان ملازمین پر عوامی گرفت کا ختم ہوجانا، یہاں تک کہ نمازوں کی پابندی کا کوئی نظام باقی نہیں رہ پائے گا، رشوت دے کر، جھوٹ بول کر، بحالی کرانا، مصنوعی سرٹیفکٹ کے ذریعہ ملازمتیں حاصل کرنا، خلاف واقعہ حاضری بنانا اور سرکاری ذمہ داروں کو دھوکہ دینا، غرض کہ وہ تمام برائیاں آجائیں گی، جو عام طور پر سرکاری محکموں میں پائی جاتی ہیں، امام ومؤذن جیسے مقدس پیشے بھی پوری طرح تجارتی رنگ اختیار کرلیں گے، اِن عہدوں کے لئے لڑائیاں ہوں گی، مگر سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ پھر ائمہ وخطباء وہی کچھ کہیں گے، جن کو کہنے کی حکومت کی طرف سے ہدایت دی جائے گی، اب اظہارِ حق کے لئے منبروں پر بھی جگہ باقی نہیں رہے گی، اور وہ دینی حمیت اور داعیانہ تڑپ مفقود ہوجائے گی، جو بہر حال کسی نہ کسی درجہ میں آج بھی پائی جاتی ہے؛ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اس فتنہ کے دوررس اثرات کو سمجھیں اور اپنی مساجد کا تحفظ کریں، ورنہ اشاعت دین اور حفاظت دین کے بنیادی سرچشمے بھی - خدانخواستہ - ہمارے ہاتھوں سے نکل جائیں گے، یہ ملت کے ہاتھ پاؤں پر نہیں؛ بلکہ اس کی شہ رگ پر حملہ ہے، کاش کہ تمام مسلمان اس حقیقت کو سمجھیں اور چند روپیوں کے عوض اپنے ضمیر اور دینی حمیت کا سودا نہ کریں۔

حِلفُ الفُضُول کی ضرورت

(انصاف پسند اور مظلوم برادرانِ وطن کے ساتھ مل کر جدو جہد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات کو پوری انسانیت کے لئے عموماً اور امت محمد یہ کے لئے خصوصاً اسوہ ونمونہ بنایا گیا ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ۲۱) اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان پر جس طرح کے بھی حالات پیش آئیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں اس کو نقش راہ اور نمونۂ عمل جائے گا، وہ غالب ہو یا مغلوب، فتح یاب ہو یا شکست سے دو چار، مالدار ہو یا غریب، دوستوں کے درمیان ہو یا دشمنوں کے درمیان، اپنوں سے سابقہ ہو یا بیگانوں سے، ہر جگہ اور ہر حال میں سیرت طیبہ اس کے لئے چراغِ راہ اور خضر طریق ہے، شاید اسی مقصد کے تحت اللہ تعالیٰ نے اپنے اس محبوب ومقبول بندے کو ہر طرح کی آزمائشوں سے گزارا ہے، اور وہ تمام مصیبتیں جو اس امت پر آسکتی ہیں، ان سب سے آپ کو بھی دو چار کیا گیا ہے؛ تاکہ جب ایسے حالات پیش آئیں تو مسلمان نورِ نبوت کی رہنمائی سے محروم نہ رہ جائیں اور انہیں کسی اور چراغ سے روشنی مستعار نہ لینی پڑے۔

اس وقت ہندوستان کے مسلمان جس صورت حال سے دو چار ہیں، اس میں سیرت کے ایک خاص واقعہ کو پڑھنے اور اس سے سبق حاصل کرنے کی ضرورت ہے، اور وہ ہے ''حلف الفضول'' کا واقعہ، واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنائے جانے سے پہلے ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ قبیلۂ بنوزبید کے ایک صاحب مکہ آئے اور انہوں نے عاص بن وائل سہمی سے اپنا تجارتی مال فروخت کیا، عاص نے قیمت کی ادائیگی میں ٹال مٹول شروع کر دیا اور ظلم وانکار پر اتر آیا؛ چنانچہ اس مسافر نے ٹھیک اس وقت جب قریش صحن کعبہ میں بیٹھا کرتے تھے، بوقبیس کی پہاڑی پر چڑھ کر لوگوں کو آواز دی کہ ایک مظلوم شخص کی پونجی لے لی گئی ہے، ایک ایسے شخص کی جو اپنے وطن اور بال بچوں سے دور ہے اور حرم محترم کی وادی میں مقیم ہے، اس طرح کے ظلم وزیادتی کے واقعات مکہ میں پیش آتے رہتے تھے؛ لیکن اس اجنبئ شہر نے کچھ ایسے درد کے ساتھ اپنی فریاد پیش کی کہ قریش کے رحم دل لوگ اس

سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہے اور قریشِ مکہ کے چند اہم خاندان —— بنو ہاشم، بنو مطلب، اسد بن عبد العزیٰ، زہرہ بن کلاب اور تیم ابن مرہ —— کی اہم شخصیتیں عبداللہ بن جدعان کے مکان میں جمع ہوئیں، اور آپس میں معاہدہ کیا کہ مکہ میں کوئی بھی مظلوم ہو، خواہ مکہ کا رہنے والا ہو یا مکہ کے باہر سے آیا ہو، ہم سب مل کر اس کی مدد کریں گے اور ظالم کو حق دینے پر مجبور کریں گے، اس معاہدہ کا نام ''حلف الفضول'' رکھا گیا، یہ نام کیوں رکھا گیا، اس سلسلہ میں بعض حضرات نے لکھا ہے کہ ''فضل'' کے معنی زیادتی اور اضافہ کے ہیں اور اس معاہدہ میں یہ بات کہی گئی تھی کہ اگر کسی شخص پر دوسرے کے ذمہ زائد حق باقی ہو تو وہ اس کو دلایا جائے گا۔ (**المعتصر من المختصر لابن یوسف موسیٰ حنفی: ۲/۵۷۳**) اور بعض حضرات نے نقل کیا ہے کہ اتفاق سے اس معاہدہ میں شریک ہونے والوں میں ''فضل، فضالہ اور مفضل'' تھے، یعنی ان تینوں کے نام کا جز ''فضل'' تھا؛ اس لئے اس کو ''حلف الفضول''، یعنی ''فضل والوں کے معاہدہ'' کا نام دیا گیا۔ (فتح الباری: ۴/۴۷۳)

اس معاہدہ کی اس لئے غیر معمولی اہمیت تھی کہ جزیرۃ العرب میں کوئی حکومت قائم نہیں تھی، لا اینڈ آرڈر کے لئے کوئی باقاعدہ نظام نہیں تھا، عرب کے مختلف قبائل کے درمیان بڑا تعصب اور تعصب کی وجہ سے اپنے خاندان کا تحفظ پایا جاتا تھا؛ لیکن اگر کوئی کمزور خاندان ہو یا اجنبی لوگ ہوں تو ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا تھا، ان حالات میں یہ معاہدہ لا اینڈ آرڈر کو قائم رکھنے اور کمزوروں کو طاقتوروں کے ظلم سے بچانے کی ایک منظم کوشش تھی، اس کی اہمیت اس لئے بھی تھی کہ اس معاہدہ میں قریش کے تمام قبائل شامل تھے، اگر چند اشخاص یا کوئی کم تعداد اور کمزور قبیلہ اس کام کو لے کر اٹھتا تو اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا؛ لیکن اتنے سارے کثیر التعداد اور مکہ کے طاقتور خاندانوں کو نظر انداز کردینا کوئی آسان بات نہ تھی؛ اس لئے اس معاہدہ کی بڑی اہمیت تھی اور اسی لئے یہ معاہدہ لا قانونیت کے ماحول میں امن وامان اور عدل وانصاف قائم رکھنے کی ایک مثبت اور مؤثر کوشش ثابت ہوا، رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس اس معاہدہ میں شریک تھے اور اسلام کے غلبہ کے بعد بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر اب بھی مجھے اس کی طرف دعوت دی جائے تو میں اسے قبول کروں گا: ''**لو دُعیتُ به الیوم في الإسلام لأجبته**'' (فتح الباری: ۴/۴۷۳) اور بعض روایتوں میں ہے کہ مجھے اس معاہدہ سے غائب رہنا پسند نہیں، اگرچہ اس کے بدلے مجھے سرخ اونٹنیاں مل

جائیں۔(المعتصر من المختصر: ۲/ ۳۷۵)

ہندوستان میں اس وقت مسلمان جن حالات سے گزر رہے ہیں اور سیاسی اعتبار سے جس تنہائی کا شکار ہیں، ان کے لئے سیرت کا یہ واقعہ بہترین پیغام اور ان کی دشواریوں کا حل ہے، حلف الفضول کس ماحول میں قائم کی گئی تھی؟ ایسے ماحول میں جب ظالموں کو ظلم سے روکنے والی قوت موجود نہیں تھی، جب مظلوموں کے لئے انصاف حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، جب برائیاں تھیں؛ لیکن برائیوں کو چیلنج کرنے والی کوئی طاقت نہیں تھی —— حلف الفضول کا مقصد کیا تھا؟ معاشرہ میں انصاف کا قائم کرنا، کمزوروں کو انصاف دلانا اور ظلم سے بچانا—— حلف الفضول کا طریقۂ کار کیا تھا؟ جمہور کی مدد سے ظالم کا پنجہ تھامنا، اجتماعی شیرازہ بندی کے ذریعہ قیام عدل کی کوشش کرنا، چھوٹی چھوٹی طاقتوں کو جمع کرکے ایک بڑی طاقت اس لئے تیار کرنا کہ ظلم کو روکا جائے اور انصاف قائم کیا جائے۔

ہمارے ملک میں بھی اس وقت یہی صورت حال ہے، ظلم کا خونی پنجہ اتنا طاقتور ہو چکا ہے کہ علی الاعلان خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے، لوگوں کی املاک لوٹی جاتی ہیں، عزت وآبرو پامال کی جاتی ہے، بستیاں اجاڑی جاتی ہیں اور لاشوں پر چڑھ کر اقتدار کے قلعہ پر قبضہ کرنے کی جدوجہد کی جاتی ہے، ہونا تو یہ چاہئے کہ لوگ اس صورت حال کو دیکھ کر بے قرار ہوجائیں، ہر زبان ایسے ظالم کو ٹوکے، ہر ہاتھ ایسے ظالم کو روکے اور ہر آنکھ ان پر غیظ وغضب کی آگ پھینکے، مگر عملاً صورت حال یہ ہے کہ ظالموں کی حمایت میں نعرے لگائے جارہے ہیں، ذرائع ابلاغ درندوں کو فرشتہ بنا کر پیش کررہے ہیں اور انصاف کے قاتلوں کو ہیرو بنایا جارہا ہے، ان حالات میں مسلمانوں کے لئے کرنے کا کام یہی ہے کہ وہ یہاں ایک نئی شیرازہ بندی کریں، خود آپس کے اختلاف کو نظر انداز کرکے کم سے کم ایک نکاتی سیاسی ایجنڈے پر متفق ہوجائیں کہ وہ فرقہ پرست سیاسی طاقتوں سے ملک کو بچائیں گے اور ایسی حکمت عملی اختیار کریں گے کہ آنے والے الیکشن میں سیکولر امیدوار کامیاب ہوسکے، ملی اتحاد کی اس کوشش کے ساتھ ساتھ کم سے کم تین اور طبقات کو ہمیں جمع کرنا چاہئے: اولاً: دوسری اقلیتوں کو، خاص کر سکھ اور عیسائی اقلیت کو، جو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں سیاسی اعتبار سے فیصلہ کن حیثیت کی حامل ہیں، دوسرے: دلتوں کو، جو ہزاروں سال سے مظلومانہ زندگی گزار رہے ہیں اور جن کو اپنے بارے میں یہ اعتراف ہے کہ وہ ہندو نہیں ہیں، انہیں زبردستی ہندو بنا دیا گیا ہے، تیسرے: سیکولر برادرانِ وطن کو؛ کیوں کہ آج

بھی ہندو بھائیوں کی اکثریت اس ملک کے فرقہ وارانہ رخ اختیار کرنے پر فکر مند بھی ہے اور متأسف بھی، اگر مسلمان ان تینوں گروہوں کو ساتھ لے کر ایک 'حلف الفضول' قائم کرنے میں کامیاب ہوجائیں، ایک ایسا مشترکہ پلیٹ فارم بنائیں جو ہر ظلم کے مقابلہ میں کمر بستہ ہو اور ہر مظلوم کو انصاف دلانے کے لئے اٹھ کھڑا ہو، کسی دلت کے ساتھ زیادتی ہو تو پُرامن طریقے پر مسلمان احتجاج کریں اور کسی مسلمان کے ساتھ زیادتی ہو تو اس کے تحفظ کے لئے دلت آگے بڑھیں، اگر اس طرح کا کوئی پلیٹ فارم قائم کرنے میں مسلمان کامیاب ہوجائیں تو موجودہ حالات میں یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی اور بہت سے امراض کا مداوا اور مشکلات کا حل ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ نے قیام عدل، تحفظ اور امن وامان کی برقراری کے لئے غیر مسلم ابنائے وطن کے ساتھ مختلف معاہدات کئے ہیں، خود مکہ میں بھی آپ نے اہلِ مکہ سے پیش کش کی تھی کہ بقائے باہم کے اصول پر مسلمان اور غیر مسلم دونوں سوسائٹی میں مل جل کر رہیں، قرآن مجید کی سورۂ کافرون میں یہی فارمولہ پیش کیا گیا ہے، پھر مدینہ پہنچتے ہی آپ ﷺ نے مسلمان، یہودی اور مشرک قبائل کے درمیان ایک اہم معاہدہ کرایا، اس معاہدہ کو قیدِ تحریر میں بھی لایا گیا اور تمام قبائل کے اس پر دستخط لئے گئے، جس کو 'میثاق المدینة'' کہا جاتا ہے اور حلف الفضول کا واقعہ تو آپ ﷺ کی نبوت سے پہلے کا ہے؛ لیکن اس کی جو اہمیت آپ کی نگاہ میں تھی، اس کا اندازہ اس جملہ سے کیا جاسکتا ہے جو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر مجھے آج بھی اس کی طرف بلایا جائے تو میں اس کو قبول کروں گا'' گویا یہ ایک وقتی تدبیر اور عارضی حکمتِ عملی نہیں تھی؛ بلکہ ایک اصولی فیصلہ تھا، جو اسلامی تعلیمات کی روح پر مبنی اور اس کے اصول انصاف کا آئینہ دار تھا۔

اس ملک کو بچانے، ملک کے دستور اور اس کی جمہوری قدروں کو بچانے اور عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے نہ صرف اس ملک کی دوسری بڑی اکثریت ہونے کے لحاظ سے بلکہ خیر امت ہونے کی حیثیت سے بھی مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ حقیر اور وقتی سیاسی مفادات کو نظر میں رکھنے کے بجائے ملک وملت کے وسیع تر مفادات کو سامنے رکھ کر اس سلسلہ میں پیش قدمی کریں، اس کوشش میں منصوبہ بندی تو ضرور ہونی چاہئے لیکن اس کی تشہیر نہیں ہونی چاہئے؛ کیوں کہ ایسے معاملات کی تشہیر سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے، اگر موجودہ حالات میں مسلمان بے سمتی کا شکار رہے، انہوں

نے سوچے سمجھے منصوبہ کے مطابق اپنے لئے راہ عمل متعین نہیں کی، تو اتنے بڑے نقصان کا خطرہ ہے جس کی تلافی دشوار ہو جائے گی؛ کیوں کہ اس وقت ہمارا ملک ایک دوراہے پر کھڑا ہے: ایک راستہ یہ ہے کہ سیکولر طاقتیں اپنی کمزوری کی وجہ سے فرقہ پرست طاقتوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں اور گویا اپنی شکست کا اعتراف کرلیں، یہاں تک کہ یہ ملک مستقل طور پر فرقہ پرستی کے راستہ پر چلا جائے، دوسرا راستہ یہ ہے کہ مسلمان سیکولر عناصر کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کریں، انہیں طاقت پہنچائیں، ان کے اندر فرقہ پرستی سے لڑنے کا حوصلہ پیدا کریں اور اس ملک کو ان لوگوں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دیں، جو اقتدار کو حاصل کرنے کے لئے انسانی خون کا دریا پار کرنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے!!

ضرورت ہے عزم اور منصوبہ بندی کی!

ملک کے موجودہ حالات نے بجا طور پر مسلمانوں کو سخت تشویش میں مبتلا کر دیا ہے، بی جے پی کے منشور میں متعدد ایسی باتیں شامل رہی ہیں، جو واضح طور پر مسلمانوں کی مخالفت پر مبنی ہیں، خاص طور پر رام مندر کی تعمیر، یکساں سول کوڈ، دینی مدارس کی تجدید کاری کے علاوہ دفعہ ۳۷۰ کشمیر کے ان مسلمانوں کے لئے ناقابل قبول ہے، جنھوں نے ۱۹۴۸ء میں پاکستان کے مقابلہ ہندوستان کا ساتھ دیا، حکومت کے بعض ذمہ داروں کے بیانات نے اس تشویش میں اضافہ کیا ہے، جن سے واضح ہوتا ہے کہ حکومت اپنے ایجنڈے کے ان نکات سے پیچھے نہیں ہٹی ہے، یہ بات نہ صرف مسلمانوں کے لئے تکلیف دہ ہے؛ بلکہ ملک کے جمہوری اقدار پر ایک بدنما داغ ہے کہ خود حکومت اپنے عوام کے ایک طبقہ کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کر رہی ہے، اور یقیناً برادران وطن کی اکثریت، جو انصاف پسند ہیں اور سیکولزم پر یقین رکھتے ہیں، وہ بھی اس سلسلہ میں مسلمانوں کے ہم خیال ہی ہوں گے۔

لیکن مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے واقعات کی وجہ سے پست ہمتی اور کم حوصلگی کا شکار نہ ہوں، اہل ایمان کی شان یہ ہے کہ ایسے واقعات ان کے ایمان میں مزید اضافے کا سبب بن جائیں اور دشمنی کا خوف کبھی ان کے عزم وحوصلہ کو کمزور نہیں کر پائے، قرآن مجید میں عہد نبوی کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ غزوہ احد میں مشرکین مکہ کی طرف سے ابوسفیان نے چیلنج کیا کہ آئندہ سال بدر کے میدان میں پھر ہمارا مقابلہ ہوگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیلنج کو قبول کر لیا اور آئندہ سال حسب وعدہ مسلمانوں کی ایک فوج کے ساتھ بدر کا سفر فرمایا، وہاں پہنچ کر کئی دنوں تک قیام کیا گیا؛ لیکن اہل مکہ کو ہمت نہیں ہوئی اور وہ مقابلہ پر نہیں آئے، اس موقع سے منافقین نے مسلمانوں میں خوف ودہشت پیدا کرنے کے لئے ان سے کہا کہ اس سے پہلے 'احد' میں وہ آئے، ہم نے تم لوگوں کو مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کرنے سے منع کیا تھا، مگر تم لوگوں نے قبول نہیں کیا، اور اس طرح ان لوگوں نے تم کو تمہارے گھر آ کر شکست دی، اب تم ان کی طرف بڑھ رہے ہو اور گویا ان کے علاقہ میں جا کر ان سے مقابلہ کرنا چاہتے ہو، تو یاد رکھو کہ انہوں نے تمہارے خلاف بڑا مجمع اکٹھا کر لیا

ہے،اس بات کا خطرہ ہے کہ تم میں سے ایک شخص بھی واپس نہیں آ سکے؛لیکن صحابہ کی ثابت قدمی کا حال یہ تھا کہ بجائے اس کے کہ وہ خوفزدہ ہوتے انہوں نے پوری جرأت کے ساتھ کہا: **حسبنا اللہ و نعم الوکیل**، ہمارے لے اللہ ہی کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے،قرآن مجید نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے:

مسلمان وہ ہیں کہ لوگوں نے ان سے کہا کہ تمہارے مقابلہ میں بہت سے لوگ اکٹھا ہو گئے ہیں،لہٰذا تم ان سے ڈرو،تو اس بات نے ان کے ایمان میں مزید اضافہ کر دیا اور وہ کہنے لگے: ہمارے لئے اللہ ہی کافی ہیں اور اللہ ہی بہترین کارساز ہیں؛ چنانچہ مسلمان اللہ کی نعمت اور مہربانی کے ساتھ واپس ہوئے،ان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے طلب گار رہے،اور اللہ بڑے ہی فضل والے ہیں،یقیناً شیطان ہے جو اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے؛اس لئے تم ان سے مت ڈرو،مجھ سے ہی ڈرو،اگر تم واقعی ایمان والے ہو(آل عمران: ۱۷۳۔۱۷۵)

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کفر کی نفسیات یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو خوف ودہشت میں مبتلا کرنا چاہتا ہے،وہ چاہتا ہے کہ ان کا حوصلہ ٹوٹ جائے اور ان کی ہمتیں پست ہو جائیں،یہ ایک شیطانی چال ہے،شیطان اس کام کے لئے اپنے چیلوں کو استعمال کرتا ہے،شیطان کا یہ کام معاندانہ قوتوں کے ذریعہ بھی ہوتا ہے اور مسلمانوں کی صفوں میں گھسے ہوئے منافقین کے ذریعہ بھی؛لیکن اہل ایمان کی شان یہ ہے کہ وہ ایسی باتوں سے گھبرائیں نہیں؛ بلکہ اس سے ان کے حوصلے بلند ہوں اور ان کے ارادہ میں مزید طاقت پیدا ہو جائے،ان کے عزائم مضبوط ہوں،اسلام کی یہ تاریخ ان کے پیش نظر ہو کہ ہر دور میں حق اور سچائی کے علمبرداروں کو اسی راہ سے گذرنا پڑا ہے؛اس لئے یہ کوئی نئی بات نہیں یہ سوچ کر ان کے ایمان میں اضافہ ہوگا؛ کیونکہ انہیں محسوس ہوگا کہ وہ بھی اسی ربانی گروہ کے نقش قدم پر ہیں جو گذشتہ انبیاء اور خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔

ایسے موقع پر مسلمانوں کی سوچ یہ ہونی چاہئے کہ قسمتوں کے فیصلے زمین پر نہیں آسمان پر ہوتے ہیں؛ اس لئے ہمارا اصل بھروسہ اللہ پر اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہدایات اور تعلیمات پر ہونا چاہئے، چنانچہ صحابہ نے اس دھمکی اور دھشت آمیز خبر کو سن کر ایک ہی بات فرمائی: "**حسبنا اللہ و نعم الوکیل**" اللہ کی ذات ہمارے لئے کافی ہے، اور وہی ہمارا کارساز ہے۔ مادی اسباب غیبی

نصرت کے مقابلہ میں کوئی طاقت نہیں رکھتے، ان کی مثال خس وخاشاک کی ہے، جو دریا کے صاف وشفاف پانی پر چھا جاتے ہیں؛ لیکن اتنی ہی تیزی کے ساتھ چھٹ بھی جاتے ہیں، یہ گھٹائیں ہیں، جو سورج کے رخ تاباں پر چھا گئی ہیں؛ لیکن چھٹ جانا ان کا مقدر ہے، یہ ایک آندھی ہے جو آبادیوں کو تہہ وبالا کر دیتی ہے؛ لیکن ان میں ٹھہراؤ نہیں، یہ بارش کی کثرت سے ابل آنے والا سیلاب ہے، جو بظاہر شہروں اور بستیوں کو تالاب میں تبدیل کر دیتا ہے؛ لیکن اس میں قرار نہیں، اس لئے مسلمانوں کو ہرگز ایسے واقعات سے گھبرانا نہیں چاہئے، یہ بات کہ کفر کی طاقت ہماری ہمت وحوصلہ کو توڑ دے، ہرگز مسلمانوں کے شایان شان نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں اس بات کا اشارہ بھی موجود ہے کہ جو صورت حال بظاہر ناکامی ونامرادی کی نظر آتی ہے، اسی سے کامیابی اور ظفر یابی کا راستہ بھی کھلتا ہے، اور جب مسلمان اس آزمائش سے باہر نکلتے ہیں تو اللہ کے فضل سے مالامال ہوکر، اور یہ آزمائش دیر پا نہیں ہوتی: ﴿فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ﴾ (آل عمران: ۱۷۴) مسلمانوں نے اس ملک کی بہترین خدمت کی ہے وہ اس ملک میں چور اور لٹیرے کی طرح نہیں آئے؛ بلکہ انہوں نے اس سرزمین کو اپنا وطن بنایا، جو ملک ذات پات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، اسے انسانیت، اخوت اور مساوات کا سبق سکھایا، اس خطہ کو ایسا خوش حال ملک بنایا، جسے سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا، اس ملک کی حدود کو اتنی وسعت دی، جو پہلے کبھی اسے حاصل نہیں تھی، آج ہم جس وسیع وعریض ملک میں رہتے ہیں، یہ وسعت واتحاد مسلمانوں کی دین ہے، اس کے چپہ چپہ پر مسلمانوں کے نقوش محبت ثبت ہیں، چاہے دہلی کا لال قلعہ ہو یا آگرہ کا تاج محل، دہلی کا قطب مینار ہو یا حیدرآباد کا چار مینار یا ہندوستان کے ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ کا احاطہ کرنے والی سڑک، جسے شیر شاہ سوری نے تعمیر کیا تھا، یہ سب مسلمانوں کی دین ہے؛ اس لئے ہم کو احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔

اور یہ بھی ایک سچائی ہے کہ مسلمان لقمۂ تر نہیں ہیں جن کو نگل لیا جائے؛ بلکہ وہ اپنے عزم وحوصلہ کے اعتبار سے لوہے کے چنے ہیں، جو لوگ ان کو چبانا چاہیں گے، ان کو خود اپنی خیر منانی پڑے گی، مسلمان اس ملک میں بہت سی آزمائشوں سے گذر چکے ہیں، ملک کی تقسیم کے وقت ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں مسلمانوں پر ایک قیامت آئی، جس کے تذکرہ سے کلیجہ منہ کو آتا ہے، اسی طرح دکن اسٹیٹ

کا انڈین یونین میں انضمام ہوا اور مسلمان ایسی آزمائش سے گذرے کہ ان غم انگیز لمحات کا نقشہ کھینچنا ممکن نہیں، مسلمانوں نے آگ کے سمندر کو پار کیا اور ان کو خون کے دریا سے گذرنا پڑا؛ لیکن اس کے باوجود انہوں نے ثابت قدمی کا دامن نہیں چھوڑا اور پوری قوت کے ساتھ اسلام پر جمے رہے، ان کی بلند حوصلگی اور قوت ارادی ہی ہے، جس نے ان کو اس ملک میں باقی رکھا ہے، اگر کوئی اور قوم ہوتی تو شاید اس نے ان مظالم کے سامنے ہتھیار ڈال دیا ہوتا، تو وہ فتنۂ ارتداد کا شکار ہوجاتی، وہ اپنے تہذیبی تشخص اور مذہبی شناخت سے ہاتھ دھو لیتی اور اپنی ملی وجود سے محروم ہوجاتی؛ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا، صرف اس لئے کہ ایمان کا نشہ ایسا نشہ ہے کہ جس قدر اس کو اتارنے کی کوشش کی جاتی ہے، وہ بڑھتا اور چڑھتا چلا جاتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مخالف حالات ہماری قوت عمل میں اضافہ کریں، ہم زندگی کے مختلف شعبوں میں آگے بڑھنے کے لئے منصوبہ بندی کریں اور حکمت واستقامت دونوں پہلوؤں کی رعایت کرتے ہوئے قدم آگے بڑھانے کی کوشش کریں، ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کی شہادت کا سانحہ پیش آیا، اور اس کے ساتھ ایک طرفہ فسادات کا ایک طویل سلسلہ بھی شروع ہوگیا، جو لوگ مظلوم تھے، پولیس کی گولیاں ان ہی کو نشانہ بناتی تھیں، کتنی ہی مسجدیں ہیں، جو شہید کردی گئیں، اور مسلمانوں کے خلاف نفرت اور بغض وعداوت کی ایک نہ ختم ہونے والی آگ لگا دی گئی، یقیناً یہ ایک بڑا سانحہ ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس سانحہ کے بعد ملت اسلامیہ نے ایک انگڑائی لی ہے، انہوں نے اپنے بھائیوں کے ایمان کی حفاظت کے لئے گاؤں گاؤں مساجد تعمیر کیں، مکاتب قائم کئے، دینی تعلیمی اداروں کو ترقی دی، بڑے پیمانے پر عصری تعلیمی اداروں کی بنیاد رکھی، پیشہ وارانہ تعلیم کو فروغ دیا، برادارنِ وطن میں دعوت دین کے کام کے لئے متوجہ ہوئے، خدمت خلق کے ادارے قائم کئے، مسلمانوں کی نئی نسل کو تعلیم سے جوڑنے کی کوششیں کیں، اور ملک کے طول وعرض میں محسوس کیا گیا کہ مسلمانوں کا شعور بیدار ہو رہا ہے، اور دین سے ان کے ربط وتعلق میں اضافہ ہوا ہے، چنانچہ ۱۹۹۲ء کے بعد مسلمانانِ ہند میں تعلیمی، دعوتی اور معاشی جد وجہد کے اعتبار سے ایک خوشگوار تبدیلی آئی، اگرچہ ابھی بھی بہت سے کمیاں ہیں جن کو دور کرنا ضروری ہے، بہت سی بیماریاں ہیں، جن کا علاج کئے بغیر ہم ایک صحت مندامت کی حیثیت سے اپنا کردار ادا نہیں کر سکتے۔

اس وقت ضرورت ہے کہ مسلمان فرقہ پرست طاقتوں کے آگے بڑھنے کا ماتم کرنے کے بجائے ایک منصوبہ بنائیں، اس منصوبے میں تعلیمی ترقی کو بنیادی اہمیت حاصل ہو، ہماری کوشش ہو کہ شرح خواندگی اور شرح تعلیم کے اعتبار سے ہمارا گراف اونچا ہو، پیشہ وارانہ تعلیم میں مسلمان آگے بڑھیں؛ کیونکہ یہ حصول روزگار کا ایک مؤثر وسیلہ ہے، اعلیٰ تعلیم کی مسلمانوں کو ترغیب دی جائے؛ کیونکہ کہ اس کے بغیر قومی پالیسی کے تعین میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں ہوسکتا، خاص کر سیول سروس کے امتحانات کے لئے مسلمانوں کو تیار کیا جائے، دینی مدارس کے تعلیمی نظام میں عمدگی لائی جائے اور اس کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے، اسی طرح مسلمان تجارت اور کاروبار کی طرف خصوصی توجہ دیں، اس کے لئے حکومت کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے، اور اللہ نے اس میں بڑی برکت رکھی ہے، مسلمانوں کی ان صنعتوں کے لئے رہنمائی کی جائے، جن کو کم سرمایہ سے شروع کیا جاسکتا ہے۔

مسلمان ایک داعی امت ہیں؛ لیکن افسوس کہ برادران وطن تک اسلام کی امانت پہنچانے کے لئے انہوں نے کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی، اب بھی وقت ہے کہ ہم اس بھولے ہوئے سبق کو یاد کریں، اور اپنی فراموش کردہ ذمہ داری کی طرف متوجہ ہو جائیں، اسی طرح اپنی سیاسی بے وزنی کو کم کرنے کے لئے اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں، اگر ہم اتحاد و یک جہتی کا ثبوت دیں تو اب بھی اپنے کھوئے ہوئے مقام کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں، اقلیت میں ہونے کے خوف کو اپنے دل سے نکال دینا چاہئے؛ کیوں کہ مسلمان اس ملک میں ہمیشہ اقلیت ہی رہے اور اقلیت ہی میں رہتے ہوئے، انہوں نے سیکڑوں سال حکومت کی، آج بھی امریکہ میں یہودی اور ہندوستان میں برہمن اقلیت میں ہیں، لیکن ان ملکوں کے فیصلوں میں جس قوت کے ساتھ وہ شریک ہیں وہ کسی صاحب نظر سے مخفی نہیں۔

ترجیحات متعین کریں

(الیکشن میں مسلمانوں کا کیا رویہ ہونا چاہیے؟)

اگر انسان کو کوئی ایسی بات درپیش ہو جس میں صرف خیر ہو، برائی کا پہلو نہ ہو، اور اسے قبول کرنے اور نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہو تو اس وقت فیصلہ کرنا چنداں دشوار نہیں، ہر عقل سلیم رکھنے والا شخص اس کو قبول کرے گا، اور اگر کوئی بات خالصتاً شر اور برائی کی ہو تو اس صورت میں بھی فیصلہ کرنا مشکل نہیں، ہر سمجھدار آدمی اس سے گریز اور اجتناب کا راستہ اختیار کرے گا؛ لیکن انسان کی قوت انتخاب کا امتحان اس وقت ہوتا ہے، جب اس کے سامنے دو اچھی چیزیں رکھی گئی ہوں، یہاں اس کو طے کرنا ہے کہ بہتر کون ہے اور بہترین کون ہے، کون خوب ہے اور کون خوب تر ہے؟ اس سے بھی مشکل مرحلہ اس وقت درپیش ہوتا ہے، جب دو برائیاں انسان کے سامنے ہوں، اور بیک وقت ان دونوں سے نہیں بچا جا سکتا ہو، انسان ایک برائی کو قبول کرنے پر مجبور ہو، اس وقت انسان کی قوت فیصلہ، فہم وشعور، زمانہ آگہی، اور مصلحت شناسی کی اصل آزمائش ہوتی ہے۔

مختلف مصلحتیں اپنی طرف کھینچتی ہیں اور انسان کے دل کا جھکاؤ کبھی ایک طرف ہوتا ہے، اور کبھی دوسری طرف، معاشی ترقی کے اعتبار سے ایک صورت بہتر معلوم ہوتی ہے، اور جان و مال کی حفاظت کے نقطۂ نظر سے دوسری صورت قابل ترجیح محسوس ہوتی ہے، ایک راستہ اختیار کرنے میں وقتی مصالح کی بہتری نظر آتی ہے؛ لیکن مآل وانجام کے اعتبار سے اس سے غیر معمولی نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے، اور دوسرے راستہ میں انجام کے اعتبار سے نسبتاً امید کی کرن نظر آتی ہے، ایسی صورت میں ترجیحات قائم کرنا اور نفع ونقصان کی ترازو میں تول کر یہ بات متعین کرنی ضروری ہوتی ہے کہ کون سی صورت کم نقصان کی ہے؟ شریعت نے ہمیں غور وفکر کا یہی طریقہ سکھایا ہے، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا گیا، ان کے سامنے دو راستے تھے، ایک صورت یہ تھی کہ کلمہ کفر کہہ کر جان بچا لیتے، دوسری صورت یہ تھی کہ جان دے دیتے اور کلمہ کفر سے اپنی زبان کی حفاظت کرتے، انہوں نے اجتہاد سے کام لیا کہ اگر جان چلی جائے گی تو اگلے مرحلوں میں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت واعانت کرنے سے محروم ہوجائیں گے،اسلام کی دعوت واشاعت کا جوکام آئندہ کر سکتے ہیں، وہ نہیں کر پائیں گے،اور اگرکلمہ کفر مجبوری کی حالت میں زبان سے نکال دیا تو چونکہ ایمان کا اصل تعلق قلب سے ہے نہ کہ زبان سے؛ اس لئے -انشاء اللہ- پھر بھی دولت ایمان سے محروم نہیں ہوں گے؛ چنانچہ حضرت عمار نے جان بچانے کوترجیح دی؛لیکن ان کا دل ایمان کے نور سے معمور تھا؛اس لئے بے چین ہو گئے روتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اوراپنی داستان دردسنائی،رسول اللہ نے دریافت فرمایا کہ تمہارادل تو ایمان پر مطمئن ہے؟ حضرت عمار نے عرض کیا: بیشک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر کوئی حرج نہیں ہے؛ بلکہ اگر آئندہ بھی ایسی آزمائش آئے تو زبان سے کلمہ کفر کہہ کر اپنی جان بچالو،اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ﴾ (النحل:۱۰۶)۔

اسی طرح اگرکوئی شخص بھوک وپیاس کی وجہ سے ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوکہ اگرکھائے اور پیئے نہیں تو اس کی جان چلی جائے،شریعت نے ایسے مضطرومجبور شخص کے لئے جان بچانے کی حدتک خنزیر جیسے حرام جانور یا مردار کا گوشت کھانے اورشراب پینے کی اجازت دی ہے،حرام شئے کا کھانا اور پینا ایک برائی اور دینی ضرر ہے،زندگی اللہ تعالیٰ کی امانت ہے،جس کی حتی المقدورحفاظت کا حکم دیا گیا ہے،اس کوکھودینا بھی ایک ضرر ہے،دینوی اعتبار سے تو یہ ضرر ہے ہی،دینی اعتبار سے بھی یہ ضرر ہے،ایک انسان سے اس کے بوڑھے والدین،یتیم بھائیوں بہنوں،کسب معاش کی صلاحیت سے محروم بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچوں کا حق متعلق ہے، نیز وہ اللہ کی توفیق سے بہت ساری دینی خدمت بھی انجام دے سکتا ہے؛لیکن اگر انسان زندگی سے محروم ہوجائے تو متعلقین کی ضروریات اور دین کی بہت ساری خدمات بظاہر پوری نہیں ہو پائیں گی؛ اس لئے اگر چہ دین کی اہمیت اس وقت ایک مسلمان کی جان ومال سے بڑھ جاتی ہے، جب جان ومال کی قربانی کے بغیر دین کا بچاؤ ممکن نہ ہو؛لیکن جب دین کا تحفظ اس پر موقوف نہ ہوتو عارضی طور پر بقدر ضرورت شریعت کے کسی عمومی حکم کے مقابلہ انسانی زندگی کی حفاظت کوترجیح دی گئی ہے۔

احکام شریعت میں اسکی بڑی اہمیت ہے؛اسی لئے شریعت کے ماہرین نے مختلف قواعد مقرر کئے ہیں، جوترجیحات کے سلسلے میں امت کی رہنمائی کرتے ہیں ان میں سے بعض کا تذکرہ یہاں

مناسب ہوگا:

★ **يتحمل الضرر الخاص لدفع الضرر العام**

عمومی اور اجتماعی نقصان کو دور کرنے کے لئے شخصی اور انفرادی نقصان کو گوارا کیا جائے گا۔

★ **إذا تعارض المفسدتان روعي أعظمها ضررا بارتكاب أخفهما**

جب دو برائیوں کا ٹکراؤ ہوتو کم تر برائی کا ارتکاب کر کے بڑی برائی کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

★ **درء المفاسد أولى من جلب المصالح**

مفاسد کو دور کرنا مصلحتوں کے حاصل کرنے سے بہتر ہے۔

ان قواعد کو مختلف الفاظ اور تعبیرات میں فقہاء نے بیان کیا ہے، ان کا تعلق صرف فقہی جزئیات ہی سے نہیں ہے؛ بلکہ زندگی کے مختلف شعبوں میں پیش آنے والے احوال سے بھی ہے، خاص کر اس وقت اپریل ومئی ۲۰۱۴ء میں جو الیکشن سر پر کھڑا ہے، اس میں اس بات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی ہے کہ مسلمان شعور سے کام لیں تائید ومخالفت میں ترجیحات قائم کریں، مفید اور زیادہ مفید، اور اس سے بڑھ کر نقصان دہ اور زیادہ نقصان دہ کے درمیان خط امتیاز کھینچیں اور پوری فراست ایمانی کے ساتھ الیکشن کے سلسلہ میں فیصلہ کریں، اگر اس وقت مسلمانوں نے سمجھداری سے کام نہیں لیا تو ایسے نقصان کا اندیشہ ہے کہ شاید دور تک اور دیر تک اس کی تلافی ممکن نہ ہو۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ بی جے پی کا ایجنڈا بالکل واضح ہے، یہ ایسی پارٹی ہے جس کا ایجنڈہ آر ایس ایس کی طرف سے طے ہوتا ہے اور آر ایس ایس کی بنیاد ہی مسلمان سے نفرت پر ہے، اس نے یکساں سول کوڈ لانے کے عزم وارادہ کو مخفی نہیں رکھا ہے؛ بلکہ یہ اس کے منشور کا حصہ ہے، اقلیتی کمیشن یا اقلیتی بہبود کی وزارت ایک ایسا کڑوا گھونٹ ہے، جس کو یہ بطیب خاطر حلق سے اتارنے کو تیار نہیں ہیں، شمال شرقی ریاستوں کو جو خصوصی اختیارات دئے گئے ہیں، اس پر تو اس کو کوئی اعتراض نہیں ہے؛ لیکن کشمیر کے مسلم اکثریت ریاست ہونے کی وجہ سے وہی رعایت اس ریاست کے لئے بی جے پی کو قبول نہیں ہے، یعنی بی جے پی کو اس ملک کا سیکولرزم پسند نہیں ہے، وہ چاہتی ہے کہ اس ملک

میں اکثریتی فرقہ کا اقتدار ہو، اقلیتیں اکثریت کی مرضی کے مطابق اپنی زندگی گزاریں اور دوسرے درجہ کا شہری بن کر رہنے پر آمادہ ہوجائیں، جو پارٹیاں بی جے پی کے بنائے ہوئے این ڈی اے اتحاد میں شامل ہیں، ان کی شمولیت میں نقصان کا پہلو تو بالکل واضح ہے کہ انہیں کی تائید سے یہ فرقہ پرست جماعت کرسی اقتدار پر قبضہ کرسکتی ہے، اور جب وہ اقتدار میں آئے گی تو ضرور ہی مسلمانوں کو نقصان پہنچائے گی، دوسرا پہلو ایک درجہ میں بہتری کا بھی ہے کہ معاون پارٹیوں کے دباؤ کی وجہ سے بہت سی دفعہ بی جے پی اپنے بعض غیر سیکولر ایجنڈے کو نافذ کرنے سے قاصر رہتی ہے، جیسے واجپائی دور میں دستور میں تبدیلی کی بہت کوشش کی گئی، مگر اتحادی پارٹیوں کی مخالفت کی وجہ سے کامیابی حاصل نہیں ہوسکی، یکساں سول کوڈ، اور اس طرح کے دوسرے فرقہ وارانہ اہداف کو وہ جاری نہیں کر پائی، یہاں تک کہ بعض ریاستوں کی مخالفت کی وجہ سے پورے ملک کی سطح پر گوکشی کی ممانعت کا قانون لانے میں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا؛ لیکن بہر حال یہ اتحادی پارٹیاں اقتدار حاصل کرنے میں بی جے پی کے لئے سیڑھی کا کام کرتی ہیں۔

افسوس کہ جو جماعتیں اپنے آپ کو سیکولر کہتی ہیں، ان کے بھی دو چہرے ہیں، ایک: وہ خوبصورت، سنوارا اور آراستہ کیا ہوا چہرہ ہے، جس کو وہ الیکشن کے موقع سے مسلمانوں کے سامنے کھولتی ہے، دوسرا: حقیقی چہرہ ہے، جو اس تصور پر مبنی ہے کہ اگر بی جے پی سخت ہندوتوا کی ترجمان ہے تو ہم بھی نرم ہندوتوا پر قائم ہیں، اگر بی جے پی نے رام مندر کے لئے تحریک چلائی ہے تو بعض سیکولر پارٹیوں نے بابری مسجد کا تالا کھلوایا اور دہلی میں تخت اقتدار پر بیٹھ کر مسجد کی شہادت کا تماشا دیکھا ہے اور یہ تو ابھی کل کی بات ہے کہ جب بے قصور مسلم نوجوانوں کو اتر پردیش کی حکومت نے رہا کرنے کے سلسلہ میں کوشش کی تو مرکز کی کانگریس حکومت نے اس کا تعاون نہیں کیا، ۲۰۰۴ء سے انسداد فرقہ وارانہ فسادات کا بل سرد خانے میں پڑا رہا اور کانگریس کا وعدہ ''وعدۂ محبوب'' ثابت ہوا، قومی پارٹیوں کے علاوہ ہندوستان میں اس وقت مقامی پارٹیوں نے بھی بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے، فطری طور پر ان کی زیادہ توجہ ریاستی مسائل پر ہوتی ہے۔

ان حالات میں مسلمانوں کے لئے یہ فیصلہ کرنا بہت دشوار ہوگیا ہے کہ وہ کس پارٹی کو اپنا ووٹ دیں؟ اگرچہ اب ووٹروں کے لئے ایک اختیار یہ بھی رکھ دیا گیا ہے کہ وہ ''کوئی نہیں'' پر اپنی مہر

لگا سکتے ہیں؛لیکن اس اختیار سے فائدہ اٹھانا اقلیت کے لئے سیاسی خودکشی کے مترادف ہوگا اور اس کا فائدہ فرقہ پرست طاقتوں کو ہوگا؛اس لئے اقلیتوں اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ ووٹ دینے کے سلسلہ میں اپنی ترجیحات قائم کریں،انہیں صرف یہی نہیں دیکھنا ہے کہ کون بہتر ہے اور کون زیادہ بہتر یا کون بدتر ہے اور کون زیادہ بدتر ؟ بلکہ ان کو یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ کون فرقہ پرست امیدوار کو شکست دینے کی صلاحیت رکھتا ہے،اور کون امیدوار اگر چہ اچھا ہے اور اگر چہ اس کی پارٹی کا منشور بھی نسبتاً اچھا ہے؛لیکن اس میں فرقہ پرست امیدوار کو شکست دینے صلاحیت نہیں ہے،ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اگر مسلمان اپنے ووٹ کا استعمال کریں گے،تبھی وہ فرقہ پرست طاقتوں کو بام اقتدار پر چڑھنے سے روک سکیں گے۔

کچھ لوگ مختلف نام نہاد سیکولر پارٹیوں کی طرف سے مسلمانوں کے استحصال کو دیکھتے ہوئے کہنے لگے ہیں کہ ایک بار بی جے پی کا یا نریندر مودی کا تجربہ کر لینے میں کیا حرج ہے؟ — مگر یہ محض جذباتیت اور جوش بلا ہوش کی بات ہے،یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص آگ میں کودنے یا زہر کھانے کا تجربہ کرے،بی جے پی کا اقتدار نا آزمودہ نہیں ہے،جنتا پارٹی دور حکومت میں مسلمانوں نے اس کا طرز عمل دیکھا ہے اور اٹل بہاری واجپائی (جن کو بی جے پی کا سب سے زیادہ سیکولر لیڈر سمجھا جاتا تھا) کے اقتدار کا بھی مسلمانوں نے تجربہ کیا ہے،آج پولس،فوج،یہاں تک کہ عدالتی ڈھانچہ میں بھی جو فرقہ پرست عناصر شامل ہیں،نیز تعلیم ومیڈیا کو زعفرانی رنگ میں رنگنے کی جو کوشش کی جا رہی ہے، یہ ان ہی حکومتوں کا کارنامہ ہے،پھر مسلمانوں نے اتر پردیش میں کلیان سنگھ کی حکومت کو دیکھا ہے، جس میں عین دو پہر کے وقت کھلے عام بابری مسجد کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی اور انہوں نے گجرات میں مودی کی حکومت کا تجربہ بھی کیا ہے،جس میں مسلمانوں کا خون بہایا گیا اور کوئی دیکھا وے کے طور پر بھی ان کے آنسو پونچھنے کے لئے آگے نہیں بڑھا؛اس لئے یہ تجربہ جانتے بوجھتے سانپ کے منہ میں اپنی انگلی ڈالنا ہے۔

البتہ ہندوستان کے موجودہ حالات اور ملی مفادات کے پس منظر میں چند ترجیحات قائم کی جاسکتی ہیں:

☆ ان میں سے پہلی ترجیح یہ ہے کہ فرقہ پرست پارٹی کے نمائندوں کو شکست دی جائے اور

جو امیدوار اس کو شکست دینے کی صلاحیت رکھتا ہو، اس کے حق میں ووٹ کا استعمال کیا جائے، خواہ وہ کسی پارٹی کا امیدوار ہو، یہاں تک کہ وہ آزاد ہی امیدوار کیوں نہ ہو، نیز چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم؛ کیوں کہ یہاں اصل مقصود فرقہ پرست عناصر کو شکست دینا ہے۔

☆ دوسری ترجیح یہ ہے کہ جہاں کوئی مسلم جماعت موجود ہو اور واقعی اس کے کامیاب ہونے کی امید ہو، وہاں اس کے حق میں ووٹ کا استعمال ہو، مسلم جماعت ہی کا نمائندہ ہو؛ لیکن بظاہر اس کے جیتنے کا امکان نہ ہو تو اس کے حق میں ووٹ کا استعمال اپنے حق کو ضائع کرنا ہے، اور بالواسطہ فرقہ پرست طاقتوں کو فائدہ پہنچانا ہے، مسلم جماعتوں کو بھی چاہئے کہ جہاں مسلم ووٹ کم ہوں یا جہاں ان کے امیدوار کھڑا کرنے کی وجہ سے مسلم ووٹ کے بٹ جانے کا اور فرقہ پرست جماعتوں کے کامیاب ہونے کا اندیشہ ہو، وہاں اپنا امیدوار کھڑا نہ کریں، ایسی جگہوں سے امیدوار کھڑا کرنے سے دو نقصان ہوتا ہے، ایک یہ کہ مسلم ووٹ کی تقسیم کی وجہ سے فرقہ پرستوں کو فائدہ پہنچ جاتا ہے، دوسرے: مسلمانوں اور اکثریتی فرقہ کے درمیان تعلقات میں ہم آہنگی باقی نہیں رہتی، نفرت کے جذبات ابل پڑتے ہیں اور ایسے مقامات پر مسلمانوں ہی کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ مسلم جماعتیں ایک دوسرے کے خلاف امیدوار کھڑا نہ کریں، جہاں ایک جماعت پہلے سے کامیاب ہوتی چلی آرہی ہے یا جہاں اس کی کامیابی کے امکانات روشن ہیں وہاں دوسری مسلم جماعتیں اپنا امیدوار کھڑا کرنے سے باز رہیں؛ بلکہ اسی جماعت کو تقویت پہنچائیں — بظاہر مسلم جماعتوں کے نمائندوں کا معتد بہ تعداد میں پارلیمنٹ تک پہنچنا دشوار نظر آتا ہے؛ لیکن کم تعداد میں سہی، ان کی موجودگی کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ان جماعتوں کے نمائندے اپنے ضمیر کی آواز پر اظہار خیال کر سکتے ہیں، ورنہ جو مسلمان سیکولر پارٹیوں کی نمائندگی کرتے ہیں، وہ اپنی پارٹی کے نقطۂ نظر سے ہٹ کر رائے نہیں دے سکتے؛ بلکہ یہ ایک کڑوی حقیقت ہے کہ اکثر اوقات ان کو اپنے ضمیر کو خواب آور گولی کھلانی پڑتی ہے، یہی وجہ ہے کہ گذشتہ یو پی اے حکومت میں پوٹا کے مماثل قانون پاس ہوا، رائٹ ٹو ایجوکیشن قانون پاس ہوا، قانون وقف ۲۰۱۰ء پاس ہوا؛ لیکن کانگریس کے کسی مسلمان ممبر کی زبان نہیں کھل سکی؛ اس لئے ایسے مسلمان نمائندوں کو ریاست اور مرکز کی سطح پر ایوان قانون میں موجود ہونا چاہئے جو اپنے ضمیر کی آواز پر اور ملی مفاد کی بنیاد پر اظہار خیال کر سکیں؛ مگر ظاہر ہے کہ ایسے نمائندہ کو اسی علاقہ میں کامیابی حاصل

ہوسکتی ہے، جہاں مسلم آبادی کا ارتکاز ہو، جیسے: آسام، کیرالہ، شہر حیدرآباد اور ملک کے مختلف علاقوں میں خاص خاص حلقہ ہائے انتخاب۔

☆ جہاں مسلمانوں کی کوئی سیاسی جماعت نہ ہو، فرقہ پرست جماعت کے مقابلہ کئی سیکولر جماعتیں ہوں، اور کسی جماعت نے مسلمان کو امیدوار بنایا ہو اور وہ فرقہ پرست امیدوار کو شکست دے سکتا ہو تو اسے ترجیح دی جائے؛ کیوں کہ مرکزی اور ریاستی قانون ساز اداروں میں مسلمانوں کی تعداد ان کی آبادی کے لحاظ سے بہت ہی کم ہے، اور دن بہ دن کم ہوتی جارہی ہے، اکثریتی فرقہ کی یہ سوچ بنتی جارہی ہے کہ مسلمان چاہے کسی پارٹی سے کھڑا ہو، اسے ووٹ نہیں دیا جائے، ان حالات میں مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے مسلمان امیدوار کی مدد کریں، جس کے کامیاب ہونے کا امکان ہو، جو ادارے ملک وقوم کی قسمتوں کا فیصلہ کرتے ہوں، وہاں مسلمانوں کی کوئی آواز باقی نہ رہے، اس سے بڑھ کر کوئی بات افسوس کی نہیں ہوسکتی۔

☆ جہاں مسلمان امیدوار نہ ہوں، یا ہوں؛ لیکن ان کے کامیاب ہونے کی توقع نہ ہو، وہاں دو باتوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے: ایک تو اس پارٹی کا منشور جس سے وہ کھڑا ہوا ہے؛ کیوں کہ موجودہ قانون میں وہپ جاری ہونے کے بعد ہر ممبر اپنی پارٹی کے نقطۂ نظر کا پابند ہوتا ہے، دوسرے خود اس امیدوار کے شخصی حالات کو بھی دیکھنا چاہئے کہ وہ اپنے علاقہ کے لوگوں کا کتنا بہتر نمائندہ ثابت ہوسکتا ہے۔

ووٹ ایک امانت ہے اور اس کا صحیح استعمال نہ صرف ہماری سماجی ذمہ داری ہے؛ بلکہ مذہبی فریضہ بھی ہے، نیز ووٹ ایک ہتھیار بھی ہے جس سے جمہوری طریقہ پر انقلاب لایا جاتا ہے، ناپسندیدہ حکمرانوں کو اقتدار سے نکال باہر کیا جاسکتا ہے، اور اچھے لوگوں کو حکومت سونپی جاسکتی ہے؛ اس لئے اس کا استعمال ضرور کرنا چاہئے اور سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے، پہلے اچھی طرح حالات کا تجزیہ کرنا چاہئے، کسی بھی پارٹی کو جیتنے اور ہارنے کے عواقب پر غور کرنا چاہئے، ماضی کے تجربات کو سامنے رکھنا چاہئے، مستقبل کے اندیشوں اور توقعات کے درمیان موازنہ کرنا چاہئے، یہ بات بھی ذہن سے اوجھل نہیں ہونی چاہئے کہ اس وقت امریکہ اور اسرائیل ہندوستان میں اپنے سیاسی عزائم رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایسے لوگ اقتدار میں آئیں جن کا ریموٹ کنٹرول ان کے ہاتھ میں ہو، وہ ان کی پالیسیوں کے مطابق فیصلے کریں، یہاں تک کہ داخلہ پالیسی، اقتصادی نظام، دفاعی سودے اور خارجہ پالیسی کے معاملہ میں بھی

ان کی خواہش ہے کہ ترقی پذیر مما لک ان کی قائم کی ہوئی حدود سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کریں۔

یہ ساری ترجیحات شریعت کے اس حکم پر مبنی ہے کہ ہر مسلمان کا فریضہ ہے کہ جس قدر ممکن ہو وہ برائی کو روکنے اور ظلم کا پنجہ تھامنے کی کوشش کرے، اس وقت ملک سیاسی اعتبار سے ایک دوراہے پر ہے، اگر مسلمان جذبات کی رو میں بہہ گئے، ہوش پر جوش کا غلبہ ہوگیا، اور فیصلہ کرنے میں غلطی ہوگئی، تو بقول شاعر:

لمحہ گزر گیا تو سمجھئے صدی گئی

سیاسی حکمت عملی کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو مجموعہ اضداد بنایا ہے، یہاں روشنی بھی ہے اور تاریکی بھی، حرارت بھی ہے اور خنکی بھی، اس دنیا کو آگ کی بھی ضرورت ہے اور پانی کی بھی، میٹھاس کی بھی اور کڑواہٹ کی بھی، کائنات کی فطرت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انسان کی زندگی اور اس کے احوال میں متضاد کیفیت رکھی ہے، انسان خوش بھی ہوتا ہے، اور غم سے بھی دو چار ہوتا ہے، یہی کیفیت اس کے دائرہ تعلقات میں بھی ہے، اس کے دوست بھی ہوتے ہیں اور دشمن بھی، اگر محبت کرنے والے اسے گلے لگاتے ہیں تو کچھ نفرت کرنے والے اس کے جیب وگریباں سے کھیلنے پر تُلے رہتے ہیں، اگر اس کو ان لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے جو عدل وانصاف کرنے والے ہیں تو وہ ایسے لوگوں سے بھی دو چار ہوتا ہے جو اس پر ظلم وزیادتی کو روا رکھتے ہیں، انسان کو ان کے درمیان انتخاب سے کام لینا پڑتا ہے، وہ بلیوں کی تو اپنے گھر میں پرورش کرسکتا ہے سانپوں کی نہیں؛ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ بلیاں اس کے گھر سے چند لقمے ہی کھا سکتی ہیں؛ لیکن وہ سانپ کی طرح ڈسیں گے نہیں؛ اس لئے یہ بات انسان کی فطرت میں رکھی گئی ہے کہ اگر خیر وشر میں ٹکراؤ ہو تو وہ خیر کی طرف لپکے اور شر سے اپنے آپ کو بچائے، اس کے برخلاف عمل وہی شخص کرسکتا ہے جو یا تو عقل سے محروم ہو یا حد درجہ کم عقل ہو۔

انسان کی عقل کا امتحان اس وقت ہوتا ہے، جب مضرت رساں اور نقصان دہ چیزیں اس کے سامنے ہوں اور اس کے لئے کوئی تیسرا راستہ نہ ہو، اسے گڑھے ہی کو منتخب کرنا ہو، چاہے وہ ایک چھوٹے گڑھے کو منتخب کرے، جس میں پھسل جانے کا اندیشہ ہو یا وہ ایک ایسی کھائی کا انتخاب کرے، جس کا انجام بظاہر ہلاکت کے سوا کچھ اور نہ ہو، اگر وہ آگ سے بچ نہیں سکتا، چاہے ایک چنگاری پر سے گزرے یا آگ کے شعلہ سے گزر کر جانا پڑے، تو وہ چنگاری کو گوارا کرلیتا ہے، ایسی صورت حال میں انسان کی عقل اور اس کی ترجیحی صلاحیت کا امتحان ہوتا ہے، اور ان حالات میں بہتر انتخاب ہی اصل میں حکمت ودانائی ہے۔

عربی زبان کے ماہرین نے لکھا ہے کہ حکمت کا لفظ ''حکم'' سے ماٴخوذ ہے، جس کے معنی معاملہ کو

درست رکھنے کے لئے کسی عمل کو روکنے کے آتے ہیں "المنع للإصلاح" (مفردات القرآن: ۱۲۶)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے حکمت سے نواز دیا ہو، اسے خیر کثیر عطا کیا گیا: ﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ (البقرۃ: ۲۶۹) اللہ تعالیٰ نے لقمان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے ان کو حکمت سے نوازا تھا: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ﴾ (لقمان: ۱۲)

دعوت دین کا کام بڑا اہم بھی ہے؛ نازک بھی ہے اور مصلحت کے ساتھ کرنے کا بھی؛ اس لئے خاص طور پر فرمایا گیا کہ اللہ کے دین کی طرف حکمت کے ساتھ بلایا کرو: ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ (النحل: ۱۲۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو چمٹالیا اور دعا دیتے ہوئے فرمایا: اے اللہ! اسے حکمت سے نواز دیجئے: **اللهم علمه الحكمة** (ترمذی: حدیث نمبر ۳۸۲۴) حضرت عبداللہ بن عباس ہیؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو ہی آدمی اصل میں رشک کے لائق ہیں، ان میں سے ایک وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حکمت سے نوازا ہو، وہ اس کے ذریعہ فیصلے کرتا ہو اور تعلیم وتربیت کی خدمت انجام دیتا ہو: **آتاه الله الحكمة فهو يقضي بها ويعلمها** (بخاری: حدیث نمبر: ۱۴۱۷) اس حدیث میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ جب کوئی فرد یا گروہ اللہ کی طرف سے حکمت ودانائی سے سرفراز ہوتا ہے تو وہ صحیح فیصلے کر پاتا ہے۔

اچھے اور برے حالات سے افراد بھی دوچار ہوتے ہیں، اور قومیں بھی دوچار ہوتی ہیں، کم درجہ کے دشمنوں اور بڑے دشمنوں سے افراد کو بھی سابقہ پیش آتا ہے اور ملتوں کو بھی، انفرادی زندگی میں تو عموماً انسان کا رویہ یہی ہوتا ہے کہ وہ کم تر نقصان کو گوارا کرلے اور بڑے نقصان سے اپنے آپ کو بچائے رکھے؛ لیکن اجتماعی زندگی میں بسا اوقات ایسے فیصلہ میں قومی جذبات حارج ہوجاتے ہیں، اور بعض تکلیف دہ واقعات انسان کو اس درجہ متاثر کردیتے ہیں کہ وہ اپنے فیصلے میں حکمت ومصلحت کے پہلو کی رعایت نہیں کر پاتا، پھر اس کے نقصانات اتنے دوررس ہوجاتے ہیں کہ ان کی تلافی دشوار ہوجاتی ہے، تاریخ میں تو اس کی بہت سی مثالیں ہے؛ لیکن خود ہندوستان کی حالیہ تاریخ میں بھی اس کی کئی مثالیں مل سکتی ہیں، جیسے ہندوستان کی تقسیم کا مسئلہ، اس وقت برصغیر میں علماء کی بڑی تعداد کا خیال تھا کہ متحدہ ہندوستان ہی مسلمانوں کے مفاد میں ہے، ملک کی تقسیم ملک کو بھی نقصان پہنچائے گی اور مسلمانوں کو خاص طور پر اس سے نقصان پہنچے گا، مگر لوگ جذبات کی رو میں بہہ گئے، انہوں نے علماء پر

لعن طعن شروع کردیا، اور انہیں اکثریتی فرقہ کا ایجینٹ ٹھہرایا گیا، اکثریت میں جو فرقہ پرست اور چالاک لوگ تھے، انہوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ مسلمانوں کو چھوٹا سا ہوم لینڈ دینے میں ہندو اکثریت کی بھلائی ہے؛ کیونکہ وہ طویل عرصہ سے محکومانہ زندگی گزارتے رہے ہیں، اب انہیں ایک بڑا خطہ حاصل ہوجائے اور وہ پوری مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرسکیں گے، بہر حال ملک تقسیم ہوا اور ہزاروں لوگوں کی جانیں گئیں ان میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی، اور ظاہر ہے کہ کسی بھی بے قصور مارے والے انسان کی ہلاکت قابل افسوس ہے؛ لیکن بہر حال ایسے مظلوموں میں غالب اکثریت مسلمانوں کی تھی، اس تقسیم کی سزا آج تک ہندوستان کے مسلمان بھگت رہے ہیں اور اس کے نتیجہ میں جو ملک حاصل ہوا، وہ ایسا کہ پچیس ہی سال میں دوٹکڑے ہوگیا اور جو کچھ بچا کچا حصہ موجود ہے، وہ خود اندر سے ٹوٹ رہا ہے، اور پوری دنیا میں بدنامی اور رسوائی کا عنوان بنا ہوا ہے۔

ہندوستان کی بعض مسلم ریاستیں ۱۹۴۸ تک موجود تھیں، قومی سطح کے بعض مسلم قائدین نے حکومت ہند کو اس بات پر آمادہ کرلیا تھا کہ وہ چند چیزوں میں اشتراک کے ساتھ اس مسلم ریاست کو باقی رہنے دے، ریاست کے حکمراں بھی اس کے حق میں تھے؛ کیونکہ مستقبل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ایک ایسا ملک جس کے پاس تربیت یافتہ فوج نہ ہو ہتھیار کا ذخیرہ نہ ہو، دوست ملک سے رابطہ نہ ہو، اور فضائیہ اور بحریہ نہ ہو، وہ مقابلہ نہیں کرسکتا؛ اس لئے انہوں نے صلح کا راستہ اختیار کرنے کو ترجیح دی؛ تاکہ خوں ریزی سے بچا جاسکے اور پُرامن طریقہ پر مسئلہ حل ہوجائے؛ لیکن کچھ جذباتی لوگوں نے قوم کو ورغلایا اور ایسے دعوے کرنے لگے جو ان کی طاقت سے باہر تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ ملک بھی ختم ہوا اور بے شمار مسلمان، مرد وعورت، بوڑھے بچے تہ تیغ کردیئے گئے، ممکن ہے کہ اس طرح کے فیصلے پورے جذبۂ خلوص کے ساتھ کئے گئے ہوں؛ لیکن یقیناً یہ حکمت ومصلحت اور تدبر کے تقاضوں کے خلاف تھے اور ان کا جو نقصان ہونا تھا، وہ ہوا۔

اب اس وقت ہندوستان ایک دو راہے پر کھڑا ہے، ایک فرقہ پرست پارٹی جس کے پارلیمنٹ میں کبھی صرف دو ممبر ہوا کرتے تھے، سیکولر پارٹیوں کی بیساکھی لگا کر بام اقتدار پر چڑھنے کے قابل ہوگئی؛ انہوں نے ملک کے دستور تک کو بدل ڈالنے کی کوشش کی؛ لیکن اس میں کامیاب نہیں ہوسکے، گجرات میں خوں آشام فساد ہوا، جس میں ریاست کا وزیر اعلی ایک ایسے قاتل کی صورت میں

ابھرا، جس کی پیاس دو چار دس مسلمانوں کے خون سے بجھنے کو تیار نہیں تھی، اس کے اشارہ پر کم وبیش دو ہزار مسلمان ایسی بے دردی اور سفا کی کے ساتھ قتل کر دیئے گئے کہ چنگیز اور ہلاکو کی روحیں بھی وجد میں آ گئی ہوں گی، اب یہی شخص دہلی کے لال قلعہ پر اپنی فتح کا جھنڈا لہرانا چاہتا ہے اور پورے ملک پر حکمرانی کا خواب دیکھ رہا ہے، یہ خواب اس شخص کے لئے سہانا ہے؛ لیکن ملک کے انصاف پسند لوگوں کے لئے خواہ ان کا تعلق اقلیت سے ہو یا اکثریت سے، ایک ڈراؤنا خواب ہے، اگر بے قصوروں کی لاش پر چڑھ کر کوئی شخص اقتدار کے زینے طے کرنا شروع کر دے تو پھر لاشوں سے تعمیر کئے ہوئے یہ زینے اونچے ہوتے چلے جائیں گے، ایسے مرحلہ پر مسلمانوں کا، دوسری اقلیتوں اور دلتوں کا، نیز سیکولر اور انصاف پسند ہندو بھائیوں کا فریضہ ہے کہ وہ حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے ملک کو ایسے ظالم شخص کے خونی پنجہ سے بچائیں، اور اس ملک کی تعمیر کرنے والوں نے جس جذبہ کے ساتھ اس کا دستور بنایا تھا اس کی روح کو برقرار رکھیں۔

اس وقت مقابلہ خیر وشر اور نیکی وبدی کا نہیں؛ بلکہ دو برائیوں کا ہے اور ان دو میں سے کم تر برائی کے انتخاب کا مرحلہ درپیش ہے، افسوس کہ کانگریس پارٹی میں فرقہ پرستی کی جڑیں اتنی گہری ہوگئی ہیں کہ انہیں سیکولر کہنا مشکل ہے، گزشتہ الیکشن کے موقع سے انہوں نے اپنے منشور میں اقلیتوں کے لئے جو وعدے کئے تھے، مسلسل دس سال اقتدار پر رہنے کے باوجود ان میں سے کوئی وعدہ وفا نہیں ہوسکا، پوٹا کا قانون ختم کیا گیا، لیکن اسی طرح کا بلکہ بعض جہتوں سے اس سے بھی سخت قانون لایا گیا، بے قصور نوجوان مسلمانوں کی گرفتاری اور چارج شیٹ داخل کئے بغیر طویل مدت سے ان کو جیل میں رکھنے کے واقعات کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گئے؛ لیکن ان سب کے باوجود موجودہ حالت میں انہیں کم تر درجہ کی برائی قرار دیا جا سکتا ہے، کیونکہ مسلم دشمنی جس کے ایجنڈے اور منشور کا حصہ ہو، ظاہر ہے کہ اس کی عداوت بڑھی ہوئی ہے ان حالات میں مسلمانوں کو گہرے تجزیہ کے ساتھ کام کرنے اور فہم وفراست کے ساتھ قدم آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

مسلمانوں کو ایسی علاقائی اور قومی سیاسی جماعتوں سے معاہدہ کی بنیاد پر معاملات طے کرنے چاہئیں، جن کو کم سے کم سیکولر ہونے کا دعوی ہو، ایک واضح ایجنڈے کے ساتھ ان سے گفت وشنید ہونی چاہئے؛ البتہ یہ گفتگو خفیہ بھی ہوسکتی ہے اگر ذرائع ابلاغ میں ایسی خبروں کا آنا نقصان دہ ہو، اور اندیشہ

ہو کہ فرقہ پرست طاقتیں اس کو بہانہ بنا کر برادران وطن کو اکسائیں گی، اور اپنے ووٹ بینک کو بڑھانے کے لئے ان کا استعمال کریں گی، حکمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ فرقہ پرست طاقتوں کو تقویت پہنچانے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں، ایک علانیہ طور پر ان کی تائید ہے اور بدقسمتی سے بعض مسلمان قائدین مودی کی حمایت میں بیانات بھی دے رہے ہیں، جس کو بے ضمیری کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جہاں ایک فرقہ پرست پارٹی کا مقابلہ براہ راست کسی سیکولر پارٹی سے ہو، وہاں سیکولر پارٹی کی مخالفت میں مہم چلائی جائے، اس سے غیر محسوس طریقہ پر فرقہ پرستوں کو تقویت حاصل ہوگی اور ان کا خواب شرمندہ تعبیر ہو جائے گا، اس وقت راجستھان، مدھیہ پردیش، چھتیس گڑھ اور دہلی میں الیکشن کے جو نتائج سامنے آئے ہیں اور جو بی جے پی کے حق میں گئے ہیں، اس کا سبب جہاں کانگریس کی ناقص کارکردگی، بڑھتی ہوئی مہنگائی اور سیکولر ووٹوں کی تقسیم ہے، وہیں اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ عین الیکشن کے موقع پر بعض مسلمانوں نے بی جے پی کے حق میں بیان دیا، بعض تنظیموں نے راجستھان جیسی ریاست میں — جہاں براہ راست کانگریس اور بی جے پی کا مقابلہ تھا — کانگریس کے خلاف جلسے منظم کئے اور کچھ نام نہاد دانشوروں نے سیاسی رہنمائی کے نام پر ایک ایسا گروپ تشکیل دیا اور اس انداز پر سیاسی مسئلہ کو پیش کیا کہ جس میں سارا نزلہ برسر اقتدار حکومت پر گرتا تھا، یہ غلط نہیں تھا، لیکن اس مہم کے لئے غلط وقت کا انتخاب کیا گیا تھا، اتفاق ہے کہ دہلی کے سوا بقیہ تینوں ریاستوں میں کانگریس بمقابلہ بی جے پی کا معاملہ تھا اور ظاہر ہے کہ وہاں کانگریس کے خلاف مہم چلانا کھلے طور پر فرقہ پرستی کا ایجنڈا رکھنے والی پارٹی کو تقویت پہنچانا ہے۔

ہمارے ملک میں کثیر جماعتی جمہوریت کا نظام رکھا گیا ہے، یہ طریقہ عوام کے حق میں بہتر ہوتا ہے؛ کیونکہ ان کو دوسے زیادہ اختیار حاصل ہوتا ہے؛ لیکن بدقسمتی سے اس وقت عملاً ہمارا ملک دو جماعتی طرز حکمرانی کی طرف جا رہا ہے، کمیونسٹ پارٹیوں کے زوال کی وجہ سے تیسرا محاذ نہایت کمزور ہے اور مستقبل قریب میں اٹھ کھڑے ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، ان حالات میں مسلمانوں کو نہایت حکمت اور تدبر سے کام لیتے ہوئے قدم اٹھانا چاہئے، حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ علم وحکمت کی بات یہ نہیں ہے کہ آدمی شر کے مقابلہ میں خیر کو اختیار کر لے؛ بلکہ دانائی یہ ہے کہ جہاں دو برائیوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر انسان مجبور ہو، وہاں کمتر برائی کا انتخاب کر کے بڑے نقصان سے اپنے آپ کو

بچالے، ایسی حالت میں جبکہ ہندوستان کے سیاسی افق پر فرقہ پرستی کی سیاہ گھٹائیں چھارہی ہیں، اگر ہم نے فراست ایمانی اورنور بصیرت سے کام نہیں لیا اور جذبات، ردعمل اور نعروں میں بہہ گئے تو اس سے دوررس نقصانات کا اندیشہ ہے، ضرورت ہے کہ مسلمان قائدین ورہنما پارٹیوں کی وفاداریوں نیز حقیر اور وقتی سیاسی مفادات سے اوپر اٹھ کر ملت کے مفاد میں اتحاد واجتماعیت کے ساتھ کام کریں اور سفینۂ ملت کو بھنور سے نکالنے کی مخلصانہ کوشش کریں۔

❁

خاندانی نظام کا تحفظ — ایک اہم سماجی مسئلہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین تخلیقی ڈھانچہ سے نوازا ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الإنسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ (التین: ۴) اور اس کو شرافت وکرامت کا تاج پہنایا ہے ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ﴾ (الاسراء: ۷۰) اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی توقیر وتکریم کا اوج کمال یہ ہے کہ اسے فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا اور شیطان کو صرف اسی لئے عالم بالا سے اتار پھینکا گیا کہ اس نے انسان کو حقیر سمجھ کر سجدہ کرنے سے انکار کردیا اور اللہ کے حکم سے سرتابی کی راہ اختیار کی، (البقرۃ: ۳۴، الاعراف: ۱۱، الاسراء: ٦١، الکہف: ۵۰، طٰہٰ: ۱۱٦) اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان پر یہ احسان بھی کیا ہے کہ اس کو قوت تسخیر سے نوازا ہے، وہ سمندر کی تہوں کو ٹٹول رہا ہے، وہ حد نظر سے دور سیاروں پر اپنی کمندیں پھینک رہا ہے، وہ ہوا کے دوش اور سمندر کی متلاطم موجوں کی پشت پر سوار ہوکر ہزاروں میل کا سفر طے کرتا ہے، ہر صبح جب طلوع ہوتی ہے تو کائنات کی چھپی ہوئی حقیقتوں کے انکشافات اور نئے نئے آلات کے اختراع میں انسان کی فتح مندی کا مژدہ سناتی ہے؛ لیکن جہاں اس کی عقل ودانش کی سحر طرازیوں کے آگے کائنات دم بخود ہے، وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ جسمانی اعتبار سے بے حد کمزور، نحیف اور محتاج وضرورت مند ہے، دنیا میں جتنے جاندار ہیں، وہ بمقابلہ نومولود انسان کے جلد اپنے پاؤں پر کھڑے ہوجاتے ہیں، بعض جانور چند گھنٹوں میں چلنے پھرنے لگتے ہیں اور اپنی غذائی ضرورت خود پوری کرلیتے ہیں، بعض چند دنوں میں اور بعض چند مہینوں میں؛ لیکن انسان کو صرف آنکھ کھولنے میں کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں، مہینوں میں وہ بولنا شروع کرتا ہے اور سالوں میں چلنا پھرنا، بلوغ وشباب کی منزل کو پہنچنے میں اسے پندرہ سولہ سال لگ جاتے ہیں، پھر شعور کی پختگی، جذبات میں اعتدال، فکر میں گہرائی وغیرہ کے لئے بھی سالہا سال مطلوب ہوتے ہیں؛ اس لئے وہ طویل عرصہ تک اپنے والدین کا، بزرگوں اور دوستوں کا، اساتذہ اور مربیوں کا، بہتر مشورہ دینے والے اور بہی خواہی کا جذبہ رکھنے والے رہنماؤں کا محتاج ہوتا ہے۔

اسی لئے انسان کو سب سے زیادہ خاندان کی ضرورت پڑتی ہے، اگر ماں باپ کا سایہ اس کے

سر سے اٹھ جائے تو وہ ایک خزاں رسیدہ درخت کی طرح اپنے آپ کو بے سایہ اور بے سہارا محسوس کرتا ہے، اگر وہ بھائی بہن سے محروم ہے تب بھی اسے اپنی تنہائی کا احساس ہوتا ہے، اگر کچھ اور بزرگ رشتہ دار — دادا، دادی اور نانا، نانی — نہ ہوں تو وہ غیر معمولی خلا محسوس کرتا ہے، اگر چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ سے محروم ہو تو اسے لگتا ہے کہ جیسے اس کے ارد گرد اپنے خاندان کا حفاظتی حصار موجود نہیں ہے، پھر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد جب تک شریک حیات کا ساتھ حاصل نہ ہو جائے، اس کی زندگی بے سکون اور نا آسودہ ہوتی ہے، اب آگے خود اس کے گھر میں پھول کھلتے ہیں اور وہ صاحب اولاد ہوتا ہے تو اس سے غیر معمولی نفسیاتی مسرت اسے حاصل ہوتی ہے اور بیٹوں اور بیٹیوں کے بغیر اسے اپنی تگ ودو اور جد وجہد بے معنی اور بے مقصد نظر آتی ہے، پھر سسرالی خاندان کے ذریعہ وہ اپنے آپ میں مزید توانائی محسوس کرتا ہے، غرض کہ انسان کی فطرت چاہتی ہے کہ وہ ایک خاندان کا حصہ بن کر رہے۔

خاندان کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ وہ اس کے لئے حفاظتی حصار ہوتا ہے، اگر کوئی شخص اس پر زیادتی کرے تو انسان یہ سمجھ کر اپنا دفاع کرتا ہے کہ اس کی پشت پر اس کا پورا خاندان ہے اور خود زیادتی کرنے والے کو بھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمیں تنہا ایک شخص کا نہیں؛ بلکہ پورے خاندان کا مقابلہ کرنا ہوگا؛ اسی لئے شریعت نے قتل کی دیت (خون بہا) قاتل کے قریب ترین رشتہ داروں کے ذمہ رکھی ہے، جس کو ''عاقلہ'' کہا جاتا ہے؛ تاکہ ایک طرف قاتل پر عائد ہونے والی اس بڑی مالی سزا کو رشتہ داروں پر تقسیم کر دیا جائے اور وہ اس کے لئے قابل برداشت ہو سکے، دوسری طرف جو اعزہ و اقارب ہیں، وہ بھی محسوس کریں کہ اپنے خاندان کے ایک فرد کو جرم سے باز رکھنے کے لئے سبھی ذمہ دار ہیں، ورنہ جرمانہ میں ہمیں بھی شریک ہونا پڑے گا، اسلام سے پہلے عربوں میں یہ خاندانی نظام ہی تھا، جس کے ذریعہ لوگوں کا تحفظ ہوتا تھا، اور آج بھی قبائلی علاقوں میں یہی نظام لوگوں کی جان و مال کا محافظ ہے۔

خاندان کا دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے کمزوروں، غریبوں، معذوروں، بوڑھوں، یتیموں، بیواؤں اور خواتین کی کفالت کا سامان ہوتا ہے؛ کیوں کہ ہر شخص اپنے خاندان کے مجبور و نادار لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے، والدین کو اولاد کی اور اولاد کو والدین کی، شوہر و بیوی،

بھائیوں، بہنوں کی ایک دوسرے کو، اسی طرح خاندان کے نادار اور بے سہارا لوگوں کی خاندان کے مرفہ الحال لوگوں کو ذمہ داری سونپی جاتی ہے، اسلام میں نفقہ، کفالت اور میراث کے پورے قانون کی اساس یہی ہے کہ انسان پر صرف اسی کی ذمہ داری نہیں ہے؛ بلکہ وہ خاندان کا ایک حصہ ہے، وہ ایک کل کا جزو اور ایک عمارت کی اینٹ ہے، اس کے لئے درست نہیں ہے کہ وہ دوسروں سے بالکل بے تعلق ہوجائے۔

خاندان کا تیسرا اہم مقصد خوشی اور مسرت کو دوبالا کرنا اور مصائب وآلام کو تقسیم کرنا اور ہلکا کرنا ہے، کتنی بھی خوشی کی بات ہوجائے، اگر اس خوشی میں ماں باپ کی شرکت نہ ہوتو یہ خوشی ادھوری، ناتمام اور بے کیف معلوم ہوتی ہے، اسی طرح اگر انسان پر کوئی مصیبت آئے، اس کے درد پر آنسو بہانے والی کوئی آنکھ نہ ہو، اس کے غم کو بانٹنے والا کوئی دل نہ ہو اور اس کی تسلی ودلداری کرنے والی کوئی زبان نہ ہو تو رائی برابر مصیبت پہاڑ کی طرح معلوم ہوتی ہے، یہ انسانی فطرت ہے اور انسان کی نفسیات کا لازمی حصہ ہے، خاندان کی شرکت خوشی کو دوبالا اور غم کے احساس کو ہلکا کرتی ہے۔

اسی لئے قرآن مجید نے خاندان کے وجود کو اللہ تعالیٰ کے احسان میں شمار کیا ہے، بنیادی طور پر انسان تین خاندانوں کے درمیان ہوتا ہے، دادیہال، نانیہال اور سسرال، دادیہال اور نانیہال ماں باپ کی طرف سے اور سسرال شوہر و بیوی کی طرف سے، قرآن نے پہلے دونوں خاندان کو ''نسب'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور تیسرے خاندان کو ''صہر'' کے لفظ سے: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۭ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا﴾ (الفرقان: ۵۴) اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خاندانی نظام انسانی سماج کے لئے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اس میں انسان کا تحفظ ہے، اس میں اس کی کفالت کا انتظام ہے اور اس میں قلبی اور روحانی سکون کا سامان ہے؛ لیکن اسلام کا قانون میراث اور قانون نفقہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ خاندانی نظام میں اتنا پھیلاؤ بھی نہ ہونا چاہئے کہ انسان کے لئے اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہوجائے اور ہر انسان کے اندر خلوت پسندی اور دوسروں کی مداخلت سے تحفظ کا جو جذبہ رکھا گیا ہے، وہ بھی مجروح ہوجائے؛ کیوں کہ اگر خاندان کی وسعت غیر محدود ہوجائے تو انسان گھر میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو بازار میں محسوس کرتا ہے اور مزاج کا اختلاف دوریاں پیدا کرنے کا اور ایک دوسرے سے اکتاہٹ کا سبب بن

جا تا ہے؛اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں خاندانی نظام کی بڑی اہمیت ہے؛لیکن اس کے دائرہ کو اس حد تک محدود کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان بےسکونی محسوس نہ کرے۔

خاندانی نظام کی بنیادشریعت اسلامی میں عدل واحسان پر ہے،عدل یہ ہے کہ جوآپ کے کام آتا ہےاور جتنا کام آتا ہے،آپ بھی اس کے کام آئیں اوراسی قدرآئیں؛اسی لئےشریعت نےنفقہ کی ذمہ داری،حصۂ میراث کےتناسب سےرکھی ہے،اعزہ واقارب کانفقہ ان رشتہ داروں پرواجب ہوتا ہے، جوامکانی طور پراس کے وارث ہونے کے اہل ہیں اورنفقہ بھی اتنی ہی مقدار میں واجب ہوگا، جتنا اس کاحق میراث ہوتا ہے، ——احسان یہ ہے کہ جوآپ کے کام نہ آئے آپ اس کے کام آئیں،یعنی ایثاراور بےغرضی پرمبنی تعلق،اسی لئے جن لوگوں کا نفقہ کسی شخص پرواجب ہوتا ہے، وہ اس پرقرض نہیں ہوتا؛ بلکہ تبرع ہوتا ہے، یہ سمجھ کر رشتہ داروں کی خدمت کی جاتی ہے کہ ان کے لئے کھونا بھی پانا ہے؛ اس لئے اسلام میں خاندانی نظام کی بنیادعدل واحسان یاانصاف وایثار پر ہے۔

خاندان کی تشکیل میں خواتین کا کردار بنیادی اہمیت رکھتا ہے،عورت ایک طرف اپنے بچوں کو سمیٹ کر رکھتی ہےاوردوسری طرف اپنے رشتہ داروں اوراپنےشوہر کے رشتہ داروں سے اپنی اولاد کو جوڑتی ہے، ماں کی ممتااور بیوی کی محبت کا حق اسی وقت ادا ہوسکتا تھا،جبکہ وہ لطافت کا پیکراورسراپالطف ومحبت ہو،لطافت کے لئے جسمانی نزاکت بھی ضروری ہےاورلطف ومحبت کے لئےضروری ہے کہ اس کے اندرجذبات کاعنصر زیادہ ہواوراس کا دل درد ومحبت سے معمور ہو،اس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک غیر معمولی خوبی ہے؛لیکن دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس سے انسان کی قوت فیصلہ متأثر ہوتی ہے اوراس میں ذکاوت حس پیدا ہوجاتی ہے؛اس لئے اسلام میں خواتین کےحقوق پرخاص طور سے زوردیا گیا ہے کہ مرداس کی جسمانی کمزوری کا فائدہ نہ اٹھائے اوراس کے جذبات محبت کااستحصال نہ کرے،رسول اللہ ﷺ نے اسی لئےعورتوں اورغلاموں کےحقوق پرسب سے زیادہ زوردیا ہے،اگرخواتین کوان کے حقوق نہ دیئے گئے،انہیں برابرکی شریک حیات کادرجہ نہ دیا گیااورانہیں اپنی ضروریات کے لئے گھر سے باہر نکلنے پرمجبورکیا گیااورفرائض مادری ادا کرنے میں رکاوٹ پیدا کی گئی تو یقینی طور پر خاندانی نظام بکھر کررہ جائے گا۔

مغرب میں اس وقت یہی صورت حال ہے،مغرب نے مادی مفادات، زیادہ سے زیادہ

افرادی وسائل کے حصول اور تجارتی ترقی کے لئے خواتین کو گھر سے باہر نکالا، انہیں تشہیر تجارت کا ذریعہ بنایا اور انہیں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اس ذمہ داری کو بھی ادا کریں، جو فطری طور پر ایک عورت ہی ادا کرسکتی ہے اور کسبِ معاش کی جد و جہد میں بھی مردوں کے ساتھ شریک ہوں، اپنا بوجھ آپ اٹھائیں اور اپنی ضرورتیں آپ پوری کریں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میاں بیوی کے تعلق میں جذباتیت اور وفاداری کم ہوگئی، طلاق کے واقعات بڑھ گئے، بغیر نکاح کے زندگی گذارنے کو بہتر سمجھا جانے لگا، بچے والدین کے لئے بوجھ بن گئے، شرح پیدائش گھٹتی چلی گئی، زنا کی کثرت اور شناخت سے محروم بچوں کی بہتات ہوگئی، پُرسکون ازدواجی زندگی سے محرومی کی وجہ سے سکون حاصل کرنے کے لئے نشہ خواری زندگی کا حصہ بن گئی، والدین اور اولاد میں بھی محبت، وفاداری اور جذبہ خدمت باقی نہیں رہا اور خاندانی نظام پوری طرح بکھر کر رہ گیا، خاندانی نظام کے بکھراؤ سے مغربی سماج کو جو نقصانات پہنچے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

○ بوڑھے اور ضعیف لوگوں کے لئے زندگی گذارنا دوبھر ہوگیا، اب ان کے لئے دو ہی راستے رہ گئے، یا تو وہ اپنے گھر میں تنہائی اور بے چارگی کی زندگی گذاریں، انہیں ایک گلاس پانی دینے والا اور ایک نوالہ کھلانے والا بھی میسر نہ ہو، یا وہ سن رسیدہ اور معمر لوگوں کے لئے بنائے گئے ہاسٹل میں رہیں اور ان کے بچے سال میں ایک دفعہ آکر انہیں گلدستہ پیش کردیں اور بس، یہ ایسی زندگی ہے جس میں انسان کو موت زندگی سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔

○ دوسرا نقصان عورتوں کا ہوا، عورتوں کی صحت میں فطری طور پر جلد انحطاط پیدا ہوتا ہے، ولادت اور فطری عوارض تیزی سے ان کی صحت کو متأثر کردیتے ہیں اور عمر گذرنے کے ساتھ ساتھ نہ صرف ان کی خوبصورتی کو گہن لگنے لگتا ہے؛ بلکہ ان کی قوت فکر اور قوت عمل بھی تیزی سے متأثر ہونے لگتی ہے، اب جس معاشرہ میں عورت صرف مرد کے لئے ہوس کا سامان ہو، اس میں ایک ایسی عورت کی کیا قیمت ہوسکتی ہے، جس کا حسن و جمال ڈھل چکا ہو؛ اسی لئے مغربی سماج میں عورتیں اپنے آپ کو بہت پریشان محسوس کرتی ہیں اور غالباً اسی باعث مغربی ممالک میں خواتین بہ مقابلہ مردوں کے زیادہ اسلام قبول کرنے پر مائل ہیں۔

○ تیسرے اس سے بچے متأثر ہوتے ہیں، جب زندگی میں ایک دوسرے سے جوڑ نہ ہو،

زندگی کا مقصد صرف عیش وعشرت ہو تو وہاں انسان کے دادِ عیش دینے میں جو چیز بھی رکاوٹ بنتی ہے، وہ بوجھ بن جاتی ہے، بچے اس آزادی میں بھی خلل انداز ہوتے ہیں، وہ ماؤں کے لئے ملازمت میں رکاوٹ بنتے ہیں اور شوہر و بیوی کے درمیان تعلقات میں بے وفائی کی وجہ سے یہ اندیشہ بھی دامن گیر ہوتا ہے کہ اگر ہمارے راستے الگ ہو گئے تو ان بچوں کا بوجھ کون اٹھائے گا؟ اس لئے مغربی سماج اولاد سے راہِ فرار اختیار کر رہا ہے اور جو بچے پیدا ہو جاتے ہیں، انہیں دیکھ بھال کے لئے پرورش گاہوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا انہیں ہفتہ میں ایک دو دن ہی مل پاتی ہے، اس طرح بچوں پر غیر معمولی نفسیاتی اثر پڑتا ہے۔

○ اس کا ایک بڑا نقصان اپنی شناخت سے محرومی ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی ہے کہ وہ اپنی پہچان کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کے شہر کی، اس کے گھر کی، اس کے کاروبار کی اور اس کی اپنی پہچان ہو، سب سے زیادہ اس کو جو شناخت عزیز ہوتی ہے، وہ فطری شناخت ہے، یعنی ماں باپ اور خاندان سے اس کی نسبت، وہ اس کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھتا ہے، جو لوگ اپنی شناخت سے محروم ہوتے ہیں، انہیں یہ محرومی ستاتی ہے، وہ نفسیاتی مریض ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ مجرمانہ حرکتوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، خاندانی نظام کے بکھراؤ کی وجہ سے نکاح سے گریز، زنا کی کثرت اور اپنی شناخت سے محروم بچوں کی پیدائش مغربی ملکوں میں ایسے مجرموں کو پیدا کر رہی ہیں۔

○ انسان کو جو چیز سب سے زیادہ محبوب ہے، وہ ہے دل کا سکون، یہ سکون یا تو انسان کو تعلق مع اللہ سے ہوتا ہے، یا ایک انسان کو دوسرے انسان سے، بچوں کو اپنے ماں باپ کی گود میں جا کر جو سکون ملتا ہے، اس کی کسی بڑی سے بڑی نعمت سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی، نوجوان اولاد بوڑھے ماں باپ کے سر میں تیل لگائے اور پاؤں دبائے اس سے والدین کو جو خوشی ہوتی ہے اور قلب و روح کو جو تسکین حاصل ہوتی ہے، وہ سونے چاندی کی پلنگ پر سلانے سے بھی حاصل نہیں ہوسکتی، شوہر و بیوی جیسے ایک دوسرے کے سکون کا ذریعہ ہیں، کوئی چیز اس کا متبادل نہیں بن سکتی، بھائی بہن کو ایک دوسرے کی محبت سے جس خوشی کا احساس ہوتا ہے، وہ کسی اور چیز سے نہیں ہوسکتا، جب خاندان بکھرتا ہے تو رشتوں کے آبگینے ٹوٹ جاتے ہیں، جیسے برقی سے محروم بلب سے روشنی حاصل نہیں کی جاسکتی، اسی طرح ان بے روح رشتوں سے انسان کو سکون کی غذا حاصل نہیں ہو پاتی، یہی وجہ ہے کہ مغرب اور

مغرب زدہ معاشرہ میں بے خوابی، ڈپریشن اور خودکشی کے واقعات تیزی سے بڑھتے جارہے ہیں؛ اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خاندانی نظام کا بقا انسان کے لئے بہت بڑی نعمت اور اس کا بکھر جانا بہت بڑی آزمائش ہے۔

گلوبلائزیشن کی بنیاد پر صرف مغرب کے تجارتی سامان ہی کا مشرقی ملکوں میں ایکسپورٹ نہیں ہورہا ہے؛ بلکہ مغربی افکار، مغربی تہذیب اور مغرب کا طرز زندگی بھی ہمارے سماج کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے، نوجوان لڑکوں اور خاص کر لڑکیوں میں خاندان سے بے تعلق ہوکر ایسی زندگی گذرانے کا مزاج پیدا ہورہا ہے کہ جس میں انہیں نہ اپنے بڑوں کی خدمت کرنی پڑے اور نہ ان کا حکم ماننا پڑے، ماں باپ جن کے قدموں کے نیچے جنت رکھی گئی اور جن کو جنت کا دروازہ کہا گیا، وہ اولاد کے لئے بوجھ بنتے جارہے ہیں، خاندان کے بزرگوں کے تجربات پر مبنی مشوروں کو دخل در معقولات تصور کیا جارہا ہے، رشتۂ نکاح میں وفاداری کے بندھن کمزور ہوتے جارہے ہیں، اولاد سے فرار کا جذبہ پروان چڑھ رہا ہے، خاندان کے مجبور لوگوں کی کفالت اور ان کی خدمت کی ذمہ داری لوگ اپنے آپ پر محسوس نہیں کرتے، غرض کہ ہمارا خاندانی نظام بھی شکست وریخت کے خطرہ سے دوچار ہے، ان حالات میں نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنے خاندانی نظام کو بچانے کی کوشش کریں اور اپنے سماج کو مغرب کے اس سیلاب میں بہہ نہ جانے دیں، جس نے خاندان کے تصور کو ایک فرسودہ روایت قرار دے دیا ہے اور چاہتا ہے کہ جیسے وہ خود خاندان کے بکھراؤ کی آگ میں جل رہا ہے، مشرقی سماج بھی اسی صورت حال کو قبول کرلے۔

جو کھیلو گے کودو گے ہو گے نواب!

(کھیل کود اور ناچ گانے پر اعزازات وانعامات)

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر بھلے کاموں کو انجام دینے کی بھی صلاحیت رکھی ہے اور بُرے کاموں کے ارتکاب کی بھی، نیز اس کو ارادہ واختیار کی طاقت بھی دی گئی ہے؛ البتہ اسے اپنی خواہش کے مطابق کام کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا ہے؛ بلکہ پابند کیا گیا ہے کہ وہ اپنی طاقت کا استعمال صحیح مقاصد کے لئے کرے اور برائیوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھے، اسی میں انسان کا اصل امتحان ہے، اگر گونگے کو بولنے سے روک دیا جائے تو اس میں کوئی آزمائش نہیں ہے، جو شخص بولنا جانتا ہو اور الفاظ کے موتی لٹانے کی صلاحیت رکھتا ہو، اگر اس کو کہا جائے کہ تم اپنے ہونٹ سی لو تو یقیناً اس کے لئے یہ ایک ابتلاء سے کم نہیں ہے، اگر ایک شخص چلنے سے معذور ہو اور اس کو حکم دیا جائے کہ تمہیں فلاں مقام پر جانے سے منع کیا جاتا ہے تو اس کے لئے کوئی دشواری نہیں؛ کیوں کہ اگر اس کو منع نہیں کیا جاتا، تب بھی وہ وہاں جانے کی سکت نہیں رکھتا؛ لیکن اگر اس کو چلنے، دوڑنے، بھاگنے کی طاقت ہو اور جس مقام پر جانے سے روکا جا رہا ہو، وہاں ایک ایسا دلچسپ پروگرام ہونے والا ہو، جس کی طرف پوری خلقت الٹی پڑ رہی ہو، تو اب اس کا رک جانا اس کے نفس پر شاق گذرے گا، انسان کی صورت حال یہی ہے کہ دماغ اور آنکھوں سے لے کر پاؤں تک کوئی عضو ایسا نہیں، جس میں دوہری صلاحیت موجود نہ ہو جس کی مدد سے انسان لذت خیر سے بھی شادکام ہو سکتا ہے اور لذت گناہ سے بھی اپنے نفس کی ہوس پوری کر سکتا ہے، اگر انسان سراپا خیر ہوتا جیسا کہ فرشتے ہیں تو وہ انعام کا مستحق نہیں ہوتا؛ کیوں کہ وہ امتحان کے مرحلہ سے گذرا ہی نہیں، اور اگر مجسم شر وفساد ہوتا تب بھی اس کے لئے انعام کا کوئی استحقاق نہ ہوتا اور اس کے لئے سزا کے سوا کوئی راہ نہیں ہوتی، اسی لئے شاعر نے خوب کہا ہے:

فرشتوں سے بڑھ کر ہے انسان ہونا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

انسان کے اندر چوں کہ دوہری صلاحیت موجود ہے؛ اس لئے کہ اس کا خیر کے کاموں کو انجام دینا نہایت ہی قابل تحسین عمل ہے، اسی لئے اُس کو کار خیر کی طرف قدم بڑھانے کی ترغیب بھی دی جاتی

ہے، اس کی خوبیوں کا اعتراف بھی کیا جاتا ہے اور اچھے کاموں پر انعام بھی دیا جاتا ہے، انعام کا نظام آخرت میں تو ہے ہی؛ بلکہ آخرت کا مقصد ہی یہی ہے کہ اس میں نیکیوں پر انعام عطا کیا جائے اور گناہوں پر سزا دی جائے؛ لیکن خود دنیا میں بھی جزاء وسزا کا نظام جاری ہے، مذاہب میں بھی اسی کی تعلیم دی ہے اور یہ فطرت انسانی کا بھی حصہ ہے، یہی وجہ ہے کہ جو لوگ مذہب پر یقین نہیں رکھتے، وہ بھی انسانی سماج میں امن وامان قائم رکھنے، ظلم وجور کو روکنے اور بھلائیوں کی طرف معاشرہ کو راغب کرنے کی غرض سے عدلیہ کا نظام قائم کرتے ہیں، بہتر کام انجام دینے والوں کو حکومت ایوارڈ دیتی ہے اور مجرموں کو سزا دی جاتی ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ انعام کے مستحق کون لوگ ہیں؟ کیا کسی بھی کام میں انسان کا آگے بڑھ جانا اور امتیازی صلاحیت حاصل کر لینا اس کے مستحق انعام ہونے کے لئے کافی ہے؟ یا اس کے لئے کوئی خاص معیار بھی ہونا چاہئے؟ —— مذہب بھی اس سوال کا جواب دیتا ہے اور انسانی عقل بھی ہماری رہنمائی کرتی ہے، قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے احسان کا رویہ اختیار کرنے والوں کو انعام دینے کا فیصلہ کر رکھا ہے: ﴿إِنَّ اللهَ لَا يُضِيْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (التوبۃ: ۱۲۰) احسان کی تعریف مختصر الفاظ میں یہ کی جاسکتی ہے کہ اچھے کام کو اچھے طریقہ پر انجام دیا جائے، یعنی کام بھی بہتر ہو اور طریقۂ کار بھی، اچھے کام کا دائرہ بہت وسیع ہے، اس میں عبادت بھی ہے، سماجی خدمت بھی ہے، بہتر اخلاق بھی ہے، دوسرے انسانوں کے ساتھ حسن سلوک اور اعانت بھی ہے، علم وتحقیق کی ایسی کوشش بھی ہے، جس کا مقصد انسانیت کو نفع پہنچانا ہو اور اسی میں ایسی تعلیم وتربیت بھی داخل ہے، جس کا مقصد انسان کو اچھا انسان بنانا اور اچھے افراد پیدا کرنا ہو، —— اگر مذہب سے ہٹ کر صرف عقل ومصلحت کے پہلو سے دیکھا جائے تو اس کا بھی حاصل یہی ہے کہ جو لوگ انسانی خدمت، مخلوق کی حاجت روائی، تعلیم وتربیت اور انسانی سماج کے لئے نفع بخش علم وتحقیق کو فروغ دینے میں لگے ہوئے ہوں، وہ انعام کے حق دار ہیں؛ کیوں کہ وہ صرف اپنی ذات کی خدمت نہیں کرتے، پورے سماج کی خدمت کرتے ہیں، انہوں نے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف اپنی مادی خواہشات کو پوری کرنے میں نہیں لگائی ہیں؛ بلکہ ان کو قوم وملک کی خدمت اور انسانیت کو نفع پہنچانے میں لگائی ہیں۔

اس لحاظ سے ہمارے ملک میں بہترین ٹیچر کو ایوارڈ دینا چاہئے، اچھے ڈاکٹر کو انعام ملنا چاہئے،

بیماروں، یتیموں، بیواؤں، معذوروں اور غریبوں کی خدمت کرنے والوں کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے، جن لوگوں نے سائنسی تحقیق میں کوئی کارنامہ انجام دیا ہو، لا علاج امراض کی دواؤں کو وجود بخشا ہو، زراعتی پیداوار کو بڑھانے کے لئے نئی تکنیک کو وجود میں لایا ہو، تعمیر کے لئے کم قیمت کا میٹریل یا ایندھن تیار کیا ہو، یا اس طرح کی کوئی اور تحقیق کی ہو، اچھی کتابیں لکھی ہو، فکر وعمل کو صحیح رخ دینے والی تحریک چلائی ہو، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور انسانی حقوق کے تحفظ کی خدمت کی ہو، مظلوموں کو انصاف دلانے کے لئے مہم چلائی ہو اور ظالم کو کیفر کردار تک پہنچانے کی مؤثر کوششیں کی ہوں، ایسے لوگوں کو انعام واکرام سے نوازنا یقیناً حق بجانب ہوگا۔

لیکن اس وقت ہمارے ملک میں ایک عجیب ماحول کھلاڑیوں کو، ناچنے گانے والوں کو اور کرتب دکھانے والوں کو انعامات سے نوازنے کا بنتا جارہا ہے، جیسے سچن تنڈولکر کرکٹ کے اچھے کھلاڑی ہیں، کرکٹ کے عشاق ان کے کھیل کو بے حد پسند کرتے ہیں؛ لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ کھیل میں ان کی اس مہارت سے نہ کسی غریب ہندوستانی کا پیٹ بھر سکتا ہے نہ تن ڈھک سکتا ہے اور نہ آسمان کے نیچے کوئی چھت مل سکتی ہے، نہ کسی مفلس بیمار کا علاج ہوسکتا ہے اور نہ کسی بیوہ کے آنسو پونچھے جاسکتے ہیں؛ لیکن کچھ عرصہ پہلے مطالبہ کیا جانے لگا کہ ان کو ہندوستان کا اعلیٰ ترین اعزاز ''بھارت رتن'' دیا جائے، یعنی ایک کھیل کود کرنے والے شخص کو جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر امبیڈکر وغیرہ جیسے مجاہدین آزادی اور معماران قوم کی صف میں کھڑا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، یہ نہ صرف سچائی کے خلاف ہے؛ بلکہ ملک کے بزرگ قائدین اور قوم کے عظیم رہنماؤں کی توہین وتذلیل بھی ہے۔

جب بھی کوئی ٹیم بیرون ملک سے جیت کر آتی ہے یا خود ہندستان میں رہتے ہوئے کھیل کا کوئی معرکہ سر کرتی ہے تو کچھ اِس طرح اُس کا استقبال کیا جاتا ہے کہ گویا وہ کوئی نسخۂ کیمیا ساتھ لایا ہو، پھر انعامات کی کچھ اس طرح بارش ہوتی ہے کہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے علاوہ بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں بھی کروڑوں کے انعامات سے نوازتی ہیں، گورنمنٹ ان انعامات کا بوجھ ٹیکس دینے والوں پر ڈالتی ہے اور کمپنیاں صارفین کی جیب پر، قوم کو کوئی نفع حاصل نہیں ہوتا، کچھ سر پھرے نوجوان شاید اس کو اپنے لئے سرمایۂ افتخار سمجھتے ہوں؛ لیکن سماج کے سنجیدہ افراد اِسے ایک وقت تفریح سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔

ابھی چند دنوں پہلے آندھرا پردیش کی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ سائنا نہوال کو پچاس لاکھ

روپے کا انعام دیا جائے گا، افسوس کہ یہ اعلان وہ حکومت کر رہی ہے، جس کی ریاست میں سیکڑوں کسانوں نے قرض کے بوجھ سے دب کر خودکشی کر لی ہے، اگر حکومت اس طرح کی انعامی رقمیں محنت کش غریب کسانوں پر خرچ کرتی تو نہ صرف ان بے چاروں کا بھلا ہوتا؛ بلکہ اس حوصلہ افزائی سے متأثر ہوکر جب وہ زراعت کی طرف بھر پور توجہ کرتے اور پیداوار بڑھتی تو سماج کے تمام لوگوں کو اس سے فائدہ ہوتا، انہیں سستا اناج ملتا، گرانی کم ہوتی اور تجارت کو ترقی حاصل ہوتی؛ لیکن مغرب نے پوری دنیا اور خاص کر مشرقی ملکوں کی یہ سوچ بنادی ہے کہ وہ بے فائدہ کاموں میں اپنی صلاحیتوں اور سرمایوں کو خرچ کریں، اس کے پیچھے یہ سرمایہ دارانہ سوچ بھی کارفرما ہے کہ عوام کے زیادہ سے زیادہ افراد تک دولت نہیں پہنچے؛ بلکہ چند ہاتھوں میں سمٹ کر آ جائے۔

ایسے انعام واکرام کا منفی پہلو یہ ہے کہ جب لوگوں کو کھیل کود پر، دوڑ بھاگ پر، فلموں میں ناچنے گانے پر، ڈرامہ بازیوں اور کرتبوں پر، نیز بے حیائی کے پھیلانے پر انعام دیئے جاتے ہیں تو نئی نسل کو تعلیم میں محنت کرنا، علم و تحقیق کی خارزار وادیوں میں آبلہ پائی کرنا، سائنس کے میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کرنا بے سود نظر آنے لگتا ہے، ہوسکتا ہے کہ ان میں سے ایک دو فی ہزار اس میدان میں آگے بڑھ جاتے ہوں، بقیہ سب نہ تعلیم کا میدان سر کر پاتے ہیں اور نہ کھیل کی دنیا میں کوئی امتیاز حاصل کر پاتے ہیں؛ اس لئے اس سوچ کو بدلنے کی ضرورت ہے، کھیل کود کی ایسی حوصلہ افزائی نہ ہونی چاہئے کہ لوگ اصحاب علم، اہل دانش، انسانیت کے خادمین اور ملک کے مخلص رہنما اور قائدین کے بجائے کھیلاڑیوں کو اپنا آئیڈیل بنانے یا اخلاق کو برباد کرنے والے گوّیوں اور رقاصاؤں کو اپنے لئے نمونہ سمجھنے لگیں، مولانا محمد اسماعیل میرٹھی نے کہا تھا:

جو کھیلو گے کودو گے ہوگے خراب
جو لکھو گے پڑھوگے ہوگے نواب

شاید مولانا میرٹھی کی روح آج کے حالات کو دیکھ کر اپنے اس شعر پر شرمندہ ہو، اگر وہ آج کا ماحول دیکھتے اور کھلاڑیوں پر انعام واکرام کی بارش ملاحظہ کرتے تو یوں کہتے:

جو کھیلو گے کودو گے ہو گے نواب

❁

کچھ نئے مسائل

قربانی کی بجائے مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کی تجویز

اکثر مذاہب میں اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق قربانی کا تصور رہا ہے، یہودیوں کے مختلف تہواروں میں قربانی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور بائبل میں متعدد مواقع پر اس کا ذکر موجود ہے، یہاں تک کہ بعض وہ قومیں جو اپنے آپ کو 'ذبح حیوان' کا مخالف کہتی ہیں، وہ بھی مذہبی قربانی کے قائل ہیں، جیسے ہندو بھائی، کہ ان کے یہاں بعض تہواروں میں اور بعض استھانوں پر جانور کی قربانی دی جاتی ہے، عربوں میں اسلام سے پہلے اُن باطل دیویوں اور دیوتاؤں کے نام پر قربانی دی جاتی تھی، جن کو وہ خدائی میں شریک تصور کرتے تھے، حج کے موقعہ پر بھی قربانی کی قدیم روایت چلی آرہی ہے اور اسلام سے پہلے بھی منیٰ میں قربانیاں کی جاتی تھیں، اسلام نے ان غلط تصورات اور اعتقادات کی تردید کی، جو قربانی سے وابستہ کر لئے گئے تھے، اسی طرح طریقہ کار کی بھی اصلاح کی گئی، فکر و عقیدہ کی اصلاح سے مراد یہ ہے کہ لوگوں نے قربانی کو ایک مشرکانہ عمل بنا رکھا تھا، اسلام نے اس کو عقیدۂ توحید کا مظہر بنا دیا، اور طریقہ کار کی اصلاح یوں فرمائی کہ قربانی کے جانور کو ذبح کرنے کے سلسلہ میں جو تکلیف دہ اور اذیت رساں طریقے مروج تھے، ان سے منع فرما دیا گیا۔

قربانی ایک ایسی عبادت ہے کہ سال بھر میں ایک بار واجب ہوتی ہے، خود قرآن مجید میں اس کا حکم فرمایا گیا ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ (کوثر:۲) کہ اپنے پروردگار کے لئے نماز پڑھئے اور قربانی کیجئے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کو گنجائش ہو، پھر وہ قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عیدگاہ کے قریب بھی نہ پھٹکے، (ابن ماجہ، کتاب الاضاحی، حدیث نمبر: ۳۱۲۳، عن ابی ہریرۃؓ) ایک موقعہ پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! ہر گھر والے پر ہر سال قربانی ہے، ''**ان علی کل بیت فی کل عام اضحیة**'' مسافر کے لئے بہت سے احکام میں سہولت ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے سفر کی حالت میں بھی قربانی فرمائی، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ ایک سفر میں ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، بقرعید آئی تو ایک گائے میں سات لوگوں نے شرکت کی، (ترمذی، کتاب الحج، باب ماجاء فی الاشتراک فی البدنة، حدیث نمبر: ۹۰۵) — اسی لئے فقہاء قربانی کے ضروری ہونے پر

متفق ہیں، اس ضروری ہونے کو فقہاء احناف نے واجب کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور دوسرے فقہاء نے ایسی سنت قرار دیا ہے جس کا ترک کرنا درست نہیں ہے۔

ادھر اُمت کے ایک گروہ کا مزاج یہ بنتا جا رہا ہے کہ ملت کی ضروریات کو پوری کرنے کے لئے الگ سے کوئی رقم خرچ نہ کی جائے؛ بلکہ دینی واجبات کے طور پر جن رقوم کی ادائیگی ضروری ہے، ان ہی کو ایسے ملی کاموں میں صرف کر دیا جائے، جیسے زکوٰۃ وقربانی، صدقۃ الفطر، ان ہی سے بچوں کو عصری تعلیم دی جائے، بے روزگار نوجوانوں کو فنی تربیت دی جائے، ٹی وی چینل قائم کئے جائیں، میڈیا سے متعلق سرگرمیوں کو انجام دیا جائے، ہاسپیٹل تعمیر کئے جائیں، غرض کہ یہ حقیر سی رقم جو غرباء کی حاجت روائی کے لئے شریعت نے مقرر کی ہے، سارے کام اسی سے لئے جائیں۔

اس وقت کشمیر میں جو تباہ کن سیلاب آیا ہے، وہ یقیناً ایک بہت بڑا سانحہ ہے اور اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کی مدد کرنا یقیناً ایک اسلامی اور انسانی فریضہ ہے؛ لیکن بعض گوشوں سے یہ بات کہی جارہی ہے کہ لوگ اس سال قربانی نہ دے کر یہی پیسہ ریلیف میں دے دیں، یہ نہایت ہی مریضانہ سوچ ہے، اگر اس کے بجائے یہ تحریک چلائی جاتی کہ آئندہ تین ماہ میں جتنی شادیاں ہوں، لوگ ان میں سے دس فیصد اخراجات کم کر کے اس فنڈ میں دے دیں، یا یہ کہا جاتا کہ ہر شخص خواہ وہ سرکاری ملازم ہوں یا پرائیوٹ یا بزنس مین یا مزدور، اپنی ایک دن کی آمدنی اس فنڈ میں دے دیں تو کیا بہتر بات ہوتی! اس سے پریشان حال لوگوں کی مدد کا مقصد بھی حاصل ہوجاتا اور اُمت میں یہ مزاج پیدا ہوتا کہ وہ اپنی ذاتی آمدنی اور بچت سے ملت کے کاموں کو انجام دیا کریں، نہ یہ کہ زکوٰۃ اور قربانی کی اس معمولی سی رقم سے سارے کام انجام دیئے جائیں اور ان شرعی واجبات کے علاوہ جیب سے ایک کوڑی بھی نہ نکالی جائے اس مزاج سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: لوگ آپ سے پوچھتے ہیں (وہ کارخیر میں) کیا خرچ کریں؟ آپ فرما دیجئے کہ جو کچھ بھی بچ جائے ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ (البقرۃ: ۲۱۹) اسی طرح قرآن مجید نے مسلمانوں کی یہ شان بتائی کہ چاہے وہ خود فاقہ سے دوچار ہوں؛ لیکن اپنے بھائیوں کے سلسلہ میں ایثار سے کام لیا کریں: ﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (الحشر: ۹)

قرآن مجید کی ان تعلیمات میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمانوں کا یہ مزاج نہیں ہونا چاہئے

کہ وہ ساری ملی ضروریات کے لئے زکوٰۃ، صدقات واجبہ اور قربانی جیسی عبادتوں پر انحصار کرنے لگیں؛ بلکہ ان کو ایسے کام خصوصی عطیات کے ذریعہ کرنے چاہئیں۔

قربانی کی اہمیت اس لئے نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو کھانے کے لئے گوشت میسر ہو جاتا ہے اور غریب سے غریب شخص بھی اس نعمت سے محروم نہیں ہوتا؛ چنانچہ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جانور کے خون اور گوشت اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچتے؛ بلکہ تمہارا جذبۂ اطاعت اللہ کی بارگاہ میں پہنچتا ہے: ﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰي مِنْكُمْ﴾ (الحج: ۳۷) کیوں کہ یہ ایک علامتی عمل ہے، جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی خودسپردگی اور فدائیت کے جذبات سے ہم آہنگی ظاہر کرنا اور اس عہد کو تازہ کرنا مقصود ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کے سامنے سرِتسلیم خم کریں گے اور اللہ کی خوشنودی کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار رہیں گے، جو عمل علامتی طور پر کیا جاتا ہے، دل ودماغ اور فکر سازی میں اس کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوتی ہے، اس سے سوئے ہوئے جذبات بیدار ہوتے ہیں، خوابیدہ اُمنگیں کروٹیں لینے لگتی ہیں، ساکت وجامد قوتِ ارادی میں ولولہ اور ایک نئی حرکت پیدا ہو جاتی ہے، غور کیجئے ہر ملک میں قومی دن منائے جاتے ہیں، خود ہمارے وطنِ عزیز میں ۲۶ رجنوری اور ۱۵ راگست قومی دن ہیں، تو غور کیجئے ان دو دنوں میں جو تقریبات ہوتی ہیں، جو جھنڈے بنائے اور لہرائے جاتے ہیں اور ملک کے تمام شہریوں کی خصوصی تعطیل رہتی ہے، ان پر کیا کچھ خرچ نہ آتا ہوگا؟ اگر اس سلسلہ میں تمام اخراجات کا حساب کیا جائے تو بہت سے عوامی کام اس رقم سے کئے جاسکتے ہیں؛ لیکن کیا ہمارا ملک یا کوئی بھی ملک اس بات کو قبول کرسکتا ہے کہ وہ ان تقریبات کو روک دے اور جو بچت ہو اس سے غریبوں کے لئے کھانے اور کپڑے کا انتظام کرے — نہیں اور ہرگز نہیں! کیوں کہ یہ تقریبات حب الوطنی کے جذبہ کو اُبھارتی ہے، ان پروگراموں کے ذریعہ ملک سے وفاداری کے عہد کی تجدید ہوتی ہے، قومی بھائی چارہ پروان چڑھتا ہے، لوگ اپنے بزرگوں کی قربانی کو یاد کرتے ہیں، خود اپنے اندر ناموس وطن کے لئے قربانی کا جذبہ اُبھرتا ہے، یہ اتنے عظیم مقاصد ہیں کہ کچھ لوگوں کو کھانا کھلانے اور کپڑے پہنانے سے کہیں زیادہ ان کی اہمیت ہے۔

اسلام میں دو اہم سالانہ تہوار رکھے گئے ہیں، ایک رمضان المبارک اور اس کے ساتھ عید

الفطر، اور دوسرے عید الاضحیٰ —— رمضان المبارک کے روزے اور اس کے اختتام پر عید الفطر اور اس کے ساتھ ساتھ صدقۃ الفطر نزولِ قرآن مجید کی یادگار ہے، اسی لئے رمضان المبارک کے آتے ہی پورے مسلم معاشرے میں قرآن مجید کا غلغلہ بلند ہونے لگتا ہے، تراویح کی نماز پڑھی جاتی ہے، تلاوتِ قرآن کی مقدار میں اضافہ ہو جاتا ہے، عظمتِ قرآن پر اجتماعات ہوتے ہیں، یہاں تک کہ قرآن مجید کے نسخوں کی خریداری میں بھی خاصا اضافہ ہو جاتا ہے، بعض اہل خیر قرآن اور اس کے نسخے تقسیم کرتے ہیں، یہ سب کچھ اسی علامتی عمل کی دین ہے، اس کے بغیر بڑے سے بڑا اجتماع اور تحریک بھی یہ بات پیدا نہیں کر پاتی۔

'بقرعید اور قربانی' بھی ایک علامتی عمل ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے قربانی کے بارے میں فرمایا کہ یہ محض جانور کو ذبح کرنا نہیں ہے؛ بلکہ یہ تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے: ''**سنة ابيكم ابراهيم**'' (مستدرک حاکم، کتاب التفسیر، حدیث نمبر: ۳۴۶۷) اور اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قربانی کے دن سب سے افضل عمل یہ ہے کہ انسان قربانی کرے: ''**ماعمل آدمی فی هذا اليوم افضل من دم يهراق الا ان يكون رحما مقطوعة توصل**'' (معجم الکبیر، حدیث نمبر: ۱۰۹۴۸، عن ابن عباسؓ) رسول اللہ ﷺ کو قربانی کا اس درجہ اہتمام تھا کہ آپ ﷺ نے مدنی زندگی کے پورے دس سالوں میں سے ہر سال قربانی فرمائی: ''**أقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالمدينة عشر سنين يضحى**'' (ترمذی، کتاب الاضاحی، حدیث نمبر: ۱۵۰۷، عن عبداللہ ابن عمرؓ) اس عمل کی اہمیت کی وجہ سے آپ ﷺ نے اپنی لختِ جگر حضرت فاطمہؓ سے فرمایا کہ قربانی کے وقت تم وہاں موجود رہو، اس کا اجر یہ ہے کہ ہر قطرہ خون کے بدلہ تمہارے پچھلے گناہ معاف کئے جائیں گے: ''**فإن لک یک قطرة من دمها أن يغفر لک ما سلف من ذنوبک**''۔ (مستدرک حاکم، کتاب الاضاحی، حدیث نمبر: ۷۵۳۵)

قربانی کا یہ مقصد صدقہ اور لوگوں کی اعانت کرنے سے حاصل نہیں ہوسکتا، پھر غور کیجئے تو قربانی میں غرباء کی مدد کا پہلو بھی نمایاں ہے، اس موقعہ سے لاکھوں کی تعداد میں جانور خرید کئے جاتے ہیں اور بہت سے مویشی پالنے والے یا اس کی تجارت کرنے والے غریب لوگوں کو کثیر آمدنی حاصل ہوجاتی ہے، ایک ہی وقت میں قربانی کرنے کی وجہ سے بہت سے ایسے غرباء کو گوشت پہنچ جاتا ہے اور وافر

مقدار میں میسر آتا ہے، جنھیں گوشت کھانے کے لئے پندرہ دن اور ایک مہینہ کا انتظار کرنا پڑتا تھا، آج بھی دیہاتوں اور شہر کے غریب محلوں میں ایسے بہت سے گھر ہیں، جن کے لئے گوشت خریدنا دشوار ہوتا ہے، پھر ان جانوروں کے چمڑوں کی فروخت سے کثیر آمدنی ہوتی ہے، جس سے غریبوں، بیواؤں اور دینی مدارس کے نادار طلبہ وطالبات کی مدد ہوتی ہے۔

اس لئے ہمیں اُمت کو تعمیری پیغام دینا چاہئے اور اس کی ایسی سوچ بنانی چاہئے کہ وہ مختلف مقاصد کے لئے اپنی ذاتی آمدنی میں سے خرچ کریں، ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کل ہو کر کہا جانے لگے کہ لوگ فلاں مقصد کے لئے حج کرنا چھوڑ دیں اور نماز میں اپنے اوقات کو صرف کرنے کے بجائے اتنے ہی اوقات کاروبار میں لگائیں اور اس کی آمدنی فلاں کارِ خیر میں خرچ کردیں، اس طرح ملت کی خدمت اور اُمت کی حاجت برآری کے نام پر دین کی بنیاد ہی منہدم ہونے لگے گی۔ **اعاذنا اللہ منه**۔

قتل بہ جذبۂ رحم

انسان کے لئے مادی اعتبار سے سب سے قیمتی شئے اس کی زندگی ہے، زندگی کا چراغ گل ہوتے ہی دنیا کی ساری نعمتیں اس کے حق میں معدوم ہوجاتی ہیں؛ اس لئے دنیا کے تمام مذاہب اور مہذب قوانین میں زندگی کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے، اسلام کی نظر میں جان اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور انسان خود اپنی جان کا مالک نہیں؛ بلکہ وہ اس کا امین ہے، نہ وہ دوسروں کی جان سے کھیل سکتا ہے اور نہ خود اپنے وجود کو ختم کرنے کا حق رکھتا ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص اپنے آپ کو دھاردار آلہ سے ہلاک کرلے تو یہ آلہ قیامت کے دن اس کے ہاتھ میں رہے گا، جس کو وہ ہمیشہ ہمیش دوزخ میں اپنے پیٹ میں بھونکتا رہے گا: "... **ومن قتل نفسه بحديدة، فحديدته في يده، يتوجأ بها في بطنه في نار جهنم خالدا مخلدا فيها أبدا**" (**صحیح البخاری، کتاب الطب، باب شرب السم والدواء به**، حدیث نمبر: ۵۷۷۸، **صحیح مسلم، کتاب الإیمان**، حدیث نمبر: ۳۱۳) خودکشی کے حرام ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ مہلک ہتھیار ہی کا استعمال کیا گیا ہو، اگر کوئی زہریلی شئے اس مقصد کے لئے کھائی جائے یا پی جائے تو ٹھیک اسی طرح اس کی بھی ممانعت ہے: "**ومن تحسى سما فقتل نفسه، فسمه في يده، يتحساه في نار جهنم خالدا مخلدا فيها أبدا**" (حوالہ سابق)، یعنی جو زہر کھا کر خودکشی کرے، اللہ تعالیٰ قیامت میں وہی زہر اس کے ہاتھ میں دے دیں گے، وہ ہمیشہ اسے پیتا رہے گا۔

خودکشی تو بہر حال انسانی زندگی کا قتل ہے، اگر خودکشی نہ کرے؛ لیکن موت کی تمنا کرے اور اللہ تعالیٰ سے موت کا طلب گار ہو تو بھی درست نہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کسی شخص کو کوئی تکلیف پہنچے تو وہ اس کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کرے: "**لا يتمنى أحدكم الموت إما محسنا فلعله يزداد، وإما مسيئا فلعله يستعتب**" (**صحیح البخاری، کتاب التمنی، باب ما یکره من التمنی**، حدیث نمبر: ۷۲۳۵)؛ اس لئے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اسلام میں نہ دوسرے کے قتل کی اجازت ہے اور نہ اپنے آپ کے قتل کی۔

اس وقت عالمی سطح پر کچھ لوگ اس بات کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ انسان کو اپنی مرضی سے مرنے کا حق دیا جائے، خاص کر اگر کوئی مریض تکلیف سے پریشان ہو، یا اس کے ورثہ تیارداری سے عاجز آچکے ہوں تو ایسے مریض کو مرنے کا حق حاصل ہونا چاہئے، اور اگر مریض یا اس کے متعلقین ڈاکٹر سے اس عمل میں تعاون کی خواہش کریں تو ڈاکٹروں کو بھی اس میں مدد کرنے کی اجازت ہونی چاہئے، اس عمل کو یوتھنیز یا (Euthabasia) کہتے ہیں، عربی زبان میں یوتھینیز یا کو 'قتل بدافع الشفقة" اور اُردو میں "قتل بہ جذبۂ رحم" کہا جاتا ہے، بنیادی طور پر یوتھنیز یا کی دو صورتیں قرار دی گئی ہیں، ایک فعال: یعنی ایکٹیو یوتھینیز یا، دوسرے: غیر فعال جس کو پیسیو یوتھنیز یا (Passive) کہتے ہیں — "فعال یوتھنیز یا" سے مراد یہ ہے کہ مریض کو ایسی دوا دی جائے یا انجکشن لگایا جائے، جو جلد سے جلد اس کو موت کی نیند سلا دے، اور "غیر فعال یوتھنیز یا" سے مراد یہ ہے کہ اس کا علاج روک دیا جائے؛ تاکہ خود بخود کم وقت میں اس کی موت واقع ہو جائے، اسی کی ایک صورت یہ ہے کہ کوئی مریض مصنوعی آلہ تنفس پر ہو، ابھی اس کا دماغ زندہ ہو اور یہ جاننے کے باوجود اس سے آلہ ہٹا لیا جائے کہ اس کے ہٹانے کی وجہ سے مریض کی موت واقع ہو جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ قدیم مذاہب میں بودھ دھرم اور کنفیوشس میں اپنی مرضی سے مرنے کی اجازت تھی؛ لیکن یہودیت، عیسائیت اور اسلام تینوں ابراہیمی مذاہب میں ایسے عمل کو نادرست قرار دیا گیا ہے، موجودہ دنیا میں نیدرلینڈ اور امریکہ کی ریاست "اورے گون" (Orgon) میں اس کی اجازت حاصل ہے، آسٹریلیا کے شمالی علاقہ میں بھی کچھ عرصہ کے لئے قانونی طور پر اس کی اجازت دی گئی تھی؛ لیکن پھر واپس لے لی گئی، ان کے علاوہ پوری دنیا میں قانونی طور پر یوتھینیز یا ممنوع ہے، ہندوستان میں 'ارونا' نامی نرس گذشتہ ۳۷ سال سے کومہ کی حالت میں ہے، وہ مظلوم ایک وحشیانہ حملہ کی وجہ سے اس حالت کو پہنچ گئی تھی؛ چنانچہ سپریم کورٹ میں درخواست دی گئی کہ اس کے لئے "رحمدلانہ ہلاکت" کی اجازت دی جائے، عدالت کے فیصلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ "فعال یوتھینیز یا" ایک غیر قانونی عمل ہے، جس کی اجازت نہیں دی جا سکتی، فیصلہ کی تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غیر فعال یوتھینیز یا کے بارے میں عدالت نرم گوشہ رکھتی ہے، اور اس کا رجحان ہے کہ اس کی اجازت ہونی چاہئے، سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کے بعد سے اصحاب دانش، طبی اخلاقیات کے ماہرین اور سماجی

تنظیموں کے درمیان بحث چھڑ گئی ہے کہ اس عمل کو جائز ہونا چاہئے یا نہیں؟

ہندوستان یا دنیا کے دوسرے ملکوں میں جو لوگ یوتھنیز یا کی قانونی اجازت کا مطالبہ کر رہے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ ایک تو اس قتل کا مقصد مریض کو تکلیف پہنچانا نہیں ہے؛ بلکہ اس کو تکلیف سے بچانا ہے؛ اس لئے اس کی اجازت ہونی چاہئے، دوسرے: انسان اپنی جان کا مالک ہے؛ اس لئے اسے اپنے آپ کو ختم کر لینے کا اختیار ہونا چاہئے — اسلام کا اصولی نقطۂ نظر یہ ہے کہ زندگی انسان کی ملکیت نہیں؛ بلکہ اس کے ہاتھوں میں اس کے خالق کی امانت ہے؛ اس لئے اسے اپنی خواہش کے مطابق اپنی زندگی کے معاملہ میں تصرف کرنے کا حق نہیں، دوسرے: انسان کی زندگی سے صرف اسی کے حقوق متعلق نہیں ہوتے؛ بلکہ اس کے متعلقین کے حقوق بھی متعلق ہوتے ہیں، خود کشی چاہے جس جذبہ سے کی جائے، اس سے ان دوسرے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے اور بعض اوقات ان کے حقوق بھی مارے جاتے ہیں، تیسرے: اس سے بعض سماجی مفاسد کے پیدا ہونے کا بھی اندیشہ ہے؛ کیوں کہ ممکن ہے کہ بعض اوقات ورثہ مورث کو جلد موت کی نیند سلا دینا چاہیں یا ان کی کوشش ہو کہ مریض کے علاج پر زیادہ خرچ کرنے کی نوبت نہ آئے، اگر اس کی اجازت دے دی جائے تو ان کے قتل کے لئے قانونی راستہ کھل جائے گا۔

اوپر جو حدیثیں گذری ہیں، وہ اس فعل کے حرام و نادرست ہونے پر بالکل واضح ہیں؛ اس لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ چاہے نہایت تکلیف دہ بیماری سے انسان دو چار ہو، پھر بھی اس کے لئے خود کشی جائز نہیں: "**لو أصابه مرض لا يطيقه لفرط ألمه لم يجز قتل نفسه**" (**قواعد الأحكام**، ص: ۸۵) اسی طرح اگر ایک شخص دوسرے کو اجازت دے کہ وہ اسے قتل کر ڈالے تب بھی اس کے لئے حکم دینے والے شخص کو قتل کر دینا جائز نہیں اور ایسے شخص پر اگر چہ قصاص واجب نہیں ہوگا؛ لیکن دیت واجب ہوگی (دیکھئے: ردالمحتار: ۱۰/ ۲۵۵)۔

ہاں اُس صورت میں شبہ ہوسکتا ہے، جب کسی مریض کا علاج ترک کر دیا جائے، یعنی غیر فعال یوتھنیز یا کا راستہ اختیار کیا جائے؛ کیوں کہ علاج کرانا محض مباح ہے، واجب نہیں؛ لیکن جو بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے، وہ یہی ہے کہ مقصود رشتۂ زندگی کو جلد ختم کر دینا ہو تو علاج پر قدرت کے باوجود علاج ترک کر دینا جائز نہیں؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے علاج کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے، آپ ﷺ

نے ارشاد فرمایا: ’’یا عباد اللہ ! تداووا فإن اللہ لم یضع داء إلا وضع لہ شفاء‘‘ (سنن الترمذی، کتاب الطب، باب ما جاء في الدواء والحث علیہ، حدیث نمبر: ۲۱۷۲)—— رہ گیا علاج کا مباح ہونا، تو جو چیزیں جائز ہوتی ہیں، وہ مقصد کے تابع ہوتی ہیں، اگر کسی خلاف شریعت مقصد کے لئے اس کو کیا جائے تو وہ گناہ کے دائرہ میں آجائیں گی، جیسے بازار جانا مباح ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص شراب پینے کے لئے بازار جائے تو شراب پینا تو حرام ہے ہی، اس مقصد کے لئے اس کا بازار جانا بھی حرام و گناہ ہوگا؛ چنانچہ فقہاء نے صراحت کی ہے کہ جو چیزیں جائز ومباح ہیں، مقصد کے اعتبار سے ان کا حکم متعین ہوگا: ’’وأماالمباحات فإنها تختلف صفتها باعتبار ما قصدت لأجله‘‘ (الأشباہ والنظائر: ۱/۸۷)، اس کی ایک نظیر ’کھانا‘ ہے کھانا عام حالات میں واجب نہیں ہے؛ بلکہ مباح ہے؛ لیکن اگر ایک شخص اضطراری کیفیت میں مبتلا ہو، پھر بھی کچھ نہ کھائے، یا شدید بھوک کے باوجود روزہ نہ توڑے، یہاں تک کہ اس کی موت واقع ہوجائے تو فقہاء لکھتے ہیں کہ وہ گنہگار ہوگا؛ کیوں کہ گویا اس نے خودکشی کی ہے: ’’من امتنع أکل المیتۃ حال المخمصۃ أم صام ولم یأکل حتی مات أثم، لأنہ أتلف نفسہ‘‘ (مجمع الأنھر: ۲/۵۲۴)—— اس لئے صحیح بات یہ ہے کہ یوتھنیزیا کی دونوں ہی صورتیں ناجائز ہیں اور قتل بجذبۂ رحم کی اجازت دینا انتہائی غیر انسانی، غیر اخلاقی اور غیر اسلامی حرکت ہوگی!

❁

مصنوعی آلۂ تنفس: عصر حاضر کا ایک اہم شرعی مسئلہ

انسان اپنے وجود سے باہر پھیلی ہوئی نعمتوں کی اہمیت محسوس بھی کرتا ہے، اس کا خواہش مند بھی ہوتا ہے، اس کو حاصل کرنے کے لئے مشقتیں برداشت کرتا ہے اور خرچ بھی کرتا ہے؛ لیکن جو نعمتیں خود اس کے اپنے وجود میں چھپی ہوئی ہیں، ان کے بارے میں سوچتا تک نہیں؛ البتہ جب ان سے محروم ہو جاتا ہے تو اسے اُس نعمت کی قدر بھی معلوم ہوتی ہے اور کھوئی ہوئی چیز پر حسرت بھی ہوتی ہے، یہ دراصل انسان کی اس نفسیاتی کیفیت کا نتیجہ ہے کہ جو چیز آسانی سے حاصل ہو جائے، وہ اہم نہیں، باہر کی نعمتوں میں ہوا اور پانی انسان کی کیسی شدید ضرورت ہے؛ قدرت نے اس کا وافر ذخیرہ کائنات کے اس کرہ میں مہیا کر دیا ہے، جس میں حضرت انسان کی بستی بسائی گئی ہے؛ اس لئے پانی کی فضول خرچی کو فضول خرچی نہیں سمجھا جاتا، انسان اپنے عمل کے ذریعہ دن رات ہواؤں کو آلودہ کرتا رہتا ہے اور نہ معلوم کتنے فضلات فضا میں چمنیوں کے ذریعہ پھینکے جاتے ہیں اور صاف وشفاف ہوا کے آلودہ ہونے پر اسے کوئی فکر نہیں ہوتی۔

انسان کا ان نعمتوں کے ساتھ بھی وہی عمل ہے، جن کا خزانہ اللہ نے اُس کے چھوٹے موٹے وجود میں محفوظ کر دیا ہے، آنکھ اللہ کی ایک زبردست نعمت ہے، اس نعمت کی قدر و قیمت ان لوگوں سے پوچھئے جو بینائی سے محروم ہیں کہ ان کے لئے دن کی روشنی اور رات کی تاریکی، گلاب کی نزاکت اور کچرے کی کثافت دونوں برابر ہے، یہی حال جسم میں موجود دوسری نعمتوں کا ہے، ان کا کوئی بدل نہیں، پھر جسم کے بعض اعضاء وہ ہیں، جن پر حیات انسانی کا باقی رہنا موقوف ہے، ہاتھ کٹ جائے یا پاؤں ٹوٹ جائے تو انسان زندہ رہ سکتا ہے؛ لیکن دل اپنی حرکت روک لے اور دماغ اپنا کام کرنا بند کر دے تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا، یہی وجہ ہے کہ بہت سے اعضاء کو آرام کی مہلت ملتی ہے، اگر انسان لیٹ جائے تو ہاتھ پاؤں کو تھوڑی دیر آرام کرنے کا موقع میسر آجاتا ہے، اگر انسان فاقہ کر لے تو شاید معدہ کو وقفہ استراحت مل جاتا ہو، انسان سو جائے تو کان اور آنکھ بھی آرام کرتے ہیں اور دماغ کے اس حصہ کو بھی وقفۂ سکون ہوتا ہے، جس کا تعلق فکر و تدبر سے ہے؛ لیکن اگر دل سو جائے اور دماغ کا وہ حصہ جو

انسانی زندگی کو کنٹرول کرتا ہے اور جس کا مرکز اطباء کی تحقیق کے مطابق بھیجے کا آخری حصہ ہوتا ہے، اگر وہ جسم سے بیوفائی کرنے لگے تو پھر انسان کے لئے موت کے منہ میں جانے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں؛ اس لئے انسانی زندگی کی بقاء میں دل ودماغ کا بڑا اہم رول ہے، دل پورے جسم میں خون کی ترسیل کرتا ہے اور اس دوڑتے ہوئے خون کی سواری پر آکسیجن پورے جسم کا سفر طے کرتی ہے اور ایک ایک عضو اور خلیات تک پہنچتی ہے؛ کیوں کہ آکسیجن کے بغیر نہ انسان کا پورا وجود زندہ رہ سکتا ہے اور نہ اس کا کوئی جز؛ اس لئے انسان کے وجود اور بقاء کے لئے دل ودماغ کے صحت مند ہونے کی بڑی اہمیت ہے۔

اللہ نے ہر بیماری کے لئے علاج بھی رکھا ہے، یہ علاج نباتاتی، جماداتی یا حیوانی اجزاء کے ذریعہ بھی ہوتا ہے اور اعضاء کی مصنوعی شکل کے ذریعہ بھی، جیسے مصنوعی پاؤں لگائے جاتے ہیں، مصنوعی قلب اور پھیپھڑا بنانے کی کوشش ہو رہی ہے اور ممکن ہے کہ اللہ کی مشیت سے اس میں کامیابی حاصل ہو جائے، تو یقیناً یہ طبی دنیا کا بڑا کارنامہ ہوگا، علاج کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بعض اعضاء کے افعال کو کسی مصنوعی آلہ اور خارجی ذریعہ سے انجام دیا جائے، جیسے گردہ کے عمل کو انجام دینے کے لئے ڈائلیسس کرایا جاتا ہے، قلب کے آپریشن کے دوران ایک خارجی آلہ کے ذریعہ خون کی ترسیل اور پمپنگ کا طریقۂ کار اختیار کیا جاتا ہے؛ البتہ دماغ کے کام کے لئے غالباً اب تک کوئی مصنوعی متبادل دریافت نہیں ہو سکا ہے اور شاید یہ دشوار بھی ہو؛ کیوں کہ قلب ہو یا پھیپھڑا، یہ ظاہری اور مادی افعال کو انجام دیتا ہے، جیسے خون کو پھینکنا یا خون کے زہر آلود مادوں کو چھانٹنا وغیرہ، اور دماغ معنوی امور کو انجام دیتا ہے، جیسے پورے جسم کے پیغام کو وصول کرنا، ضرورت کے مطابق جسم کے مختلف حصوں کو احکام دینا، سوچنا، اور غور وفکر کرنا، فیصلے کرنا، شکلوں اور باتوں کو محفوظ کرنا، یہ سب معنوی امور ہیں اور بظاہر مادہ واحساس کے دائرہ سے باہر ہیں۔

خارجی آلات کے ذریعہ کسی اندرونی عضو کے افعال کو انجام دینے کی ایک صورت 'مصنوعی آلۂ تنفس' کی ہے، جس کو Ventilator کہتے ہیں، اس کے ذریعہ مصنوعی طور پر سانس کی آمد ورفت اور قلب کی حرکت کو باقی رکھا جاتا ہے، یہ نہایت گراں علاج ہے اور افسوس کہ آج کل ڈاکٹروں اور اسپتالوں نے اسے پیسہ کمانے کا آسان اور سستا ذریعہ بنا لیا ہے، وینٹلیٹر کی ضرورت ختم ہو جانے کے باوجود اس کو باقی رکھا جاتا ہے؛ تاکہ زیادہ سے زیادہ پیسے حاصل کئے جاسکیں، اور ایسا تو بہت زیادہ

ہوتا ہے کہ مریض کی موت ہوچکی ہے، یا اس کا دماغ مر چکا ہے؛ لیکن وینٹیلیٹر نکالا نہیں جاتا؛ تاکہ بل میں اضافہ ہو اور مریض کے ورثہ سے زیادہ سے زیادہ پیسے حاصل کئے جائیں، اب تو بعض دفعہ یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے بعض شخصیتوں کی موت کا اعلان بعض معاملات کے طے ہونے تک موقوف رکھا جاتا ہے، اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ بعض دفعہ ورثہ پیسے بچانے کے لئے مصنوعی آلۂ تنفس کو نکال دینے کے خواہاں ہوتے ہیں، حالاں کہ اِس آلہ کی برقراری سے زندگی کے بحال ہونے کا اور صحت کے عود کر آنے کا امکان ہوتا ہے اور مریض کے پاس اتنی املاک موجود ہوتی ہیں کہ اس کے علاج کو جاری رکھا جاسکے۔

اس لئے یہ مسئلہ بڑا اہم ہے اور آج کل تیمارداروں اور ڈاکٹروں کی طرف سے بہ کثرت یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اس طرح کے مصنوعی آلۂ تنفس کو کب تک لگائے رکھنا واجب ہوگا اور کب علاحدہ کردینا درست ہوگا؟ —— اس سلسلہ میں اہل علم کے یہاں یہ بات بھی قابل غور سمجھی گئی ہے کہ موت کا اطلاق کس کیفیت پر ہوگا، موت کے بعد یقیناً اس آلہ کا نکال دینا واجب ہوگا؛ اس لئے کہ شریعت نے مردہ کی تدفین میں عجلت کا حکم دیا ہے اور اس کے علاوہ مرنے کے بعد بھی آلہ کو باقی رکھنا اسراف وفضول خرچی بھی ہے اور دوسرے مریض جن کو اس آلہ کی ضرورت ہے، ان کے لئے دشواری کا باعث بھی ہے۔

ہمارے فقہاء اور قدیم اطباء نے عام طور پر ظاہری علامتوں پر موت کے واقع ہونے کا فیصلہ کیا ہے اور عام حالات میں یقیناً یہ علامتیں فیصلہ کن ہوتی ہیں؛ لیکن بعض اوقات ان علامتوں کا دریافت کرنا دشوار ہوجاتا ہے اور زندگی کی رمق کو معلوم کرنے کے لئے جو آلات رکھے گئے ہیں، جیسے تھرمامیٹر کے ذریعہ حرارت، یا بلڈ پریشر کے آلات پیمائش کے ذریعہ دورانِ خون کی کیفیت کو معلوم کرنا، یا اس طرح کے دوسرے آلات، مصنوعی وسائل کے استعمال کے دوران وہ ظاہر نہیں ہو پاتے تو ایسی صورت میں یہ مسئلہ کھڑا ہوتا ہے کہ طبی اعتبار سے موت کی حقیقت کیا ہے؟ کیا دماغ کے مرجانے سے موت ہوجاتی ہے، یا قلب کا اپنے عمل کو چھوڑ دینے پر موت کا اطلاق ہوتا ہے، یا پھیپھڑے کام کرنا بند کردیں، یہ موت ہے، یا اعضاء یا خلیات کی موت کے بعد ہی انسان مردہ سمجھا جائے گا؟ یہ موجودہ دور کا ایک اہم مسئلہ ہے۔

جہاں تک اعضاء میں زندگی کے باقی رہنے کی بات ہے تو وہ تو حقیقی موت طاری ہونے کے بعد بھی کچھ لمحات تک باقی رہتی ہے؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جانور ذبح کر دیا جاتا ہے؛ لیکن ذبح کا عمل مکمل ہونے کے بعد بھی کچھ دیر تک اعضاء میں حرکت باقی رہتی ہے، جسے 'حرکتِ مذبوحی' کہا جاتا ہے اور اعضاء کے بھی مرنے کے بعد خلیات کی موت ہوتی ہے؛ اس لئے اعضاء اور خلیات کی موت سے انسانی وجود کا تعلق نہیں، یعنی اگر دماغ اور قلب مر چکے ہوں؛ لیکن اعضاء میں زندگی کی حرارت موجود ہو تو ان کے سرد ہونے تک مصنوعی آلۂ تنفس کو باقی رکھنے کی ضرورت نہیں — پھیپھڑے، دل اور دماغ کی زندگی اہم ہے اور یہ بڑی حد تک ایک دوسرے سے مربوط ہے، دل پھیپھڑے کو خون دیتا ہے اور ان سے خون وصول کرتا ہے، پھیپھڑے آکسیجن کو جذب کرتے ہیں اور دل تک پہنچاتے ہیں اور دل کے واسطے سے وہ پورے جسم میں گردش کرتا ہے، دماغ کی صورت حال یہ ہے کہ اگر تین چار منٹ اسے آکسیجن نہ ملے تو وہ مر جاتا ہے، پھر جسم کے دوسرے حصوں کے خلیات کا معاملہ یہ ہے کہ اگر وہ ختم ہو جائیں تو دوبارہ بنتے رہتے ہیں، ان میں ختم ہونے اور بنتے رہنے کا عمل جاری رہتا ہے؛ لیکن دماغ کے خلیات ختم ہونے کے بعد بنتے نہیں ہیں؛ اس لئے سوال پیدا ہوا کہ اگر قلب اور دماغ میں سے ایک کی موت ہو جائے اور دوسرا زندہ ہو تو انسان مردہ سمجھا جائے گا یا زندہ اور مصنوعی آلۂ تنفس کو باقی رکھنا واجب ہوگا یا نہیں؟ طبی اعتبار سے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ خود دماغ کے دو حصے ہیں، ایک دماغ علیا، یعنی دماغ کا بالائی حصہ اور ایک دماغ سفلی یعنی دماغ کا نچلا حصہ، اب یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ اگر خون نہ پہنچنے کی وجہ سے دماغ کے بالائی حصہ کی موت واقع ہو جائے تو جسم کے بہت سے افعال بند ہو جاتے ہیں، نہ انسان بول سکتا ہے، نہ سوچ سکتا ہے، نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ دیکھ سکتا ہے؛ لیکن قلب کی حرکت اور سانس کی آمد و رفت باقی رہتی ہے، اس کے معدے تک کھانا پانی پہنچایا جا سکتا ہے، پیشاب پائخانہ کے فطری عوارض جاری رہتے ہیں؛ اس لئے بعض اوقات یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ ایک شخص 'کوما' کی حالت میں ہے؛ لیکن مہینوں اور بعض دفعہ برسوں جسم سے زندگی کا رشتہ ٹوٹتا نہیں ہے، اس حالت میں وہ یقیناً زندہ ہے؛ البتہ جب دماغ کا نچلا حصہ مر جاتا ہے تو پھر زندگی کے تمام افعال فوراً یا تھوڑے وقفہ سے ختم ہو جاتے ہیں اور انسان کے اندر زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہتی؛ اس لئے اس دور کے اطباء متفق ہیں کہ دماغ کے نچلے حصہ کی موت مکمل موت ہے۔

شرعی نقطۂ نظر یہ ہے کہ:

۱۔ کسی شخص کو مردہ قرار دینے سے شریعت کے بہت سے احکام متعلق ہیں؛ اس لئے جب تک قلب اور دماغ دونوں کی موت واقع نہ ہوجائے، کسی شخص کے مرنے کا حکم جاری نہیں ہوسکتا، نہ اس کے مال سے ورثہ کی ملکیت متعلق ہوگی، نہ وصیت نافذ کی جائے گی، اور اگر مرد ہوتو نہ اس کی بیوی کی عدت شروع ہوگی؛ کیوں کہ یہ احکام یقینی طور پر موت کے واقع ہوجانے سے متعلق ہیں۔

۲۔ جہاں تک مصنوعی آلۂ تنفس کے لگانے کی بات ہے تو یہ ایک طریقۂ علاج ہے اور علاج کا مدار مریض کی استطاعت اور صلاحیت پر ہے، اگر مریض کے اندر مالی اعتبار سے اس کی استطاعت نہ ہو اور معاشی اعتبار سے وہ اس علاج کا تحمل نہیں کرسکتا ہو تو مصنوعی آلۂ تنفس سے استفادہ نہ کرنا درست ہوگا؛ کیوں کہ شریعت میں علاج کی کسی خاص صورت کو واجب قرار نہیں دیا گیا ہے، اس کی تائید ان فقہاء کے قول سے بھی ہوتی ہے، جن کے نزدیک علاج واجب نہیں ہے؛ بلکہ حنبلی دبستان فقہ میں تو ترک علاج افضل ہے، اور یہی قول شوافع کا بھی ہے؛ کیوں کہ علاج نہ کرانا توکل اور رضا بہ تقدیر سے قریب ہے:

”قال النووي في المجموع: إن ترک التداوي توکلا فھو فضیلة، وکذلک عند الحنابلة ترک التداوي أفضل، لأنه أقرب إلی التوکل ولا یجب التداوي ولو ظن نفعه ألخ“ (الفقه الإسلامي وأدلته: ۴۷۷/۲)۔

۳۔ اگر مریض کے اندر مصنوعی آلہ سے استفادہ کی مالی استطاعت موجود ہے یا کسی اور وجہ سے اس کی سہولت حاصل ہے اور ماہر اطبا کی رائے میں اس علاج کی وجہ سے مریض کے بچ جانے کا غالب گمان ہے تو ایسے مریض کو آلۂ تنفس لگانا واجب ہے؛ کیوں کہ حتی الامکان جان کی حفاظت واجب ہے اور ”غالب گمان“ احکام شریعت میں یقین کے درجہ میں ہے اور جب جان کا بچنا یقینی ہو تو قدرت کے باوجود اسے نہ بچانا اللہ کی دی ہوئی امانت کے ساتھ خیانت کا مرتکب ہونا ہے۔

۴۔ اگر مصنوعی آلۂ تنفس کے استعمال سے مریض کے بچ جانے کا غالب گمان نہ ہو؛ بلکہ ایک امکان کے درجہ میں ہو تو چاہے صاحب استطاعت ہو، مصنوعی آلۂ تنفس لگانا ضروری نہیں؛ چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی علاج موہوم درجہ کا ہو، یعنی اس کے نتیجہ خیز ہونے کا کم امکان ہو تو علاج

کرانا بہتر تو ہے،مگر نہ کرانے کی ممانعت نہیں:

"۔۔۔بخلاف الموهوم وتركه ليس محذورا بخلاف المقطوع به، بل قد يكون أفضل من فعله في بعض الأحوال وفي حق بعض الأشخاص"

(حاشیہ کوکب الدری: ۲؍۳۰)۔

۵۔اگر دماغ یا قلب نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا ہو اور ماہر ڈاکٹروں کی رائے ہو کہ اب فطری نظامِ تنفس کی بحالی کی امید نہیں تو ورثہ کے لئے بھی اور معالجین کے لئے بھی مصنوعی آلۂ تنفس کا علاحدہ کر دینا درست ہے؛ چنانچہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے سولہویں سیمینار میں اس موضوع پر جو تجاویز منظور ہوئی ہیں،ان میں ایک یہ ہے:

''اگر مریض آلۂ تنفس پر ہو اور ڈاکٹروں نے مریض کی زندگی اور فطری طور پر نظام تنفس کی بحالی سے مایوسی ظاہر کر دی ہو تو ورثہ کے لئے جائز ہوگا کہ مصنوعی آلۂ تنفس علاحدہ کر دیں''۔

نیز مکہ فقہ اکیڈمی نے اپنے دسویں سیمینار منعقدہ ۱۴۰۸ھ میں جو فیصلہ کیا ہے،وہ حسب ذیل ہے:

''جس مریض کے جسم میں زندگی برقرار رکھنے والے آلات لگے ہوں،اگر اس کے دماغ کی کارکردگی مکمل طور پر بند ہو جائے اور تین ماہر ڈاکٹر اس بات پر متفق ہوں کہ اب دماغ کی یہ کارکردگی دوبارہ بحال نہیں ہو سکتی تو اس مریض کے جسم سے لگے ہوئے آلات ہٹا لینا درست ہے،خواہ ان آلات کی وجہ سے مریض میں حرکت قلب اور تنفس قائم ہو؛ البتہ مریض کی موت شرعاً اس وقت سے معتبر مانی جائے گی، جب ان آلات کے ہٹانے کے بعد قلب اور تنفس اپنا کام بند کر دیں''

کم وبیش اسی قسم کی تجویز ''فقہ اکیڈمی جدہ'' نے بھی منظور کی ہے۔

بہر حال ان تفصیلات سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ڈاکٹروں کا بلاوجہ مصنوعی آلۂ تنفس لگانے کا مشورہ دینا جائز نہیں،مریض کی موت واقع ہونے کے باوجود محض پیسے کمانے کے لئے مصنوعی آلۂ تنفس کو لگائے رکھنا جائز نہیں،اور اس پر حاصل کی جانے والی اجرت حرام ہے،ورثہ کے

لئے یہ بات درست نہیں کہ تنفس کے بحال ہوجانے کا ظن غالب ہو اور خود مریض کی املاک سے علاج جاری رکھنا ممکن ہو پھر بھی آلہ کو نکال لیا جائے، یہ مریض کے ساتھ ناانصافی اور جرم ہے، اگر مریض مالی اعتبار سے اس علاج کی صلاحیت نہیں رکھتا تو مصنوعی آلۂ تنفس سے استفادہ کرنا واجب نہیں اور استفادہ نہ کرے تو گنہگار نہیں، ان حدود کو باقی رکھنا نہ صرف انسانی فریضہ ہے؛ بلکہ انسانیت کا بھی تقاضا ہے!

ذبیحہ سے متعلق ڈنمارک کا حالیہ قانون

انسان کے لئے ایک بہت بڑی ضرورت غذا ہے، اور غذا کے حاصل ہونے کے بنیادی ذرائع دو ہیں: ایک زمین سے اگنے والی چیزیں، جن کو ''نباتات'' کہتے ہیں، دوسرے حیوانات سے حاصل ہونے والے اجزاء، پھر جانوروں میں کچھ خشکی کے جانور ہیں، کچھ پانی کے، پانی کے جانوروں میں احناف کے نزدیک صرف وہ مچھلیاں حلال ہیں جو آپ اپنی موت نہ مری ہوں؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کے جانوروں میں صرف مچھلیاں ہی تناول فرمائی ہیں، بقیہ آبی حیوانات حرام ہیں؛ البتہ اس سلسلہ میں بعض فقہاء کا اختلاف بھی ہے، خشکی کے جانوروں میں کچھ حلال ہیں اور زیادہ تر حرام، حلال جانوروں میں بھی دو باتیں ضروری ہیں: اول یہ کہ وہ ان سات آٹھ اعضاء میں سے نہ ہو جن کا کھانا جائز نہیں، اس میں خون بھی شامل ہے، دوسرے ان کو شرعی طریقہ پر ذبح کیا گیا ہو، شرعی طریقہ پر ذبح کرنے میں تین باتوں کی رعایت ضروری ہے: دو کا تعلق ذبح کرنے والے سے ہے اور ایک کا فعل ذبح سے۔

ذبح کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسلمان یا کتابی، یعنی عیسائی یا یہودی ہو، عیسائی اور یہودی صرف نام کا نہ ہو جیسا کہ آج کل مغربی ممالک کی اکثریت کا حال ہے؛ بلکہ وہ حقیقت میں یہودی اور عیسائی ہو، یعنی اللہ کے وجود پر یقین رکھتے ہوں، نبوت و وحی کے قائل ہوں، اور آخرت کا ان کو اقرار ہو، گو وہ حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتے ہوں، ذبح کرنے والے سے متعلق دوسری شرط یہ ہے کہ وہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لے اور غیر اللہ کا نام نہ لے، اس حکم کی صراحت خود قرآن مجید میں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''جس جانور پر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جائے، اسی میں سے کھاؤ'' (انعام: ۱۱۸) دوسری جگہ مزید صراحت فرما دی گئی کہ جس ذبیحہ پر اللہ کا نام نہ لیا جائے، اس میں سے نہیں کھاؤ کہ ایسا کرنا اللہ کی نافرمانی ہے، (انعام: ۱۲۱) اسی لئے گو بعض تفصیلات میں فقہاء کے یہاں اختلاف ہے؛ لیکن جانور کو ذبح کرتے وقت بسم اللہ کہنا چاہئے اور یہ شریعت کا نہایت اہم حکم ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

فعل ذبح کے سلسلہ میں ضروری بات یہ ہے کہ شہہ رگ کے پاس چار چیزیں جمع ہوجاتی ہیں، دو وہ رگیں ہیں جو جسم میں خون کی سپلائی کے لئے بنیادی پائپ لائن کی حیثیت رکھتی ہیں، یہیں پر ایک نالی غذاء (مری) کی ہوتی ہے اور دوسری نالی سانس (نرخرہ) کی، ذبح کرتے ہوئے ان چاروں رگوں کو کاٹنا ضروری ہے؛ البتہ ان چاروں میں سے تین بھی کٹ جائیں، تب بھی ذبیحہ حلال ہوجاتا ہے؛ بلکہ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک تو اگر سانس اور غذاء کی نالیاں کٹ جائیں تب بھی کافی ہے، (موسوعۃ فقہیہ: ۱۷۸/۲۱) — ذبح کے سلسلہ میں ان احکام کا مقصد یہ ہے کہ رگوں کا بہتا ہوا خون اچھی طرح نکل جائے، جسم میں منجمد نہ ہوجائے؛ کیوں کہ جسم کے اندر خون کا رک جانا گوشت کو صحت کے لئے نقصاندہ بنا سکتا ہے، دوسرا مقصد یہ ہے کہ جلد سے جلد جانور کی جان نکل جائے؛ کیوں کہ جان نکلنے میں جتنی تاخیر ہوگی، تکلیف کا احساس بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا، جتنی جلد جان نکل جائے گی، اتنی جلد اسے موت کی اذیت سے نجات مل جائے گی۔

جانور کو ممکن حد تک تکلیف سے بچانا شریعت کا ایک اہم منشاء ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ضروری قرار دیا ہے کہ ہر چیز میں خوش سلیقگی اختیار کی جائے، یہاں تک کہ کوئی مجرم قتل کا مستحق ہو اور اسے قتل کیا جائے تو اس کے لئے بھی بہتر طریقہ اختیار کیا جائے، یعنی جو کم تکلیف دہ ہو، اور جب جانور کو ذبح کرو تو وہ بھی بہتر طریقہ پر: ”**وإذا ذبحتم فأحسنوا الذبح**“ اور وہ اس طرح کہ اپنی چھری اچھی طرح تیز کرلو اور ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ۔ (**مسلم، کتاب الصید والذبائح، باب الأمر بإحسان الذبح والقتل وتحدید الشفرۃ**، حدیث نمبر: ۵۱۶۷)، جانور کو خواہ مخواہ کی تکلیف سے بچانے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: ناخن، دانت اور ہڈی سے جانور کو ذبح نہ کیا جائے؛ کیوں کہ یہ اتنی دھاردار نہیں ہوتی کہ آسانی سے مطلوبہ رگیں کٹ جائیں اور خون بھی اچھی طرح بہہ جائے، ایسی کند چیزوں سے جانور کو ذبح کرنے میں اس کو زیادہ تکلیف ہوگی۔

ذبح سے متعلق یہ احکام نہ صرف اسلام میں ہیں؛ بلکہ گذشتہ آسمانی مذاہب میں بھی ہیں، اگرچہ کہ بہت سی قوموں نے اپنے مذہب کی ان تعلیمات کو بھلا دیا ہے، مذہب سے ان کا تعلق اسی لئے ہے کہ تقریباً سبھی مذاہب میں اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق خدا کی رضا کے لئے جانور کی قربانی دی جاتی

ہے، یہاں تک کہ جوقومیں سبزی خور ہیں اور گوشت کھانے کی مخالف ہیں، ان کے یہاں بھی خدا کے لئے قربانی کا تصور موجود ہے، آسمانی مذاہب نے اس عمل کو معبودِ حقیقی سے جوڑنے کے لئے ذبیحہ پر اللہ کا نام لینے کا حکم دیا ہے اور اس وقت دنیا میں یہود اور مسلمان دو قومیں ایسی ہیں جو اس حکم پر قائم ہیں، عیسائیت نے تو اپنا رشتہ پوری طرح شریعت الٰہی سے توڑ لیا ہے؛ اس لئے ان کے یہاں بہت سے دوسرے احکام کی طرح اس پر عمل کا بھی کوئی اہتمام نہیں ہے۔

ادھر اکثر مغربی ممالک میں ایسے قوانین بنا دیئے گئے ہیں کہ سرکاری مذبح کے علاوہ کہیں جانور ذبح نہیں کئے جاسکتے، جانوروں کو ذبح کرنے سے پہلے بے ہوش کیا جاتا ہے؛ تاکہ انہیں کم تکلیف ہو، اور ذبح کرنے میں بھی آسانی ہو، خاص کر اس وجہ سے کہ ذبح کا عمل بھی مشین کے ذریعہ سے پورا ہوتا ہے اور اس عمل میں جانور کی اضطرابی حرکت مخل ہوسکتی ہے، تاہم اس کے ساتھ یہ گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ کچھ لوگ چاہیں تو وہیں اس مدہوش جانور کو ہاتھ سے ذبح کرلیں، پھر چمڑے کی چھلائی اور گوشت کی کٹائی مشین کے ذریعہ ہوجائے، عام طور پر مسلمان اور یہود اسی طریقہ پر جانور ذبح کرلیتے ہیں اور ایسا گوشت ''حلال'' کے نام سے بازار میں اور ہوٹلوں میں دستیاب ہے، اگرچہ کہ جانور کو بے ہوش کرنا بھی کوئی مناسب عمل نہیں ہے؛ کیوں کہ اس سے دورانِ خون متأثر ہوجاتا ہے؛ لیکن بہر حال اگر زندگی کی رمق باقی ہو اور اسے ذبح کردیا جائے تو جانور حلال ہے؛ اس لئے اس کو بہ درجۂ مجبوری گوارا کیا جاسکتا ہے۔

مگر پچھلے دنوں ڈنمارک کے بارے میں یہ اطلاع آئی کہ وہاں ایسے ذبیحہ پر مکمل پابندی عائد کردی گئی ہے، اب وہاں کوئی جانور ذبح نہیں کیا جاسکے گا؛ بلکہ بے ہوش کرنے والی شئ کا زیادہ استعمال کرکے اسے موت کی نیند سلا دیا جائے گا؛ تاکہ وہ ذبح کرنے کی تکلیف سے محفوظ رہے، اسے حیوانات کے ساتھ حسن سلوک اور رحم دلی کا نام دیا گیا ہے؛ لیکن غور کیا جائے تو یہ کئی وجوہ سے نامعقول بات ہے:

اول: یہ کہ یہ مختلف مذہبی گروہوں کی مذہبی اور شخصی آزادی کو چھین لینے کے مترادف ہے، اگر کسی گروہ کو اپنے مذہب کے مطابق عمل کرنے کی اجازت نہیں دی جائے اور اسے ایک ایسی چیز کے کھانے پر مجبور کیا جائے، جس کو اس کا مذہب جائز نہیں ٹھہراتا ہو تو مذہبی آزادی کے تقاضے پورے نہیں

ہو سکتے۔

دوسرے: جانور کو اگر ذبح نہ کیا جائے اور کسی اور طریقہ پر اس کی موت واقع ہو تو جسم کا خون پوری طرح باہر نہیں نکل پائے گا اور کچھ حصہ جسم میں رکا رہ جائے گا، جو انسان کی صحت کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا، پس جانور پر رحم کھانا اور انسان کے ساتھ بے رحمی کا سلوک کرنا کیا درست عمل ہے؟

تیسرے: یہ بات بھی محل نظر ہے کہ کیا بے ہوش کر کے مارنے کا طریقہ ذبح کرنے کے مقابلہ میں کم تکلیف دہ ہے، بے ہوش کرنا بھی ایک تکلیف دہ عمل ہے، اور بے ہوش کرنے کی صورت میں دیر تک تکلیف باقی رہتی ہے؛ کیوں کہ دماغ کی موت جلد واقع نہیں ہوتی اور جب دماغ مرتا نہیں ہے تو تکلیف کا احساس ختم نہیں ہوتا؛ لیکن جب جانور کو ذبح کیا جاتا ہے اور شہہ رگ کٹ جاتی ہے تو قلب سے دماغ کو خون کی سپلائی بند ہو جاتی ہے اور آکسیجن نہیں مل پاتا ہے، اس طرح چند سکنڈ میں دماغ کی موت واقع ہو جاتی ہے، احساسات بالکلیہ ختم ہو جاتے ہیں اور اس کیفیت کے بعد جانور تکلیف سے آزاد ہو جاتا ہے؛ اس لئے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ بے ہوش کر کے مارنے کا عمل کم تکلیف دہ ہے؛ لیکن غالباً حقیقت اس کے برخلاف ہے اور اس حقیر کو یقین ہے کہ اگر اس پر میڈیکل تحقیق کی جائے تو شریعت کا مقرر کردہ طریقہ ہی جانور کے لئے بھی بہتر ثابت ہوگا؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی شریعت تمام عالم اور تمام مخلوقات کے لئے سراپا رحمت ہے، مگر افسوس کہ اس وقت مغربی افکار کی بنیاد خدا سے بغاوت اور خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت سے بغاوت پر ہے؛ حالاں کہ فطرت سے بغاوت ہمیشہ انسان کو تباہی و بربادی ہی کی طرف لے جاتی ہے۔

مسلمان ملکوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ڈنمارک پر زور دیں کہ وہ اس طرح مذہب آزادی کے خلاف اقدام کرنے سے باز رہے، نیز ڈنمارک سے ایسی تمام برآمدات کو بند کر دیں، جن کا تعلق حیوانی ماکولات سے ہے اور خود یہ ممالک آپس میں اپنی تجارت کو بڑھائیں، اس سے انہیں فائدہ بھی ہوگا اور مسلمانوں کے جذبات کا استحصال کرنے والی طاقتوں کو عبرت بھی ہوگی۔

ہوائی سفر کیلئے مردوں اور عورتوں کی اسکیننگ

انسان کی فطرت مجموعۂ اضداد ہے، اسے مٹھاس کی بھی ضرورت ہے اور نمک کی بھی، وہ گرمی کا بھی دلدادہ ہے اور ٹھنڈک کا بھی، اسے دھوپ بھی عزیز ہے اور سایہ بھی، اسی طرح وہ خلوت کو بھی چاہتا ہے اور جلوت کو بھی، اس کے اندر جذبہ نمائش بھی ہے اور اخفاء کی خواہش بھی، وہ اپنے حسن و جمال، علم و کمال اور صحت و توانائی کو نمایاں کرنا بھی چاہتا ہے اور اپنی زندگی کے بہت سے احوال کو چھپانا بھی، وہ دولت کی نمائش کرنے پر آتا ہے تو زمین پر تارے سجاتا اور صحراء میں آبشار بہاتا ہے؛ لیکن دوسری طرف سونا چاندی اور روپے پیسے کو بینک جیسے محفوظ اداروں اور سخت جان آہنی تجوریوں میں چھپا کر رکھتا ہے، یہ تضاد انسانی فطرت کا حصہ ہے۔

اگر انسان کے اندر خلوت پسندی اور اپنے آپ کو چھپانے کا جذبہ نہ ہوتا تو نہ مکانات کی ضرورت ہوتی اور نہ ایک ہی مکان میں الگ الگ کمروں کی، ایک بڑا سا ئبان پورے محلہ کے لئے اور ایک بڑا ہال پورے خاندان کے لئے کفایت کر جاتا؛ لیکن یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے، ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کی بود و باش کی جگہ ایسی ہو جس سے غیر متعلق شخص کا کوئی تعلق نہ رہے، نہ اس تنہائی کو چھیڑنے والی زبانیں ہوں، نہ اس خلوت کو چھین لینے والی نگاہیں، یہی جذبہ انسان کے اندر اس کے جسم کے سلسلہ میں بھی رکھا گیا ہے، وہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کے چہرے کو دیکھیں اور اس پر فریفتہ ہوں، اس کے بالوں کی سیاہی اور خوبصورتی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ لے، اس کے ہاتھ کی زینت بننے والی گھڑی توجہ کا مرکز بن جائے، اس کا لباس، اور لباس کا رنگ اور ڈیزائن لوگوں کے لئے باعث کشش ہو، عورتوں میں نسبتاً یہ جذبہ زیادہ ہوتا ہے؛ لیکن ہزار جذبہ حسن آرائی کے باوجود مرد ہوں یا عورتیں، اپنے جسم کے بعض حصوں کو بہر حال چھپا کر رکھنا چاہتے ہیں، سوائے اس کے کہ کوئی شخص حیا اور انسانیت سے بالکل ہی محروم ہو گیا ہو۔

اسلام نے انسان کے پردہ، تخلیہ اور تحفظ کے حق کو تسلیم کیا ہے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جب کسی کے گھر میں داخل ہو تو پہلے اجازت حاصل کر لو: ﴿ لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى

تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓي اَهْلِهَا﴾ (النور:۲۷)اسی طرح آپ ﷺ نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ کسی کے گھر میں بلا اجازت جھانکا جائے، یہاں تک کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کا ارشاد مروی ہے: ''جس نے کسی کے گھر میں بغیر اجازت کے جھانکا، گھر والوں کے لئے جائز ہے کہ اس کی آنکھ پھوڑ ڈالے''، **''من اطلع فی بیت قوم بغیر إذنهم، فقد حل لهم أن یفقؤوا عینه''** (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۵۶۴۲) ایک بار ایک صاحب نے دار اقدس ﷺ میں جھانکا، آپ ﷺ اس وقت ایک کنگھے سے سر مبارک کھجار ہے تھے، جب آپ ﷺ کی ان پر نظر پڑی تو فرمایا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم مجھے دیکھ رہے ہو تو میں اس کو تمہاری آنکھوں میں چبھو دیتا: ''۔۔۔**لو أعلم أنک تنظرني لطعنت به في عینیک**'' (**صحیح مسلم، باب تحریم النظر فی غیر بیته، حدیث نمبر:۵۶۳۸**)

سلیم الفطرت انسان جن چیزوں میں راز داری چاہتا ہے، ان میں ایک میاں بیوی کا تعلق بھی ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس بات کی سختی سے تاکید فرمائی کہ شوہر و بیوی اس سلسلہ میں ایک دوسرے کی کیفیت کو چھپائیں، آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس راز کو افشاء کردے، وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین شخص ہوگا: **''إن من أشر الناس عند الله منزلة یوم القیامة الرجل یفضي إلی امرأته وتفضي إلیه، ثم ینشر سرها''** (**صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب تحریم أفشاء سر المرأة، عن أبي سعید الخدری** رضی اللہ عنہ، **حدیث نمبر: ۳۵۴۲**)، اسی طرح عورت کی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اجنبی مردوں سے چھپائے، تمام مذاہب میں اسی کی تعلیم دی گئی ہے اور ہمیشہ سے ہر مہذب سماج میں اس کو برتا جاتا رہا ہے، اس پس منظر میں رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو منع فرمایا کہ ایک عورت کی دوسری عورت سے ملاقات ہو اور وہ اپنے شوہر سے اس عورت کے خد و خال بیان کرے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ تو اس اجنبی مرد کے اس عورت کو براہ راست دیکھنے کے مترادف ہے: **''لا تباشر المرأة المرأة فتنعتها لزوجها کأنه ینظر إلیها''** (**صحیح البخاری، عن عبداللہ بن مسعود** رضی اللہ عنہ، **کتاب النکاح، باب لا تباشر المرأة المرأة، حدیث نمبر: ۵۲۴۰**)

انسان کے تحفظ اور ستر کا بہت زیادہ تعلق اس کے جسم سے ہے، کوئی بھی سلیم الفطرت انسان دوسرے کے سامنے بے لباس ہونا پسند نہیں کرتا؛ بلکہ بعض اوقات اپنے آپ کو اس سے بچانے کے لئے جان پر کھیل جاتا ہے، اور اگر اس کو اس پر مجبور کیا گیا ہو تو اس کو اپنے لئے آخری درجہ کی تذلیل اور

بے توقیری تصور کرتا ہے، یہ انسانی فطرت ہے؛ اسی لئے قرآن مجید نے بے لباسی کو شیطانی عمل قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ شیطان چاہتا ہے کہ انسان کے لباس اتروالے، یہاں تک کہ اس کی شرمگاہ بھی شیطان کی نظروں کے سامنے ہو' ﴿يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا﴾ (الاعراف: ۲۷) اس کے مقابلہ قرآن نے فطرت انسانی بتلائی ہے کہ وہ اپنی شرمگاہ کو انتہائی قابل ستر حصہ تصور کرتا ہے اور اسے چھپانا چاہتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق جب آدم وحواء علیہما السلام سے جنت کا لباس اتارا گیا تو وہ مضطربانہ اپنی شرمگاہوں کو جنت کے پتوں سے ڈھکنے لگے: ﴿فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ﴾ (الاعراف: ۲۲)

اس وقت امریکہ، برطانیہ اور مختلف مغربی ملکوں میں ایرپورٹ پر مسافروں کی تفتیش کے لئے اسکیننگ کا طریقہ اختیار کرنے کی تیاری ہے، عجب نہیں کہ کچھ دنوں بعد مغربی قوتیں ہندوستان اور مشرقی ممالک سے بھی طیران گاہوں پر ایسے ہی نظم کا مطالبہ کریں اور آہستہ آہستہ یہ طریقہ پوری دنیا میں مروج ہوجائے، اسے حفاظتی تدبیر کا عنوان دیا گیا ہے؛ لیکن غور کیا جائے تو یہ انسانی شرافت پر زبردست حملہ ہے، جس میں بوڑھے، جوان، بچے، مردوں اور عورتوں ہر ایک کو نادانستہ طور پر بے لباس ہوکر گذرنا پڑے گا، مغرب کی فطرت کچھ اس طرح مسخ ہوگئی ہے کہ ان کے نزدیک انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں، اگر بیل اور گائے پائجامہ نہیں پہنتے اور کتے اور کتیوں کو پینٹ کی ضرورت نہیں تو انسان ان کا محتاج کیوں ہو؟ شاید اس کے پیچھے ڈارون کی وہ بدنام زمانہ فکر بھی کارفرما ہو، جس میں بندر کو انسان کی اصل مانا گیا ہے؛ اس لئے ان کی طرف سے اس کو قبول کرلینا باعث تعجب نہیں؛ لیکن مشرقی سماج اخلاقی دائروں کو ضروری سمجھتا ہے، اس کی لغت میں شرم وحیا کے الفاظ ابھی باقی ہیں، یہ دنیا کے تمام مشہور مذاہب کی جائے پیدائش ہے؛ اس لئے ابھی بھی وہ مذہبی قدروں سے محروم نہیں ہے، اس کے لئے اس تلخ گھونٹ کو حلق سے اتارنا دشوار ہوگا، خاص کر مسلمانوں کے لئے، جن کے نزدیک شوہر و بیوی کے سوا کسی کے سامنے بے لباسی کی گنجائش نہیں؛ بلکہ یہاں تک تلقین کی گئی ہے کہ وہ صنفی تعلق میں بھی بالکل ہی بے لباس نہ ہوجائیں: "**إذا أتى أحدكم أهله فليستتر ولا يتجرد تجرد العيرين**" (**سنن ابن ماجة، كتاب النكاح، باب التستر عند الجماع**، حدیث نمبر: ۱۹۲۰)، مذہبی اور اخلاقی نقطۂ نظر کے علاوہ بھی یہ انسان کے بنیادی حق کو مجروح کرنے کے مترادف ہے؛

کیوں کہ یہ انسان کی خلوت، تنہائی اور سیکریسی میں دخیل ہونا ہے؛ اس لئے نہ صرف مسلمانوں کا؛ بلکہ پوری انسانیت کا فریضہ ہے کہ وہ مل جل کر ایسے قوانین کی مخالفت کریں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حفاظتی اقدامات ضروری ہیں؛ لیکن اس کا صحیح طریقہ کار یہ ہے کہ جانچ کے ذمہ دار افسروں کو چوکس کیا جائے، ایسے حساس ترین آلات فراہم کئے جائیں، جو دھما کو اشیاء کی نشاندہی کرتے ہوں، ہاں، جو افراد پہلے سے شک کے دائرہ میں ہیں اور ان پر شبہ کے لئے مناسب وجوہ موجود ہوں، ان کی خصوصی جانچ کی جاسکتی ہے، ان کی اس طرح اسکیننگ کی جاسکتی ہے کہ انسانی اعضاء اور چھپائی ہوئی چیزیں اس طرح نظر آئیں، جس طرح ایکسرے کی تصویر میں ہوتی ہیں، اسی طرح اگر مستور اعضاء کو بے لباس حالت میں دیکھنا ناگزیر ہو جائے تو مرد ایسے مشتبہ مرد مسافروں اور عورت ایسی مشتبہ مسافر عورتوں کو اسکرین پر دیکھیں کہ مرد کا مرد کو اور عورت کا عورت کو دیکھنا مخالف جنس کے دیکھنے سے کم تر ہے۔

شبہ پر واضح دلیل پائے جانے کے وقت اس طرح کے عمل کی دلیل فتح مکہ کا وہ واقعہ ہے، جس میں حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے باندی کو ایک راز کی تحریر دے کر مکہ کی طرف بھیجا تھا، رسول اللہ ﷺ کو اس کی وحی کے ذریعہ اطلاع دی گئی، آپ ﷺ نے وہ تحریر اس سے واپس لینے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس باندی کو جا پکڑا، اور جب اس نے آنا کانی کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر وہ خط حوالہ نہیں کرے تو اسے بے لباس کر دیا جائے گا: "۔۔۔ **لتخرجن الكتاب أو لنقلبن الثياب۔۔۔**" (**مسند أحمد بن حنبل، مسند علی بن أبي طالب** رضی اللہ عنہ، حدیث نمبر: ۶۰۰)

بہر حال امریکہ اور مغربی ممالک کا رویہ اکثر اوقات مشرقی اقوام کے ساتھ نہایت اہانت آمیز ہوتا ہے، یہاں تک کہ ہندوستان کے سابق وزیر دفاع جارج فرنانڈیز کو امریکی ایئرپورٹ پر برہنہ ہونا پڑا، اور ان کے احتجاج کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی، اسکیننگ کے مجوزہ قانون سے مشرقی ملکوں کے عوام ہی کو نہیں حکمرانوں کو بھی گذرنا پڑے گا؛ اس لئے یہ کسی ملک کا نجی مسئلہ نہیں؛ بلکہ بین الاقوامی مسئلہ ہے اور پوری دنیا کا فریضہ ہے کہ وہ ایسے بے ہودہ طریقہ کو نہ خود اختیار کرے اور نہ دوسروں کو اختیار کرنے کی اجازت دے۔

کرایہ کی ماں' ایک حیاسوز تجارت

انسان سے متعلق احکام واوامر کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ احکام جو اللہ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے انسانیت کے لئے بھیجے ہیں، اگر چہ کہ انسان کے لئے ان احکام پر قائم رہنا اور ان کی خلاف ورزی سے بچنا ضروری ہے؛ لیکن چوں کہ اس کائنات میں انسان کا امتحان مقصود ہے؛ اس لئے انسان کو ارادۂ واختیار کی طاقت دی گئی ہے، اور انسان جو کرنا چاہتا ہے، اللہ کی مشیت اس میں مددگار ہو جاتی ہے، اگر وہ مسجد جانا چاہے تو اس میں بھی اللہ کی توفیق شامل ہوتی ہے، اور اگر وہ شراب خانہ کی طرف قدم اُٹھائے تو ایسا نہیں کہ اس کے قدم مفلوج ہو جائیں، ایسے ہی احکام کو علم شریعت کی اصطلاح میں 'تکلیف شرعی' کہا جاتا ہے، یعنی شریعت انسان کو اِن احکام کا پابند بناتی ہے۔

دوسری قسم کے احکام وہ ہیں، جو اللہ کی طرف سے فطرت کے واسطے سے دیئے گئے ہیں، جیسے انسان کھانے کے لئے اپنے منھ کا استعمال کرتا ہے، ناک سے غذا ئیں نہیں لیتا، چلنے کے لئے دونوں پاؤں سے کام لیتا ہے، ایسا نہیں ہے کہ چاروں ہاتھ پاؤں سے چلے، جیسے چوپائے چلتے ہیں، یہ اللہ کی پیدا کی ہوئی فطرت ہے اور اسی میں انسان کی مصلحت ہے، قانونِ فطرت کو توڑنا دنیا وآخرت دونوں میں نقصان کا باعث ہے، مثلاً غسل کے لئے اللہ تعالیٰ نے پانی کو پیدا فرمایا، پس قانون فطرت یہی ہے کہ انسان غسل کرنا چاہے تو پانی کا استعمال کرے، اب اگر کوئی شخص پانی کے بجائے آگ سے نہانے لگے تو یہ فطرت سے بغاوت ہوگی اور خود اسی کو نقصان اُٹھانا پڑے گا۔

شیطان جو انسان کا ازلی دشمن ہے، وہ دونوں پہلوؤں سے احکامِ الٰہی کی مخالفت پر اُکساتا ہے، انبیاء کے ذریعہ آنے والے احکام سے انسان کو برگشتہ کرنے کے سلسلہ میں وہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے وقت سے ہی زور لگا رہا ہے، اور قیامت تک ایمان والوں کو درست راستہ سے ہٹانے کی کوشش کرتا رہے گا؛ چنانچہ اس نے اللہ تعالیٰ سے کہا تھا:

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَیْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ

وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَ هُمْ شٰكِرِيْنَ﴾ (الاعراف:۱۶-۱۷)

چوں کہ آپ نے مجھے ہدایت سے محروم کردیا ہے؛ اس لئے میں ان (کو راہ سے بھٹکانے) کے لئے آپ کے سیدھے راستہ پر ضرور بیٹھوں گا، میں آگے، پیچھے، دائیں، بائیں سے ان پر حملہ کروں گا، اور آپ ان میں سے زیادہ تر لوگوں کو شکر گزار نہیں پائیں گے۔

اسی طرح شیطان انسان کو قانونِ فطرت سے بھی بغاوت پر اُکساتا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَّ لَاُضِلَّنَّهُمْ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا﴾ (النساء:۱۱۹)

میں ضرور انھیں گمراہ کروں گا، انھیں آرزوئیں دلاؤں گا، ان کو سکھاؤں گا کہ جانوروں کے کان کاٹیں اوران کو حکم دوں گا کہ اللہ کی تخلیق میں تبدیلی کردیں، اور جو اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنالے، اس نے کھلا ہوا نقصان اُٹھایا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی جو فطرت بنائی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک ماں، باپ کے ذریعہ حلال تعلق کی بنیاد پر انسان وجود میں آئے، اور نسل انسانی کی افزائش ہوتی رہے، یوں تو تمام ہی جانداروں میں جنسی جذبات رکھے گئے ہیں، اوران میں انسان بھی شامل ہے؛ لیکن اس باب میں انسان کو ایک خصوصی شرف عطا کیا گیا ہے کہ وہ عفت وعصمت کا جوہر رکھتا ہے، صنفی اعتبار سے شوہر اور بیوی کی وفاداری ایک دوسرے تک محدود ہوتی ہے، شوہر و بیوی کے ذریعہ توالد وتناسل کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے، یہ انسانی فطرت ہے، اور پہلے انسان ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے یہ سلسلہ جاری وساری ہے، (سورۂ نساء:۱) اسی سے خاندان وجود میں آتے ہیں، والدین اور اولاد کی شناخت قائم ہوتی ہے، اور ایک دوسرے سے متعلق ذمہ داریوں کا تعین ہوتا ہے، دوسرے جانداروں کا کوئی خاندان نہیں ہوتا، نہ ان کی کوئی نسلی شناخت ہوتی ہے اور نہ ہی ایک دوسرے کے حقوق اور ذمہ داریوں کا اس طرح کا نظام ہوتا ہے، جو نظام انسانی سماج میں پایا جاتا ہے، یہ پہچان

سماجی اعتبار سے انسان کا بہت بڑا اشرف ہے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اُس کو اپنے احسانات میں شمار کیا ہے۔ (حجرات: ۱۳، فرقان: ۵۴)

افسوس کہ موجودہ دور میں مغرب کی خدانا آشنا اور اخلاق بیزار تمدن اس بات کی کوشش کر رہا ہے کہ انسان صنفی مسائل میں پوری طرح قانونِ فطرت سے آزاد ہوجائے اور اپنی شناخت کھودینے میں اسے کوئی تأمل نہ ہو، ایسی ہی صورتوں میں ایک وہ ہے، جس کو رحم کو کرایہ پر یا عاریت پر دینے سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کی ابتداء ۱۹۵۳ء سے ہوتی ہے، جب ''مرد کے مادہ منویہ کو مثلج (Freezer) کیا گیا؛ تاکہ اسے بعد میں بھی قابل استعمال بنایا جائے، ۱۹۷۱ء میں نیویارک میں اسپرم بینک قائم کیا گیا، اور عورتوں کے لئے یہ راستہ کھولا گیا کہ وہ اپنے انتخاب کے مطابق کسی بھی مرد کے مادۂ منویہ سے حاملہ ہوسکیں، پھر ۱۹۷۸ء میں برطانیہ میں ٹیسٹ ٹیوب کا کامیاب تجربہ ہوا، ۱۹۸۰ء میں امریکہ میں رحم کے کرایہ پر لگانے کا آغاز ہوا، اور ۱۹۸۵ء میں امریکہ ہی میں پہلی بار کرایہ کے رحم کے ذریعہ ولادت ہوئی، ۱۹۸۶ء میں یہ واقعہ پیش آیا کہ رحم کو کرایہ پر لگانے والی عورت نے اس عورت کو بچہ دینے سے انکار کردیا، جس کا بیضہ لیا گیا تھا؛ لیکن امریکی عدالت نے اس عورت کو حق پرورش دیا اور ماں تسلیم کیا جس نے اپنا بیضہ دیا تھا۔

اس طرح کی خلاف فطرت کوششیں عموماً مغرب سے شروع ہوتی ہیں؛ لیکن بہت جلد مشرقی ممالک اسے قبول کرلیتے ہیں؛ چنانچہ اس سلسلہ میں بھی ہندوستان کی صورت حال یہی ہے، مثلاً ۲۰۱۰ء میں ہندوستان میں کرایہ کی ماں کے ذریعہ اولاد حاصل کرنے کے ۱۵۰۰ / واقعات ہوئے، جن میں دوسو سے زیادہ بچے اسرائیلی شہریوں کے تھے، جون ۲۰۱۳ء میں ایک ایسا شخص کرایہ کی ماں سے بچہ حاصل کرکے اپنے ملک چلا گیا، جو خلافِ فطرت فعل کا عادی تھا اور جب یہ بات منظر عام پر آئی تو اس سے بحث کا ایک دروازہ کھل گیا، کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں اس وقت یہ ایک انڈسٹری بن چکی ہے، جس کا بزنس تین ملین امریکی ڈالر سے بھی آگے بڑھ چکا ہے، ہندوستان میں عام طور پر ۲۰ ہزار ڈالر سے حمل کی تکلیف اُٹھائے بغیر ماں باپ بننے کی خواہش پوری ہوجاتی ہے، جب کہ مغربی ملکوں میں اس سے بہت زیادہ اخراجات آتے ہیں، اسی لئے اولاد کے خواہش مندوں کا رُخ تیزی سے ہندوستان کی طرف ہورہا ہے، ہندوستان میں ۲۰۰۵ء میں کرایہ پر رحم دینے والی عورتوں کے حقوق

کے تحفظ کے لئے ایک قانون بھی مرتب کیا گیا؛ لیکن عملی طور پر اس کا نفاذ نہیں ہو پایا۔

کرایہ کی ماں کی اس نئی صورت نے طبی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے مختلف مسائل پیدا کر دیئے ہیں، امریکہ میں دو سے زیادہ ایسے حمل کی اجازت نہیں دی جاتی، جب کہ ہندوستان میں ایک ہی عورت پر پانچ پانچ دفعہ تک اس کا تجربہ کیا جاتا ہے، بچہ کی پیدائش کے بعد حمل کی تکلیف اُٹھانے والی عورت کو نومولود کی صورت تک نہیں دکھائی جاتی، اس کی وجہ سے وہ ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہیں، کم وقت میں زیادہ بچہ حاصل کرنے کے لئے یا اولاد کے حصول کو یقینی بنانے کے لئے ایک ہی بار میں عورت کے جسم میں کئی بیضے پہنچا دیئے جاتے ہیں، اس سے عورت کی مشقت بڑھ جاتی ہے اور وہ متعدد بیماریوں کی شکار ہو جاتی ہیں، ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ایسی عورتوں کو نہ صرف پیشاب میں انفیکشن، شوگر اور ولادت کے قریب خون کے اخراج کی شکایت پیش آتی ہے؛ بلکہ ایسی خواتین اور بچوں میں اموات کی شرح بمقابلہ عام حالات کے زیادہ ہے، نیز حاملہ کو زیادہ ہارمون پہنچانے کی وجہ سے اس کی صحت پر بہت زیادہ منفی اثر پڑتا ہے۔

یہ تو اس کے بعض طبی نقصانات ہے؛ لیکن جو نفسیاتی اور اخلاقی اثرات پڑتے ہیں، وہ بھی اس سے کم نہیں ہیں، اگرچہ ایک عورت اپنا رحم کرایہ پر دینے پر آمادہ ہو جائے؛ لیکن حمل کی مشقت جھیلنے کے بعد جب بچہ اس کے ہاتھ نہیں آتا تو اس کو کرایہ پر لینے والے سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے، وہ بچہ دینا نہیں چاہتی ہے، اگر حمل ساقط ہو گیا تو اس کو کوئی معاوضہ نہیں ملتا، یہ بات بھی اس کے لئے باعث رنج ہوتی ہے، اس عورت کو پوری مدتِ حمل اپنے ماحول اور رشتہ داروں سے کاٹ کر ہاسٹل میں رکھا جاتا ہے، جو اس کے لئے ایک جیل کی طرح ہوتا ہے، یہ ساری باتیں اس کے دل و دماغ کو متأثر کرتی ہے، اس کے اخلاقی نقصانات بالکل واضح ہیں، اس میں مرد و عورت کے اندر پائے جانے والے قدرتی تولیدی وسائل کو سامانِ خرید و فروخت بنا دیا گیا ہے، عورت کی عفت و عصمت بازار کی ایک ایسی چیز بن گئی ہے، جس کو پیسہ کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے، اس کی وجہ سے ہم جنسی کو فروغ حاصل ہوگا؛ کیوں کہ جب کرایہ کی ماں کے ذریعہ اولاد حاصل ہو جائے تو فطری طریقہ پر مرد و عورت کے تعلق کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اسی لئے جن ملکوں میں اخلاقی اقدار کی اہمیت ہے، وہاں اس پر پابندی عائد کی گئی ہے، جیسے: سعودی عرب، مسلم ممالک اور جاپان وغیرہ، خود چین میں بھی ۱۹۹۴ء میں اس سلسلہ

میں پیدا ہونے والے اختلافات کو سامنے رکھتے ہوئے اس پر پابندی لگادی گئی ہے۔

ایک مسلمان کے لئے تو اس کا تصور بھی تکلیف دہ ہے، اور سوائے ایرانی اہل تشیع علماء کے جنھوں نے اولاد نہ ہونے کی صورت میں اس کی اجازت دی ہے، مسلمان علماء، اسکالرس اور فقہ اکیڈمیوں نے سختی کے ساتھ اس کو منع کیا ہے، مگر افسوس کہ راقم الحروف نے جب اس موضوع پر منعقد ہونے والے ایک سیمینار میں حصہ لینے کی غرض سے مسلمان ڈاکٹروں کی ایک میٹنگ رکھی اور انھوں نے معلومات جمع کیں، تو حیرت ہوئی کہ ہندوستان کے بڑے شہروں میں رحم کو کرایہ پر لگانے والی عورتوں میں اچھی خاصی تعداد مسلم خواتین کی بھی ہے، یہ نہایت خطرناک رجحان ہے، اور یہی معلومات ان سطور کے لکھنے کی محرک بنی ہیں، نسلی شناخت اور تشخص انسان کے لئے سرمایہ افتخار ہے، اور ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کی شناخت کھونے نہ پائے، شناخت کا کھوجانا اس کے لئے انتہائی ذلت کی بات ہوتی ہے، اور وہ ہر طریقہ پر اس کا تحفظ چاہتا ہے، اسی لئے شریعت نے زنا کو اتنی شدت کے ساتھ منع کیا ہے اور اس کے لئے سخت ترین حد مقرر کی ہے، کسی شخص کے باپ، ماں کے بارے میں شک کیا جاتا ہو تو یہ بات اس کے لئے بے حد تکلیف دہ ہوتی ہے، نسب کی شناخت جیسے باپ سے متعلق ہوتی ہے، ویسے ہی ماں کے ساتھ بھی اس کا تعلق ہوتا ہے؛ بلکہ بعض خاندان تو اولادِ نرینہ نہ ہونے کی صورت میں ماں کی طرف سے ہی چلتے ہیں، کرایہ کی ماں کا تصور اس شناخت کو مجروح کرتا ہے۔

فقہی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس طرح مصنوعی ولادت کے لئے بحیثیت مجموعی چار طریقے اختیار کئے جاتے ہیں:

(۱) مادۂ منویہ شوہر کا ہو، بیضہ اجنبی عورت کا ہو اور اس کی پرورش خود اس شخص کی بیوی کے رحم میں ہو۔

(۲) مادۂ منویہ شوہر کا ہو، بیضہ خود اس کی بیوی کا ہو؛ لیکن جنین کی پرورش اجنبی عورت کے رحم میں ہو۔

(۳) مادۂ منویہ اجنبی مرد کا ہو، بیضہ اس عورت کا ہو، جو اپنے شوہر کی اجازت سے اولاد کی خواہاں ہو اور کسی اور عورت کے رحم میں اس کی پرورش ہو۔

(۴) مادۂ منویہ اجنبی مرد کا ہو، جو عورت اولاد کی خواہاں ہے، اسی کا بیضہ ہو، اور خود

اسی کے رحم میں جنین کی پرورش ہو۔

ان چاروں صورتوں میں یہ بات مشترک ہے کہ یا تو جو عورت ماں بننا چاہتی ہے، اس کی اولاد کے لئے اجنبی مرد کا مادہ استعمال کیا جائے، یا اجنبی عورت کا بیضہ یا اجنبی عورت کا رحم، اور یہ بات قطعاً حرام ہے کہ کوئی مرد یا عورت بیوی اور شوہر کے علاوہ اجنبی شخص کے ذریعہ صاحب اولاد بنے، زنا کو حرام قرار دینے اور اس پر سخت ترین سزا دیئے جانے کا سبب یہی تو ہے کہ اس میں اجنبی مرد وعورت کے ذریعہ صنفی فعل کو انجام دیا جاتا ہے، تو اگر جسمانی اعتبار سے اجنبی مرد وعورت کے درمیان تعلق نہ پایا جائے؛ لیکن انجام کار ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہوئے اولاد حاصل کی جائے تو یہ بھی کم وبیش اسی درجہ کا گناہ اور اسی درجہ کی بے حیائی ہے، اس لئے مسلم معاشرہ کو اس نئی بیماری سے بچانے، عصمت ِانسانی کی خرید وفروخت سے روکنے اور اس کے اخلاقی وطبی نقصانات سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کی معاشی پس ماندگی اور جہالت نے جیسے ان کو مختلف برائیوں میں مبتلا کردیا ہے، اس حیا سوز تجارت میں بھی ان کے قدم آگے بڑھنے لگیں اور ملت کی پیشانی پر رُسوائی کے ایک اور داغ کا اضافہ ہو جائے۔

کرایہ پر کوکھ حاصل کرنا کیوں جائز نہیں؟

ایک عرصہ پہلے اس حقیر کو براعظم افریقہ کے ایک جزیرہ ''ری یونین'' جانے کا موقع ملا، جو فرانس کے تحت ہے، یہاں فرنچ زبان بولی جاتی ہے اور یہ چھوٹا سا جزیرہ قدرتی خوبصورتی کا شاہکار ہے، سفر کے دوران بہت سے پروگرام رکھے گئے، جن میں ایک پروگرام ہائی اسکول کے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ سوال وجواب کا رکھا گیا تھا، میں جب مترجم کے ساتھ ہال میں داخل ہوا تو ہال کچھا کھچ بھرا ہوا تھا، میرے مختصر خطاب کے بعد سوال وجواب شروع ہوا، مجھے ان کے سوالات سن کر بڑی حیرت ہوئی، وہ مختلف فقہی مذاہب کی آراء اوران کے دلائل کے بارے میں بھی دریافت کر رہے تھے، معلوم ہوا کہ فرنچ زبان میں نیٹ پر ڈھیر سارا مواد موجود ہے، جس سے نوجوان حضرات استفادہ کرتے ہیں۔

یہاں ایک طالب علم نے بہت عجیب وغریب سوال کیا جو میرے لئے بالکل غیر متوقع تھا، سوال یہ تھا کہ جب ہم ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ اخلاق سے پیش آسکتے ہیں تو بوسہ لینا بھی تو اظہار محبت کا ایک ذریعہ ہے، جس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا، پھر ایک نوجوان لڑکا اپنی دوست لڑکی کا بوسہ کیوں نہیں لے سکتا؟ —— اگر ہندوستان کے ماحول میں کوئی نوجوان اس طرح کا سوال کرے تو یقیناً ہم جیسوں کو ناگواری ہوگی اور غصہ آئے گا؛ بلکہ اس کو بدتہذیبی پر محمول کیا جائے گا؛ لیکن وہاں کے ماحول میں یہ سوال وہاں کے معاشرہ کی عکاسی کرتا تھا اور یہ اس طالب علم کی سادہ لوحی تھی کہ اس نے بے تکلف وہ بات دریافت کر لی، جو اس کے دل میں کھٹکتی تھی، میں نے ان سے کہا: بچو! کیا آپ کے یہاں گائے، بیل، بکرے، بکریاں ہوتے ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں، میں نے پوچھا: کیا آپ کو کبھی کسی گائے اور بیل کی شادی میں شرکت کا موقع ملا ہے؟ بچے ہنسنے لگے، میں نے کہا: کبھی آپ کو ایسا دعوت نامہ ملا، جس میں بکرے اور بکری کی شادی کی اطلاع دی گئی ہو؟ تو وہ خوب ہنسے اور کہنے لگے: کہیں جانوروں کے درمیان بھی نکاح ہوتے ہیں؟ میں یہی کہلانا چاہتا تھا، میں نے کہا: جیسے انسان روز پیدا ہوتے ہیں، ایسے ہی جانوروں کی بھی پیدائش ہوتی ہے، جیسے

انسان میں مرد وعورت دو صنفیں پائی جاتی ہیں، اسی طرح جانوروں میں بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں؛ فرق یہ ہے کہ جانوروں کے درمیان نکاح کا کوئی نظام نہیں ہے اور اس لئے ان کے یہاں ماں باپ کی شناخت بھی نہیں ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے نکاح کا نظام رکھا ہے، جس سے ماں باپ کی شناخت باقی رہتی ہے، آپ خود غور کریں ماں باپ کتنی بڑی نعمت ہیں، اگر ہمارے اور آپ کے ماں باپ نہ ہوتے تو ہم کتنی بڑی نعمت سے محروم ہوتے ! نکاح کے ذریعے شوہر وبیوی کی وفاداری ایک دوسرے کے لئے مخصوص ہو جاتی ہے؛ اسی لئے ماں باپ کی پہچان بھی باقی رہتی ہے، یہ عفت وعصمت انسانیت کا بہت بڑا جوہر ہے؛ جو اس کو جانوروں سے ممتاز کرتا ہے؛ اس لئے شریعت نے ہر ایسی چیز سے منع کیا ہے جو، انسان کی اس وفاداری کو داغ دار کرتی اور بے عفتی کی طرف لے جاتی ہو، ''بوسہ'' بھی ایسے ہی افعال میں سے ہے، اس لئے اسلام میں بیوی کے علاوہ کسی عورت کا بوسہ لینے سے منع کیا گیا ہے...... یہ بات جو اللہ نے بروقت دل میں ڈالی، ان بچوں کے لئے مؤثر ثابت ہوئی۔

پچھلے دنوں جب ہندوستان کے ایک مسلمان فلمی ستارہ کی طرف سے ''مادر مستعار'' لینے کی بات اخبار میں آئی تو یہ بھولا بسرا واقعہ یاد آگیا، جانوروں کے بارے میں تو یہ بات سننے میں آتی تھی کہ مادہ کو نر کے نطفہ سے بار آور کیا ہے؛ لیکن اب انسان بھی جانور کی سطح پر آگئے اور سماج کی ایک مشہور شخصیت نے خود اپنی بیوی کی بھاوج کی کوکھ اپنے بیٹے کے لئے عاریت پر حاصل کی اور اسے قابل اخفاء بھی سمجھا نہیں گیا؛ یہاں تک کہ یہ چیز میڈیا کے ذریعہ عام لوگوں تک پہنچی، یہ بات حیرت انگیز تھی، مغربی معاشرہ کے لئے تو شاید اس طرح کی باتیں قابل تعجب نہیں ہوں؛ اس لئے کہ ان کے یہاں ''رحم'' کو کرایہ پر لینا باپ بننے کا ایک معروف طریقہ بنتا جا رہا ہے، اسی طرح مادۂ منویہ کے بینک بھی قائم ہو رہے ہیں اور خواتین یا میاں، بیوی آپسی اتفاقِ رائے کے ساتھ اس سے استفادہ کرتے ہیں؛ لیکن مشرقی سماج کے لئے عموماً اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً یہ نہایت افسوس ناک اور قطعاً ناقابل قبول ہے۔

جہاں تک میرے علم میں ہے، دنیا کا کوئی مذہب ماں باپ بننے کے لئے کسی اجنبی مرد کے نطفہ، یا کسی اجنبی عورت کے رحم کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا، سوائے ہندو بھائیوں کے ایک طبقہ آریہ سماجیوں کے، کہ ان کے رہنما پنڈت دیانند جی سرسوتی نے ستیارتھ پرکاش میں نیوگ کو درست

ٹھہرایا ہے اور ہندو مذہبی کتابوں سے اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ''نیوگ'' سے مراد یہ ہے کہ کوئی عورت اولاد حاصل کرنے کے لئے اپنے دیور سے، یا کسی اور اجنبی شخص سے جنسی تعلق قائم کرلے؛ بلکہ ان کے نزدیک شادی شدہ لاولد عورتوں کے لئے بھی اس کی اجازت ہے، نیوگ کا یہ قانون اخلاق کی ترازو اور شرافت کی میزان میں کس درجہ قابل قبول ہے؟ وہ محتاج اظہار نہیں؛ تاہم مجھے یقین ہے کہ یہ غیر شریفانہ قانون حقیقی ہندو مذہب کی تعلیمات نہیں ہیں اور نہ ہندو بزرگوں نے ایسی بات فرمائی ہوگی؛ بلکہ یہ مذہبی کتابوں میں کی جانے والی ملاوٹوں اور آمیزشوں کا نتیجہ ہے:

اسلام کا تصور بالکل واضح ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ﴾ (البقرۃ: ۲۲۳)

''تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں؛ لہٰذا اپنی کھیتی پر جس طرح آنا چاہو، آؤ''

کھیتی سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہارے لئے اولاد کی پیدائش کا ذریعہ بیوی ہی کو ہونا چاہئے اور بیوی سے تعلق میں کسی خاص کیفیت کی تحدید نہیں ہے؛ لیکن یہ تعلق بہر حال ایسا ہونا چاہئے جس کا مقصد اپنی کھیتی کو بارآور کرنا اور اولاد کو حاصل کرنا ہو، اس طرح قرآن مجید نے ایک جامع فقرہ کے ذریعہ بیک وقت تین باتوں کی طرف اشارہ کردیا، اول یہ کہ اولاد کا حصول مرد وعورت کے باہمی تعلق سے ہونا چاہئے، تنہا مرد یا تنہا عورت سے نہیں؛ ٹھیک اسی طرح جیسے کاشت کار کی محنت اور قابل کاشت زمین کی صلاحیت کے اشتراک سے پیداوار حاصل ہوا کرتی ہے، کلوننگ کا جو طریقہ سائنسدانوں نے ایجاد کیا ہے نسل انسانی کی افزائش میں اس کا استعمال جائز نہیں؛ کیوں کہ اس طریقہ میں تنہا مرد یا تنہا عورت کے سیل سے بھی بچہ کو وجود میں لایا جاسکتا ہے؛ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مرد وعورت کے تعلق کو فطرت کے دائرہ میں محدود ہونا چاہئے، غیر فطری عمل کی میاں، بیوی کے درمیان بھی اجازت نہیں، تیسری بات جو اس وقت بیان کرنی مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ میاں، بیوی کے لئے حصول اولاد کا ایک ہی محل متعین ہے، اور وہ ہے مرد کے لئے اس کی بیوی اور عورت کے لئے اس کا شوہر، نہ مرد کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ اس کے بچے کی پرورش اس کی بیوی کے بجائے کسی اور عورت کے پیٹ میں ہو، نہ عورت کے لئے گنجائش ہے کہ اس کے پیٹ میں اس کے شوہر کے علاوہ کسی اور مرد کے بچہ کی پرورش ہو؛ اس لئے کرائے کی ماں، یا مستعار ماں کا تصور شریعت اسلامی کی رو سے قطعاً ناجائز

اورحرام ہے۔

غور کیا جائے تو اس طریقہ کار میں کئی مفاسد پائے جاتے ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ اس سے انسان کی شناخت مشتبہ ہوجائے گی اور بچے اپنی پہچان سے محروم ہوجائیں گے، بچہ اس عورت کو ماں کہے جس کے رحم میں اس کی پرورش ہوئی ہے، جس نے اس کے لئے حمل کی تکلیف اٹھائی ہے اور جس نے بچہ جننے کے درد کو سہا ہے، یا اس عورت کو ماں سمجھے، جس کا اس کی پیدائش میں کوئی کردار نہیں رہا، جس نے اس کے وجود کو پروان چڑھانے کے لئے ادنی سی بھی تکلیف نہیں اٹھائی اور جس کی خوبی صرف اس قدر ہے کہ وہ اس مرد کی بیوی ہے جس کا نطفہ اس کے وجود میں آنے کے لئے استعمال ہوا ہے؟ — یہ مشتبہ ہے، اس طرح بچہ اپنی حقیقی پہچان سے محروم ہوجائے گا، انسان کی پہچان صرف باپ سے ہی نہیں ہوتی، ماں سے بھی ہوتی ہے؛ بلکہ بعض مقدس خاندانی سلسلے ماں ہی کے ذریعہ جاری ہوئے ہیں جیسے سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت حضرت مریم علیہا السلام سے ہے؛ بلکہ خود خانوادۂ نبوی ﷺ کا سلسلہ خواتین جنت کی سردار حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے ذریعہ چلا ہے؛ اس لئے انسان کی خاندانی شناخت میں ماں کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے، — یہ عمل اس شناخت کو مشتبہ بنادے گا اور بچے اپنی حقیقی پہچان سے محروم ہوجائیں گے۔

دوسرا نقصان یہ ہے کہ جو بچے ناجائز طور پر پیدا ہوئے ہوں؛ ان کو مرد کی درست اولاد نہیں مانا جاتا ہے، یہی ہر مہذب معاشرہ کا عمل رہا ہے اور یہی اسلام کی سوچ ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**الولد للفراش وللعاھر الحجر**'' (صحیح البخاری، باب تفسیر المشبہات، حدیث نمبر: ۲۰۵۳) یعنی منکوحہ عورت کو جو بھی بچہ پیدا ہو، وہ اس کے شوہر کا سمجھا جائے گا اور زانی کے لئے محرومی ہوگی، اگر کرایہ کی ماں یا عاریت کی ماں کے تصور کو مان لیا جائے تو ایسے بچے جو زنا کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہوں — اگر زانی صاحب حیثیت شخص ہو تو — وہ اس سے اپنی فرزندی کے رشتہ کا دعویٰ کرسکتا ہے، جیسا کہ اس وقت ملک کی ایک بڑی سیاسی شخصیت کے خلاف عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے، اس طرح کے واقعات بڑھیں گے اور کسی زمانے میں مغلوب الجذبات ہوکر جو ناروا حرکتیں کی گئی ہوں گی اور ان سے بچے پیدا ہوئے ہوں گے، وہ عاریت اور کرائے کی کوکھ کا نام دے کر اپنی نسبت ثابت کرنا چاہیں گے۔

تیسرے: اس سے حقیقی اولاد اور حقیقی ورثہ کو قانون میراث میں نقصان پہنچے گا؛ کیوں کہ مرد کی حقیقی اولاد — جو اس کی جائز بیوی سے ہے — کا حصہ اس ناجائز بچے کی وجہ سے کم ہو جائے گا، اور یہ بھی بعید نہیں کہ ایسے واقعات میں ''مادر مستعار'' سے پیدا ہونے والا بچہ خود اس عورت کے شوہر سے وارث ہونے کا مدعی ہو جائے اور اس طرح اس شخص کے حقیقی ورثہ کا حق متاثر ہو؛ اس کے علاوہ قانون نفقہ اور حق پرورش سے متعلق قانون — جس کا تعلق عورت سے ہے — میں بھی الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں اور نزاعات جنم لے سکتے ہیں۔

چوتھے: اس سے غریب عورتوں کا استحصال ہوگا، متمول شوہر و بیوی اور کام کرنے والی خواتین خود حمل کی تکلیف سے بچنے اور اپنے وقت کو فارغ رکھنے کے لئے کچھ پیسے دے کر غریب عورتوں کو تیار کریں گے، ان بے چاری خواتین کو باعزت زندگی تو نہیں مل سکے گی، شوہر کی محبت تو ہاتھ نہیں آئے گی؛ لیکن ان کا دوہرا استحصال ہوگا، ایک طرف ایک حقیر معاوضہ کے بدلے حمل و ولادت کی مشقتیں انگیز کرنی ہوں گی، جو ایک ماں کو اپنے جگر کے ٹکڑے کے لئے کرنی پڑتی ہے، دوسری طرف ان کو سماج میں باعزت زندگی نہیں مل سکے گی، انہیں حقارت کی نظر سے دیکھا جائے گا، غیرت مند مرد اُن سے نکاح کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے؛ بلکہ ''مادر مستعار'' کا معاملہ تو بالواسطہ قحبہ گری کا ہے، یہ بھی بعید نہیں کہ یہ آہستہ آہستہ بلا واسطہ قحبہ گری کا ذریعہ بن جائے اور بدقماش لوگ نفس کی آگ مٹانے پر قانع نہ ہوں؛ بلکہ اس کو حصول اولاد کا ذریعہ بھی بنانے لگیں۔

پانچویں: نکاح اور نکاح کے ذریعہ فطری طور پر اولاد کے حصول کے علاوہ اگر معاشرہ میں حصول اولاد کی دوسری صورتیں پیدا ہو جائیں تو نکاح کی گھٹتی ہوئی شرح اور بھی کم ہو جائے گی؛ کیوں کہ نکاح کا ایک اہم مقصد اولاد کا حصول بھی ہے، اگر یہ مقصد بھی انسان کو نکاح کے بغیر بھی حاصل ہونے لگے تو وہ اپنے کندھوں پر نکاح کا بوجھ کیوں اٹھائے؟ اس طرح بحیثیت مجموعی اس سے معاشرہ میں فحاشی اور بے حیائی پیدا ہوگی اور ایک ایسے معاشرتی بگاڑ کا دروازہ کھلے گا، جس کے نہایت منفی اثرات مرتب ہوں گے۔

ہماری حکومت کو چاہئے کہ وہ مغربی ممالک سے تجارتی معاملات تو کرے، سرمایہ کاری تو کرائے، ان سے جدید ٹیکنالوجی بھی حاصل کرے؛ لیکن ان کی تہذیب وثقافت کو درآمد نہ کرے،

یورپ میں مذہب اور کلیسا کی جنگ کلیسا کی شکست پر ختم ہوئی، وہاں اس کے بعد ایک ایسے سیکولرزم کی بنیاد پڑی، جس کے بنیادی تصورات میں مذہب بیزاری داخل ہے اور جس کا مقصد انسانی سماج کو اخلاقی حدود اور مذہب کے دائرے سے بالکل باہر نکال دینا ہے، ہندوستان میں اس کے معماروں نے اس ملک کے لئے ایسے سیکولزم کا انتخاب کیا، جس میں اگر چہ سلطنت کا کوئی مذہب نہیں ہوگا؛ لیکن وہ مذہبی اور اخلاقی قدروں سے بالکل آزاد بھی نہیں رہے گا، یہ بات بھی بے حد قابل افسوس ہے کہ یہ واقعہ میڈیا کے ذریعہ تمام لوگوں تک پہنچا؛ لیکن نہ سماجی تنظیموں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور نہ ان خواتین تنظیموں نے جو اپنے آپ کو عورتوں کے حقوق کی محافظ سمجھتی ہیں؛ حالاں کہ قانونی طور پر ’’مادر مستعار‘‘ کی اجازت عورتوں کی آبرو نیلام کرنے اور ماں کی حرمت کو پامال کرنے کے مترادف ہے۔

❁

فیس بک کا سیاہ چہرہ

الیکٹرانک ذرائع ابلاغ میں ایک اہم ذریعہ انٹرنیٹ ہے، انٹرنیٹ پر مختلف ادارے اپنے وسائل سے بلا کسی معاوضہ کے استفادہ کا موقع دیتے ہیں، ان ہی میں ایک فیس بک (Face book) بھی ہے، یہ دنیا بھر کے لوگوں سے دوستی کرنے، رابطہ رکھنے اور ایک دوسرے سے استفادہ کرنے کا وسیع الاثر ذریعہ ہے، جس کو زوکر برگ نے بارورڈ یونیورسیٹی کے دو طلبہ ڈاسٹن موسکوویٹز اور کریز ہیوز کے تعاون سے ایجاد کیا ہے اور اس وقت پوری دنیا میں ساڑھے تین ارب افراد اس کا استعمال کررہے ہیں، جدید ایجادات کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ بعض شر پسند عناصر تخریبی مقاصد کے لئے اس کا استعمال کرنے لگتے ہیں، ایسے ہی استعمال کی ایک بدترین مثال پچھلے دنوں فیس بک پر رسول اللہ ﷺ کے کارٹون کی اشاعت ہے، اولاً تو اسلام کی نظر میں کسی بھی جاندار کی فوٹوگرافی حرام ہے، رسول اللہ ﷺ نے تصویر کشی کرنے والوں پر اللہ کی لعنت بھیجی ہے (مسند احمد، حدیث نمبر: ۳۱۳۳، ۵۰۱۸) اور ان کے لئے بھیانک عذاب کی وعید سنائی ہے، دوسرے: تصویر انسان کی شخصیت کا عکس ہوتی ہے، جیسے انسان خود اپنی شخصیت کا مالک ہے، اسی طرح وہ اپنی تصویر کا بھی مالک ہے، کسی آدمی کے لئے اس بات کی گنجائش نہیں ہوسکتی کہ وہ دوسرے کی تصویر کھینچے، سوائے اس کے کہ وہ خود اس پر رضامند ہو یا حفاظت یا کسی اور ضرورت کے پس منظر میں کسی کی تصویر کھینچنا مجبوری بن گئی ہو؛ اس لئے عام حالات میں کسی شخص کی تصویر کھینچنا اور اس کو لوگوں تک پہنچانا ایک اخلاقی جرم اور متعلق شخص کے ساتھ زیادتی ہے۔

پھر فرضی تصویر بنانا اور اس کو کسی شخصیت کی طرف منسوب کردینا نہ صرف مذکورہ شخص کے ساتھ زیادتی ہے؛ بلکہ اس میں جھوٹ اور دھوکہ بھی ہے؛ کیوں کہ جب یہ فرضی تصویر کسی کی طرف منسوب کردی جاتی ہے تو لوگ اس کو حقیقی تصویر سمجھنے لگتے ہیں، یہ ایسے ہی ہے، جیسے ''الف'' کا تعارف کراتے ہوئے آپ اس کو ''ب'' سے موسوم کردیں اور جو شخص ''ب'' ہے، اس کو ''الف'' کہہ دیں، یا آپ کسی کا جعلی دستخط کردیں، ظاہر ہے کہ اس طرح کا عمل شخصی تلبیس کے دائرہ میں آتا ہے اور اس پر فوجداری

مقدمہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

پھر اس طرح کی ناشائستہ حرکت اگر مذہبی پیشواؤں کے سلسلہ میں ہو تو یہ اور بھی غلط ہے؛ کیوں کہ ان کی ذات سے ہزاروں لوگوں کے جذبات متعلق ہوتے ہیں؛ اس لئے ان کی فرضی تصویریں بنانا بے شمار لوگوں کے جذبات کو مجروح کرنے کی کوشش ہے، بدقسمتی سے دنیا کی مختلف قومیں اس سلسلہ میں سنجیدگی سے خالی ہیں اور مذہب سے ان کا تعلق رسمی سا رہ گیا ہے، وہ خود ہی دیویوں، دیوتاؤں کی فرضی شکلیں بناتے ہیں، عیسائی مذہب میں بنیادی طور پر توحید کا تصور پایا جاتا ہے، اس کے باوجود وہ بھی حضرت مریم اور حضرت مسیح علیہ السلام کے نہ صرف فرضی مجسمے بناتے ہیں؛ بلکہ ان کی پرستش بھی کرتے ہیں؛ لیکن مسلمانوں کا تصور اس سلسلہ میں دوسری اقوام سے مختلف ہے، وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ ان کے پیغمبر شرک اور بت پرستی کو مٹانے کے لئے دنیا میں تشریف لائے، انہوں نے کعبۃ اللہ کو بتوں سے پاک فرمایا اور ان کے متبعین جہاں جہاں گئے، انہوں نے اپنے نبی کی سنت کو زندہ کیا، ان کے سامنے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اسوہ ہے کہ آپ نے نہ صرف شرک کو منع فرمایا؛ بلکہ وہ تمام باتیں جو پچھلی امتوں میں مشرکانہ افکار کا باعث بنی تھیں، ان کی بھی ممانعت فرمادی؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو تعظیمی سجدہ کرنے سے بھی منع کیا گیا، (**سنن أبی داؤد، کتاب النکاح، باب فی حق الزوج علی المرأۃ**، حدیث نمبر: ۲۱۴۲) غلام کو''عبد'' اور آقا کو''رب'' کہنے سے منع کیا گیا، جس کا استعمال عربوں میں عام تھا اور اسی لئے تصویر کشی اور مجسمہ سازی کی ممانعت فرمائی گئی؛ تاکہ وہ دروازے بند ہوجائیں، جو بہ تدریج کسی گروہ کے شرک میں مبتلا ہونے کا سبب بن جاتے ہیں۔

یہ تو محض تصویر سے متعلق قابل توجہ پہلو ہے؛ لیکن کارٹون تصویر کی ایک خاص شکل ہے، جس کا مقصد عموماً تمسخر اور طنز کرنا ہوتا ہے، دن رات ہم اخبارات میں جو کارٹون دیکھتے ہیں، وہ کسی طنزیہ پہلو کو اجاگر کرنے کے لئے ہی بنایا جاتا ہے، اس طرح جب آپ کسی کا کارٹون بناتے ہیں، تو آپ صراحتاً اس کی اہانت کے مرتکب ہوتے ہیں؛ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کارٹون بنانا کھلے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کرنے کی مذموم کوشش ہے اور یہ مسلمانوں کی عزت وآبرو اور ان کے وقار کو متاثر کرنا اور ان کے جذبات کو مجروح کرنا ہے۔

انسان کو دنیا میں جو چیزیں سب سے زیادہ عزیز ہیں اور جن کا تحفظ ان کا بنیادی حق ہے، وہ ہیں: جان، مال اور عزت وآبرو، عزت وآبرو کا تعلق عصمت وعفت کی حفاظت سے بھی ہے اور اس کی عزتِ نفس سے بھی، عزتِ نفس کی بڑی اہمیت ہے، اللہ تعالیٰ نے مختلف جانداروں میں ان کی حیثیت اور شان کے لحاظ سے عزتِ نفس کا احساس رکھا ہے، کوئی گدھا کھڑا ہوا اور آپ اسے دو چار لات رسید کر دیں تو شاید اس پر کوئی ردِ عمل نہ ہو؛ لیکن اگر آپ یہی حرکت گھوڑے اور کتے کے ساتھ کر گذریں تو جوابی وار سے بچ نہیں سکیں گے، یہی ہے عزتِ نفس کا احساس، انسان کے اندر یہ احساس دوسری مخلوقات سے زیادہ رکھا گیا ہے، اگر آپ ایک چھوٹے بچے کو بھی ڈانٹیں تو وہ رونا شروع کر دیتا ہے، پورے گھر کو سر پر اٹھالیتا ہے اور جب تک آپ اس کو پیار نہ کریں یا اس کی کوئی محبوب چیز اسے دے کر بہلا نہ لیں، اس کا رونا بند نہیں ہوتا، یہ وہی عزتِ نفس کا فطری جذبہ ہے، جو قدرت کی طرف سے ہر انسان کو ودیعت ہوا ہے۔

انسان کا اس جذبہ سے محروم ہوجانا دو ہی صورتوں میں ہوتا ہے، یا تو اس کی عقل میں خلل پیدا ہو گیا ہو یا وہ غیرت وحیا سے محروم ہو؛ اسی لئے امام غزالیؒ نے فرمایا: جس کو غصہ کی بات پر بھی غصہ نہ آئے وہ پاگل ہے، دنیا میں بہت سے افعال کو جرم شمار کرنے کی وجہ یہی ہے کہ اس سے اس کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے، کسی شخص کو گالی دینا اور بے سبب برا بھلا کہنا جرم ہے۔ حالاں کہ اس سے نہ اس کے جسم پر کوئی خراش لگتی ہے اور نہ اس کو کوئی مالی نقصان پہنچتا ہے، اگر کسی ''دلت'' کو حقارت آمیز انداز پر اس کی ذات برادری کا حولہ دے دیا جائے تو اسے بڑا جرم تصور کیا جاتا ہے؛ حالاں کہ اس سے اس کو کوئی جسمانی یا مالی ضرر نہیں پہنچتا، اگر آپ نے ملک کے جھنڈے کو الٹا لہرا دیا یا زمین پر بچھا کر اس کے اوپر سے گذر گئے تو بہ ظاہر اس سے ملک کا کوئی نقصان نہیں، نہ اس کی وجہ سے کوئی طوفان آئے گا، نہ سیلاب امڈ پڑے گا، نہ آتش فشاں پھٹنے کی نوبت آئے گی؛ لیکن قانون کی نظر میں یہ ایک سنگین جرم ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والا قابلِ سرزنش ہے؛ اس لئے کہ اس سے پوری قوم کا وقار مجروح ہوتا ہے اور اس کی عزتِ نفس کو چوٹ لگتی ہے۔

مذہبی پیشواؤں کی اہانت —— جس کی ایک صورت کارٹون کا بنانا بھی ہے —— کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہئے، مذہب سے ہزاروں نہیں کڑوروں لوگوں کے جذبات متعلق ہوتے ہیں، مسلمانوں

کی تعداد دنیا کی پوری آبادی کے لحاظ سے بیس تا پچیس فیصد ہے؛ اس لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا کارٹون بنانا گویا پورے کرۂ ارض کے لحاظ سے بیس تا پچیس فی صد انسان کی عزت نفس سے کھیلنا ہے، جب ایک شخص کے جذبات کو مجروح کرنا جرم ہے اور جب چند لاکھ افراد پر مشتمل چھوٹے چھوٹے ملکوں کی عزت نفس کا پاس ولحاظ ضروری ہے تو غور کیجئے کہ انسانیت کی اتنی بڑی تعداد کو تکلیف پہنچانا اور ان کے جذبات کو ٹھیس لگانا کتنے غیر معمولی درجہ کا جرم ہوگا ؟

مغربی قوموں کا کہنا ہے کہ دنیا کی دوسری قومیں اپنی مذہبی پیشواؤں کی اہانت پر مشتعل نہیں ہوتی ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نہایت اہانت آمیز فلمیں بنائی جاتی ہیں، ہندو دیویوں اور دیوتاؤں کی بے لباس تصویریں بنتی ہیں، کرشن اور رادھا کے تعلق پر عاشقانہ گیت کہے جاتے ہیں اور کرشن جی کے ساتھ گوپیوں کی عریاں تصویریں شائع کی جاتی ہیں؛ لیکن یہودی، عیسائی یا ہندو دنیا میں کوئی ردعمل پیدا نہیں ہوتا، اور مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک شبیہ بنادی گئی، تو پوری دنیا کے مسلمان مشتعل ہوجاتے ہیں اور ردعمل کی ایک لہر پیدا ہوجاتی ہے؟ — اس سوال پر سنجیدگی کے ساتھ سوچنے کی ضرورت ہے، اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ مختلف قومیں کس حد تک مذہب سے مربوط ہیں؟ انسان کی فطرت یہ ہے کہ جس شخصیت یا جس شی سے اس کو جتنا زیادہ جذباتی لگاؤ ہوتا ہے، اسی نسبت سے اس کی بے توقیری انسان کو مشتعل کرتی ہے، اگر کوئی شخص کسی کے نوکر کو گالی دے دے تو اس کو اتنا ناگوار نہیں گذرتا، جتنا یہ کہ کوئی شخص اس کے بچوں کو گالی دے دے، اگر کسی کے نوجوان بیٹے کو کسی نے ایک دو تھپڑ رسید کردیا تو وہ اتنا جذباتی نہیں ہوتا جتنا اس بات پر کہ کوئی شخص اس کے باپ پر ہاتھ اٹھا دے، یعنی جس سے جتنی زیادہ محبت کا تعلق ہوتا ہے اور جس کی جتنی زیادہ عظمت اس کے دل میں ہوتی ہے، اتنا ہی زیادہ اس کے بارے میں وہ حساس ہوتا ہے۔

صورتِ حال یہ ہے کہ مغرب نے جس مادیت کا بگل بجایا ہے، اس نے روحانی قدروں کو ختم کر کے رکھ دیا ہے، اور مذہب کی حیثیت ایک رسمی چیز کی ہوگئی ہے، چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ یورپ میں چرچ اور گرجے شراب خانوں میں تبدیل ہورہے ہیں، ان کی ویرانی کا حال یہ ہے کہ اب صرف اتوار کو ان میں عبادت ہوتی ہے اور بقیہ دنوں میں انہیں کرایہ پر لگا دیا جاتا ہے، ہندو بھائیوں کے

یہاں مذہب صرف ایک تہذیب اور کلچر کے درجہ میں ہے، خود ہندو فرقہ پرست تنظیمیں لوگوں کو ہندوتوا کے بجائے نیشنل کلچر کی دعوت دے رہی ہیں؛ کیوں کہ ہندو مذہب میں اتنے تضادات ہیں کہ وہ دھرم کی بنیاد پر مختلف گروہوں کو جمع نہیں کر سکتے، وہ تہذیب ہی کے نام پر مختلف گروہوں کو جوڑ سکتے ہیں؛ اس لئے اس وقت دنیا کی اکثر قومیں اپنے مذہب پر یقین سے محروم اور مذہبی معاملات میں سنجیدگی سے خالی ہیں، اس وقت دنیا میں صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہیں، جو حقیقی معنی میں بڑی حد تک مذہب سے وابستہ ہیں اور ان میں آج بھی اپنے مذہب کی شناخت جان وتن سے بڑھ کر عزیز ہے۔

مغربی ممالک مادی مفادات کے بارے میں حساس ہیں؛ اس لئے اس سلسلہ میں ان کا رد عمل بھی بہت شدید ہوتا ہے، ۱۱/ستمبر کے واقعہ کو دیکھئے، ایک عمارت زمین بوس ہوئیں، اور چند ہزار افراد مارے گئے، یہ یقیناً ایک بڑا سانحہ تھا؛ لیکن وہی امریکہ جو جاپان کے لاکھوں انسانوں کے قتلِ عام پر ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوا، اپنی انا کو ٹھیس لگنے اور اپنی عزتِ نفس پر ضرب کی وجہ سے تلملا اٹھا اور اس نے افغانستان اور عراق کے لاکھوں بے قصور لوگوں کو تہِ تیغ کر دیا، اس سے زیادہ انسانیت سوز رد عمل اور کیا ہوسکتا ہے؟ اگر کہیں قدرتی ذخائر نکل آئیں، چاہے بحر اخضر کا پٹرول ہو یا صومالیہ میں ہیرے کی کانیں، مغربی طاقتیں کس پُھرتی کے ساتھ وہاں کود پڑتی ہیں اور کتنی ڈھٹائی کے ساتھ لوگوں کے وسائل پر قبضہ جماتی ہیں؛ کیوں کہ وہ مادی دولت کے بارے میں حساس ہیں اور روحانی اقدار کے بارے میں بے حس؛ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ جن مفادات کے بارے میں وہ سنجیدہ ہیں، ان میں ان کا ردعمل مسلمانوں سے بھی کہیں بڑھ کر ہے؛ لیکن جن چیزوں کی ان کے نزدیک اہمیت نہیں ہے، وہ ہیں روحانی اقدار؛ اس لئے اس پر ان کا جذباتی نہ ہونا اور ہر طرح کی ناشائستہ باتوں کو سہ جانا فطری بات ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ مذہب بیزار طاقتیں سمجھتی ہیں کہ مادیت کے اس حمام میں مسلمان ہی ایک ایسا گروہ ہیں، جو بے لباس ہونے کو تیار نہیں ہیں اور آج بھی مذہب کو اپنے سینہ سے لگائے ہوئے ہیں؛ اس لئے کسی طرح مسلمانوں کو بھی مذہب سے دور کیا جائے اور انہیں ایک بے خدا تمدن کا حصہ بننے پر آمادہ کرلیا جائے، مسلمانوں کی مذہب سے وابستگی کے لئے سب سے اہم محرک پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے محبت اور ان کی عظمت ہے، اگر نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا رشتہ کمزور

ہوجائے اور اپنے نبی کی عظمت ان کے دلوں سے نکل جائے تو ان کو اغوا کر لینا اور انہیں اسلام سے دور کر دینا چنداں دشوار نہیں، افسوس کہ وہ اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جو فرق ایک زندہ شیر اور کھلونے کے شیر کے درمیان ہوتا ہے کہ زندہ شیر کا تصور انسان کو ڈرانے کے لئے کافی ہوتا ہے اور مردہ شیر کو سواری بنانا بھی دشوار نہیں ہوتا؛ یہی حال زندہ اور مردہ مذاہب کا بھی ہے، نبوت محمدی پچھلی نبوتوں کے لئے اور آپ کی لائی ہوئی شریعت گذشتہ شریعتوں کے لئے ناسخ ہے، اور انسانیت کو قیامت تک آپ ہی کی نبوت کے سایہ میں زندگی گذارنی ہے؛ اس لئے اس دین کی کشش اور اس کی طاقت کو ان مذاہب پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، جو زندگی سے محروم ہیں، یہی وجہ ہے کہ مسلمان کتنا بھی برا ہو، وہ اپنے نبی کے بارے میں ادنی سی ناشائستہ بات کو بھی گوارا نہیں کر سکتا، وہ اپنے رگ گلو کا آخری قطرۂ لہو نچوڑ سکتا ہے، وہ اپنی جوان اولاد کی تڑپتی ہوئی لاشوں کو دیکھ سکتا ہے، وہ اس بات کو گوارا کر سکتا ہے کہ اس کے مکان کی اینٹ سے اینٹ بج جائے، اس کے لئے یہ بات قابل برداشت ہو سکتی ہے کہ تختِ اقتدار سے محروم کر کے اسے تختۂ دار پر چڑھا دیا جائے؛ لیکن وہ ہرگز اس بات کو قبول نہیں کر سکتا کہ اس کے نبی کی شان میں کسی گستاخی کا ارتکاب ہو؛ کیوں کہ اس کے نزدیک مسجد کے میناروں کی اہمیت کارخانوں کی چمنیوں سے بڑھ کر ہے اور روحانی قدروں کی عظمت مادی مفادات سے کہیں زیادہ ہے، اگر مغربی طاقتیں اس حقیقت کو سمجھ لیں تو مسلمانوں کے ردعمل پر انہیں کوئی حیرت نہ ہو؛ بلکہ اگر مسلمانوں کا ردعمل ہلکا ہو یا نہ ہو تو انہیں اس پر تعجب ہوگا۔

فیس بک-روااورناروااستعمال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کی علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ فاصلے سمٹ جائیں گے، فاصلوں کے سمٹنے کی غالباً دوصورتیں ہوں گی، ایک ذرائع مواصلات کی ترقی کہ مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہونے لگے گا؛ چنانچہ آج دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے کا سفر ۲۴ر گھنٹے کے اندر مکمل ہوجاتا ہے، گذشتہ زمانہ میں شاید اس کے لئے ایک سال کا عرصہ بھی ناکافی ہوتا، دوسری صورت 'ذرائع ابلاغ' کی ترقی کی ہے، پہلے ایک پیغام دوسرے تک پہنچانے میں ایک مدت درکار ہوتی تھی، تیز ترین ذرائع کے طور پر تیز رفتار گھوڑوں اور کبوتروں کا استعمال کیا جاتا تھا؛ لیکن ظاہر ہے کہ گھوڑ سوار کے ذریعہ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک خبر پہنچانے میں کئی کئی ماہ لگ جاتے تھے، جن کبوتروں کو نامہ بری کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، ان کی اڑان کا دائرہ بھی محدود ہوتا تھا اور ان کے ذریعہ بہت مختصر پیغام رسانی ہوسکتی تھی؛ لیکن ٹیلی گرام، ریڈیو، ٹی وی، ٹیلیفون اور موبائل کی ایجادات نے ابلاغ کے میدان میں بے حد سہولتیں پیدا کردیں اور انٹرنیٹ نے اس سہولت کو اوج کمال تک پہنچادیا، اب 'چین' کے دور دراز دیہات میں بیٹھ کر ایک شخص امریکہ اور کناڈا کے کسی پُرشور اور ترقی یافتہ شہر تک پلک جھپکتے اپنا پیغام پہنچاسکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو عقل دی ہے، تحقیق وتفحص کا جذبہ عطا فرمایا ہے اور علمی ترقی کے راستے سجھائے ہیں، ان سے فائدہ اٹھا کر انسان یہ اور اس طرح کی ایجادات کو وجود میں لایا ہے، فرشتے جو دنیا میں انسانوں کے بسائے جانے کے حق میں نہیں تھے، شاید انسان کی اس ترقی اور اختراعی صلاحیت پر رشک کرتے ہوں گے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انٹرنیٹ ایک ایسی ایجاد ہے کہ جس نے بہت سی دشوار گذار گھاٹیاں طئے کرنے کو انسان کے لئے ممکن؛ بلکہ آسان بنادیا ہے اور اگر اس کا صحیح استعمال کیا جائے تو وہ انٹرنیٹ کو اپنے لئے علم ومعرفت کی کلید بنا سکتا ہے، اسی سلسلہ میں ایک کڑی انٹرنیٹ کی وہ ویب سائٹ ہے، جو فیس بک (Face Book) کے نام سے شروع ہوئی تھی، جس میں صرف تصویریں شائع ہوتی

تھیں اور ایک نوجوان امریکی طالب علم مارک زکر برگ Mark Zucreer Berg (پیدائش: ۱۹۸۴ء) اور ان کے ساتھی نے مل کر اسے قائم کیا تھا، یہ ہارورڈ یونیورسٹی کے طلبہ تھے اور انہوں نے اپنے ہاسٹل میں ایک دوسرے سے تعارف کے لئے یہ ویب سائٹ شروع کی تھی؛ تاکہ وہ بہتر طریقہ پر ایک دوسرے کو جان سکیں؛ لیکن اسے ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ ۲۴ رگھنٹہ کے اندر ہی یونیورسٹی کے بارہ سو طلبہ اس میں شامل ہوگئے اور پھر دوسرے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس ویب سائٹ نے پذیرائی حاصل کرنا شروع کردیا، پھر ۲۰۰۵ء میں اس نے برطانیہ تک کا سفر طے کرتے ہوئے وہاں اپنا تعارف کرایا اور رفتہ رفتہ پوری دنیا میں اس نے اپنا قدم جمالیا۔

اس ویب سائٹ کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت اس ۸۴۵ ملین سرگرم صارفین (Active users) اس سے مربوط ہیں، جس میں ۴۸۳ ملین صارفین اسے روزانہ استعمال کرتے ہیں، امریکہ میں اس کے استعمال کرنے والے سب سے زیادہ، یعنی ۱۵۲،۵ ملین ہیں، دوسرے نمبر پر ہندوستان ہے، جہاں اس کے ۴۳،۵ ملین ممبرز ہیں، اگست ۲۰۱۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق عالم عرب میں ۲۳ رملین صارفین اس ویب سائٹ پر موجود تھے، اس وقت عالم عرب میں آزادی اور جمہوریت کی جو تحریکیں اٹھیں اور آمرانہ اقتدار کے خلاف جو آندھی چلی، اس میں فیس بک کا بڑا اہم کردار رہا ہے، مصر میں ایک نوجوان 'خالد سعید' کو پولیس نے بے دردی کے ساتھ شہید کردیا، اسی کو بنیاد بنا کر وہاں کے ایک کمپیوٹر انجینئر نے **''کلنا خالد سعید''** (ہم میں سے ہر ایک خالد سعید ہے) کے عنوان سے فیس بک کا پیج بنایا، جس کو غیر معمولی عوامی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس نے مصر کے انقلاب میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

اس وقت فیس بک جہاں سماجی تعلقات کو فروغ دینے اور باہمی تعارف کو آسان بنانے کی خدمت انجام دے رہا ہے، وہیں اسے اشتہارات کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے؛ اس لئے اسے ایک زبردست تجارت کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور اس کے مالک زکر برگ اس وقت دنیا کے ان چند نوجوانوں میں ہیں، جن کی دولت بلینوں میں ہے؛ چنانچہ ایک اندازہ کے مطابق ان کی دولت ۱۷،۵ بلین ڈالر تک پہنچ چکی ہے۔

اگر فیس بک کا استعمال صرف بہتر مقاصد اور تعمیری کاموں کے لئے ہوتا تو یہ معروف کی

اشاعت اور منکر کو روکنے کا نہایت زبردست وسیلہ ثابت ہوتا، خاص کر نوجوانوں کے ذہن کو تعمیری رخ دینے اور سماج کو اخلاقی مفاسد سے بچانے میں اس کا غیر معمولی کردار ہوتا؛ لیکن عملی صورت حال یہ ہے کہ اگرچہ اچھے مقاصد کے لئے بھی اس ویب سائٹ کا اچھا خاصا استعمال ہورہا ہے، مگر افسوس کہ سماج کے بگڑے ہوئے افراد نے غلط مقاصد اور اخلاقی مفاسد کی اشاعت کے لئے اس مفید ویب سائٹ کا گویا اغوا کرلیا ہے، ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اس کے صحیح استعمال کو فروغ دیں اور پڑھے لکھے نوجوانوں میں اس کا مزاج بنائیں اور یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اس کے غلط استعمال کو روکنے اور نئی نسل کو اس کی تباہ کاریوں سے بچانے کی بھرپور سعی کریں۔

فیس بک بنیادی طور پر تعارف اور دوستی کا ذریعہ ہے، اگر یہ دوستی اپنی ہی صنف کے لوگوں سے کی جائے، ان تک اچھا پیغام پہنچایا جائے اور ان کو بے راہ روی پر داعیانہ اسلوب میں متوجہ کیا جائے تو یہ ایک بہتر بات ہوگی، اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے، چاہے اس کا مقصد دعوت وتبلیغ ہو، تعلیم و تعلم ہو یا اپنے ذاتی مسائل کو حل کرنا ہو؛ لیکن کسی غیر محرم لڑکے اور لڑکی کا ایک دوسرے سے دوستی کرنا درست نہیں ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے خواتین سے گفتگو کا ادب یہ بتایا ہے کہ ضرورت پر ہی گفتگو کی جائے اور یہ بھی حجاب کے ساتھ ہو کہ یہ مرد وعورت دونوں کے لئے دل کی پاکیزگی کا باعث ہے: ﴿وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ۭ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ﴾ (الاحزاب: ۵۳) — حجاب صرف کپڑے اور دروازے ہی کی آڑ کا نام نہیں ہے؛ بلکہ ایسا رابطہ جو تکلف کو ختم کردے، جس میں ایک مرد ایک عورت سے ایسی باتیں کرسکے جو حیادار انسان تنہائی ہی میں کرسکتا ہے، جس میں گفتگو کرتے ہوئے لڑکے اور لڑکی کی صورتیں ایک دوسرے کے سامنے ہوں، یہ بھی بے حجابی میں داخل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفقاء کی ایسی تربیت فرمائی تھی کہ حج کے درمیان — جب کہ خواتین کے لئے چہرہ کھولنے کا حکم ہے — عورتیں اپنے گھونگھٹ چہرے کے سامنے ڈال لیا کرتی تھیں: ''**فإذا حاذوا بنا سدلت إحدانا جلبابنا من رأسها علی وجهها**'' (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۸۳۲) یہ بات قابل توجہ ہے کہ مرد ہوں یا عورت، جب وہ احرام باندھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے جذبہ سے معمور ہوتے ہیں اور پاکیزہ داعیہ کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں، پھر بھی انہیں اتنی احتیاط کی تعلیم دی گئی ہے؛ اس لئے ضروری ہے کہ فیس بک

کے ذریعہ دوستی کا دائرہ یا تو اپنی صنف کے لوگوں تک محدود ہو اور اگر دوسری صنف کے لوگوں سے رابطہ استوار کیا جائے تو وہ غیر محرم نہ ہوں، یہ سوچنا درست نہیں کہ صرف گفتگو اور تحریر ہی کا تو رابطہ ہوتا ہے؛ کیوں کہ فیس بک پر چارٹنگ (Charting) کے نتیجہ میں نہ صرف وقت ضائع ہوتا ہے؛ بلکہ انسان غیر شرعی عمل تک پہنچ جاتا ہے، آپس میں شادی بیاہ کی باتیں طے ہوتی ہیں، اس میں مسلم اور غیر مسلم کی تمیز بھی باقی نہیں رہتی اور فسق و فجور میں مبتلا فریق کو انسان زندگی کا رفیق بنا لیتا ہے، اس کی بہت سی مثالیں اس وقت معاشرہ میں موجود ہیں۔

معلوم ہوا کہ فیس بک پر جو تصویریں یا پیغامات (Link) بھیجے جاتے ہیں، ان پر ردعمل کے تین راستے کھلے ہوئے ہیں: ایک یہ کہ اس پر آپ اپنی پسند (Like) کا اظہار کریں، دوسرے یہ کہ آپ اس میں حصہ (Share) لیں اور اسے دوسرے لوگوں تک پہنچائیں، تیسرے یہ کہ اس پر آپ اپنا تبصرہ (Comment) درج کریں، ان تینوں ہی باتوں کا حکم اس بات سے مربوط ہے کہ جو چیز آپ کے پاس بھیجی گئی ہے، وہ کسی طرح کی ہے، اگر وہ بے حیائی پر مبنی تصویر یا ناشائستہ ویڈیو ہو تو اس پر پسندیدگی بھی حرام ہے، کیوں کہ کفر پر راضی ہونا کفر اور حرام پر راضی رہنا اور اس کو پسندیدہ قرار دینا حرام ہے، اسی طرح ایسے تصویریں یا تحریری پیغام کو دوسروں تک پہنچانا سخت گناہ ہے؛ بلکہ گناہ بے لذت ہے، یہ جس قدر در واسطہ در واسطہ پھیلتا جائے گا، جس شخص نے اس میں حصہ لیا ہے، اس پر گناہ کا بوجھ بڑھتا جائے گا، ظاہر ہے کہ یہ کوئی عقل مندی کی بات نہیں کہ آدمی بیٹھے بیٹھائے اپنے سر پر گناہ کا بوجھ رکھتا چلا جائے، قرآن مجید میں بے حیائی کی باتوں کے پھیلانے والوں کے لئے دردناک عذاب کی خبر دی گئی ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (النور:۱۹)

اسی طرح ایسے پیغام پر وہ تبصرہ جس سے اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہو، گناہ میں شرکت ہے اور برائی سے روکنے کی بجائے برائی کی دعوت دینا ہے۔

اگر اس کے برخلاف ایسے پیغام کی ترسیل ہو، جس میں دینی گفتگو ہو، انسانی فلاح کی بات ہو، معلومات میں اضافہ ہو، تعلیم و تعلم میں تعاون ہو، تو اس پر پسندیدگی کا اظہار، اس کو پھیلانے کی کوشش

اوراس پر مثبت تبصرہ ایک بہتر عمل ہوگا، جواس کے فوائد کے اعتبار سے کبھی مستحبات کے درجہ میں ہے اور کبھی جائز ومباح کے درجہ میں؛اس لئے کہ یہ نیکی کے کام میں تعاون ہےاور ایسے کاموں میں تعاون کا قرآن مجید نے حکم دیا ہے: ﴿ وَتَعَاوَنُوْا عَلَي الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ﴾ (المائدۃ:۲)

یہ بات بھی حد درجہ افسوس ناک ہے کہ اس ویب سائٹ کا استعمال فحشاء اور بے حیائی کے استعمال اور اخلاقی بگاڑ کی طرف دعوت کے لئے تو ہو ہی رہا ہے، مذہبی جذبات کو مجروح کرنے اور نادرست معلومات کو پھیلانے میں بھی ہورہا ہے، مذہب سے کروڑوں انسانوں کے جذبات وابستہ ہوتے ہیں اور چاہے کسی مذہب سے تعلق رکھنے والوں کا نظریہ درست ہو یا غلط اور حق ہو یا باطل، بہر حال اگر اس پر تنقید وتنقیص کا ہتھیار آزمایا جائے تو اس سے بے حد تکلیف پہنچتی ہے، جذبات مشتعل ہوتے ہیں اور بعض دفعہ اشتعال کی یہ آگ معاشرہ کے امن وآشتی کو جلا کر خاکستر کردیتی ہے؛اس لئے یہ ایک انسانی فریضہ بھی ہےاور مذہبی ذمہ داری بھی کہ ایسی حرکتوں سے باز رہا جائے۔

فیس بک کے صحیح اور غلط استعمال کے سلسلہ میں ایک اہم ذمہ داری حکومت کی بھی ہے کہ وہ انٹرنیٹ کی ایسی سائٹس کو اور فیس بک سے ایسے رابطے (Links) پر پابندی عائد کرے؛ کیوں کہ کسی شخص کو ایسے امور کی اجازت نہیں دی جاسکتی، جو دوسروں کے لئے نقصان دہ ہو، اسلامی قانون کے ماہرین نے لکھا ہے کہ اگر آپ کے پڑوسی کا مکان نیچا ہے، آپ اس کے مقابلہ میں اونچی عمارت بناتے ہیں اور اس سے پڑوسی کے گھر میں بے پردگی ہوتی ہے تو آپ کے لئے بے پردگی سے بچاؤ کا انتظام کئے بغیر اونچا مکان بنانا جائز نہیں ہے اور حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ آپ کو ایسے مکان کی تعمیر سے منع کردے، یہ نسبۃً تو معمولی مضرت ہے؛ لیکن انٹرنیٹ کے پروگرام سے جو نقصان پہنچتا ہے، وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے؛اس لئے حکومت کو چاہئے کہ وہ ایسے پروگراموں کی روک تھام کے لئے مؤثر کوشش کرے؛ تاکہ ہماری نئی نسل بے راہ روی میں پڑنے سے محفوظ رہے اور ملک کی اخلاقی قدریں محفوظ رہیں۔

موجودہ حالات میں جب کہ ایسے ذرائع زندگی کی ضرورت بنتے جارہے ہیں اور اسے یک قلم روک دینا ممکن نہیں، اس بات کی ضرورت ہے کہ ان ذرائع کو زیادہ سے زیادہ خیر کے کام اور نیکی کے

پیغام کے لئے استعمال کیا جائے، دینی ادارے، مذہبی تنظیمیں اور دینی وعلمی شخصیتیں اس میدان میں آگے بڑھیں، اگر کسی راستہ میں صرف کانٹے بچھانے والے موجود ہوں، پھول رکھنے والے موجود نہ ہوں تو جو لوگ اس رہ گذر سے گذرنے پر مجبور ہوں، وہ تو بہر حال گذریں گے؛ لیکن اس طرح کہ ان کے قدم لہولہان ہوں، ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اپنے سماج کو اس صورت حال سے بچائیں اور بگاڑ کے خارزار کے درمیان بہتر تعلیمات کے پھول بچھانے کی کوشش کریں!!

❁

دولت کا ارتکاز

اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کی رزق کا ذمہ لیا ہے: ﴿وَمَامِنْ دَآبَّةٍفِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَي اللهِ رِزْقُهَا﴾ (ہود: ٦) اور رزق کی کنجی اللہ نے اپنے پاس رکھی ہے: ﴿اِنَّ اللهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ (الذاریات: ۵۸) اللہ ہی رزق میں کشادگی فرماتے ہیں اور تنگی بھی، اگر ایک انسان کے ہاتھ میں دوسرے انسانوں کا رزق ہوتی تو انسان اپنے اور اپنے متعلقین کے سوا شاید سبھوں پر اس دروازہ کو بند کردیتا؛ کیوں کہ بخل اور مال کی محبت اس کی فطرت میں رچی بسی ہوئی ہے: ﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ﴾ (العادیات: ۸) اسی لئے اللہ تعالیٰ نے رزق کی کلید اپنے ہاتھ میں رکھی ہے؛ البتہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے لئے رزق کا ذریعہ بنایا ہے اور انسان کو ایسی حاجت سے دوچار کردیا ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں سے بالکل بے نیاز نہ ہوجائے۔

رزق کا ایک اہم ذریعہ تجارت ہے، ہر انسان اپنی ضرورت کی چیز خود مہیا نہیں کرسکتا، شہر میں رہنے والے لوگوں کو چاول، گیہوں، سبزی، ترکاری اور پھل کی ضرورت ہے؛ لیکن شہروں میں کاشتکاری اور باغبانی کے مواقع میسر نہیں ہوتے، دیہات کے لوگوں کو کپڑے اور صابن سے لے کر دواؤں اور گاڑی تک بے شمار مصنوعات کی ضرورت پڑتی ہے، جو شہر میں تیار ہوتی ہیں، تجارت کے ذریعہ شہر کی مصنوعات دیہات تک پہنچتی ہیں اور دیہات کی پیداوار شہر تک، اس طرح دونوں کی ضرورت پوری ہوتی ہے اور اس کے لئے تاجرین واسطہ بنتے ہیں، خود ان تاجروں کو زندگی کے لئے مطلوب وسائل ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں مناسب منافع حاصل ہوتے ہیں، اس طرح تجارت کا یہ نظام بے شمار لوگوں کے لئے رزق کا ذریعہ بنتا ہے۔

تجارت میں قیمتوں کا اتار چڑھاؤ بھی جاری رہتا ہے، اگر بازار میں طلب بڑھ جاتی ہے اور رسد اس کے مقابلہ میں کم ہوتی ہے تو قیمتیں بڑھ جاتی ہیں اور رسد زیادہ ہو اور طلب کم، تو قیمتیں کم ہوجاتی ہیں، اسی طرح قیمتوں میں اتار چڑھاؤ جاری رہتا ہے، جب دھان کی کٹائی کا موسم آئے گا تو چاول سستا ہوجائے گا اور جب اس کا موسم ختم ہوجائے گا تو قیمت بڑھ جائے گی، کم وبیش یہی صورت

حال تمام چیزوں میں ہے؛ لیکن بعض دفعہ لوگ مصنوعی طور پر قیمتوں کو گراں اور ارزاں کر دیتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سخت ناپسند فرمایا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مسلمانوں کی قیمت میں دخیل ہو اور گرانی پیدا کردے، اللہ پر حق ہے کہ قیامت کے دن اسے جہنم کے مرکزی حصہ میں عذاب دیں: ''**من دخل في سعر من سعر المسلمين يغله عليهم كان حظا على الله أن يعذبه في معظم النار يوم القيامة**'' (جمع الفوائد عن ابی ہریرۃ ومعقل بن یسار: ۶۶۹/۳، حدیث نمبر: ۴۳۷۸)۔

جب رسول اللہ ﷺ دنیا میں تشریف لائے تو مصنوعی طور پر قیمت گھٹانے اور بڑھانے کی مختلف صورتیں مروج تھیں، اس کی ایک صورت ذخیرہ اندوزی کی تھی، یعنی کچھ تجار مال روک لیتے تھے اور مارکٹ میں سامان آنے سے روک دیتے تھے؛ تاکہ مصنوعی قلت پیدا ہوجائے، اس طرح سامان گراں ہوجاتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سخت ناپسند فرمایا ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ بدترین شخص وہ ہے جو ذخیرہ اندوزی کرنے والا ہو، اگر اللہ تعالیٰ قیمتیں کم کردے تو اسے رنج ہو اور قیمت بڑھ جائے تو اسے خوشی ہو۔ (مجمع الزوائد: ۱۰۱/۴، بحوالہ طبرانی کبیر)

ایک موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذخیرہ اندوزی کرنے والے کے بارے میں فرمایا: وہ اللہ سے بَری ہے اور اللہ اس سے بَری ہیں: ''**بریٔ من الله و بریٔ الله منه**'' (مسند احمد عن معاذ بن جبل: ۳۳/۲)، کھانے پینے کی چیزوں میں خاص طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذخیرہ اندوزی اور گراں فروشی کو ناپسند فرمایا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خوراک کی چیزوں میں ذخیرہ اندوزی نہ کرو اور قیمتیں بڑھاؤ نہیں، جس نے چالیس دنوں ذخیرہ اندوزی کی، پھر اس سامان کو صدقہ کردیا تب بھی وہ اس کے لئے کفارہ نہیں بن سکے گا۔

مصنوعی طور پر چیزوں کو مہنگا کرنے اور قیمتوں میں دخیل ہونے کی جو صورتیں اس زمانہ میں مروج تھیں، اس میں ایک صورت ''تلقی جلب'' کہلاتی تھی، یعنی تجارتی قافلے مال تجارت لے کر نکلتے تھے، وہ مختلف شہروں اور علاقوں میں مال اتارتے اور بیچتے جاتے تھے، مقامی لوگوں کو نسبتاً سستی قیمت پر ان سے چیزیں مل جاتی تھیں، بعض اوقات کچھ بڑے تاجر اور سرمایہ دار آگے بڑھ کر قافلہ والوں سے

سارا مال خرید کر لیتے تھے، اور پھر اسے گراں قیمت میں مقامی لوگوں سے فروخت کر دیتے تھے، اگر یہ حضرات اس سے نہ خریدے ہوتے اور قافلہ نے براہ راست سامان بیچا ہوتا تو یقیناً انہیں یہی چیز سستے داموں حاصل ہوجاتی؛ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کو منع فرمایا: **''لا تلقوا الرکبان بالبیع''** (جمع الفوائد: ۳؍ ۵۶۳، حدیث نمبر: ۶۸۷۳، بحوالہ صحاح ستہ عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)۔

مصنوعی طور پر قیمت بڑھانے کی ایک صورت وہ ہے جسے ''بیع حاضر للبادی'' سے تعبیر کیا گیا ہے، 'حاضر' سے مراد ہے شہر کا آدمی اور 'بادی' سے مراد ہے دیہات میں رہنے والا شخص، دیہات کے لوگ اپنی پیداوار فروخت کرنے کے لئے شہر میں آتے تھے؛ چوں کہ ایک ساتھ زیادہ مال آجاتا تھا اور شہر کی قیمت سے بھی وہ واقف نہیں ہوتے تھے؛ اس لئے شہر کے بعض چالاک تاجر اُن کو اکساتے تھے کہ اگر وہ خود بیچیں گے تو سستا بیچیں گے؛ اس لئے خود بیچنے کی بجائے ان کے حوالہ کر دیں، وہ ان کا مال زیادہ قیمت میں بیچ دیں گے، اس طرح شہر کے لوگوں کو دیہات کی پیداوار ارزاں قیمت پر حاصل نہیں ہو پاتی تھی اور مصنوعی طور پر گرانی پیدا کر دی جاتی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا: **''ولا بیع حاضر لباد''** (حوالہ سابق)۔

مصنوعی طور پر قیمت بڑھانے اور گھٹانے کی ایک شکل وہ تھی، جسے حدیث میں ''تناجش'' کہا گیا ہے، زیادہ تر اس کی نوبت نیلام میں آتی تھی، قیمت بڑھانے کے لئے ایسا کیا جاتا تھا کہ کچھ لوگوں کا لینے کا ارادہ نہیں ہوتا تھا؛ لیکن وہ بڑھ کر بولی لگاتے تھے؛ تاکہ سامان گراں ہوجائے، بعض دفعہ قیمت کم رکھنے کے لئے پہلے سے طے کر کے آتے تھے اور لینے کا ارادہ نہیں ہوتا تھا؛ لیکن کم قیمت کی بولی لگاتے تھے، اس طرح مصنوعی طور پر قیمتیں بڑھائی اور گھٹائی جاتی تھیں، غیر فطری طور پر کسی فریق کو فائدہ پہنچایا جاتا تھا اور کوئی نقصان سے دوچار ہوتا تھا، اس کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے: **''ولا تناجشوا''** (حوالہ سابق)۔

غرض کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ قیمتیں فطری اتار چڑھاؤ کے مطابق رہیں؛ اسی لئے بعض اوقات صحابہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ گراں فروشی کو روکنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم چیزوں کا نرخ متعین کر دیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پسند نہیں فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیمت کم وبیش کرنے والی اصل ذات اللہ تعالیٰ کی ہے، اللہ ہی قیمت

بڑھاتے ہیں اور اللہ ہی قیمت گھٹاتے ہیں، میں اس حال میں اللہ کی ملاقات چاہتا ہوں کہ میرے اوپر کسی کی طرف سے ظلم کا دعوی نہ ہو: ''إن اللہ ھو المسعّر القابض الباسط الرزاق الخ'' (ابوداؤد، البیوع، حدیث نمبر: ۳۴۵۲) — یقیناً یہ ایک منصفانہ نظام اور عادلانہ طریقہ کار ہے اور اس میں سماج کی بھلائی اور عام شہریوں کا فائدہ ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا مزاج یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ سرمایہ چند سرمایہ کاروں کی مٹھی میں آجائے، چاہے اس کے لئے عوام کو کتنی ہی تکلیف اٹھانی پڑے اور چاہے لوگ لقمہ لقمہ کو ترسنے پر مجبور ہو جائیں، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ بعض مغربی ممالک میں زرعی پیداوار اور مویشی سے حاصل ہونے والی چیزیں کثیر مقدار میں سمندر کی نذر کر دی جاتی ہیں؛ کہ اگر یہ چیزیں عالمی مارکٹ میں پہنچ گئیں تو قیمتیں کم ہو جائیں گی، دوسری طرف افریقہ میں کئی ممالک وہ ہیں، جہاں فاقہ کشی کے نتیجہ میں جانیں جارہی ہیں اور بے شمار لوگ ایک زندہ ڈھانچے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

ہمارے ملک ہندوستان میں بھی روس کے زوال کے بعد سے سرمایہ دارنہ نظام کا بول بالا ہے، مغربی کمپنیوں کو تجارت اور صنعت کے مختلف شعبوں میں سرمایہ کاری کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے؛ بلکہ غیر معمولی رعایت اور چھوٹ سے بھی نوازا گیا ہے، یہ کمپنیاں جب میدان عمل میں اترتی ہیں تو اپنے بے پناہ سرمایہ کے بل پر نقصان اٹھا کر سامان کو سستا کر دیتی ہیں، اس کے نتیجے میں مقامی کمپنیاں بند ہو جاتی ہیں؛ کیوں کہ وہ اتنا نقصان اٹھانے کی متحمل نہیں ہوتیں، پھر جب پوری طرح معاملہ ان کے قابو میں آجاتا ہے تو اب اِن اشیاء کی قیمتیں بڑھا دیتی ہیں اور گرانی بڑھتی چلی جاتی ہے، اس طرح عوام اپنی جیب کا ایک ایک پیسہ نکال دینے پر مجبور ہوتے ہیں اور سرمایہ داروں کی جیبیں بھرتی چلی جاتی ہیں، اب بہت کم شعبے ایسے رہ گئے ہیں، جن میں بیرونی سرمایہ کاروں کا راج قائم نہ ہو، ان ہی شعبوں میں ایک خوردہ فروشی ہے، پھٹکر اور چلّر سامان کی خرید و فروخت سماج کے غریب طبقہ کے ہاتھ میں ہے، یہ چھوٹی موٹی دکانیں لگا کر اپنی اور اپنے خاندان کی ضرورتیں پوری کرتا ہے، ہماری موجودہ حکومت کو اپنی عوام سے زیادہ سرمایہ داروں سے محبت ہے؛ اس لئے انہوں نے ایک نیا شوشہ چھوڑا ہے کہ اس شعبہ میں بھی پچاس فیصد غیر ملکی سرمایہ کاری کی گنجائش فراہم کی جائے، جو ایف ڈی آئی (فارن ڈائرکٹ اینویسٹمنٹ) کے عنوان سے جانا جاتا ہے، عوام کی مخالفت اور اپوزیشن کے اصرار پر فی الحال

حکومت نے اس بل کو مؤخر کر دیا ہے، اگر اس شعبہ میں بھی بیرونی کمپنیاں تجارتی کمپنیاں آجائیں تو یہاں ترکاری کی دکانیں، پھلوں کی منڈیاں اور اس طرح کی روزمرہ استعمالی اشیاء کے چھوٹے چھوٹے کاروبار بھی غریبوں کے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔

اسلام میں تجارت کا بنیادی تصور یہ ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹنے نہ پائے، مصنوعی طور پر گرانی بڑھائی نہ جائے؛ بلکہ اتنی ارزانی بھی پیدا نہ کی جائے کہ لوگوں کے لئے پیداوار کو بازار تک لانا دشوار ہوجائے اور وہ نقصان اٹھائے، اسلام جس عادلانہ نظام معیشت کا داعی ہے، اس کے لازمی تقاضوں میں سے یہ بھی ہے کہ معیشت کے وسائل میں زیادہ سے زیادہ پھیلاؤ ہو اور زیادہ سے زیادہ لوگ کاروبار سے جڑ سکیں، اس وقت سرمایہ دارانہ نظام بالکل اس کے مخالف سمت میں جارہا ہے، جو دولت کے ارتکاز، خودغرضی اور دوسروں کو پہنچنے والے ضرر سے بے اعتنائی اور اخلاقی قدروں کی پامالی پر مبنی ہے، سماج کی اجتماعی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے روکنے کی کوشش کرتے رہیں، ایسا نہ ہو کہ سرمایہ داروں کا یہ استحصال اسی طرح کے ردِعمل کو جنم دے، جو کارل مارکس کے ذریعہ سامنے آیا تھا، اور جس نے دنیا کے ایک بڑے حصہ کو کمیونزم کے جبر واستبداد کا شکار بنادیا تھا۔

❁

سونے کے ذریعہ لین دین

انسان کو دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے بنیادی طور پر پانچ چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے، ایک: خوراک، جس پر زندگی کا مدار ہے، دوسرے: پوشاک، جو تن ڈھکنے اور موسمی اثرات سے بچنے کے لئے ناگزیر ہے، تیسرے: علاج؛ کیوں کہ صحت اور بیماری کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یقیناً یہ بنیادی ضرورتوں میں شامل ہے، چوتھے: سر چھپانے کی جگہ، جس میں انسان راحت وسکون کی سانس لے سکے اور لوگوں کی نگاہ سے بچ کر زندگی گزار سکے، پانچویں: ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے سواری؛ کیوں کہ کسی بھی انسان کی ساری ضرورتیں ایک ہی جگہ سے پوری نہیں ہوسکتیں، وہ اپنی مختلف ضرورتوں کو پوری کرنے کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنے کے لئے مجبور ہے۔

ان ضروریات کو براہ راست پوری کرنے کے لئے جو وسائل مطلوب ہیں، اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ان کی وافر مقدار مہیا رکھی ہے، غذا کی ضرورت اناج، گوشت، تیل، ترکاری اور پانی وغیرہ سے پوری ہوتی ہے، جسم کو چھپانے کے لئے مختلف نوع کے کپڑے موجود ہیں، جن میں انسان کی سہولت اور موسم کا بھی لحاظ ہے، علاج کے لئے دوائیں ہیں، جو نباتات، جمادات اور حیوانات سے حاصل کی جاتی ہیں اور مختلف شکلوں میں بنائی جاتی ہیں، مکان کی تعمیر کے لئے مٹی، پتھر، لوہا، لکڑی، ریتی، اور ان سے تیار کی ہوئی مصنوعی اشیاء ہیں، سواری کا استعمال تو انسان اول دن سے کرتا آرہا ہے؛ بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام نے بھی بیل کی سواری کی ہے، چند سو سال پہلے تک انسان کے پاس دو ہی سواریاں تھیں، خشکی کے سفر کے لئے چوپائے، اور دریا کے سفر کے لئے کشتیاں، صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ زندگی کے اس شعبہ میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں، اب انسان نے فضاء کو مسخر کرلیا ہے، سمندر کی تہہ تک اس کے قدم پہنچ چکے ہیں اور خشکی کے لئے بھی ایک سے ایک سواریاں مہیا ہوچکی ہیں۔

کائنات میں ان تمام وسائل کے فراہم ہونے کے باوجود شاذ و نادر ہی ایسی مثال مل سکے گی کہ ایک شخص کے پاس بیک وقت یہ تمام وسائل مہیا ہوں، کوئی کاشتکار ہے، اس کے پاس اناج کا انبار

ہے؛ لیکن کپڑے نہیں ہیں، اسے کپڑا کہیں اور سے خرید کرنا پڑے گا، ہوسکتا ہے کہ کسی کے پاس کپڑے کی فیکٹری یا اس کی دوکان ہو؛ لیکن اگر اسے اپنا گھر تعمیر کرنا ہے تو اس کے لئے مطلوب مٹیریل یقیناً کسی دوسری دوکان سے حاصل کرنا ہوگا، اس لئے انسان اس بات پر مجبور ہے کہ جو مطلوبہ سامان اس کے پاس مہیا نہیں ہے، وہ اس کو حاصل کرنے کے لئے دوسروں سے رُجوع کرے۔

چنانچہ قدیم زمانہ میں اس کے لئے اشیاء کے تبادلہ کا طریقہ مروج تھا، قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں اس کا اشارہ موجود ہے کہ برادرانِ یوسف کنعان سے کچھ سامان لے کر گئے اور اس کے بدلہ میں خزانۂ مصر سے انھیں غذائی اشیاء دی گئیں، اس زمانہ میں اسی طرح کاروبار ہوتا تھا، مثلاً کسی شخص کے پاس گیہوں ہے تو وہ گیہوں سے بدل کر گوشت، کپڑے وغیرہ حاصل کرتا تھا؛ لیکن اس میں دو دشواریاں تھیں، ایک دشواری یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو گیہوں کے بدلہ کپڑا خرید کرنا ہے تو ضروری نہیں کہ جیسے اسے کپڑوں کی ضرورت ہے، اسی طرح کپڑے والوں کو گیہوں کی ضرورت ہو، یا اگر کپڑے والوں کو دوا کی حاجت ہے تو ضروری نہیں کہ دوا بیچنے والا بھی کپڑے کا ضرورت مند ہو، دوسری دشواری یہ ہے کہ اشیاء اور سامان کے باہمی تبادلہ میں بار برداری کی غیر معمولی مشقت ہے، اگر سیمنٹ کے مالک کو دوا خرید کرنی ہو تو اسے سیمنٹ کے کئی تھیلی لے کر دوا بیچنے والے کے یہاں پہنچنا ہوگا اور اگر کسان کو غلہ کے بدلہ کپڑا خریدنا ہو تو اسے گیہوں یا دھان کا اچھا خاصا بوجھ اُٹھا کر کپڑے کی دوکان تک جانا ہوگا، اس میں جو مشقت اور دشواری ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔

اس لئے تمدن کی ترقی کے ساتھ انسان نے کچھ ایسی چیزوں کو ذریعۂ تبادلہ بنایا، جن سے ہر طرح کی ضرورت حاصل کی جاسکتی ہو، جن کا وزن کم ہو اور جن کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی آسان ہو، ایسی ہی چیز کو کرنسی اُردو میں زر اور شرعی اصطلاح میں ''ثمن'' کہتے ہیں، شروع میں کوڑیاں جو عام طور پر سمندر اور دریا کے کنارے ملتی ہیں، کو ذریعۂ تبادلہ بنایا گیا، پھر لوہے اور تانبے کے سکے ڈھالے جانے لگے، پھر ایک مدت کے تجربے کے بعد سونے اور چاندی کو ذریعۂ تبادلہ تسلیم کرلیا گیا، اس کے متعدد اسباب ہوسکتے ہیں، ایک یہ کہ سونا اور چاندی زنگ آلود نہیں ہوتا اور پہلے زمانہ میں دولت کی حفاظت کیلئے سکوں کو زمین میں دفن کردیا جاتا تھا، اس صورت میں دوسری دھاتیں زنگ آلود ہوجاتی رہی ہوں گی، دوسرے: یہ ایسی دھاتیں ہیں جو ہر زمانہ میں انسان کی نظر میں قابل قدر اور وقیع سمجھی گئی ہیں اور بمقابلہ دوسری دھاتوں

کہ ان کی قیمت میں زیادہ استحکام ہوا کرتا تھا، قرآن مجید سے بھی ہمیں یہ اشارہ ملتا ہے کہ طویل زمانہ سے سونے اور چاندی کا بطور ذریعہ تبادلہ استعمال ہوتا رہا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ میں یہ موجود ہے کہ ایک باپ نے اپنے بچہ کیلئے دیوار کی جڑوں میں اپنی دولت محفوظ کردی تھی؛ تاکہ یتیمی کا داغ لگنے کے بعد مستقبل میں اس کے کام آئے، یہ دیوار گرنے کے قریب تھی کہ حضرت خضر نے اس کو درست کردیا، اسی طرح اصحابِ کہف کے واقعہ میں بھی ہمیں یہ بات ملتی ہے کہ ان کے پاس سکے موجود تھے، جب وہ تین سو سال سے زیادہ عرصے پر محیط اپنی نیند سے بیدار ہوئے تو وہ یہی سکے لے کر بازار گئے اور اسی سے ان کی نینداور اس سے بیداری کا راز کھلا۔

رسول اللہ ﷺ جب اس دنیا میں تشریف لائے تو جزیرۃ العرب کے مشرق ومغرب دونوں طرف دو بڑی حکومتیں قائم تھیں، جو فوجی طاقت اور دولت دونوں پہلوؤں سے اس زمانہ کی سپر طاقتیں تھیں، ایک: روم، دوسرے: ایران، روم میں سونے کا سکہ چلتا تھا، جسے 'دینار' کہا جاتا تھا، اور ایران میں چاندی کا سکہ مروج تھا، جسے 'درہم' کہا جاتا تھا، عربوں کی اپنی کوئی الگ کرنسی نہیں تھی؛ بلکہ یہی دونوں سکے یہاں بھی چلتے تھے، دینار قیمتی تھا اور درہم اس کے مقابلہ میں سستا، دونوں کے درمیان ایک اور دس کا فرق تھا، اسلام نے بھی سونے اور چاندی کے سکوں کو تسلیم کیا، اسی لئے قرآن مجید نے خاص طور پر سونے اور چاندی کو روک رکھنے اور اس کے جمع کئے رہنے کو پسند نہیں کیا، (توبہ: ۳۴) اور غالباً اسی لئے تمام دھاتوں میں سے سونے اور چاندی میں زکوٰۃ واجب قرار دی گئی؛ اگرچہ کہ اس کا مالک تجارت نہ کرتا ہو؛ کیوں کہ جو چیز کرنسی کا درجہ رکھتی ہو، اس کو گردش میں رہنا چاہئے؛ اگر اس کو روک رکھا جائے تو سماج کی معاشی ترقی رُک جائے گی اور نہ صرف یہ کہ وہ شخص خود اس کے فوائد سے محروم رہے گا؛ بلکہ یہ پورے معاشرے کے لئے محرومی کی بات ہوگی۔

چنانچہ شریعت نے تقریباً تمام ہی مالی واجبات کے لئے سونے اور چاندی کے سکے کو معیار بنایا ہے، سونے اور چاندی میں نہ صرف زکوٰۃ واجب قرار دی گئی؛ بلکہ مالِ تجارت کے لئے بھی سونے اور چاندی ہی کا نصاب معیار قرار پایا، بعد کے ادوار میں جب بعض اور دھاتوں کے سکے بنائے گئے تو فقہاء نے اس کے لئے بھی درہم ودینار ہی کے سکوں کو معیار قرار دیا، مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم یا بعض روایتوں کے مطابق پاؤ دینار واجب قرار دی گئی، غیر مسلموں سے چوں کہ زکوٰۃ نہیں لی جاسکتی

تھی ؛ کیوں کہ یہ ان کو ایک اسلامی عبادت پر مجبور کرنا ہوتا، جو اسلام میں اقلیتوں کو دی گئی مذہبی آزادی کے مغائر ہوتا، اس لئے ان پر جزیہ عائد کیا گیا اور وہ بھی درہم و دینار کی شکل میں، جتنے مالی واجبات ہیں، ان میں سب سے گرانقدر دیت ہے، دیت کے لئے اصل معیار تو اونٹنیوں کو بنایا گیا؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ درہم و دینار کو بھی شامل رکھا گیا، اسی لئے علماءِ اسلام کا یہ نقطۂ نظر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سونے اور چاندی کی تخلیق ہی اس لئے فرمائی ہے کہ وہ انسان کے لئے اموال کے تبادلہ کا ذریعہ بنے اور کرنسی کے طور پر اس کا استعمال ہوا کرے۔

مختلف مرحلوں سے گزرتے ہوئے گذشتہ صدی میں کاغذی نوٹوں کا رواج ہوا، جن کی حیثیت وثیقہ کی ہوتی تھی، یعنی نوٹ کے ذریعہ سونے، چاندی کی ایک خاص مقدار کی ذمہ داری قبول کی جاتی تھی اور ہر ملک کا بینک اس کا ذمہ دار ہوتا تھا، پھر مختلف ملکوں کی کرنسیاں امریکی ڈالر سے مربوط کردی گئیں اور امریکہ نے اس کے متبادل سونے کی ذمہ داری قبول کی، اسی پس منظر میں ماضی قریب کے فقہاء اور اربابِ افتاء نے نوٹ کو وثیقۂ ثمن قرار دیا تھا، یعنی یہ خود زر نہیں ہے، زر کی دستاویز ہے، مگر اہل مغرب کے شاطر دماغ کو اس پر بھی چین نہ ملا اور انھوں نے دنیا کے دولت کے خزانہ پر کوئی بدل ادا کئے بغیر قابض ہونے کے لئے اعلان کردیا کہ اب سونا دینے کی کوئی ذمہ داری نہیں، امریکہ صرف ڈالر ہی دے سکتا ہے، یہ غالباً سب سے بڑا ظلم تھا، جو معاشی دنیا میں ڈھایا گیا اور نوٹ کی حیثیت محض کاغذ کے ٹکڑے کی ہوگئی، اسی کے نتیجہ میں افراط زر کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا، دنیا کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اسی نوٹ کو کرنسی تسلیم کرلے، اسی لئے ہمارے فقہاء اور اربابِ افتاء بھی اس بات پر مجبور ہوئے کہ وہ ثمن (کرنسی) کی دو قسمیں کریں، ایک: خلقی وفطری ثمن، جس کو اللہ تعالیٰ نے زر بنانے ہی کے لئے پیدا فرمایا ہے اور وہ ہے سونا چاندی، دوسرے: زر اصطلاحی، جو حقیقت میں زر نہیں؛ لیکن لوگوں کے مان لینے کی وجہ سے اس کو زر تسلیم کرلیا گیا ہے، یہ ہے کاغذی نوٹ، اسی لئے اس کی ادائیگی کو زکوۃ کی ادائیگی کے لئے کافی قرار دیا گیا اور تمام معاملات میں بطور معاوضہ اس کے استعمال ہونے کو قبول کرلیا گیا، اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کاغذی کرنسی معتبر نہیں ہے، یا ثمن نہ ہونے کی وجہ سے مثلاً ایک روپیہ کا تبادلہ دو روپیہ سے جائز ہے؛ کیوں کہ موجودہ حالات میں اس کے ثمن ہونے کا انکار دشوار بھی ہے اور سونے چاندی کی کرنسی کو بہ حالت موجودہ رواج دینا ممکن نہیں۔

البتہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کاغذی کرنسی کا یہ نظام معاشی اعتبار سے بھی اور شرعی نقطۂ نظر سے بھی بہت سے مفاسد کو شامل ہے، یہ ایک ایسا وثیقہ ہے جس کے پیچھے کوئی مال نہیں ہے، جب ہم روپیہ کے ذریعہ کوئی چیز خریدتے ہیں تو گویا ہم فروخت کرنے والے کے ہاتھ ایک ایسی چیز کو بیچ رہے ہیں، جس کا کوئی وجود نہیں ہے، اس کرنسی کی جڑوں میں سود پیوست ہے، جب کسی ملک کو زائد کرنسی کی ضرورت ہوتی ہے تو نوٹ جاری کرنے والا بینک اس شرط کے ساتھ نوٹ جاری کرتا ہے کہ حکومت اس کا سود ادا کرے گی، قرآن مجید نے کم تولنے اور کم ناپنے کو منع کیا ہے، جس کو ''تطفیف'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے، (مطففین :۱) نوٹ کی کیفیت یہی ہے، حکومت خود اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ ایک روپیہ کی قیمت اب اپنی حقیقی صلاحیت کے اعتبار سے دس پیسے بھی نہیں رہ گئی ہے، اس طرح مثلاً آپ کی مزدوری گو ایک روپیہ تھی؛ لیکن جب یہ رقم آپ کو ملتی ہے تو اس کی قیمت دس پیسے ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ ناپ تول کی کمی ہے، آپ جو رقم کسی خیر کے کام میں یا عبادت کے طور پر دیتے ہیں، اس کی قدر آپ سے آپ گھٹ جاتی ہے، اگر آپ نے آج ایک لاکھ روپیہ کسی کارخیر میں دیا اور وہ رقم کسی وجہ سے ایک سال کے بعد خرچ کرنے کی نوبت آئی تو قوت خرید کے اعتبار سے اس وقت وہ رقم نوے ہزار تک گر چکی ہوتی ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ کاغذی کرنسی کے اس نظام کی وجہ سے سود کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، لوگ ایک دوسرے کو بڑی رقمیں قرض حسنہ کے طور پر اس لئے نہیں دیتے ہیں کہ مثلاً اگر تین سال میں یہ رقم واپس ہو تو کم سے کم تیس فیصد اس کی قدر گھٹ چکی ہوگی، آج جو اشیاء ضرورت نوے ہزار میں حاصل کی جاسکتی ہیں، وہی اس وقت ایک لاکھ روپیہ میں حاصل ہوں گی، افراط زر ایسا دیمک ہے جو اس کے دیئے ہوئے قرض کو چاٹتا چلا جائے گا اور اپنے آپ اس کی قدر گھٹتی چلی جائے گی، اس لئے وہ سودی بینکوں میں اپنی رقموں کے رکھوانے کو ترجیح دیتے ہیں کہ روپیہ کی قدر میں کمی ہوگی تو سود کے ذریعہ کچھ نہ کچھ اس کی تلافی ہوجائے گی، اسی لئے آج دنیا کی جو بڑی طاقتیں سودی نظام کو مسلط کئے ہوئی ہیں، ان کو ہرگز یہ بات گوارہ نہیں ہے کہ فطری کرنسی دنیا میں بحال ہو، کرنل معمر قذافی نے جب اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ ڈالر کے بجائے سونے کے بدلہ پٹرول فروخت کریں گے تو ان کا جو حشر کیا گیا، وہ سب کو معلوم ہے، ڈاکٹر مہاتر محمد سابق وزیر اعظم ملیشیا نے جب تجویز پیش کی کہ اسلامی ممالک

آپس میں سونے کو ذریعہ تبادلہ بنائیں تو بالآخر انھیں بھی اپنے اس ملک کی قیادت سے سبکدوش ہونا پڑا، جسے انھوں نے خون پسینہ سے سینچ کر ترقی کے بامِ عروج پر پہنچایا تھا؛ اس لئے بحالت موجودہ یہ بات ممکن نظر نہیں آتی کہ دنیا کی بڑی طاقتوں کی تائید کے بغیر اس نظام میں کوئی بڑی تبدیلی آسکے؛ لیکن موجودہ حالات میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

مختلف مواقع ہیں، جن میں مسلمان اپنے طور پر سونے کو ذریعہ تبادلہ کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں اور اس طرح ہم عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے اور سودی لین دین کو کم کرنے میں ممد و معاون ہو سکتے ہیں، وہ مواقع یہ ہیں:

(۱) **مہر:** اگر مہر اُدھار ہو تو روپے کے بجائے سونے یا چاندی میں مہر مقرر کرنا چاہئے، حقیقت یہ ہے کہ روپیہ میں مہر مقرر کرنے سے عورت کے ساتھ غیر معمولی ناانصافی ہوتی ہے، مثلاً بیس سال پہلے کسی خاتون کا مہر پانچ ہزار روپیہ طے ہوا ہو تو اس وقت پانچ ہزار روپیہ میں پچاس گرام سونا لیا جا سکتا تھا، اب اگر آج پانچ ہزار روپیہ ادا کیا جائے تو اس میں غالباً دو گرام سونا بھی نہیں ملے گا، سونے اور چاندی سے مہر مقرر کرنا سنت کے عین مطابق ہے؛ کیوں کہ نبوت کے بعد رسول اللہ ﷺ کے جو نکاح ہوئے، ان میں ایک اُم المومنین کا مہر سونے میں مقرر ہوا اور بقیہ تمام اُمہات المومنین اور بنات طاہرات کا مہر چاندی میں، حضرت فاطمہ کا مہر پانچ سو درہم تھا، جو ڈیڑھ کیلو سے زیادہ چاندی ہوتی ہے اور آج بھی اس کی قیمت تقریباً سوا لاکھ روپے ہے۔

(۲) **قرض:** طویل مدتی قرض اگر روپیہ میں دیا جائے تو قرض دینے والے کو واقعی نقصان ہوتا ہے؛ کیوں کہ جب اس کا قرض وصول ہوتا ہے تو اس کی قوت خرید خاصی کم ہو جاتی ہے، اسی لئے لوگ قرض دینے کو آمادہ نہیں ہوتے، اگر قرض سونے کی شکل میں دیا جائے تو اس کی قیمت میں استحکام رہتا ہے اور اس کی قوت خرید بڑی حد تک محفوظ رہتی ہے، اس لئے قرض دینے والوں کو قرض دینے میں تامل نہیں ہوگا اور قرض لینے والے کو آسانی سے قرض حاصل ہو جائے گا، اس طرح لوگ سودی لین دین کی لعنت سے بچ سکیں گے۔

(۳) **اُدھار قیمت:** یعنی اگر کسی چیز کی قیمت اُدھار رکھی گئی ہو اور ایک مدت کے بعد اس کی ادائیگی طے پائی ہو تو روپیہ کی شکل میں قیمت طے پانے سے ایک نقصان تو وہی ہوتا ہے کہ بیچنے والا

قوت خرید کے اعتبار سے نقصان اُٹھاتا ہے اور اگر خریدار نے ٹال مٹول سے کام لیا تو اس کے لئے مصیبت بالائے مصیبت ہوجاتی ہے، ایسی صورتوں میں اگر سونے میں قیمت متعین کی جائے تو اُدھار بیچنے والا بڑی حد تک نقصان سے محفوظ رہے گا اور قیمت ادا کرنے والا بھی جلد قیمت ادا کرنے کی کوشش کرے گا۔

(۴) **بچت:** عام طور پر لوگ اپنی بچت کو روپیہ کی شکل میں رکھتے ہیں، خواہ اپنے پاس رکھیں یا بینک میں، ہر صورت میں یہ پیسہ بظاہر محفوظ ہے؛ لیکن نتیجہ کے اعتبار سے مسلسل کم ہوتا جارہا ہے؛ کیوں کہ اس کی قوت خرید گھٹ رہی ہے، اگر لوگ اپنی بچت کو سونے یا زمین کی شکل میں محفوظ کریں تو اس کی قدر بھی محفوظ رہے گی اور بیچتے ہوئے جو نفع حاصل ہوگا، وہ حلال نفع ہوگا، بخلاف مروجہ بینکوں میں رقم محفوظ کرنے کے، کہ اس میں اتنا سود نہیں ملتا جو قوت خرید کی کمی کی تلافی کردے اور اس سے بڑے نقصان کی بات یہ ہے کہ وہ حرام ہے اور کسی مسلمان کے لئے اس سے بڑا نقصان کیا ہوسکتا ہے۔

(۵) **زکوۃ وعبادات:** زکوۃ وعبادات میں اگر روپیہ کے بجائے مستحقین کو سونا اور چاندی دیا جائے تو مستحقین کے لئے زیادہ منفعت بخش بات ہوگی اور اگر وہ کچھ دنوں رُک کر اس کو استعمال کریں گے تو ان کو نقصان نہیں ہوگا، یہودیوں نے ہی اصل میں کاغذی کرنسی کو اصل کرنسی کی حیثیت سے جاری کیا ہے، مگر عجیب بات ہے کہ ان کے مذہبی واجبات سونے چاندی کی شکل میں ادا کئے جاتے ہیں۔

غرض کہ جن معاملات میں حقیقی زر یعنی سونے اور چاندی کا استعمال ممکن ہو اور قانوناً اس میں کوئی رکاوٹ نہ ہو تو ان میں سونے اور چاندی کو ذریعہ تبادلہ بنانا چاہئے، اس طرح غیر سودی قرض کا لین دین آسان ہوگا اور ہماری دولت سود کی تقویت کے لئے استعمال نہیں ہوگی —— ان سطور کے لکھتے ہوئے یہ بات ذہن میں آئی کہ کاغذی کرنسی کی بے ثباتی کا یہ حال ہے کہ دس سال میں اس کی قیمت کہیں سے کہیں گر جاتی ہے؛ لیکن سونے کی قیمت کے استحکام کا یہ حال ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک دینار میں دو بکریاں لی گئیں اور آج بھی ایک دینار میں دو بکریاں بسہولت لی جاسکتی ہیں، خدا کرے یہ تجویز علماء، مسلمان ماہرین معاشیات اور تاجرین کے لئے قابل توجہ ثابت ہو۔

بیماروں کو مسیحا کی ضرورت

(علاج کیلئے تعاون پر مبنی انشورنس)

اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت کا دو مختلف نظام رکھا ہے، دنیا میں ہر چیز نقص کے ساتھ پیدا کی گئی ہے اور آخرت میں ہر شئی درجہ کمال پر ہوگی، یہ معاملہ دوسری اشیاء کے علاوہ خود انسان کے وجود کے ساتھ بھی ہے، دنیا میں ہر انسان پر موت آتی ہے، آخرت میں خود موت کو موت آچکی ہوگی، جن خوش نصیبوں کو جنت حاصل ہوگی، وہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور جن بد نصیبوں کے لئے جہنم کا فیصلہ ہوگا وہ ہمیشہ کے لئے یا اپنے اعمال کے لحاظ سے مقررہ مدت تک دوزخ کی سزا پائیں گے؛ لیکن بہر حال کسی پر موت نہیں آئے گی، کوئی انسان کتنا بھی صحت منداور طاقتور ہو؛ لیکن دنیا میں وہ ضرور چھوٹی بڑی بیماری سے دوچار ہوتا ہے، بیماری بھی ایسی جفا شعار چیز ہے کہ نہ وہ طاقتور کو خاطر میں لاتی ہے نہ کمزور پر رحم کھاتی ہے، نہ اسے حکمرانوں کا خوف نہ اس کے نزدیک رعایا کی رعایت، نہ گنہگاروں سے ڈرتی ہے اور نہ نیکوکاروں کا پاس ولحاظ رکھتی ہے، یہاں تک کہ انبیاء کرام بھی بیماری سے دوچار ہوتے رہے ہیں، حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری کا اشارہ خود قرآن مجید میں موجود ہے اور رسول اللہ ﷺ کی علالت؛ نیز آپ کے مرض وفات کا ذکر کتب احادیث میں مذکور ہے، آخرت میں انسان بیماری سے دوچار نہیں ہوگا، جسمانی تکان کی وجہ سے انسان کو نیند آتی ہے، یہ بھی جسمانی نقص کی ایک علامت ہے، جنت کے باسیوں کو نہ نیند آئے گی، نہ تکان ہوگی۔

جیسے دنیا میں انسان کے لئے ایک اہم ضرورت غذا ہے، اسی درجہ؛ بلکہ ایک حد تک اس سے بڑھ کر انسان کی ضرورت علاج بھی ہے، اسی لئے شریعت میں جیسے غذا کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، علاج کو بھی بڑی اہمیت دی گئی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی بیماری نہیں اتاری، جس سے شفا کے اسباب پیدا نہیں کئے، ''ما أنزل اللہ داء إلا أنزل اللہ شفاء'' (بخاری: باب ما أنزل اللہ داء، حدیث نمبر: ۵۶۷۸) آپ ﷺ نے علاج کرانے کی ترغیب دی، ارشاد فرمایا کہ: ہر بیماری کی دوا ہے؛ لہٰذا علاج کرایا کرو......

''وجعل لکل داء دواء فتداووا'' (ابوداؤد: باب فی الأدویة المکروھة، حدیث نمبر: ۳۸۷۴) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ صرف بوڑھاپا ایسی بیماری ہے کہ جس کا علاج نہیں (مستدرک حاکم: حدیث نمبر: ۷۴۲۴) بعض صحابہ رضی اللہ عنہم بیمار پڑے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے معالج کے بلانے کا اہتمام فرمایا (مؤطاامام مالک عن زید بن اسلم، باب معالج المریض، حدیث نمبر:۱۹۸۹)

علاج کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاتا ہے کہ علاج کی ضرورت کے تحت فقہاء نے بعض ایسی باتوں کو جائز قرار دیا ہے جو عام حالات میں جائز نہیں ہیں، جیسے حرام شئے سے بھی علاج کرنا جائز ہے؛ بشرطیکہ اس کا کوئی حلال متبادل نہ ہو، ناپاک شئ کو بھی بطور علاج کے استعمال کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ اس کا کوئی حلال وجائز بدل نہ ہو، شریعت میں حصۂ ستر کو چھپانے کی بڑی اہمیت ہے؛ لیکن اگر علاج کے لئے بے ستری کے سوا چارہ نہ رہے تو اس کی بھی گنجائش ہے، کتب فقہ میں ان باتوں کی صراحت موجود ہے؛ اسی لئے بعض فقہاء کے نزدیک جو شخص علاج کرانے پر قادر ہو اس کے لئے علاج کرانا واجب ہے (فتاوی ابن تیمیہ:۲۱/ ۵۶۴)

بعض حضرات نے علاج کو مستحب یا مباح بھی قرار دیا ہے؛ لیکن راجح یہ ہے کہ اس کا تعلق لوگوں کے حالات سے ہے؛ اگر کسی شخص کے علاج نہ کرانے سے دوسرے کو نقصان پہنچ سکتا ہو، جیسے کوئی شخص متعدی بیماری میں مبتلا ہو اور اس کے علاج نہ کرانے سے اس کے متعلقین کو وہ بیماری لگ سکتی ہو، یا وہ کسی ایسے مرض کا شکار ہو کہ اگر علاج نہ کرے تو اس سے دوسرے کا حق متاثر ہوگا تو ان صورتوں میں علاج کرانا واجب ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں کو ضرر پہنچانے سے منع فرمایا ہے: ''لا ضرر ولا ضرار'' (سنن ابن ماجہ: حدیث نمبر:۲۳۴۱) اور اگر یہ صورتحال نہ ہو تو کم سے کم علاج کرانا مستحب ضرور ہوگا؛ کیوں کہ علاج سے انسانی جان کی حفاظت متعلق ہے اور شریعت میں انسانی جان کی بڑی اہمیت ہے؛ چنانچہ بہت سے فقہاء نے علاج کے مستحب ہونے کی صراحت کی ہے۔

''ویسن التداوی بالمریض ویستحب له'' (الاقناع:۱/ ۲۰۹)

کیوں کہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا علاج کرایا ہے۔

گذشتہ زمانے میں علاج کا طریقہ بہت سادہ ہوتا تھا، عام طور پر علاج کرنے والے خدمت کے طور پر علاج کرتے تھے؛ لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ سائنسی ترقی کی بنا پر ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ

علاج اور زیادہ سستا ہوجاتا اور علاج کے ماہرین انسانی خدمت کے طور پر اس کام کو انجام دیتے؛ لیکن صورت حال یہ ہے کہ بہت سے کام جو بطور خدمت کئے جاتے تھے، اب وہ سب تجارت بن گئے ہیں، ان میں ایک علاج بھی ہے، علاج میں تین چیزوں کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، ایک: معالج، جس کی فنی مہارت اور تجربہ سے مریض کو فائدہ پہنچتا ہے، دوسرے: تشخیصی وسائل، جن کے ذریعہ مرض کی شناخت ہوتی ہے، تیسرے: دوائیں، جن کا علاج میں بنیادی کردار ہوتا ہے، پہلے معالج یا تو فیس نہیں لیتے تھے، یا ان کی فیس بہت معمولی ہوتی تھی، اب علاج کرنے والوں کی فیس بہت زیادہ ہوتی ہے اور مزید ستم یہ ہے کہ مدت علاج میں جتنی بار مریض رجوع کرتا ہے ہر بار فیس وصول کی جاتی ہے، پہلے امراض کی تشخیص کے اخراجات بالکل نہیں ہوتے تھے؛ کیوں کہ نبض اور قارورہ دیکھ کر بیماری کی شناخت کی جاتی تھی، اب اخراجات بہت زیادہ ہوتے ہیں؛ کیوں کہ جسم کے مختلف اجزاء کے ٹیسٹ اور جسم کے داخلی حصوں کی عکس بندی کے ذریعے امراض کی شناخت ہوتی ہے؛ اس لئے اخراجات بہت بڑھ جاتے ہیں، پہلے دوا کے طور پر عام جڑی بوٹیاں استعمال کی جاتی تھیں، لوگ خود انہیں تلاش کر لیتے تھے؛ لیکن اب جڑی بوٹیوں سے فاضل اجزاء کو الگ کر لیا جاتا ہے اور مفید علاج اجزاء سے مشینوں اور کارخانوں کے ذریعے دوائیں بنائی جاتی ہیں، ان ایجادات کے رجسٹرڈ ہونے کی وجہ سے دوسرے لوگ ان دواؤں کو بنا نہیں سکتے؛ اس لئے جب یہ دوائیں بازار میں آتی ہیں تو بہت مہنگی ہو چکی ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ اب علاج کے لئے صرف ادویہ ہی کا استعمال نہیں ہوتا؛ بلکہ مہنگی مشینوں کا بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے وینٹیلیٹر، ڈائیلاسس وغیرہ کے اخراجات غیر معمولی ہوتے ہیں، یہ تو حقیقی اخراجات ہیں، ان کے علاوہ معالجین کی طرف سے بلاضرورت ٹیسٹ کرانے، قیمتی آلات استعمال کرنے، کسی خاص سبب کے بغیر بار بار نسخہ بدلنے اور ہر جگہ سے کمیشن وصول کرنے کے نتیجے میں مصنوعی طور پر علاج گراں سے گراں تر ہوتا جا رہا ہے۔

عام طور پر حکومتیں علاج کی ذمہ داری قبول کرتی ہیں، خود ہمارے ملک میں بھی پندرہ، بیس سال پہلے تک سرکاری اسپتال اکثر مریضوں کے لئے کافی ہوجاتے تھے، اب بھی بہت سے مغربی ملکوں میں گورنمنٹ اپنے آپ کو علاج کا ذمہ دار سمجھتی ہے؛ لیکن ہندوستان پر جب سے گلوبلائزیشن کا بخار آیا ہے اور خدمات میں پرائیوٹیشن کا رجحان بڑھا ہے، تب سے سرکاری اسپتالوں کا حال یہ ہو گیا ہے کہ گویا وہ خود

مریض ہوں، نہ ملازمین کے اندر اوقات کی پابندی اور نہ دواؤں کا اسٹاک محفوظ، نہ طبی آلات کارکرد، عملہ کی بد اخلاقی اور بے توجہی زبان حال سے کہتی رہتی ہے کہ وہ کہیں اور جا کر علاج کرالیں، اور معالجین۔جنہوں نے اپنے پرائیویٹ نرسنگ ہوم قائم کر رکھے ہیں۔مریضوں کو تلقین کرتے رہتے ہیں کہ وہ ان کے پرائیویٹ نرسنگ ہوم میں آجائیں، اس طرح سرکاری ہسپتالوں کے بارے میں لوگوں کا تاثر ہے کہ جن لوگوں کو دنیا سے جتنا جلد رخصت ہونا ہے ان کے لئے یہ بہترین جگہیں ہیں۔

اس صورتحال کا ایک حل میڈیکل انشورنس کی صورت میں نکالا گیا ہے اور بہت سی کمپنیاں اس میدان میں اتر چکی ہیں یا اتر رہی ہیں؛ لیکن میڈیکل انشورنش کی مروجہ صورت تجارت کے تصور کے ساتھ ہے، شرعی اعتبار سے اس میں کئی قباحتیں جمع ہوگئیں ہیں، اس میں سود بھی ہے، اس میں قمار بھی ہے اور اس میں وہ ابہام بھی جس کو حدیث میں ''غرر'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور جس معاملہ میں اس طرح کی کیفیت پائی جائے، اس کو ممنوع ٹھہرایا گیا ہے، چنانچہ اسلامک فقہ اکیڈمی کے پندرہویں سیمنار منعقدہ ۲۰۰٦ء میں ملک بھر کے علماء اور ارباب افتاء نے جمع ہوکر جو فیصلہ کیا، وہ یہ ہے:

میڈیکل انشورنس، انشورنس کے دوسرے تمام شعبوں کی طرح بلاشبہ مختلف قسم کے ناجائز امور پر مشتمل ہے؛ لہٰذا عام حالات میں میڈیکل انشورنس ناجائز ہے اور اس حکم میں سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں کوئی فرق نہیں۔

یہ تو انشورنس کے موجودہ نظام میں پیدا ہونے والا بگاڑ ہے؛ لیکن اپنے مقصد اور روح کے اعتبار سے انشورنس کا نظام اسلام سے پوری طرح ہم آہنگ ہے، انشورنس کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ جو خطرات افراد کے لئے ناقابل برداشت بن جائیں، شریعت میں جو مالی واجبات لوگوں سے متعلق کئے گئے ہیں، ان میں سب سے گراں قدر دیت (خون بہا) ہے، شریعت میں دیت کا اصول یہ ہے کہ اس کی ادائیگی تنہا مجرم پر نہیں ہوگی؛ بلکہ اس کے عاقلہ رشتہ دار مل کر اسے ادا کریں گے، بظاہر اس کی دو مصلحتیں ہیں: ایک یہ کہ ایک بھاری ہرجانہ کی ادائیگی عام افراد کے بس سے باہر ہوتی ہے تو اس کے تعاون کا ایک راستہ موجود رہے، دوسرے: جب دیت ادا کرنے میں تمام لوگ شریک ہوں گے تو سب لوگ مل کر جرم کو روکنے کی کوشش بھی کریں گے، دیت صرف قتل عمد پر ہی واجب نہیں ہوتی؛ بلکہ قتل خطا پر بھی واجب ہوتی ہے، اس طرح ایک متوقع خطرہ کی تلافی کو بہت سے ایسے افراد پر تقسیم کر دیا گیا

ہے کہ اس کی ادائیگی نا قابل تحمل باقی نہ رہے، انشورنس کا بھی بنیادی منشاء یہی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس میں مزید وسعت برتتے ہوئے رشتہ داروں کے بجائے اس کے لئے ''اہل ارزاق'' اور ''اہل دیوان'' کے گروپ بنادیئے، اہل دیوان سرکاری اور فوجی ملازمین تھے اور اہل ارزاق وہ فقراء تھے، جن کو ان کی غربت کی وجہ سے وظیفہ دیا جاتا تھا؛ چنانچہ احناف نے اسی سے اخذ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایک پیشہ کے لوگ باہم ایک دوسرے کے ''عاقلہ'' ہوں گے (دیکھئے: ہدایہ: ۳۶۰/۴)اس میں مزید سہولت ہے؛ کیوں کہ ایک پیشہ کے لوگ ایک طرح کے خطرہ سے دوچار ہوتے رہتے ہیں، اس لئے وہ زیادہ خوش دلی کے ساتھ اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔

اگر مریضوں کے لئے تجارت کے بجائے تعاون کی بنیاد پر مختلف لوگ گروپ بنا کر ''تکافل اسکیم'' شروع کریں جس میں اسکیم کا ہر ممبر مریضوں کی مدد کے نقطۂ نظر سے ایک متعینہ رقم دے، جو نا قابل واپسی ہو اور اس کی شرائط طے پا جائیں کہ فلاں فلاں بیماریوں میں اس فنڈ سے مدد کی جائے گی، جن کے لئے کثیر اخراجات مطلوب ہیں، یہ مدد پورے علاج کے بقدر بھی ہوسکتی ہے اور نصف یا اس سے کم یا زیادہ بھی، تو یہ صورت جائز ہے، یا تو رقم دینے والے یہ رقم ''وقف'' کی نیت سے دیں گے اور وقف ایسی خیراتی رقم ہے کہ جس سے خود وقف کرنے والے کے لئے بھی فائدہ اٹھانا جائز ہے؛ البتہ وقف کی صورت میں اصل رقم کو محفوظ رکھنا یا اس کو کسی کاروبار میں مشغول کردینا ضروری ہوگا اور اس پر جو نفع حاصل ہوگا یا اس مقصد کے لئے ان ممبران کے علاوہ دوسرے اہل خیر کی طرف سے جو چندہ آئے گا ان کو علاج پر خرچ کیا جائے گا...... دوسری شکل ہبہ وعطیہ کی ہے، یعنی بعینہ ممبران کی رقم علاج پر خرچ کی جائے گی، حدیث میں ایک مسئلہ ہبہ بالعوض کا آتا ہے، یعنی ایک شخص کسی کو کوئی چیز ہبہ کرے اور دوسرا شخص اس کے عوض میں کچھ دے دے تو یہ درست ہے، ''**الرجل أحق بهبته ما لم يثب منها**'' (ابن ماجہ: ۲۳۸۷) لہٰذا جس ممبر کے علاج پر پیسے خرچ ہوں گے گویا دوسرے ممبروں کی طرف سے یہ اس کے عطیہ کے مقابلہ عطیہ ہے...... یہ دونوں طریقے جائز ہیں اور عصر حاضر کے فقہاء نے اس کو ''تکافل'' کا نام دیا ہے، جو مروجہ انشورنس کا بھی متبادل ہے۔

مروجہ انشورنس اور تکافل کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ انشورنس میں ہر سال کی بچی ہوئی رقم انشورنس کمپنی کی ملکیت بن جاتی ہے اور یہ اس کا نفع شمار کیا جاتا ہے؛ کیوں کہ انشورنس تجارتی مقصد

پر مبنی ہوتا ہے اور اس میں نفع مقصود ہوتا ہے، بخلاف ''تکافل'' کے کہ اس میں بچی ہوئی رقم یا تو آئندہ کے لئے محفوظ کردی جاتی ہے؛ تا کہ مریضوں کے کام آئے، یا جن لوگوں سے لی گئی تھی، ان کو واپس کردی جاتی ہے، اگر حکومت یا کسی ذمہ دار کمپنی کے تحت تکافل کا ایسا ادارہ قائم ہوتب تو یہ بہت مفید اور محفوظ صورت ہوگی؛ لیکن ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اس طرح کا نظام ابھی موجود نہیں ہے، وہاں کچھ لوگ مل کر اور گروپ بنا کر اس کام کو کرسکتے ہیں، مثلاً ایک مسجد کے تحت سو گھر آتے ہیں تو سو گھروں کا ایک گروپ بنالیا جائے، ایک ادارے میں پچاس افراد کام کرتے ہیں تو ان پچاس افراد کو ایک گروپ مان لیا جائے، خاص کر دینی مدارس کے اساتذہ اور خدمت گذار پچاس سو افراد مل کر ایک گروپ کی تشکیل دیں، کچھ خاص بیماریوں کو متعین کردیں اور ایک آسان قسط (پریمیم) ماہوار طئے کردیں، یہ رقم جمع ہو اور اس گروپ میں سے کوئی شخص جب اس میں شامل بیماریوں میں سے کسی بیماری میں مبتلا ہو تو ان کے علاج کا انتظام کردیں، اس فنڈ کو ممبروں تک محدود رکھتے ہوئے دوسرے اصحاب خیر سے اس میں عطیہ کی رقم بھی حاصل کی جاسکتی ہے، اس طرح موجودہ حالات میں بہت سے نادار اور پریشان حال مریضوں کے لئے علاج کی سہولت فراہم ہوسکتی ہے۔

اگر کوئی چیز انسان کی عمومی ضرورت بن جائے؛ مگر وہ حرام ہو تو اس سے روکنے کا راستہ یہی ہے کہ اس کا حلال متبادل پیش کردیا جائے؛ اس لئے یہ وقت کی اہم ضرورت ہے، مسلمانوں کے زیر انتظام ہسپتالوں کو، غریب محلوں کی مساجد کمیٹیوں کو، دینی مدارس کے ذمہ داران اور اساتذہ کو اس پہلو پر غور کرنا چاہئے اور میڈیکل مقاصد کے تحت ''تکافل'' کی ایسی صورت قائم کرنی چاہئے؛ تا کہ غریبوں اور بیماروں کا مداوا ہوسکے، ورنہ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلم آبادیوں میں بہت سے مرد وعورت بے کسی کے عالم میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اپنی جان دے دیتے ہیں اور ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا، یقیناً اس کا بارِ گناہ پورے سماج پر ہوگا۔

❁

بے گھروں کے لئے گھر

(ہوم فائنانس کا اسلامی طریقہ)

اللہ تعالیٰ نے اَن گنت مخلوقات پیدا فرمائی ہیں، اِن میں بعض اتنی بڑی ہیں کہ انسان اُن کی بڑائی کا تصور بھی نہیں کرسکتا اور بعض اتنی چھوٹی ہیں کہ ان کو ناپنے کے لئے دنیا میں کوئی پیمانہ ایجاد نہیں ہوسکا ہے؛ لیکن اللہ نے تمام مخلوقات میں شرافت وکرامت کا تاج جس نوع کو پہنایا، وہ ہیں حضرت انسان، انسان کے لئے خاص طور پر یہ زمین بچھائی گئی اور اس میں وہ تمام سہولتیں پیدا کی گئیں، جو انسانی زندگی کے لئے ضروری تھیں، دوسرے سیاروں پر وہ وسائل مہیا نہیں تھے جو ایک جاندار کی ضرورت پوری کرسکیں، زمین کو اس لائق بنایا کہ اس میں قرار اور ٹھہراؤ کی کیفیت رہے، ایسی دلدلی نہ ہو کہ چیزیں اس میں دھنس جائیں: ﴿اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا﴾ (النمل:۶۱، الغافر: ۶۴) پہلے اس زمین کو پھیلایا گیا اور اسے ایک ایسی برابر کی سطح دی گئی؛ کہ انسان اس میں رہائش اختیار کرسکے، اسی کو قرآن نے ''فراش'' اور ''بساط'' سے تعبیر کیا ہے: ﴿وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ﴾ (الذاریات: ۴۸)، نیز ارشاد ہے: ﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا﴾ (نوح:۱۹) پھر زمین کو اللہ نے ایسا نرم بنایا کہ انسان حسب سہولت اس میں اپنے لئے راستے بناتا ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا﴾ (الملک: ۱۵) اسے لوہے اور پتھر کی طرح سخت جان نہیں بنایا گیا، جسے کاٹنا اور پھاڑنا ممکن نہ ہو: ﴿ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا﴾ (عبس: ۲۶) اگر زمین میں شق ہونے کی صلاحیت نہیں ہوتی تو کیسے کھیتیاں کی جاتیں اور مکانات بنائے جاتے، اور کیسے زندگی کے وسائل فراہم ہوتے؟

پھر انسان کے لئے ایک بہت بڑی ضرورت پانی کی تھی، اللہ نے زمین کے اندر پانی کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ محفوظ کردیا: ﴿وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا﴾ (القمر: ۱۲) اور سطح زمین پر بھی نہروں کا جال بچھادیا گیا: ﴿وَّجَعَلَ خِلٰلَهَا اَنْهٰرًا﴾ (النمل: ۶۱) پھر اب کائنات نے زمین کو دوسرے سیاروں کے ساتھ قوت کشش میں اس طرح باندھ دیا کہ وہ اپنے محور سے ہٹے نہیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا﴾ (الفاطر: ۴۱) غرض کہ قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے

تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمینی دنیا کا وجود اللہ کی شان ربوبیت کی عظیم نشانی ہے، جہاں نرم مٹی سے زمین کو تھامنے والے پہاڑ بھی ہیں، آلائشوں کو تحلیل کرنے کے لئے ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر بھی ہے، پیاس بجھانے کے لئے میٹھے پانی کے چشمے اور دریا بھی ہیں، قوت کشش ایسی معتدل ہے کہ نہ انسان زمین سے چپک کر رہ جائے اور نہ اس کے لئے قدم جمانا دشوار ہو جائے، آکسیجن کی پیدائش اور اس کی صفائی کا متواتر اور نہ ختم ہونے والا نظام ہر وقت انسان کی خدمت میں مصروف ہے، ابھی تک فضا میں جتنے سیارے دریافت ہوئے ہیں، ان میں نہ آکسیجن ہے، نہ پانی ہے، نہ سطح زمین کی طرح ٹھہراؤ ہے اور نہ زندگی کے دوسرے وسائل ہیں۔

خدا نے جتنی جاندار چیزیں پیدا کی ہیں بظاہر فرشتوں کے علاوہ وہ سب اسی کرۂ ارض میں ہیں، ان کی رہائش کا فطری نظام ہے جو ان کے زندگی گذارنے کے لئے کافی ہوتا ہے، مچھلیوں اور آبی جانوروں کا مسکن سمندر، دریا اور تالاب ہیں، انہیں کسی گھر کی ضرورت نہیں ہوتی، جنگلی جانور جنگلات میں گذر بسر کر لیتے ہیں، جنگل، صحرا اور بیابان ہی ان کی رہائش گاہیں ہیں، پرندے پر پھیلائے ہوئے فضا میں تیرتے رہتے ہیں اور کہیں دو چار گھنٹے سکون کی سانس لینے کے لئے اترتے اور پھر اگلی منزل کے لئے پرواز کر جاتے ہیں؛ لیکن حضرت انسان — جو حاصلِ کائنات ہیں — ان کا حال یہ ہے کہ نہ وہ پرندوں کی طرح فضا کو اپنا راستہ بنا سکتے ہیں، نہ مچھلیوں کی طرح سمندر کو اپنا مسکن اور نہ دوسرے جانوروں کی طرح جنگلوں، صحراؤں اور بیابانوں میں گذارہ کر سکتے ہیں، ان کو ضرورت ہے زمین کے فرش پر ایک اور فرش کی، انہیں حاجت ہے آسمان کی چھت کے علاوہ ایک اور چھت کی، وہ محتاج ہیں بلند قامت پہاڑوں کے علاوہ محفوظ در و دیوار کے، وہ ایک گھر کے بغیر کھلے آسمان کے نیچے زندگی نہیں گذار سکتے، نہ سورج کی براہ راست تپش کو برداشت کر سکتے ہیں، نہ سرما کی یخ بستہ ہواؤں کو سہنے اور برف کی سفید چادر اوڑھنے کی ان میں صلاحیت ہے اور نہ برسات کی موسلا دھار بارش انہیں گوارا ہے؛ اس لئے اسے ایک ایسے گھر کی ضرورت ہے جو سردی اور گرمی سے بچاتا ہو، جو لوگوں کی نگاہ سے اسے چھپاتا ہو اور جو دشمنوں کی بدبیں نگاہوں سے اسے بچا سکتا ہو؛ اس لئے جیسے کھانا پینا اور پوشاک انسان کے لئے بنیادی ضرورت ہے، اسی طرح گھر بھی اس کے لئے ایک اہم ترین ضرورت کا درجہ رکھتی ہے، انسان کو کتنی بھی غذا مل جائے اور عمدہ سے عمدہ کپڑے میسر آجائیں؛ لیکن اگر رہائش کی مناسب جگہ

حاصل نہ ہوتو وہ ہمیشہ اپنے آپ کو بے سکون محسوس کرتا ہے، وہ آرزومند رہتا ہے کہ سر چھپانے کی کوئی جھونپڑی ہی سہی، اسے حاصل ہو جائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ''کشادہ گھر'' کو اللہ کی بڑی نعمت قرار دیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: انسان کی خوش بختی ہے کہ اسے کشادہ گھر، اچھا پڑوسی اور آرام دہ سواری فراہم ہو: ''**من سعادة المرء المسلم المسكن الواسع والجار الصالح والمركب الهنيء**'' (**الأدب المفرد للبخاري، كتاب الجار، باب الجار الصالح، حديث** نمبر: ۱۱۶، وكتاب البنيان، باب المسكن الواسع، حدیث نمبر: ۴۵۷) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے بھی اسی مضمون کی روایت منقول ہے، اس میں چار چیزوں کا ذکر ہے اور ''نیک عورت'' کا اضافہ کیا گیا ہے، (**صحيح ابن حبان، كتاب النكاح، ذكر الإخبار عن الأشياء التي هي من سعادة المرء في الدنيا، حديث** نمبر: ۴۰۳۲، **ط: مؤسسة الرسالة**) ایک روایت یہ بھی ہے کہ چار چیزیں انسان کی بد بختی کی ہیں: خراب پڑوسی، بدمزاج بیوی، تکلیف دہ سواری اور تنگ گھر: ''**---- وأربع من الشقاء، فأما الشقاء فالزوجة السوء والجار السوء والمركب السوء وضيق المسكن**'' (**شعب الإيمان للبيهقي، حديث** نمبر: ۹۵۵۶، **عن سعد بن أبي وقاص رضي الله عنه**)۔

اگر دو باتوں پر عمل کیا جائے تو شاید دنیا میں کوئی شخص بے گھر باقی نہ رہے: ایک: وسائل کی منصفانہ تقسیم، دوسرے: فضول خرچی سے اجتناب، اس وقت پوری دنیا پر سرمایہ دارانہ نظام کا بول بالا ہے، اس نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ دولت مندوں اور غریبوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جاتا ہے، ایک ارب آبادی کے ملک میں ستر پچہتر فیصد دولت بیس پچیس بڑے صنعت کاروں اور تاجروں کے ہاتھوں میں سمٹ آتی ہے اور پچیس تیس فیصد قومی سرمائے میں ملک کے تمام عوام کی شرکت ہوتی ہے—— دوسرے اس نظام میں فضول خرچی کو بڑھاوا دیا جاتا ہے، لوگوں میں حیثیت سے زیادہ خریداری کا جذبہ پیدا کیا جاتا ہے، چاہے مزدور کو اپنی ذات کا بھی سودا کر دینا پڑے، یہ دو عوامل وہ ہیں جن کی وجہ سے آج بھی بہت بڑی آبادی ایک چھت سے محروم ہے، ہندوستان میں اس وقت حکومت ہند کے سن ۲۰۰۷ء کے عدد و شمار کے مطابق ملک میں ڈیڑھ کڑور خاندان (دیہاتی علاقوں میں) ڈھائی کڑور خاندان (شہری علاقوں میں) بے گھر زندگی گذار رہے ہیں، گویا کہ چار کڑوڑ خاندان اس مشکل سے دو چار ہیں، جن کے

پاس رہنے کے لئے گھر میسر نہیں ہے، جن لوگوں کے پاس گھر ہے؛ لیکن ناکافی ہے ان کی تعداد شاید اس سے بھی زیادہ ہو اور یہ بھی ایک کھلا ہوا راز ہے کہ ان بے گھر لوگوں میں مسلمانوں کا تناسب ان کی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے، حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ بے گھروں کے لئے گھر کا نظم کرے، حکومت ایک حد تک اس کام کو کرتی بھی ہے؛ لیکن وہ حقیقی ضرورت کے مقابلہ بہت کم ہے اور حکومت کی دوسری اسکیموں کی طرح اس میں بھی مسلمانوں کو بہت کم حصہ مل پاتا ہے۔

اس لئے صاحب ثروت مسلمانوں اور خاص کر مسلمان بلڈروں کا فریضہ ہے کہ وہ اس طرف توجہ دیں اور خدمت خلق کے جذبہ کے ساتھ ساتھ کاروباری انداز میں بھی اس کام کو انجام دیں، اس کے لئے کامیاب، آزمودہ اور بہتر صورت وہ ہے جس کا ''شرکت متناقصہ'' کے نام سے اسلامی بینک استعمال کرتے ہیں، یعنی آپ ایک گھر کی تعمیر کریں اور مثلاً دس یونٹ میں اس کو تقسیم کردیں، خریدار تھوڑی تھوڑی مدت پر ایک ایک یونٹ خریدتا جائے، شروع میں تو پورے گھر کا کرایہ بلڈر حاصل کرے گا؛ لیکن جیسے جیسے خریدار یونٹ خریدکرتا جائے گا، وہ ان یونٹوں کا مالک ہوتا جائے گا اور جو یونٹس انہوں نے ابھی خریدنہیں کئے ہیں وہ کمپنی کی ملکیت ہوں گے اور کمپنی کو ان کا کرایہ ملتا رہے گا، یہاں تک کہ جب وہ آخری یونٹ خرید کرلے گا تو مکمل طور پر اس کا مالک ہوجائے گا، اس کے ذمہ کوئی کرایہ باقی نہیں رہے گا، اس طرح خریدار کو آسان قسطوں پر گھر حاصل ہوگا اور کمپنی کو ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے نقصان اٹھانے کی نوبت نہیں آئے گی، خریداری میں جتنی تاخیر ہوگی اسی قدر بلڈر کو کرایہ حاصل ہوگا، اس میں سود یا قمار کی صورت بھی پیدا نہیں ہوگی اور تجارت کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔

یہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے کہ کچھ مسلمان سرمایہ دار، صنعت کار اور تجار مختلف شہروں میں ایک مشن کے طور پر اس کام کو شروع کریں اور اپنے ان بھائیوں کے لئے جو فٹ پاتھوں پر سونے، ساھوکاروں کے قرضوں کے بوجھ سے دب کر خودکشی کرنے، یہاں تک کہ بعض اوقات عزت وآبرو بھی گنوادینے پر مجبور ہیں، ان کو عزت کی زندگی گذارنے اور باعزت طریقہ پر دنیا میں جینے کا موقع ملے، یہ مادی اعتبار سے بھی ایک نفع بخش کاروبار ہے اور غریب مسلمانوں کے لئے تعاون کی ایک صورت بھی۔

❁

خواتین اور کسبِ معاش

شریعت نے خاندانی نظام کے بقاء، بچوں کی بہتر نگہداشت اور خواتین کی فطری صلاحیت کی رعایت کرتے ہوئے، ذمہ داریوں کی اس طرح تقسیم کی ہے، کہ کسبِ معاش کی ذمہ داری —— جس کے لئے محنت، مزدوری، دوڑ دھوپ کی ضرورت پیش آتی ہے —— مرد پر رکھی گئی ہے اور اُمور خانہ داری خواتین سے متعلق رکھے گئے ہیں، اس کی یہ تعبیر درست نہیں ہے کہ عورت گھر کی خادمہ ہے؛ بلکہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ عورت گھر کی ''مالکہ'' ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''**المرأة راعية على بيت بعلها وولده وهي مسئولة عنهم**'' (بخاری: کتاب العتق، باب **كراهية التطاول على الرقيق**، حدیث نمبر: ۲۵۵۴، مسلم: **كتاب الامارة، باب فضيلة الامير العادل وعقوبة الجائر**، حدیث نمبر: ۱۸۲۹) یعنی عورت گھر کی ذمہ دار اور اس کی انچارج ہے، عورت کو —— چاہے وہ کسبِ معاش کی صلاحیت رکھتی ہی ہو —— کسبِ معاش پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، یہ خواتین کے لئے بہت بڑی رحمت ہے، آج مغربی دنیا میں خواتین سے دوہری خدمت لی جاتی ہے، ان کو بچوں کی پرورش اور اُمور خانہ داری کی بھی تکمیل کرنی پڑتی ہے اور ملازمت کرکے پیسے بھی کمانے پڑتے ہیں اور معاشی ذمہ داریوں میں شریک ہونا پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس تقسیم کار میں خاندانی نظام کا بقا ہے، انسانی فطرت یہ ہے کہ باہمی احتیاج اور ضرورت مندی سے تعلقات استوار رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی صلاحیت باقی رہتی ہے، مزدور سرمایہ دار کو اس لئے برداشت کرتا ہے کہ اس کی روزی روٹی سرمایہ دار سے متعلق ہے، سرمایہ دار مزدور سے اپنا تعلق اس لئے بنائے رکھنا چاہتا ہے کہ جب تک مزدور ان کے ہاتھ نہیں لگیں، محض سرمایہ سے کوئی چیز نہیں بن سکتی، یہی حال زندگی کے دوسرے شعبوں کا ہے، ازدواجی زندگی کا مسئلہ بھی اسی طرح ہے، شوہر اپنے ذہنی وقلبی سکون نیز گھر اور بچوں کی نگہداشت اور تربیت کے لئے بیوی کا محتاج ہے اور بیوی اپنی ضروریاتِ زندگی اور تحفظ کے لئے شوہر کی ضرورت مند ہے، یہ ایک دوسرے کی ضرورت باہم تعلقات کی استواری کا سبب بنتی ہے اور انسان ایک دوسرے کو برداشت کرتا

ہے، اگر شوہر عیاشی کا راستہ اختیار کرلے اور اس کا دل بال بچوں کی محبت سے خالی ہوجائے تو بیوی سے بے اعتنائی پیدا ہوجاتی ہے اور اس کی کمزوریوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے، اسی طرح عورت اپنی ضروریاتِ زندگی کے بارے میں شوہر سے بے نیاز ہوجائے تو ناگواریوں کے باوجود اس سے نباہ کی صلاحیت نہیں رہتی، غرض کہ گھر اور باہر کی ذمہ داریوں کی تقسیم شوہر و بیوی کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے رہیں اور ہلکے پھلکے ناخوشگوار واقعات کو برداشت کرلیا کریں، مغربی ملکوں میں چوں کہ عورتوں کو گھر سے باہر لایا گیا، وہ مردوں ہی کی طرح معاشی دوڑ دھوپ میں مشغول کردی گئیں؛ اس لئے طلاق کی کثرت ہوگئی، نکاح کے رشتے مکڑی کے جالے کی طرح قائم ہونے اور ٹوٹنے لگے اور اس طرح خاندانی نظام بکھر کر رہ گیا، جب خاندانی نظام بکھرا تو بچے اپنی شناخت اور ماں باپ کی محبت سے محروم ہوگئے، شوہروں کے لئے وہ سکون بخش شریکِ حیات عنقا ہوگئیں، جو پسینہ بہا کر آنے والے شوہر کا محبت کے ساتھ استقبال کریں اور بیویوں کے لئے وہ وفا شعار شوہر نہیں رہے، جو اپنی بیوی سے جاں نثارانہ محبت رکھنے والا اور جوانی کے بعد بوڑھاپے میں بھی اس کا ساتھ دینے والا ہو۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام میں خواتین پر کسبِ معاش کا دروازہ بالکل ہی بند کردیا گیا ہے، اگر وہ اپنے سرپرست یعنی شادی سے پہلے والد اور شادی کے بعد شوہر کی اجازت سے شرعی حدود کی رعایت کرتے ہوئے کسبِ معاش کی سرگرمی میں حصہ لینا چاہے، تو اس کی گنجائش ہے۔

کسبِ معاش کی بنیادی طور پر دو صورتیں ہیں: ایک صورت ہے براہ راست معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی، اور دوسری صورت ہے بالواسطہ سرمایہ کاری کی، براہ راست کسبِ معاش کی چار صورتیں ہیں:

(۱) تجارت: (خرید وفروخت) (۲) زراعت: (کاشت کاری)
(۳) صنعت: (کاریگری) (۴) اجارہ: (کرایہ پر لگانا یا ملازمت کرنا)

تجارت سے مراد خرید وفروخت ہے، یعنی کسی شئے کو خود یا اپنے نمائندہ کے ذریعہ خرید کرنا اور پھر نفع کے ساتھ اسے خود یا نمائندہ (وکیل) کے ذریعہ فروخت کردینا، عورتوں کے لئے کسی شئ کا خریدنا بھی جائز ہے اور بیچنا بھی، اُم المومنین حضرت عائشہؓ نے حضرت بریرہؓ کو ان کے مالکان سے خرید

فرمایا تھا، (ترمذی، أبواب الولاء والھبة، حدیث نمبر: ۳۱۲۵) حضرت شفاء عدویہؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ عطر فروخت کیا کرتی تھیں، اسی طرح اسماء بنت مخرمہؓ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں عطر بیچا کرتی تھیں، عبداللہ ابن ابی ربیعہؓ یمن سے ان کے پاس عطر بھیجتے تھے، وہ اسے فروخت کرتیں اور شیشی میں رکھ کر حوالہ کرتیں، نیز جن کے ذمہ پیسے ہوتے، ان کا اندراج بھی کرلیتیں، (دیکھئے: طبقات ابن سعد: ۸/۳۰۰) اس طرح کی بہت سی روایتیں موجود ہیں، اسی لئے فقہاء کا اتفاق ہے کہ خرید وفروخت کرنے والے کا عاقل و بالغ ہونا ضروری ہے، مرد ہونا ضروری نہیں ہے، عورت بھی شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ سامان خرید اور فروخت کرسکتی ہے، یا اپنے وکیل ونمائندہ کی وساطت سے تجارت کرسکتی ہے۔

اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ کاشت کاری یا باغ بانی کے لئے 'مرد ہونا' ضروری نہیں ہے، خواتین شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ خود بھی کاشت کاری کرسکتی ہیں، باغ لگاسکتی ہیں اور دوسروں سے کام لیتے ہوئے بھی زراعت کرسکتی ہیں، رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک کے موقع سے تشریف لے جارہے تھے، آپ ﷺ نے وادئ قریٰ میں ایک خاتون کو دیکھا، جو اپنے باغ میں تھیں، آپ ﷺ نے زکوٰۃ کی مقدار کا اندازہ کرنے کے لئے باغ کی پیداوار کا اندازہ فرمایا، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وہ باغ انھیں خاتون کا تھا اور وہ خود اس کی نگرانی کررہی تھیں، (بخاری: **کتاب الزکوٰۃ، باب خرص التمر، عن أبی حمید الساعدی**، حدیث نمبر: ۷) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میری خالہ کو طلاق ہوگئی تھی، وہ اپنے کھجور کے پھل توڑنا چاہتی تھیں، ایک صاحب نے ان کو نکلنے سے منع کیا، انھوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں صورتِ حال پیش کی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیوں نہیں؟ اپنے کھجور توڑو، اس لئے کہ اُمید ہے کہ تم اس سے صدقہ کروگی، یا کوئی بہتر کام کروگی، (مسلم: **کتاب المساقاة، باب فضل الغرس والزرع، مسند دارمی، باب خروج المتوفی عنھا زوجھا**: ۲/۹۰، حدیث نمبر: ۲۲۹۳) — غرض کہ عورت زراعت اور باغبانی کے ذریعہ بھی کسب معاش کرسکتی ہے۔

خواتین کے لئے ایسی صنعت وحرفت — جو اُن کی صلاحیت کے مطابق ہو اور جن میں شرعی حدود کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو — بھی جائز ہے، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی زوجہ کچھ کاریگری سے واقف تھیں، خود حضرت عبداللہؓ اور ان کے بچے بے روزگار تھے، انھوں نے حضور ﷺ سے

دریافت کیا کہ میں اپنی رقم حضرت عبداللہ ابن مسعود ﷛ پر اور بچوں پر خرچ کر دیتی ہوں، صدقہ نہیں کر پاتی، کیا مجھے اس پر اجر ملے گا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم کو اس پر بھی اجر ملے گا: ''**لک فی ذلک أجر ما أنفقت علیھم**'' یہ روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں کہیں اختصار اور کہیں تفصیل کے ساتھ آئی ہے، (دیکھئے: بخاری، **کتاب الزکوٰۃ، باب الزکوٰۃ علی الزوج والأیتام فی الحجر**، حدیث نمبر: ۱۴۶۶، عن اُم ساعۃ: ۱۴۶۷، مزید تفصیل کے لئے: مسند احمد: ۳/ ۵۰۳، مسلم: **کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقۃ والصدقۃ علی الأقربین**، حدیث نمبر: ۲۳۱۸، طبقات ابن سعد: ۸/ ۲۹۰) حضرت سعد ابن سہل ﷛ سے مروی ہے کہ ایک خاتون نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بارڈر والی چادر لا کر پیش کی اور عرض کیا: اللہ کے رسول میں نے اسے اپنے ہاتھ سے بُنا ہے، (بخاری: **کتاب الجنائز، باب من استعد الکفن**، حدیث نمبر: ۱۲۷۷) اسی طرح بعض صحابیات کے خنجر بنانے کا بھی ذکر ملتا ہے، موجودہ دور میں جو کمپیوٹر اور الیکٹرانک مشینوں کا دور ہے، بہت سے ایسے شعبے نکل آئے ہیں، جن میں خواتین، شرعی حدود اور نسوانی تقاضوں کی رعایت کے ساتھ کام کر سکتی ہیں۔

آمدنی کا ایک ذریعہ اجارہ ہے، یعنی اپنی چیز کرایہ پر لگا کر اُجرت حاصل کی جائے، یہ خواتین کے لئے بالکل درست ہے، اس لئے کہ آجر کا مرد ہونا ضروری نہیں، جیسے مرد اپنی مملوکہ شئے کو کرایہ پر لگا سکتا ہے، اسی طرح ایک عورت بھی اپنا مکان، یا گاڑی وغیرہ کرایہ پر لگا سکتی ہے، اجارہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ خود کسی کام کی ذمہ داری لے کر اس کی اُجرت حاصل کی جائے، یعنی ملازمت اور نوکری کی جائے، یہ بھی عورتوں کے لئے جائز ہے؛ بشرطیکہ شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ ہو، یعنی پردہ کے احکام پر عمل کیا جائے اور کسی مرد کے ساتھ تنہائی یا مردوں کے ساتھ اختلاط کی نوبت نہ آئے، نیز سرپرست یعنی شادی سے پہلے والد اور شادی کے بعد شوہر کی اجازت سے ہو، اس لئے کہ فقہاء نے اجیر ہونے کے لئے مرد ہونے کی شرط نہیں لگائی ہے، بلکہ اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ جس عورت کو دودھ آتا ہو، وہ اُجرت لے کر دودھ پلا سکتی ہے، (مجمع الانہر: ۱/ ۴۹۷، **ولایۃ المرأۃ فی الفقہ الإسلامی لحافظ محمد أنور**: ۸۱ - ۴۸۰) ظاہر ہے یہ اجارہ کی ایسی صورت ہے، جو عورت ہی کے لئے مخصوص ہے، اسی طرح غلام اور باندی کی ایک خاص قسم 'مکاتب' کی ہوا کرتی تھی، جو اپنے مالک سے معاہدہ کے مطابق متعینہ رقم محنت مزدوری کے ذریعہ کما کر ادا کرتی تھی اور اسے غلامی سے آزادی

حاصل ہوجاتی تھی۔

غرض کہ شریعت نے عورت پر کمانے کی ذمہ داری نہیں رکھی ہے، لیکن اگر کوئی خاتون احکام شریعت کی رعایت کرتے ہوئے شادی کے پہلے والد اور شادی کے بعد شوہر کی اجازت سے کسب ِمعاش کرنا چاہے، یا شوہر نے اسے چھوڑ رکھا ہو، اس کی اور اس کے بچوں کی ضروریات کا خیال نہ رکھتا ہو اور اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے کسبِ معاش کرے تو اس کی اجازت ہے، اور ان صورتوں میں عورت خود ہی اپنی کمائی کی مالک ہوگی اور اس کے کمانے کے باوجود شوہر پر اس کے اور اس کے بچوں کے اخراجات واجب رہیں گے، سوائے اس کے کہ عورت خود ہی اپنی اور اپنے بچوں کی ضروریات پوری کرلیا کرے اور شوہر کو اس سے بری کردے۔

کسبِ معاش کی بعض صورتیں وہ ہیں، جن میں بالواسطہ سرمایہ کاری کی جاتی ہے اور نفع حاصل کیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں تین صورتیں زیادہ اہم ہیں:

(۱) مضاربت (۲) شرکت (۳) مزارعت۔

مضاربت میں ایک شخص کا سرمایہ ہوتا ہے اور دوسرے شخص کی محنت، اور نفع میں دونوں کی شرکت ہوتی ہے۔

شرکت میں دو یا دو سے زیادہ اشخاص کا سرمایہ ہوتا ہے اور نفع ان میں تقسیم ہوجاتا ہے۔

مزارعت یہ ہے کہ ایک شخص خود کھیتی کرنے کی بجائے، کھیت کسی کسان کے حوالہ کردے اور بٹائی پر اس سے معاملہ طے کرلے۔

یہ تینوں صورتیں ایسی ہیں کہ عمل میں شریک ہوئے بغیر انسان نفع اٹھا سکتا ہے، عورتوں کے لئے سرمایہ کاری کے یہ تینوں راستے کھلے ہوئے ہیں، وہ اپنا مال ورکنگ پارٹنر (مضارب) (المدونۃ الکبریٰ: ۳۸/۴) کو دے کر اس سے نفع لے سکتی ہے، وہ کسی شخص یا کمپنی کے ساتھ سرمایہ لگا کر ’پارٹنر‘ بن سکتی ہے یا شیئر خرید سکتی ہے، وہ اپنی اراضی بٹائی پر لگا کر پیداوار کی شکل میں نفع حاصل کرسکتی ہے؛ کیوں کہ سرمایہ کاری کی ان تینوں صورتوں میں سرمایہ لگانے والے کا مرد ہونا ضروری نہیں، خواتین بھی ان طریقوں پر سرمایہ کاری کرسکتی ہیں۔

اگر شریعت کے ان احکام کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کے لئے اسلام میں

کسبِ معاش کے بہت سے راستے موجود ہیں، عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام نے چوں کہ مردوں اور عورتوں کے اختلاط کو روکا ہے، اس لئے عورتوں کے لئے کسبِ معاش کا راستہ محدود ہو گیا ہے؛ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس تحدید کی وجہ سے عورتوں کے لئے مواقع بڑھ گئے ہیں، مثلاً تعلیم اور صحت ہی کو لے لیجئے، اگر مخلوط تعلیم کا نظام نہ ہو، لڑکیوں کے لئے الگ اسکول اور کالج قائم ہوں اور ان کو خاتون اساتذہ کی خدمت کے لئے مخصوص کر دیا جائے تو یقیناً اس کی وجہ سے معلمات کی ضرورت بڑھ جائے گی اور وہ ذہنی دباؤ اور تناؤ سے فارغ ہو کر تدریس کی خدمت انجام دے سکیں گی، اسی طرح اگر خواتین کے لئے علاحدہ اسپتال قائم ہوں، تو خاتون ڈاکٹروں، نرسوں اور عملہ کی ضرورت میں خاصا اضافہ ہو جائے گا، یہی حال زندگی کے دوسرے شعبوں کا ہے، اس لئے سچائی یہ ہے کہ پردہ کا حکم اور اختلاط کی ممانعت کی وجہ سے عورتوں کے لئے کسبِ معاش کے مواقع بڑھیں گے نہ کہ گھٹیں گے۔

ٹی وی چینل اور مسلمان

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو سب سے بڑا جوہر عطا فرمایا، وہ ہے عقل اور اخلاق، عقل کے ذریعہ انسان نت نئی چیزوں کی تحقیق کرتا ہے اور دنیا کو اپنی ایجادات واختراعات سے نوازتا ہے، یہ عقل ہی ہے جس کے ذریعہ انسان نے سمندر کی تہوں سے لے کر اتھاہ بلندیوں تک پائی جانے والی فضاؤں کو فتح کرلیا ہے اور ایک ذرۂ بے مقدار (ایٹم) کو ایسی غیر معمولی طاقت دے دی ہے کہ وہ لمحوں میں شہر کے شہر تباہ وبرباد کرسکتا ہے —— اخلاق انسان کی رہنمائی کرتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو کس مقصد کے لئے استعمال کرے؟ اس کی طاقت ظالموں کے خلاف استعمال ہو یا مظلوموں کے خلاف، اس کی صلاحیت لوگوں کو بھلائی کی ہدایت دینے میں خرچ ہو یا برائی کی دعوت دینے میں؟ اگر انسان کے پاس عقل ہو؛ لیکن وہ اپنے آپ کو اخلاق کی رہنمائی سے آزاد سمجھنے لگے تو اس کی عقل فائدہ کی بجائے نقصان کا سبب بن جاتی ہے، اسی طرح اگر اخلاق ہو لیکن عقل کی صلاحیت کا استعمال نہ ہو تو بہت سے وہ فوائد جو انسانیت کو پہنچا سکتا تھا نہیں پہنچا پاتا ہے، سائیکل سے لے کر جہاز تک اور سر کے درد کی دوا سے لے کر دل ودماغ کے آپریشن تک کائنات میں جو کچھ ترقیاں ہم دیکھ رہے ہیں، جن سے زندگی کی دشواریاں حل ہوتی ہیں اور انسان کو سہولتیں میسر آتی ہیں، سب قوتِ عقل ہی کے کرشمے ہیں۔

موجودہ دور میں انسان کی ان دونوں صلاحیتوں کے استعمال کے درمیان توازن باقی نہیں رہا، انسان نے اپنی قوت عقل کو بے پناہ استعمال کیا ہے اور استعمال کرتا ہی جارہا ہے؛ اس لئے ہر میدان میں جدید سے جدید تر آلات ووسائل وجود میں آتے جارہے ہیں، جو باتیں سو دوسو سال پہلے ناقابل تصور تھیں، وہ آج نہ صرف ایک واقعہ بن چکی ہیں؛ بلکہ وہ ہر عام وخاص کی رسائی میں ہیں، شاید قرآن مجید نے ایسی ہی ایجادات کی طرف اشارہ کرتے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی چیزوں کو پیدا فرماتے رہیں گے، جن کے بارے میں تم آج جانتے بھی نہیں: ﴿وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل: ۸) مگر افسوس کہ ان ایجادی کوششوں کے ساتھ انسانیت نے ان اخلاقی ہدایات کو نظر انداز کردیا، جن کا سرچشمہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض نہایت مفید ایجادات فائدہ کی

بجائے مضرت کا اور اصلاح کی بجائے فساد کا ذریعہ بن چکی ہیں۔

ایسی ہی ایجادات میں ٹیلی ویژن بھی ہے، ریڈیو کی ایجاد نے انسانی آواز کو دور دراز فاصلوں تک پہنچانا شروع کیا اور یہ بات ممکن ہوگئی کہ ایک شخص مغرب میں بیٹھ کر مشرق کی آخری انتہاؤں تک اپنا پیغام پہنچائے اور اس کی آواز سنی جائے، پھر ٹیلی ویژن نے اس بات کو بھی ممکن کر دیا کہ دنیا کے ایک کنارے کے لوگ دوسرے کنارے پر بیٹھے ہوئے شخص کو نہ صرف سنیں؛ بلکہ سر کی آنکھوں سے اسے دیکھ بھی لیں، اس کے بعد انٹرنیٹ نے ریڈیو اور ٹی وی دونوں کو جمع کر دیا، جس کے ذریعہ دور دراز کی آواز سنی جاسکتی ہے اور صورت بھی دیکھی جاسکتی ہے، مگر افسوس کہ ابلاغ کے ان تینوں جدید ترین ذرائع کا استعمال اس وقت خیر سے زیادہ شر کے لئے اور اصلاح سے زیادہ بگاڑ کے لئے ہو رہا ہے، مشکل یہ ہے کہ سہولت بخش ایجادات ابتداءً تو ایک سہولت کا درجہ رکھتی ہیں؛ لیکن آہستہ آہستہ ضرورت بن جاتی ہیں، جب لوگ چوپاؤں پر سفر کرنے کے عادی تھے، تب ٹرین اور جہاز ان کے لئے ضرورت نہیں تھے؛ لیکن حالات و مواقع اور لوگوں کے مسائل کے اعتبار سے اب یہ تیز رفتار سواریاں بھی ضروریات و معمولات میں داخل ہو چکی ہیں، یہی حال ریڈیو، ٹی وی اور ان دونوں صلاحیتوں کے مجموعہ 'انٹرنیٹ' کا بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج شاید ہی کوئی اہم دینی درسگاہ اور قابل ذکر مذہبی تنظیم ہو جہاں انٹرنیٹ موجود نہ ہو۔

اس پس منظر میں ضروری ہے کہ مسلمان عموماً اور علماء، مذہبی قائدین و مذہبی تنظیمیں خصوصاً ٹی وی چینل کے بارے میں غور کریں اور پوری گہرائی و گیرائی کے ساتھ اس مسئلہ پر سوچیں —— اس سلسلہ میں چند سوالات قابل توجہ ہیں، اول یہ کہ اگر مسلمانوں کے پاس اپنے چینل ہوں تو اس سے کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں؟ دوسرے: اس سے کن نقصانات کا اندیشہ ہے، تیسرے: ٹی وی چینل نہ ہونے پر کیا کچھ نقصانات بھی ہیں؟ چوتھے: ٹی وی پر آنے والی صورتیں کیا تصویر کے دائرہ میں آتی ہیں؟ پانچویں: اگر یہ تصویریں ہیں تو یہ جواز کے دائرہ میں ہیں یا ناجائز ہیں اور اس سلسلہ میں فقہاء کے نقطۂ نظر کیا ہیں؟

جہاں تک چینل کے فوائد کی بات ہے تو اس سے کچھ دینی فوائد بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور کچھ جائز دنیوی فوائد بھی —— دینی فوائد میں تین باتیں بہت اہم ہیں:

(۱) اسلام کی دعوت واشاعت —— اگر ہم بڑا سے بڑا اجتماع رکھیں تو دو تین لاکھ آدمیوں تک اپنی بات پہنچا سکتے ہیں، ہماری اکثر دینی کتابیں ہزار تا پانچ ہزار طبع ہوتی ہیں اور دسیوں سال میں فروخت ہوتی ہیں، گویا ہم سال بھر میں پانچ سو آدمیوں تک اپنی بات پہنچا پاتے ہیں؛ لیکن ٹی وی چینل کے ذریعہ آپ چند منٹ میں اپنا پیغام کروڑوں انسانوں تک پہنچا سکیں گے، اس میں اجتماع کی طرح لوگوں کا جمع ہونا بھی شرط نہ ہوگا؛ بلکہ مرد وعورت، چھوٹے اور بڑے، مسلمان اور غیر مسلم، پڑھے لکھے اور اَن پڑھ اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر آپ کا پیغام سن سکیں گے۔

(۲) دوسرا فائدہ دفاع اسلام کا ہے، اس وقت پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی منظم کوشش ہورہی ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی باریش مرد اور برقعہ پوش خاتون سڑک سے گذرتے ہیں تو ان پر انگشت نمائی ہوتی ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ ضرور دہشت گرد ہوگا، یہ سارا پروپیگنڈہ ٹی وی اور انٹرنیٹ کے ذریعہ کیا جارہا ہے، ہم اخبارات اور اکثر اردو اخبارات میں مضامین لکھ کر اور بیان دے کر اس کا جواب دیتے ہیں؛ لیکن یہ جواب کتنے لوگوں تک پہنچتا ہے اور کن لوگوں تک؟ اگر مسلمانوں کا اپنا چینل ہو تو ہم پوری قوت کے ساتھ اپنا موقف پیش کر سکیں گے، اور ہمیں لوگوں کی غلط فہمیاں دور کرنے کا موقع ملے گا۔

(۳) تیسرا فائدہ دینی تعلیم کا ہے، موجودہ نظام تعلیم نے بچوں کا پورا وقت اور ان کی پوری عمر کو گھیر لیا ہے، وہ صبح سے شام تک یا تو اسکول میں رہتے ہیں یا اس میں دیئے ہوئے کاموں کو گھر پر انجام دیتے ہیں اور ہفتہ وار چھٹی کو تفریح اور ذہن کو ہلکا کرنے کے لئے گذارنا چاہتے ہیں، ان بچوں کو دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مدارس و مکاتب میں آنے کا مکلف بنانا بہت دشوار ہوگیا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ مسلمان لڑکے اور لڑکیاں یونیورسیٹیوں تک پہنچ جاتے ہیں؛ لیکن ناظرہ قرآن مجید تک نہیں پڑھ سکتے، ٹی وی چینل کے ذریعہ اس وقت مختلف یونیورسیٹیاں تعلیم کا اہتمام کررہی ہیں، خاص کر فاصلاتی تعلیم میں بڑی عمدگی سے ان کا استعمال کیا جارہا ہے، مسلمان مختلف مرحلوں کے طلبہ وطالبات کی مناسبت سے اس ذریعۂ ابلاغ کو دینی تعلیم کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔

دنیوی فوائد بہت سے ہیں، طب وصحت کے سلسلہ میں مشورے، عصری تعلیم میں بچوں کی مدد، مقابلاتی امتحانات کے لئے تربیت، روزگار کے مواقع کی رہنمائی، تعمیرِ شخصیت، زبان کی تدریس وغیرہ

یہ سب جائز اور ضروری امور ہیں، غریب گھرانوں کے لئے ان کی معلومات اور تعلیمات کا حاصل کرنا دشوار ہوتا ہے؛ حالاں کہ یہ سب انسانی ضروریات کا حصہ ہیں؛ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ اس سے دینی مفاد بھی متعلق ہے، اور دنیوی زندگی کے منافع بھی۔

جہاں تک ٹی وی سے ہونے والے نقصانات کی بات ہے تو وہ محتاج بیان نہیں ہیں؛ کیوں کہ اگر آپ اپنے چینل کو خالص اسلامی بنیاد پر بھی چلائیں تب بھی اس بات کا اطمینان نہیں کیا جاسکتا کہ ٹی وی دیکھنے والے صرف آپ کا پروگرام دیکھنے پر اکتفا کریں گے اور دوسرے پروگراموں کو نہیں دیکھیں گے، جن میں بے حیائی کی بہت سی چیزیں موجود ہوتی ہیں؛ بلکہ ان ہی کا غلبہ ہوتا ہے، ٹی وی کے فحش اور جرائم پر مبنی پروگراموں کے دیکھنے کا اثر جو لوگوں پر ہوتا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے؛ اس لئے اس کے نقصانات تو بالکل واضح ہیں — لیکن سوال یہ ہے کہ جو لوگ ٹی وی کے خراب پروگراموں کو دیکھنا چاہتے ہیں کیا وہ اچھا چینل نہ ہونے کی صورت میں ان پروگراموں کو نہیں دیکھیں گے؟ ایسا نہیں ہے؛ بلکہ ایسی صورت میں ان کے لئے گندی چیزوں کے دیکھنے کے سوا کوئی اور صورت باقی نہ رہے گی، اور اگر کوئی مہذب چینل بھی موجود ہو تو ان کا کچھ وقت اچھے پروگرام کے دیکھنے اور سننے میں بھی گذرے گا اور امید کی جاسکتی ہے کہ یہ ان کے لئے اصلاح اور ہدایت کا ذریعہ بھی بن سکے گا، بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایسے چینلوں کے بہانے لوگ ٹی وی اپنے گھر میں رکھنا شروع کردیں گے، مگر یہ بات بہت زیادہ درست نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ اب دیندار اور مذہبی گھرانوں میں بھی ٹی وی آچکا ہے، اور آہستہ آہستہ یہ جزو زندگی بنتا جارہا ہے، بعض ملکوں میں تعلیمی مقاصد کے لئے ٹی وی ایک اہم وسیلہ بن گیا ہے، بعض ملکوں میں امتحانات کے سوالات ٹی وی پر لکھائے جاتے ہیں؛ اس لئے ہم چاہیں یا نہ چاہیں یہ بتدریج جزوِ زندگی بنتا جائے گا اور اگر ہم نے ذرائع ابلاغ کے استعمال کا مفید راستہ پیدا نہیں کیا تو لوگ غلط مقاصد ہی کے لئے اس کا استعمال کرتے رہیں گے؛ اس لئے یہ سمجھنا درست نہیں کہ ہم اگر اپنے چینل قائم نہ کریں تو مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اپنے کو ٹی وی سے دور رکھے گی۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ ٹی وی چینل نہ ہونے کی نقصانات کیا ہیں؟ نقصانات ان فوائد سے محرومی ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس وقت ذرائع ابلاغ کو چوتھی بڑی طاقت مانا گیا ہے، لیکن اگر نتائج

کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ تمام طاقتوں سے بڑی طاقت ہے، میڈیا اس وقت جنگ کا ہتھیار ہے، اس کے ذریعہ مظلوم کو ظالم ٹھہرایا جاتا ہے، اس کا استعمال کر کے ظالم کو کیفر کردار تک پہنچایا جا سکتا ہے، اس کے ذریعہ لوگوں کے دماغ فتح کئے جا سکتے ہیں، اس کے ذریعہ قوموں اور گروہوں کے دل جیتے جا سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اپنی طاقت بھر دشمن سے مقابلہ کی تیاری کرو'' ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾ (الانفال: ٦٠)، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ غیر مسلموں سے مال کے ذریعہ بھی جہاد کرو، جان کے ذریعہ بھی اور زبان کے ذریعہ بھی: ''**جاهدوا المشركين بأموالكم وأنفسكم وألسنتكم**'' (سنن ابی داؤد، **کتاب الجهاد، باب كراهية ترك الغزو**، حدیث نمبر: ۲۵۰٦، سنن النسائی، کتاب الجہاد، باب وجوب الجہاد، حدیث نمبر: ۳۱۰۹)، زبان سے جہاد کی ایک صورت اس دور میں ٹی وی بھی ہے، جو آپ کی بات کو دور دور تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دشمن کا بہتر طور پر جواب دینے اور دفاع کرنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ (النحل: ۱۲۵) ایک اور موقع پر فرمایا گیا ہے: ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ (المؤمنون: ۹٦، فصلت: ۳۴) غور کریئے تو اس زمانہ میں دشمن کا دفاع کرنے کے لئے بہترین ہتھیار الکٹرانک ذرائع ابلاغ بھی ہیں کہ ایک طرف ان کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ان کی پہنچ دور دور تک ہے، اور دوسری طرف یہ زیادہ مؤثر بھی ہیں؛ کیوں کہ دیکھی ہوئی چیز انسان پر سنی ہوئی باتوں سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے اور ٹی وی سے انسان دیکھتا بھی ہے اور سنتا بھی ہے۔

اس وقت ہم پوری دنیا کے نقشے پر نظر ڈالیں تو مسلمانوں کا خون پینے کے پانی سے بھی زیادہ ارزاں کر دیا گیا ہے، فلسطین میں معصوم بچوں کا قتل روزمرہ کا معمول بن چکا ہے؛ لیکن اس کے باوجود پوری دنیا اسرائیل کو ہی مظلوم سمجھتی ہے، عراق میں ۱۰ / لاکھ سے زیادہ افراد مارے جا چکے ہیں، خود امریکہ نے ایک لاکھ شہریوں کے مارے جانے کا اعتراف کیا ہے؛ لیکن عراق کو دہشت گرد سمجھا جاتا ہے اور امریکہ کو انصاف کا علمبردار، افغانستان پر کسی معقول دلیل کے بغیر مغربی طاقتوں نے حملہ کیا اور لاکھوں نہتے افغانیوں کی جانیں جا چکی ہیں؛ لیکن دنیا انہیں کو دہشت گرد سمجھتی ہے، ہندوستان میں صورت حال یہ ہے کہ مسلم سماج کا کوئی چھوٹا مسئلہ بھی ہو تو وہ ذرائع ابلاغ کی بحث کا موضوع بن جاتا ہے، مگر اکثریتی سماج کے بڑے بڑے واقعات اس طرح دبا دیئے جاتے ہیں کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں،

اس صورت حال کا بنیادی سبب یہ ہے کہ عالمی سطح پر بھی اور قومی سطح پر بھی ہمارے اپنے چینل نہیں ہیں۔

یہ تو نقصان کا ایک پہلو ہے، دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس وقت باطل ادیان اور باطل افکار کی اشاعت کا ایک بڑا مؤثر ذریعہ ٹی وی ہے، خاص کر قادیانیت کی اشاعت کے لئے ایک ذریعہ کے طور پر اس کا استعمال ہو رہا ہے اور برطانیہ وجرمنی جیسے دور دراز ملکوں سے پوری دنیا میں ارتداد اور گمراہی کی یہ دعوت پہنچائی جارہی ہے، اگر اسی سطح پر اسلام کی حفاظت واشاعت کا نظم نہ ہو تو ہم اس سیلاب کو روک نہیں سکتے، جیسا کہ اس وقت کی صورتحال ہے؛ اس لئے یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے اپنے چینل کا موجود نہ ہونا قومی اور اجتماعی، نیز ملی اور دینی لحاظ سے بڑے نقصان کا باعث ہے اور ایسی مضرت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، کہیں ایسا نہ ہو کہ جب فساد پھیلانے والی طاقتیں بہت آگے نکل جائیں تب ہم بیدار ہوں اور اس وقت ہماری کوششیں اپنی منزل تک پہنچنے سے قاصر رہ جائیں۔

تیسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ ٹی وی کے لئے جو تصویر کھینچی جاتی ہے، کیا فقہی اعتبار سے بھی اس پر تصویر کا اطلاق ہوتا ہے؟ —— اس سلسلہ میں موجودہ دور کے اہل علم کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے، عالم عرب میں بعض حضرات کے نزدیک یہ صورت بھی تصویر کے دائرہ میں آتی ہے، اور اس لئے ان کے نزدیک یہ حرام ہے، شیخ حمود بن عبداللہ التویجری، شیخ عبداللہ بن محمد بن حمید اور بعض دیگر اہل علم اسی کے قائل ہیں، برصغیر کے بہت سے علماء کا یہی نقطۂ نظر ہے، دوسری رائے یہ ہے کہ ٹیلی ویژن پر نشر ہونے والی تصویر، تصویر کے دائرہ میں نہیں آتی ہے، عالم عرب میں مفتی حرمین شریفین شیخ محمد بن صالح عثیمینؒ، معروف فقیہ شیخ محمد توفیق رمضان بوطی وغیرہ اسے تصویر نہیں مانتے، اور اسے جائز قرار دیتے ہیں، (**أحکام التصویر فی الفقه الإسلام**، ص: ۳۵۸) یہی رائے مشہور داعی اور عالم شیخ محمد یوسف قرضاوی کی ہے، جن کے نزدیک کیمرے سے کھینچی گئی تصویر بھی جائز ہے، (**الحلال والحرام فی الإسلام**، ص: ۱۱۴) یہی نقطۂ نظر سعودی عرب میں علماء کی خصوصی کونسل ''**هیئة کبار العلماء**'' کا ہے، کہ دعوت اور علم کی نشر واشاعت کے لئے ٹی وی سے مدد لینا جائز ہے، (دیکھئے: **فتاوی لجنة الدائمة للبحوث العلمیة والإفتاء**: ۱/ ۴۵۸) معروف مفسر قرآن شیخ محمد شعراوی (**الفتاوی**، ص: ۴۵) شیخ محمد محمد عساف (**الحلال والحرام**، ص: ۵۳۲) اور شیخ محمد عبداللہ الخطیب (**الفتاوی حول الدین والدنیا الخ**: ۱/ ۱۳۲) کی بھی یہی رائے ہے، عالم عرب اور عالم اسلام میں

زیادہ تر اس وقت یہی نقطۂ نظر ہے۔

برصغیر کے بھی بہت سے علماء اور ارباب افتاء اس کے قائل ہیں کہ اگر خاص اسلامی مقاصد کے لئے کوئی ٹی وی چینل ہو تو وہ جائز ہے، اور وہ تصویر کے دائرہ میں نہیں آتا، اس نقطۂ نظر کے حاملین میں سرفہرست معروف عالم دین اور مصنف مولانا محمد تقی عثمانی ہیں —— جن کا اس سلسلہ میں ایک تفصیلی فتویٰ شائع ہو چکا ہے—— اسی طرح مشہور صاحب افتاء مولانا مفتی رشید احمد صاحبؒ—— جن کے فتاویٰ کا مجموعہ ''احسن الفتاویٰ'' نے نہ صرف عوام میں بلکہ علماء کے درمیان بھی پذیرائی حاصل کی ہے—— کی بھی یہی رائے ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''اگر کسی وقت ملک میں اسلامی حکومت قائم ہو اور ٹی وی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر اسے موجودہ منکرات سے پاک کردے، ٹی وی میں عورتوں کا گذر نہ ہو، کسی جاندار کی تصویر بھی پیش نہ کی جائے، اس کا پورا عملہ صالح مردوں پر مشتمل ہو جو اسے عمومی خواہشات کے تابع رکھنے کے بجائے مفید مقاصد میں استعمال کرے، استعمال کی مخصوص حدود و شرائط وقت کے محققین سے طے کرائے تو دریں حالت ٹی وی آلہ خیر بن جائے گا اور علماء کو اس پر کوئی اعتراض نہ رہے گا، مگر بحالت موجودہ یہ قطعاً آلۂ شر ہے'' (احسن الفتاویٰ: ۸ / ۳۰۴)

ہندوستان کے علماء میں مولانا محمد برہان الدین سنبھلی—— جو نئے مسائل میں احتیاطی روش اختیار کرنے کے لئے ممتاز ہیں —— وہ لائیو اور ریکارڈ پروگرام کے درمیان فرق کرتے ہیں اور پہلی صورت کو جائز اور دوسری کو ناجائز کہتے ہیں؛ چنانچہ لکھتے ہیں:

''اگر ٹیلی ویژن پر براہ راست ایسے مناظر اور پروگرام پیش کئے جائیں، جن کا بغیر ٹیلی ویژن کے بھی دیکھنا جائز ہے تو ایسے پرروگراموں اور مناظر کا ٹیلی ویژن پر دیکھنا، سننا جائز ہوگا'' (موجودہ زمانہ کے شرعی مسائل کا حل، ص: ۱۲۶)

ہندوستان میں جدید شرعی مسائل پر غور کرنے کے لئے سب سے نمائندہ ادارہ 'اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا' کا بارہواں سیمینار ۱۱ تا ۱۴ فروری ۲۰۰۰ء کو دار العلوم اسلامیہ بستی (یوپی) میں منعقد ہوا تھا، اس میں شریک ہونے والے ممتاز علماء اور ارباب افتاء کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ تھی، ان میں

سے چھ حضرات نے اسلامی اغراض کے تحت بھی ٹی وی چینل کے قائم کرنے کو نادرست قرار دیا، دو حضرات کی رائے تھی کہ لائیو پروگرام جائز ہے، اور ریکارڈ پروگرام جائز نہیں، بقیہ حضرات جس نتیجہ پر پہنچے وہ یہ ہے کہ جو چینلس خالص دینی ودعوتی مقاصد کے لئے قائم کئے گئے ہیں، اور قائم کئے جارہے ہیں، نیز ہر طرح کی فحاشی اور عریانی سے پاک ہیں، ایسے چینلس قائم کرنا اوران سے استفادہ کرنا جائز ہے۔(دیکھئے: انٹرنیٹ اور جدید ذرائع ابلاغ، ص: ۳۹، ط: ایفا پبلیکیشن، دہلی)۔

ان حضرات کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ تصویر ایسی صورت گری کا نام ہے جو کسی چیز پر مستقل طریقہ سے نقش ہوجائے، جیسا کہ دیوار یا کاغذ یا کپڑے پر ہوتی ہے، اب ڈیجیٹل تصویر کی صورتحال یہ ہے کہ اس میں کوئی جماؤ اور ٹھہراؤ نہیں ہوتا؛ بلکہ جوں ہی اس کو متحرک کرنے والا آلہ بند کردیا جاتا ہے، اسکرین سفید ہوجاتی ہے اور اس پر کوئی تصویر باقی نہیں رہتی، رہ گئی سی ڈی جس کے ذریعہ صورتیں اسکرین پر آتی ہیں تو اس میں بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور نہ بالفعل صورت موجود ہوتی ہے؛ بلکہ الکٹرانک ذرات موجود ہوتے ہیں، جب انہیں متحرک کیا جاتا ہے تو وہ حروف یا شکلوں کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں، جیسے دوات میں روشنائی رکھی ہو یہ تصویر نہیں ہے؛ لیکن یہ صورت گری اور تصویر کشی میں استعمال کی جاسکتی ہے کہ کوئی فن کار قلم کاغذ اٹھائے اور اس سے تصویر بنادے، یہی حال ان ذرات کا بھی ہے، جن کو مشینی حرکت دے کر صورتوں کی شکل دی جاسکتی ہے، غرض کہ جو صورت نظر آتی ہے، اس میں ٹھہراؤ نہیں اور اس سے پہلے جو کیفیت ہے، اس میں صورت کا وجود نہیں ہوتا اور نہ اسے دیکھا جاسکتا ہے؛ اس لئے اس کی حیثیت عکس اور سائے کی ہے نہ کہ تصویر کی، چنانچہ مولانا محمد برہان الدین صاحب رقمطراز ہیں:

> ''ٹیلی ویژن پر جو کچھ نظر آتا ہے وہ دراصل بجلی اور مشین کے ذریعہ لے کر دکھایا جانے والا عکس یا ظل ہے؛ لہٰذا اس کا حکم وہی ہوگا جو اصلی مناظر کا ہے'' (موجودہ زمانہ کے شرعی مسائل کا حل، ص: ۱۳۵)

حاصل یہ ہے کہ علماء کے ایک گروہ کے نزدیک ٹی وی پر نظر آنے والی صورتیں تصویر کا مصداق ہیں اور علماء کی ایک معتد بہ جماعت کے نزدیک اس کو چاہے عرفاً تصویر کہہ لیں؛ لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ تصویر نہیں ہے۔

پانچویں قابل توجہ بات یہ ہے کہ جوشرعاً تصویر ہوخود اس کے سلسلہ میں فقہاء کے نقاط نظر کیا ہیں؟— اس سلسلہ میں یہ بات تو واضح ہے کہ جاندار کی تصویر حرام ہے اور بے جان کی تصویر جائز (شرح نووی علی مسلم: ۲/ ۲۰۱)اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ تصویر بنانا گناہ اور حرام ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب میں تصویر کشی کرنے والے ہوں گے: "**إن أشد الناس عذابا يوم القيامة المصورون**" (**مسلم، باب تحريم صورة الإنسان**:۲/ ۲۰۱)۔

لیکن بعض احادیث سے کچھ مستثنیات بھی معلوم ہوتی ہیں، جن کی اجازت دی گئی ہے، اسی بنیاد پر امام مالک اور بعض دیگر سلف صالحین نے ایسی تصویروں کو منع کیا ہے، جو سایہ دار ہوں، یعنی مجسمے کہ اگر دھوپ یا روشنی ان پر پڑے تو ان کا سایہ ظاہر ہو، چنانچہ مشہور فقہی انسائیکلوپیڈیا "**الموسوعة الفقهية**" (مرتب کردہ: وزارت اوقاف کویت) میں لکھا گیا ہے:

> "دوسرا قول جو کہ مالکیہ اور بعض سلف کا مسلک ہے اور حنابلہ میں سے ابن احمدان نے ان کی موافقت کی ہے یہ ہے کہ وہی تصاویر حرام ہوں گی جن میں مندرجہ ذیل شرطیں اکٹھا ہوں، پہلی شرط یہ ہے کہ انسان یا حیوان کی تصویر سایہ والی ہو، یعنی جسم رکھنے والا مجسمہ ہو؛ چنانچہ اگر مسطح ہو تو اس کا بنانا حرام نہیں ہوگا، جیسے وہ تصویر جو دیوار، ورق یا کسی سامان پر منقوش ہو؛ بلکہ مکروہ ہوگا" (مادہ، تصویر: ۱۲/ ۱۰)

دوسرے اہل علم جیسے شیخ عبدالرحمن جزیری نے بھی مالکی فقہاء کی یہی رائے نقل کی ہے اور مزید بعض تفصیلات ذکر کی ہیں۔(**الفقه علی المذاهب الاربعة**:۲/ ۴۰)

اگر چہ مالکیہ وغیرہ کی رائے دلائل کے اعتبار سے اس درجہ قوی نہیں؛ کیونکہ متعدد روایتیں موجود ہیں جن میں مطلقاً تصویر کو حرام قرار دیا گیا ہے؛ لیکن فقہاء کا اختلاف امت کے لئے رحمت اور آسانی کا باعث بنتا ہے؛ اس لئے بعض علماء کا رجحان ہے کہ چونکہ اس دور میں اسلام دشمن پروپیگنڈوں کا مقابلہ مسلمانوں کے اپنے ٹی وی چینلوں کے بغیر شاید ممکن نہ ہو؛ اس لئے اس مسئلہ میں امام مالک کی رائے سے فائدہ اٹھایا جائے؛ کیونکہ ان کی رائے پر ٹی وی چینل کے ذریعہ نشر ہونے والی صورتیں حرام تصویروں کے دائرہ میں نہیں آتی ہیں۔

ٹی وی چینل کو جن لوگوں نے جائز قرار دیا ہے ان کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ ٹی وی اپنے موجودہ پروگراموں کے ساتھ جائز ہے؛ بلکہ مقصد یہ ہے کہ جس چیز کا ٹی وی سے باہر دیکھنا جائز ہے اس کا ٹی وی کے اندر بھی دیکھنا جائز ہے اور جس کا ٹی وی کے باہر دیکھنا نا جائز ہے، جیسے غیر محرم عورتیں یا ایسے کپڑوں میں ملبوس مرد جن میں ستر کی پوری رعایت نہ ہو، ان کا ٹی وی پر بھی دیکھنا ناجائز وحرام ہوگا، مسلمانوں کو ایسے چینل قائم کرنا چاہئے جن میں شرعی حدود کی پوری پوری رعایت ہو اور جن کا مقصد بھی اسلام کی دعوت، دین کا دفاع، اخلاقیات کی تعلیم، بہتر معلومات کی فراہمی، سچی خبروں سے لوگوں کو واقف کرانا ہو، وہ بے حیائی پر مبنی اشتہارات سے بھی خالی ہو، شائستہ طریقہ پر اشتہارات دیئے جائیں تو حرج نہیں، آج کل غالباً یہ بات ممکن ہوگئی ہے کہ ٹی وی دیکھنے والا کچھ چینلوں کی ترسیل اپنے یہاں روک دے اور جن چینلوں کو پسند کرے انہیں باقی رکھے، اس طرح ٹی وی دیکھنے والوں کو اپنے آپ کو ٹی وی کے ممکنہ مفاسد سے بھی بچانا ممکن ہے —— اس پس منظر میں عالمی سطح پر بھی مسلمانوں کو اور ہندوستان کی سطح پر بھی دینی وملی تنظیموں کو اس سلسلہ میں غور کرنا چاہئے اور مناسب قدم اٹھانا چاہئے، کہ اس میدان میں مسلمانوں کا مؤثر رول موجود نہ ہونے کی وجہ سے نہایت منفی اثر مرتب ہو رہا ہے، منکرات کی اشاعت جس پیمانہ پر ہو رہی ہے، امر بالمعروف کی کوششیں اس کے مقابلہ ایسی ہوگئی ہیں، جیسے ہاتھی کے مقابلہ مچھر۔ **وما أرید إلا الإصلاح والله هو المستعان!**

ملی وقومی مسائل

مسلم پرسنل لا بورڈ اور مسلمان

یہ بات ہر مسلمان کے ایمان کا لازمی جز ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو دین ہم تک پہنچا ہے، یہ اللہ کی طرف سے ہے، مگر ایسا نہیں ہے کہ خالقِ کائنات نے کان اور آنکھ کی طرح ہر شخص کو براہِ راست دین کے احکام عطا کر دیئے ہوں؛ بلکہ یہ انسانیت تک مختلف واسطوں سے پہنچا ہے، ان میں پہلا واسطہ انبیاء کرام کا ہے، جس کا سلسلہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ختم ہو گیا، دوسرا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے برگزیدہ رفقاء یعنی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں، اور تیسرا واسطہ علماء امت ہیں، ان تینوں سے امت کا ربط وتعلق جتنا زیادہ ہوگا، اتنا ہی زیادہ وہ دین سے مربوط رہیں گے، اور یہ تعلق جتنا کم ہوگا اور ان پر یقین واعتماد کی جتنی کمی ہوگی، اسی قدر وہ دین سے دور ہوتے چلے جائیں گے؛ اسی لئے رسول پر ایمان لانے کو لازم قرار دیا گیا ہے، صحابہ کے بارے میں فرمایا گیا کہ ان کے سلسلہ میں زبان کی حفاظت کریں اور یہ کہ ان سے محبت رکھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنا اور ان سے بغض رکھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھنا ہے: ’’**الله الله في أصحابي، لا تتخذوا أصحابي غرضا، من أحبهم فبحبي أحبهم، ومن أبغضهم فببغضي أبغضهم**‘‘ (**صحيح ابن حبان، كتاب إخباره صلى الله عليه وسلم عن مناقب الصحابة، باب فضل الصحابة والتابعين رضي الله عنهم**، حدیث نمبر: ۷۲۵۶) —— اور علماء کے بارے میں فرمایا گیا کہ یہ انبیاء کے وارث ہیں: ’’**إن العلماء ورثة الأنبياء**‘‘ (**سنن أبي داؤد، كتاب العلم، باب الحث على طلب العلم**، حدیث نمبر: ۳۶۴۳، **سنن الترمذي، كتاب العلم، باب ما جاء في فضل الفقه على العبادة**، حدیث نمبر: ۲۸۹۸)۔

علماء کو انبیاء کا وارث کہنے میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے: جن میں سے ایک کے مخاطب خود علماء ہیں اور دوسرے کے مخاطب عام مسلمان ہیں، اس حدیث میں علماء کے لئے یہ پیغام ہے کہ دین کی تشریح وتوضیح، دعوت وارشاد اور حفاظت وحمایت جس طرح ہر عہد میں اس عہد کے پیغمبر کیا کرتے تھے، اب یہ علماء کی ذمہ داری ہے، اور عوام سے یہ خطاب ہے کہ علماء کے تئیں ان کے دلوں میں توقیر

اور اعتماد ہونا چاہئے، اور ایسی بات نہ کہنی چاہئے، جس سے ان کی بے توقیری ہوتی ہو یا ان پر لوگوں کا اعتماد مجروح ہوتا ہو؛ چنانچہ جن لوگوں کو اسلام سے کدورت اور حق وسچائی سے عداوت رہی ہے، وہ ہمیشہ ان تینوں واسطوں کو مطعون کرنے کے لئے کوشاں رہے ہیں، یہود و نصاریٰ نے سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو اپنی تنقید؛ بلکہ بعض اوقات تمسخر کا ہدف بنایا ہے، مختلف ادوار میں جو گمراہ فرقے پیدا ہوئے اور جنہوں نے اندر سے اسلام کے درخت کو کھوکھلا کرنے کی کوشش کی، انہوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اپنا نشانہ بنایا؛ کیوں کہ اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی شخصیت مجروح ہوجائے، تو ایک طرف احکامِ شریعت پر لوگوں کا اعتماد متزلزل ہوجائے گا؛ کیوں کہ ان ہی کے واسطہ سے دین لوگوں تک پہنچا ہے اور دوسری طرف اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوگی کہ نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت اتنی ناقص تھی کہ جو لوگ شب وروز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے اور جن پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے حد اعتماد فرمایا کرتے تھے، وہ بھی اچھے لوگ نہیں تھے؛ اس لئے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان کو گرانا دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام ومرتبہ کو مجروح کرنا ہے۔

ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو کھل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرتا، یا تو ایمان کی جو چنگاری دل میں چھپی ہے، وہ ان کو اتنا آگے جانے نہیں دیتی یا سماج کا خوف ان کی زبان تھام لیتا ہے، ایسے لوگ اکثر علماء اور مذہبی قیادت کو نشانہ بناتے ہیں، ان پر ناشائستہ تنقیدیں کرتے ہیں، انہیں بے خبر، بے شعور، مجہول اور غافل وکاہل سمجھتے ہیں؛ اس طرح دراصل وہ اسلام دشمن طاقتوں کو تقویت پہنچانے اور خوش کرنے کا کام کرتے ہیں؛ اگر ڈاکٹروں کے گروہ کے بارے میں کہا جائے کہ یہ بیوقوف ہوتے ہیں، تو یہ بالواسطہ اس بات کا اعلان ہے کہ ان کا پیشہ ورانہ علم انسان کو بے وقوفی کے راستہ پر لے جاتا ہے، اسی طرح اگر علماء اور مذہبی قیادت کے بارے میں عمومی طور پر یہ بات کہی جائے کہ وہ ناسمجھ اور بے عمل ہیں تو اس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ یہ دین ہی انسان کو ناسمجھی اور بے عملی کی طرف لے جاتا ہے، ایک زمانہ میں مسلمانوں کو علماء اور مذہبی شخصیتوں سے دور کرنے کا یہ طریقہ کمیونسٹ اختیار کرتے تھے اور آج کل یہی کام مغربی میڈیا کر رہا ہے، درخت کے تنے اور اس کی ٹہنیوں کو کاٹا جائے تو ہر گذرنے والا اسے دیکھ سکتا ہے اور اس کی غلطی پر بعض اوقات شور مچ جاتا ہے؛ لیکن اگر اس کی جڑوں کو خشک کر دیا جائے اور زمین سے اس کا

رابطہ کٹ جائے تو خود بخود درخت زمین بوس ہوجاتا ہے، اس میں نہ درخت کو کاٹنے کا الزام کسی پر آئے گا، نہ نگاہیں اس حرکت کو دیکھ سکیں گی اور نہ زبانیں اس کے خلاف کھل سکیں گی، اسی طرح بالواسطہ اسلام کو نقصان پہنچانے کا کام اس وقت مغربی میڈیا کررہا ہے؛ مگر افسوس کہ بہت سے مسلمان اپنی سادہ لوحی اور جذبۂ روشن خیالی میں اس حقیقت کو سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے ایمان کے بچاؤ اور شریعتِ اسلامی کے تحفظ میں علماء کا بڑا اہم کردار رہا ہے، انہوں نے ملک میں عیسائی مشنریز کی تحریک ارتداد کا مقابلہ کیا ہے، انہوں نے آریہ سماجیوں کی طرف سے مسلمانوں میں ہندومت کی تبلیغ اور ارتدادی کوششوں کا مؤثر طور پر سد باب کیا ہے، انہوں نے فتنۂ انکارِ حدیث کا استیصال کیا ہے، مستشرقین کے اعتراضات کا مدلل جواب دیا ہے، دینی مدارس کے ذریعہ مسلم معاشرہ کو دین سے جوڑے رکھنے کی اہم خدمت انجام دی ہے، اس دور میں جو نئے شرعی مسائل پیدا ہوئے ہیں، انہیں انفرادی اور اجتماعی کوششوں کے ذریعہ حل کیا ہے، اور حل کررہے ہیں، دینی تعلیم، عصری تعلیم، خدمت خلق، مسلمانوں کی شیرازہ بندی اور امت کے مختلف کاموں کے لئے مسلمانوں کو جوڑ کر بے شمار ادارے اور تنظیمیں قائم کئے ہیں، اردو زبان کے ملازمت اور معاشی مفادات سے بے تعلق ہوجانے کے باوجود مسلمانوں کے درمیان رابطہ کی حیثیت سے اس کی حفاظت کی ہے اور بہت سی علمی، دینی، تنظیمی؛ بلکہ ایک حد تک سیاسی خدمات انجام دی ہیں اور دے رہے ہیں۔

ہندوستان میں علماء اور مذہبی قائدین کی خدمت کا ایک اہم پہلو شریعتِ اسلامی کی حفاظت بھی ہے، اس کے لئے ایک طرف انہوں نے دار القضاء کا نظام قائم کیا؛ تاکہ مسلمان شرعی عدالتوں کے ذریعہ اپنے معاملات طے کرائیں؛ کیوں کہ ایک مسلمان اور شریعت سے واقف قاضی ہی احکامِ شریعت کی صحیح تشریح کرسکتا ہے اور اس کی روح کے مطابق اس کو نافذ کرسکتا ہے، دوسری طرف انہوں نے سیاسی سطح پر بھی مؤثر جد وجہد کی ہے؛ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں ''شریعت اپلی کیشن ایکٹ'' علماء ہی کی کوششوں سے بنا، ۱۹۳۹ء میں ''انفساخ نکاح'' کا قانون پاس ہوا، یہ بھی ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا، اس قانون میں ایک دفعہ یہ بھی رکھی گئی تھی کہ انفساخ نکاح سے متعلق مقدمات مسلمان قاضی یا مجسٹریٹ کے ذریعہ فیصل ہوا کریں گے اور حکومتِ برطانیہ نے اسے منظور بھی کرلیا تھا؛ لیکن بعض مسلمان دانشوروں نے اس پر اعتراض کیا، ان کا خیال تھا کہ اس طرح مولویوں اور ملاؤں کو عدالتی

اختیارات حاصل ہوجائیں گے؛ اس لئے یہ دفعہ مسودۂ قانون سے خارج کردی گئی، اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو مسلم پرسنل لاء کے سلسلہ میں اس وقت مسلمان جس پریشان کن صورت حال سے دوچار ہیں، غالباً اس کی نوبت نہیں آتی ،مگر برا ہو زعمِ دانشوری اور جذبۂ روشن خیالی کا، کہ اس نے ملت کو کتنے ہی نقصان پہنچائے ہیں!

آزادی کے بعد دستور میں اقلیت کے لئے مذہبی حقوق کی صراحت کرنے اور دستور ساز شخصیتوں کے بار بار کی یقین دہانیاں کرانے کے باوجود جلد ہی حکومت کی بدنیتی سے پردہ اٹھنے لگا، ۱۹۵۶ء میں جب ہندو کوڈ بنا اس وقت بھی کہا گیا کہ یہ یکساں سیول کی طرف ایک قدم ہے، پھر قانونِ شفعہ اور ۱۸ سال سے کم عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح کی ممانعت کے لئے اس طرح راستہ نکالا گیا کہ انہیں قانون شخصی کی بجائے دوسرے قوانین کا حصہ بنادیا گیا، اسپیشل میرج ایکٹ بنایا گیا؛ تاکہ جو مسلمان مرد وعورت مسلم پرسنل لا سے آزاد ہوکر نکاح کرنا چاہیں، وہ اس کے تحت نکاح کریں، یہاں تک کہ ۱۹۷۲ء میں لے پالک کو حقیقی بیٹے کا درجہ دینے اور گود لینے والے کے ترکہ سے اس کو میراث دلانے کی مہم شروع کی گئی، ہندوؤں کے لئے پہلے سے اس نوعیت کا قانون موجود تھا؛لیکن مسلمانوں کے بشمول تمام قوموں کو اس میں شامل کرنے کے لئے ایک خصوصی بل مرتب کیا گیا، اس وقت مختلف مسلم تنظیموں کی جانب سے اس کے خلاف آواز بلند کی گئی، یہاں تک کہ مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے ۱۹۶۸ء میں پٹنہ میں امارت شرعیہ بہار کی طرف سے ''مسلم پرسنل لا کانفرنس'' بلائی اور اس میں مسلمانوں کی دو بڑی کل ہند جماعتوں — جمعیۃ علماء ہند اور جماعت اسلامی ہند — کے ذمہ داران ' مفتی عتیق الرحمن عثمانی اور مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی' کو مدعو فرمایا، یہ گویا مسلم پرسنل لا کے موضوع پر پہلا چند جماعتی اجلاس تھا، پھر مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی کوششوں سے اسی نوعیت کا ایک پروگرام دار العلوم دیوبند میں ہوا، اور وہیں طے پایا کہ اس سلسلہ میں ایک بڑا کنونشن ممبئی میں کیا جائے؛ کیوں کہ مسلم پرسنل لاء کے خلاف بعض نام نہاد مسلمانوں کی آواز یہیں سے اٹھ رہی تھی، پھر دسمبر ۱۹۷۲ء میں وہ عظیم الشان مسلم پرسنل لا ممبئی کنونشن منعقد ہوا، جس کے بارے میں بعض بزرگوں کی رائے تھی کہ خلافت تحریک کے بعد اتنے وسیع پیمانے پر مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کا ایسا پروگرام نہیں ہوا، اس کنونشن میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل کی تجویز منظور کی گئی، اور اگلا

اجلاس حیدرآباد میں ہوا، جہاں باضابطہ بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی، بورڈ کی تشکیل بجائے خود ایک کرامت سے کم نہیں، مختلف مکاتب فکر، مختلف جماعتیں اور تنظیمیں، جن کے تعلقات دریا کے دو کناروں کا درجہ رکھتے تھے، اور جن کا ایک جگہ مل بیٹھنا ناقابل تصور تھا، وہ تحفظ شریعت کے مقصد کے تحت یکجا ہوئے، اور بورڈ میں نہ صرف علماء، بلکہ راسخ العقیدہ مسلمان دانشوروں اور قانون دانوں کی بھی ایک مناسب تعداد شامل کی گئی اور اب تک اس کا یہی ڈھانچہ برقرار ہے۔

بورڈ کی تشکیل کا ایک ضمنی فائدہ یہ ہوا کہ مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے مسلمان مختلف پلیٹ فارموں پر ایک ساتھ بیٹھنے لگے، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے سیمینار، آل انڈیا ملی کونسل کی بنیادی ہیئت، جمعیۃ علماء ہند، اور جماعتِ اسلامی کے حالیہ عوامی جلسے اس کی واضح مثال ہیں؛ لیکن اس کے علاوہ خود تحفظ شریعت کے سلسلے میں حکومت متبنّٰی بل واپس لینے پر مجبور ہوئی، مسجدوں کو عوامی مقاصد کے لئے ایکوائر کرنے کی بات واپس لی گئی، نفقۂ مطلقہ سے متعلق دفعہ ۱۲۷ کے اثرات کو ختم کرنے کے لئے ''تحفظ حقوق مسلم مطلقہ خواتین'' کا قانون پاس ہوا، نکاح کے رجسٹریشن کے لزوم کے سلسلے میں اکثر ریاستوں میں قانون بنانے سے گریز کیا گیا اور جہاں قانون بنا، وہاں بھی ثبوت نکاح کے لئے رجسٹریشن کا لزوم نہیں رکھا گیا، یہ اور اس طرح کے بعض اور فیصلے عوامی جدو جہد اور سیاسی نمائندگی کے ذریعہ ہو سکے، اور اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ بورڈ کے قیام کے بعد سے گورنمنٹ پارلیمنٹ کے ذریعہ کوئی ایسا بل لانے کی جرأت نہیں کرسکی، جو براہ راست مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کا باعث ہو، یہ یقیناً مسلم پرسنل لا بورڈ کی کامیابی اور اس کے پیچھے مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا نتیجہ ہے۔

لیکن بدقسمتی سے ہماری معزز عدالتیں اپنے حدود سے تجاوز کرتی جارہی ہیں، اور انہوں نے تشریح قانون سے آگے بڑھ کر وضع قانون کی خدمت بھی اپنے ذمہ لے لی ہے اور نہ صرف مسلم پرسنل لا؛ بلکہ بعض دوسرے معاملات میں بھی ان کی طرف سے دخل در معقولات کا سلسلہ جاری ہے، سابق اسپیکر سومناتھ چٹر جی بھی اس سلسلہ میں اپنی شکایت کر چکے ہیں، ماضی قریب میں ہم جنسی کے سلسلہ میں عدالت کا جو رویہ سامنے آیا ہے، اسے بھی بد بختانہ ہی کہا جا سکتا ہے؛ یہاں تک کہ عدالتیں اب مسلمانوں کے اقلیت ہونے سے بھی انکار کر رہی ہیں؛ تاکہ ایک طرف وہ اکثریت کے حقوق سے تو محروم ہیں ہی، اب اقلیت کے حقوق سے بھی محروم ہو جائیں، سب سے افسوسناک صورت حال اس

وقت سامنے آئی، جب الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بینچ نے بابری مسجد مقدمہ کا فیصلہ کیا، جس میں ثبوت کی بجائے عقیدہ اور آستھا کو اہمیت دی گئی اور جس کو خود سابق معزز ججوں نے پنچوں کے ذریعہ دیہاتوں میں ہونے والے فیصلوں کے مماثل قرار دیا۔

مسلم پرسنل لا کے مسئلہ نے ایک نئی صورت اس وقت اختیار کر لی، جب نفقۂ مطلقہ سے متعلق شاہ بانو کیس میں عدالت نے اپنے طور پر آیت قرآنی کی تشریح کی اور ﴿وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (البقرۃ:۲۴۱) سے استنباط کرتے ہوئے یہ رائے قائم کی کہ مطلقہ عورت دوسرے نکاح تک نفقہ کی مستحق ہے، یہ استنباط اتنا ہی غلط ہے جتنا یہ کہ کوئی شخص عین دوپہر کے وقت کہے کہ یہ رات ہے، اس فیصلہ کا خطرناک پہلو یہ ہے کہ اب تک عدالتیں مذہبی کتابوں کی اپنے طور پر تشریح کرنے سے گریز کرتی تھیں اور اس مذہب کے ماہر علماء کی آراء کا اعتبار کرتی تھیں؛ لیکن اس بار عدالت نے اپنی روایات سے تجاوز کرتے ہوئے براہ راست قرآن مجید کی تفسیر کرنی شروع کر دی، چنانچہ اس فیصلہ کے بڑے مضر اثرات مرتب ہوئے، اور مختلف عدالتوں نے طلاق کے سلسلہ میں اپنے طور پر احکام کا استنباط کرنا اور فیصلے کرنا شروع کر دیا، جسٹس بہار الاسلام اور جسٹس بدر دریز وغیرہ کے فیصلے اسی نوعیت کے ہیں؛ اسی لئے بورڈ نے اس کے خلاف پورے ملک میں تحریک چلائی اور اس تحریک کے نتیجہ میں ''تحفظ حقوق مسلم خواتین'' قانون بنا۔

بعض حضرات کے ذہن میں ہے کہ بورڈ نے ایسا قانون پاس کرایا ہے، جس سے آئندہ مزید غلط فیصلوں کا راستہ کھل گیا؛ لیکن یہ غلط فہمی پر مبنی ہے، حقیقت یہ ہے کہ بورڈ نے جو مسودہ تیار کیا تھا، اس میں گورنمنٹ نے اتنی تبدیلیاں کر دیں کہ اس کا منشا ہی فوت ہو گیا، جب وزیر قانون نے مجوزہ مسودہ قانون پیش کیا تو بورڈ کے ذمہ داروں نے اسے ناقابل قبول قرار دیا اور اس میں بتیس ترمیمات کا مسودہ بنا کر حوالہ کیا؛ لیکن جب بل پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو اس میں ان ترمیمات کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا تھا؛ البتہ اس وقت کے وزیر اعظم آنجہانی راجیو گاندھی نے بورڈ کے ذمہ داروں سے وعدہ کیا کہ وہ کسی اور موقع سے اس میں ترمیم کرا لیں گے، بورڈ اس کے لئے کوشاں تھا؛ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی ترمیم کراتے، اقتدار سے محروم ہو گئے اور پھر اگلے الیکشن کے دوران ہی ان کی حادثاتی موت ہو گئی۔

یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ہماری عدالتوں کا رویہ بھی مسلمانوں کے مسائل کے بارے

میں مثبت نہیں ہے اور متواتر کئی فیصلے ایسے آچکے ہیں جن سے مسلمانوں کے مفادات کونقصان پہنچا ہے، اس سلسلہ میں ہمیں یہ بات یادرکھنی چاہئے کہ جب کبھی فرقہ پرست جماعتوں کو اقتدار حاصل ہوا ہے، انہوں نے تعلیم، ذرائع ابلاغ اور انصاف کے شعبوں پر ایک خاص ذہن کے لوگوں کو لانے کی کامیاب کوشش کی ہے، یہاں تک کہ ان شعبوں سے تعلق رکھنے والے بعض ملازمین نے ریٹائرڈ ہونے کے بعد علانیہ فسطائی جماعتوں کی رکنیت اختیار کر لی ہے، اس بات کی بھی کوشش کی جاتی ہے کہ راسخ العقیدہ مسلمانوں کو —— جہاں تک ممکن ہو—— اس شعبہ میں ترقی نہ دی جائے، اس صورت حال کی وجہ سے بعض دفعہ کسی معاملہ کو عدالت میں لے جانے کے مقابلہ یہ بات زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے کہ مناسب وقت کا انتظار کر کے مقدمہ میں فریق بنا جائے؛ کیوں کہ اگر ایک بار اونچی عدالتوں میں کوئی ناموافق فیصلہ ہو جائے تو پھر اس کی تلافی مشکل ہو جاتی ہے۔

عدالتوں کے ذریعہ مسلم پرسنل لا میں مداخلت پر مبنی فیصلے یقیناً ہوئے ہیں، بورڈ اس سے واقف بھی ہے اور وہ اس پر مسلسل نظر رکھے ہوئے ہے؛ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ عدالتی فیصلوں کے سلسلہ میں کافی احتیاط سے کام لینا ہوتا ہے، اب اس کی تلافی کی دو ہی صورتیں ہیں، یا تو تحت کی عدالت کے خلاف اوپر کی عدالت میں اپیل کی جائے یا پارلیمنٹ کے ذریعہ قانون میں تبدیلی کرائی جائے، ماضی قریب میں عدالتوں کا جو رویہ رہا ہے، اس پس منظر میں زیادہ درست یہی معلوم ہوتا ہے کہ پارلیمنٹ کے ذریعہ اس صورت حال کا مقابلہ کیا جائے اور پارلیمنٹ کی صورت حال یہ ہے کہ ہمارا ملک تیزی سے دو جماعتی جمہوریت کی طرف بڑھ رہا ہے، ایک اتحاد U.P.A کا ہے اور دوسرا N.D.A کا، تیسرا محاذ دن بدن کمزور سے کمزور تر ہوتا جا رہا ہے اور ابھی حکومت سازی میں اس کو فیصلہ کن حیثیت حاصل نہیں ہے۔

گزشتہ پانچ سالہ میقات سے پہلے N.D.A سرکار تھی جس میں سب سے اہم شریک بی، جے، پی تھی، اور B.J.P نے یکساں سول کوڈ کو اپنے منشور کے نمایاں موضوعات میں رکھا تھا، اس وقت قانون میں تبدیلی کی کوشش بارآور نہیں ہو سکتی تھی، پھر اس کے بعد منموہن سنگھ کی قیادت میں U.P.A کی حکومت آئی، مگر یہ حکومت بائیں بازو کی تائید پر منحصر تھی اور بایاں بازو مسلمانوں اور اقلیتوں سے متعلق بعض مسائل میں گو مثبت رویہ رکھتا ہے؛ لیکن چوں کہ اشتراکیت کی بنیاد ہی لامذہبیت پر ہے؛ اس لئے وہ مسلم پرسنل لا یا کسی بھی مذہبی قانون کے باقی رہنے کا مخالف ہے اور یہ اس کی علانیہ

پالیسی ہے، جسے اس نے کبھی چھپانے کی کوشش نہیں کی ہے؛ اس لئے اس دوران بھی پارلیمنٹ کے ذریعہ ایسی کوشش ممکن نہیں تھی، اب پھر U.P.A کی سرکار ہے اور گو اب بھی افرادی قوت کے اعتبار سے وہ قانون میں تبدیلی لانے کے موقف میں نہیں ہے؛ لیکن بعض اپوزیشن جماعتوں سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اس مسئلہ میں مسلمانوں کے موقف کی تائید کریں گی؛ چنانچہ مسلم پرسنل لا بورڈ نے اس سلسلہ میں کوششیں شروع کردی ہیں، ''رائٹ ٹو ایجوکیشن ۲۰۰۹ء'' دینی مدارس اور اقلیتی تعلیمی اداروں کے لئے نہایت مضر ہے، ''قانون وقف'' ۲۰۱۰ء وقف کے تحفظ کو خطرہ میں ڈالتا ہے اور ''ڈائریکٹ ٹیکس کوڈ'' کا مجوزہ قانون مسجدوں اور مدرسوں پر بھی ٹیکس عائد کرتا ہے، بورڈ ان سب میں تبدیلی کے لئے حکومت سے رابطہ میں ہے اور ان مسائل کے حل ہوجانے کی امید ہے، یوپی میں زرعی اراضی میں بیٹیوں کو میراث نہیں دی جاتی، اس کی اصلاح کے لئے ریاستی سطح پر کوشش کی جارہی ہے، ان کوششوں کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اسے سڑک پر لایا جائے، احتجاج کا موضوع بنایا جائے، اگر ایسا ہوا تو اندیشہ ہے کہ ہمارے ملک کے تنگ نظر ذرائع ابلاغ اس کو منفی انداز پر پیش کریں گے، فسطائی طاقتیں اسے مسلم مخالف فضا بنانے کے لئے استعمال کریں گی اور خدانخواستہ صورت حال اسی طرح پیدا ہوجائے گی، جو بابری مسجد کے قضیہ میں پیدا ہوئی؛ اس لئے بورڈ کی سوچ یہ ہے کہ وہ حکمت کے ساتھ گورنمنٹ سے رابطہ قائم کرتے ہوئے پُرامن طور پر اس مسئلہ کو حل کرے؛ لیکن ایسی کوششیں راتوں رات ثمر آور نہیں ہوتیں، اس کے لئے طویل جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔

یہ تو مسئلہ کو حل کرنے کی سیاسی جہت ہے؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ عدالتی سطح پر بھی بورڈ نے کبھی غفلت نہیں برتی، اس وقت بورڈ بابری مسجد کی حقیت کے مقدمہ میں اپیل کے علاوہ وشوا لوچن کی طرف سے سپریم کورٹ میں نظام دار القضاء کے خلاف دائر ہونے والے مقدمہ میں پیروی کررہا ہے، جس میں خود مدعی نے بورڈ کو مدعا علیہ بنایا ہے، دوسرے لے پالک کو حقیقی بیٹے کا درجہ دینے کے سلسلہ میں شبنم ہاشمی کی طرف سے دائر شدہ مقدمہ میں فریق بنا ہے، تیسرے شریعت کے قانون میراث کے سلسلہ میں کیرالا ہائی کورٹ میں نام نہاد ''قرآن وسنت سوسائٹی'' اور ''مسلم ویمن فورم'' کی طرف سے دائر کئے جانے والے مقدمہ میں فریق بننے کے لئے کوشاں ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا وجود نہ ہوتا تو جو کام آج عدالتیں دھیرے

دھیرے کررہی ہیں، اس کو علی الاعلان حکومت نے کیا ہوتا اور اسے اپنے ایسے اقدامات کے بارے میں کوئی خوف نہیں ہوتا؛ لیکن بورڈ کی بیدار مغزی اور چوکسی کی وجہ سے حکومت کو ایسی قانون سازی کی جرأت نہیں ہوسکی، اس کے علاوہ بورڈ تحفظ شریعت کے لئے کئی مثبت کام بھی انجام دے رہا ہے، ان میں ایک اصلاح معاشرہ کا کام بھی ہے، بورڈ چاہتا ہے کہ مسلمانوں میں شریعت کا ایسا احترام پیدا کیا جائے کہ وہ ازخود اپنے آپ کو شریعت پر قائم رکھیں؛ چنانچہ پورے ملک میں یہ تحریک چل رہی ہے اور ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اس موضوع پر لٹریچر کی اشاعت عمل میں آئی ہے، جب سے بورڈ نے اصلاح معاشرہ کی تحریک شروع کی ہے، ہندوستان میں مختلف تنظیمیں، جماعتیں اور ادارے اس موضوع پر کام کرنے لگے ہیں اور جلسۂ سیرت النبی کی طرح جلسۂ اصلاح معاشرہ بھی مسلمانوں کے اجتماعات اور علماء کے خطابات کا ایک اہم عنوان بن گیا ہے، اگرچہ منکرات کی اشاعت وتبلیغ کے ذرائع اتنے ہمہ گیر اور دوررس اثرات کے حامل ہیں کہ ان کا مقابلہ دشوار سا ہو گیا ہے؛ لیکن پھر بھی ان کوششوں کے بہتر اثرات مرتب ہو رہے ہیں اور نوجوان ذہنوں میں تبدیلی آرہی ہے۔

تحفظ شریعت ہی کا ایک پہلو یہ ہے کہ بہت سے قانون داں یہاں تک کہ مسلمان قانون داں بھی یا تو شریعت کے احکام سے واقف نہیں ہیں یا ان احکام کی حکمتوں اور مصلحتوں سے آگاہ نہیں ہیں، اس کی وجہ سے وہ بعض اوقات عدالتوں میں بھی شریعت کی غلط ترجمانی کرتے ہیں؛ چنانچہ ملک کے ان شہروں میں جہاں ہائی کورٹ کے بینچ ہیں، تفہیم شریعت کمیٹیاں قائم کی جارہی ہیں، دہلی، لکھنؤ اور اورنگ آباد میں ایسی کمیٹیاں قائم ہوچکی ہیں۔

بورڈ نے عدالتوں کے فیصلوں پر نظر رکھنے کے لئے مستقل لیگل کمیٹی بنائی ہے، اس کمیٹی میں زیادہ تر قانون داں حضرات اور فقہ سے تعلق رکھنے والے بعض علماء شامل ہیں، اس کمیٹی میں سپریم کورٹ کے متعدد وکلاء اور ماہرین قانون بھی شریک ہیں، یہ مختلف ریاستوں کے اہم وکلاء سے بھی اپنا رابطہ رکھتے ہیں؛ تا کہ ہائی کورٹوں کے فیصلے بھی ان کے سامنے رہیں، بورڈ میں اچھی خاصی تعداد قانون دانوں کی ہے، اس کے ساتھ ساتھ بورڈ اس کا اہتمام کرتا رہا ہے کہ اس طرح کے فیصلوں کا ترجمہ کر کے انہیں علماء اور ارباب افتاء تک بھی پہنچایا جائے؛ تا کہ وہ صحیح صورتحال سے واقف ہوسکیں، اور فقہی نقطۂ نظر سے بورڈ کے مقدمات کی پیروی کرنے والے وکلاء کو فقہی معلومات بہم پہنچائی جائے۔

جب بابری مسجد کا مسئلہ کھڑا ہوا اور اس عنوان پر کمیٹی بنی تو بورڈ نے اس مسئلہ کو اپنے ایجنڈہ میں لینے سے اجتناب کیا؛ تاکہ انتشار وافتراق کی فضا نہ پیدا ہو، بدقسمتی سے بعض سیاسی شخصیتوں نے اس مسئلہ کو کچھ اس طرح ڈیل کیا کہ یہ قانونی لڑائی کی بجائے عوامی لڑائی کا میدان بن گیا اور پھر جو کچھ ہوا، وہ سب کے سامنے ہے، ایک مرحلہ ایسا آیا کہ بعض لوگ بابری مسجد کا سودا کرنا چاہتے تھے، اس موقع پر بورڈ نے مجبور ہوکر اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور فیصلہ کیا کہ مسجد ہمیشہ کے لئے مسجد ہے، اس کی شرعی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی، یہ ایک تاریخی فیصلہ تھا، جس نے ایک بہت بڑے خطرہ کا سد باب کیا، آخر نرسمہا راؤ حکومت کی بد دیانتی کی وجہ سے بابری مسجد شہید کردی گئی، اور اس سلسلہ میں لبرہان کمیشن بنایا گیا، بورڈ نے لبرہان کمیشن میں بھر پور پیروی کی، جس نے بالآخر فرقہ پرست لیڈروں کو مجرم قرار دیا، بابری مسجد کی ملکیت کا مقدمہ بھی اس وقت بورڈ لڑ رہا ہے اور امید ہے کہ اگر عدالت نے انصاف کو شرمسار نہیں کیا تو مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوگی، ماضی قریب میں جسٹس کاٹجو نے داڑھی کے سلسلہ میں نہایت ہی قابل افسوس ریمارک کیا اور اس سلسلہ میں بعض نام نہاد مسلمان دانشوروں نے ان کو گمراہ بھی کیا؛ لیکن بورڈ اور اس کے بعض ذمہ داروں کی کوشش سے وہ اپنا ریمارک واپس لینے پر مجبور ہوئے، جو واقعہ ہے کہ عدالت کی دنیا کا ایک اہم واقعہ ہے۔

بورڈ مسلمانوں کی سب سے طاقتور اور متحدہ آواز ہے؛ اسی لئے اسلام دشمن عناصر ہمیشہ اس پلیٹ فارم کو توڑنے کو شاں رہے ہیں، پہلے تو کہا گیا کہ یہ بورڈ مسلمانوں کا نمائندہ بورڈ ہی نہیں ہے، پھر ایک حلقہ کی طرف سے مسلم پرسنل لا بورڈ کے مقابلہ میں ''مسلم پرسنل کانفرنس'' قائم کی گئی، جسے کوئی تائید حاصل نہیں ہوسکی، پھر نام نہاد ''شیعہ پرسنل لا بورڈ'' کی کچھ ایسے لوگوں نے تشکیل کی، جو فرقہ پرست عناصر کے آلۂ کار تھے، اس کے بعد ''خواتین پرسنل لا بورڈ'' کا اعلان ہوا؛ لیکن ان نامسعود کوششوں کو ذرا بھی قبولیت حاصل نہ ہوسکی اور ان کی حیثیت حقیقی شیر کے مقابلہ میں کھلونے کے مصنوعی شیر کی ہوکر رہ گئی، غرض کہ جو لوگ اپنی اسلام دشمنی کو روشن خیالی کے پردہ میں چھپاتے ہیں اور جو جماعتیں کھلے عام مسلمانوں کی مخالفت کو اپنا ایجنڈہ بنائے ہوئی ہیں، وہ بے چین ہیں کہ کسی طرح مسلمانوں کا یہ اتحاد پارہ پارہ ہوجائے، بدقسمتی سے بعض اوقات مسلمان صحافیوں اور قانون دانوں کی طرف سے بھی ایسے مضامین سامنے آتے ہیں تو افسوس بھی ہوتا ہے اور اپنے ان بھائیوں کی سادہ لوحی

پر ترس بھی آتا ہے کہ وہ ایسی تحریروں کے ذریعہ اعداء اسلام کے سوا اور کس کو تقویت پہنچا رہے ہیں؟ اگر انہیں بورڈ سے شکایت تھی — جو زیادہ تر ناواقفیت پر مبنی ہے — تو وہ براہ راست بورڈ کے ذمہ داروں سے گفتگو کر سکتے تھے اور اپنی شکایت پیش کر سکتے تھے، اس کے بجائے ہر مسئلہ کو ذرائع ابلاغ کا عنوان بنا دینا موجودہ حالات میں اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنا ہے، — کاش، ہم سمجھ داری سے کام لیں، نقش دیوار کو پڑھیں اور حالات کے تیور کو پہچانیں؛ کہ قومیں جوش و جذبہ سے کامیابی کا سفر طے نہیں کرتیں، غور و فکر اور تدبر کے ذریعہ منزل تک پہنچتی ہیں!

❁

نظامِ دارالقضاء اور سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ

اللہ تعالیٰ نے انسان ہی کے لئے یہ دنیا بسائی ہے؛ لیکن یہ کائنات ہمیشہ کی قیام گاہ نہیں ہے، یہ ایک مسافر خانہ ہے، جہاں کچھ عرصہ رہ کر انسان آخرت کی طرف چلا جاتا ہے اور یہ اس کے لئے عرصۂ امتحان ہے، جس میں اللہ اپنے بندوں کو آزماتے ہیں، کہ وہ کس حد تک احکامِ خداوندی کا پابند رہتا ہے، اس لئے انسان کے اندر خواہشات اور آرزوئیں تو بہت رکھی گئی ہیں؛ مگر اس کے گرد پھیلی ہوئی دنیا میں وسائل محدود رکھے گئے ہیں، جن سے اس کی تمام خواہشات پوری نہیں ہوسکتیں، اسی وجہ سے خواہشات میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے اور اسی ٹکراؤ سے جھگڑے جنم لیتے ہیں۔

اس صورتحال کا علاج یہی ہوسکتا ہے کہ سماج میں کوئی ایسا ادارہ موجود ہو، جو فریقین کے معاملات کو سنے اور انصاف کے مطابق فیصلہ کرے؛ تاکہ ظالم کو ظلم سے روکا جاسکے اور مظلوم کو اس کا حق مل سکے، اسی ادارہ کا نام ''دارالقضاء'' ہے، اس لئے اسلام کے ابتدائی عہد سے ہی قضاء کا نظام قائم رہا، رسول اللہ ﷺ پیغمبر بھی تھے اور قاضی بھی، مسجد نبوی آپ کی عدالت تھی، اس عدالت میں سول معاملات سے لے کر تعزیری مقدمات تک ہر معاملہ فیصل ہوتا تھا، علامہ ابن قیمؒ نے رسول اللہ ﷺ کے ان عدالتی فیصلوں کو ''أقضیۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' کے نام سے جمع فرمایا، جس کا اُردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

آپ ﷺ نے نہ صرف خود فیصلے فرمائے؛ بلکہ قضاء کے بنیادی اُصول کی بھی رہنمائی فرمائی، اپنے سامنے بعض مقدمات کی سماعت کرائی، اور ان سے فیصلہ کرایا؛ تاکہ ان کی تربیت ہوسکے، حضرت علیؓ کو سب سے بہتر قاضی ہونے کی سند دی اور حضرت معاذ ابن جبلؓ کو قاضی مقرر کرتے ہوئے ان کا امتحان لیا اور مطمئن ہونے کے بعد ہی ان کو یہ ذمہ داری سونپی، رسول اللہ ﷺ کی ان تعلیمات کا نتیجہ ہے کہ عدالتی قوانین پر مسلمان علماء ومصنفین نے بڑا کام کیا، نہایت باریک بینی کے ساتھ عدالتی نظام کی تفصیلات کو واضح کیا اور اس موضوع پر اتنی کتابیں لکھی گئیں کہ جس کو ایک کتب خانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، نظام قضاء قائم کرنے کو اُمت مسلمہ کا شرعی فریضہ قرار دیا گیا ہے، جہاں مسلم حکومت ہو، وہاں تو خود حکومت اس ذمہ داری کو انجام دے گی اور جہاں مسلم حکومت نہیں ہے، وہاں مسلم سماج کے علماء وخواص کی ذمہ داری ہے کہ وہ دارالقضاء کا نظام قائم کریں، رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ اور حضرت معاذ بن جبل کو یمن کے دو الگ الگ علاقوں کا قاضی مقرر فرمایا تھا؛ حالاں کہ اس وقت پورا یمن دامن اسلام میں نہیں آیا تھا، یہ عہد نبوت کی نظیر ہے کہ مسلمان اقلیتوں پر بھی نظام قضاء کا قائم کرنا واجب ہے، اندلس میں جب مسلمانوں کی پسپائی ہوئی تو وہاں کچھ ایسے علاقے باقی رہ گئے، جہاں مسلمان آباد تھے، اس وقت مشہور حنفی فقیہ علامہ کمال الدین ابن ہمام نے غالباً پہلی بار فتویٰ دیا کہ ان مسلمان اقلیتوں پر قاضی کا تقرر شرعاً واجب ہے، اس کے بعد ابن قاضی سماوہ، علامہ علاء الدین حصکفی، علامہ ابن عابدین شامی، علامہ ابن نجیم مصری، علامہ طحطاوی اور مختلف دوسرے فقہاء نے یہی بات لکھی، فقہ کی بہت سی کتابوں میں اس کی صراحت موجود ہے۔

ہندوستان میں دارالقضاء کی تاریخ بڑی قدیم ہے، بعض عرب سیاحوں کے سفرناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مسلم حکومت سے پہلے بھی ہندو راجاؤں کے تحت جنوبی ہند کے علاقہ میں مسلمانوں کے لئے قاضی ہوا کرتے تھے، جن کو ''ہنرمن'' یا ''ہنرمند'' کہا جاتا تھا، پھر جب مغل حکومت کا زوال ہونے لگا اور ہندوستان پر برطانوی تسلط مکمل ہونے کے قریب پہنچ گیا تو علماء ہند میں سب سے پہلے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے فتویٰ دیا کہ مسلمانوں کو اپنا نظام قضاء قائم کرنا چاہئے اور اسی وقت سے ملک کے مختلف خطوں میں اس قسم کی کوششیں شروع ہوگئیں، جس کو شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کے شاگرد رشید مفکر اسلام مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نے ریاست بہار میں اوجِ کمال پر پہنچادیا اور ایک مستحکم اور منظم نظام دارالقضاء کو وجود بخشا، یہ ریاست اُس وقت موجودہ بہار، اُڑیسہ، جھارکھنڈ اور مغربی بنگال کے کچھ علاقے پر مشتمل تھی، یہ اتفاق ہے کہ بہار کے بعد اس طرح کے منظم نظام میں آسام نے سبقت کی اور وہاں سات مشرقی ریاستوں پر مشتمل امارت اور قضاء کا نظام قائم ہوا، اس کے علاوہ جنوبی ہند کے ایک اہم شہر بھٹکل میں کئی صدی پرانا نظام قضاء قائم ہے، گذشتہ پچاس سال کے عرصہ میں کرناٹک، آندھرا پردیش، نیز مہاراشٹرا اُتر پردیش، مدھیہ پردیش اور ملک کے مختلف حصوں میں دارالقضاء قائم ہیں، ان سب کی تعداد ڈیڑھ سو سے بھی زیادہ ہوگی۔

دارالقضاء مسلمانوں کے لئے ایک شرعی ضرورت ہے؛ کیوں کہ بہت سے معاملات وہ ہیں جن میں ایک مسلمان قاضی ہی کا فیصلہ معتبر ہوتا ہے، ورنہ وہ فیصلہ شریعت کی نظر میں کالعدم ہے؛ لیکن اس کے علاوہ سماجی اعتبار سے بھی دارالقضاء کے بڑے فوائد ہیں، ہمارے مروجہ سرکاری عدالتی نظام میں انصاف بہت مہنگا پڑ جاتا ہے، لوگوں کا گھر بک جاتا ہے، اچھا خاصا صاحب ثروت آدمی قلاش ہوجاتا ہے، اگر خدانخواستہ سپریم کورٹ تک مقدمہ چلا گیا تو وکیل کی ایک پیشی کی فیس لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے، دوسری دشواری مقدمہ کی طوالت ہے، عام نوعیت کے مقدمات کو فیصل کرنے میں بھی دس دس سال کا عرصہ گذر جاتا ہے اور اگر ہائی کوٹ اور سپریم کورٹ تک اپیل کی نوبت آ گئی تو پانچ دس سال اس میں لگ جاتے ہیں، یعنی انصاف کے انتظار میں بسا اوقات ایک شخص جوانی سے بڑھاپے تک کا سفر طے کر لیتا ہے، اس کا ایک سبب تو عدالتوں پر مقدمات کا غیر معمولی بوجھ ہے، اس وقت صرف ہائی کورٹوں میں لاکھوں مقدمات زیر التواء ہیں، دوسرا سبب وکلاء کی طرف سے مقدمہ کو طول دینے کی کوشش ہے، جس میں مختلف بہانوں سے پیشیاں ملتوی کرائی جاتی ہیں اور فیصلہ میں زیادہ سے زیادہ تاخیر کرائی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ ایک اہم پہلو دینی اور اخلاقی بھی ہے، شائد کوئی مقدمہ ایسا ہو جس میں مدعی اور اس کے گواہوں کو دعویٰ ثابت کرنے کے لئے اور مدعا علیہ اور اس کے گواہوں کو رفع الزام کے لئے حلف لے کر اور قرآن مجید اُٹھا کر کئی کئی جھوٹ بولنے نہ پڑتے ہوں، پھر خواتین کے معاملات میں بعض دفعہ مخالف وکیل ان کو مرعوب کرنے اور دہشت میں مبتلا کرنے کے لئے اوچھے سوالات نہ کرتے ہوں، جن کا جواب دینا حیا کے مغائر ہوتا ہے، سرکاری عدالتوں میں رُجوع کرنے کی ان دشواریوں کی وجہ سے بھی دارالقضاء کا نظام بحمداللہ مسلم سماج میں مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ پورے ملک میں اس نظام کو سراہا جاتا؛ کہ اس سے مسلمانوں اور خاص کر مسلم خواتین کو بڑی سہولت حاصل ہو رہی ہے اور یہ حکومت کی اِس سوچ کے عین مطابق ہے کہ زیادہ سے زیادہ نزاعات کو عدالت سے باہر طے کرنے کی کوشش کی جائے؛ لیکن بدقسمتی سے کوئی بھی ایسی چیز جو مسلمانوں سے متعلق ہو، فرقہ پرست عناصر کی نگاہوں میں کھٹکتی رہتی ہے؛ چنانچہ دارالقضاء کے خلاف ۲۰۰۵ء میں وشولوچن مدن نامی شخص نے سپریم کورٹ سے رُجوع کیا تھا اور اس میں اس نظام کو

متوازی عدالت قرار دیتے ہوئے اس پر پابندی لگانے کی درخواست کی گئی تھی، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اس مقدمہ میں فریق بنتے ہوئے بھرپور پیروی کی، وکلاء اور علماء نے مل کر بیان تحریری تیار کیا اور حکومتوں نے بھی جن کو اصلاً مقدمہ میں فریق بنایا گیا تھا، اسی کے موافق اپنا جواب داخل کیا، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ۷ رجولائی ۲۰۱۴ء کو جسٹس سی کے پرشاد نے اپنا فیصلہ سنایا، فیصلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ وشولوچن کی درخواست خارج کر دی گئی ہے، کورٹ نے اپنے فیصلہ میں کہا ہے کہ دو شخص اپنے ذاتی تنازعات کو حل کرنے کے لئے دارالقضاء کو جا سکتے ہیں، اور دارالقضاء کی حیثیت متوازی عدالت کی نہیں ہے؛ کیوں کہ وہ بزور طاقت اپنا فیصلہ نافذ نہیں کرتی، فریقین کے اختیار سے ہی فیصلہ نافذ ہوتا ہے، کورٹ نے اس بات کا بھی اعتراف کیا کہ اس سے عدالتوں پر مقدمات کا بوجھ کم ہوتا ہے؛ البتہ یہ بات ظاہر ہے کہ جب تک فریقین حاضر نہ ہوں، دارالقضاء کے فیصلے اگرچہ شرعاً معتبر ہوتے ہیں؛ لیکن قانوناً فریقین پر لازم نہیں ہوتے، یہ صورتحال اس فیصلہ سے پہلے بھی تھی اور ابھی بھی برقرار ہے۔

یہ بات حد درجہ افسوس ناک ہے کہ پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا نے اس فیصلہ کی بالکل خلاف واقعہ رپورٹنگ کی اور یہ تاثر دیا کہ عدالت نے دارالقضاء پر پابندی لگا دی ہے؛ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اب اس سلسلہ میں مسلم سماج کی ذمہ داری کیا ہے؟ اس سلسلہ میں پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ مسلمان اپنے عائلی مقدمات میں دارالقضاء سے رُجوع کرتے رہیں، چاہے ان کو فائدہ ہو یا نقصان، وہ شریعت کے حکم پر اپنے آپ کو راضی رکھیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> آپ کے پروردگار کی قسم! وہ مسلمان ہو ہی نہیں سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں آپ کو (یعنی شرعی نقطۂ نظر سے فیصلہ کرنے والے کو) حکم نہ مان لیں، پھر یہاں سے جو فیصلہ ہو اس کے بارے میں اپنے دل میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں، اور اس فیصلہ کے سامنے سر نہ جھکا دیں۔ (النساء: ۶۵)

اس لئے جن دو مسلمانوں کے درمیان کوئی نزاع پیدا ہوئی ہو، ان کا شرعی فریضہ ہے کہ اگر ان کے درمیان کوئی اختلاف ہو جائے تو وہ خود اپنا مقدمہ دارالقضاء میں لائیں اور دوسرے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کو عدالت کے چکر لگانے اور پیسہ، وقت اور عزت و آبرو کو کھونے کے بجائے دارالقضاء سے رُجوع کرنے کا مشورہ دیں، اگر مسلمانوں میں خود یہ مزاج پیدا ہو جائے تو

دارالقضاء پر کوئی انگلی نہیں اُٹھا سکتا۔

اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو یہ کوشش جاری رکھنی چاہئے کہ دارالقضاء کے اس نظام کو قانونی طور پر عدالتی اختیارات حاصل ہوجائیں، جیسا کہ بعض قبائلی علاقوں میں قبائلی پنچائتوں کو حکومت نے دیا ہے، آزادی سے پہلے بھی علماء نے اس طرح کی کوششیں کی ہیں اور آزادی کے بعد بھی ایسی کوششیں کی جاتی رہیں ہیں، اب بھی یہ کوشش جاری رہنی چاہئے، بعض دفعہ سفر طویل ہوتا ہے؛ لیکن راہ رو ہمت نہ ہارے اور چلتا رہے تو بالآخر منزل اس کا استقبال کرتی ہے اور کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔

نکاح کی عمر

دہلی ہائی کورٹ کے ایک دورکنی بنچ نے — جو جسٹس رویندر بھٹ اور جسٹس ایس پی گارک پر مشتمل تھا — ایک اہم فیصلہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ پندرہ سال کی مسلمان لڑکی اپنی پسند کے مطابق خود اپنی شادی کرسکتی ہے، بشرطیکہ وہ بالغ ہوچکی ہو، بنچ نے سپریم کورٹ کے بعض فیصلوں کا حوالہ بھی دیا ہے اور قانون فطرت کو بھی ملحوظ رکھا ہے، یہ فیصلہ بظاہر اس قانون سے مختلف ہے، جس میں اٹھارہ سال سے کم عمر کی لڑکی اور اکیس سال سے کم عمر کے لڑکے کے نکاح سے منع کیا گیا ہے، اس طرح کا قانون آزادی سے پہلے بھی ''شاردا ایکٹ'' کے نام سے بنا تھا، جس میں حالت نابالغی میں نکاح کو غیر قانونی قرار دیا گیا تھا، اس وقت بھی مسلمانوں نے اس کی سخت مخالفت کی تھی اور اسے شریعت اسلامی میں مداخلت قرار دیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ نکاح عام افعال کی طرح کوئی فعل نہیں ہے، جس کا کرنا یا نہ کرنا برابر ہو؛ بلکہ یہ انسان کی ایک فطری ضرورت ہے کیوں کہ نسل انسانی میں تسلسل کا برقرار ہونا ضروری ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مرد کے باپ بننے اور عورت کے ماں بننے کی حقیقی صلاحیت کے لحاظ سے انسان کے اندر بچوں کی پیدائش بہت کم ہوتی ہے اور اس پیدائش کا ذریعہ اللہ نے ماں باپ کو بنایا ہے، نکاح سے گریز کے رجحان کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض نسلیں اپنے وجود کو کھونے کے قریب ہیں، متعدد مغربی ممالک میں یہ صورت حال ہے کہ تارکین وطن کی آبادی مقامی آبادی سے بڑھ چکی ہے، اگر صحیح عمر میں نکاح ہو تو نسلی سلسلہ کے برقرار رہنے کے امکانات زیادہ ہوں گے، نکاح کا دوسرا مقصد عفت وعصمت کی حفاظت ہے، اللہ تعالیٰ نے نکاح کے پہلے مقصد کو پورا کرنے کے لئے انسان کے اندر اپنی صنف مخالف کی طرف غیر معمولی میلان رکھ دیا ہے، اگر انسان کے اس جذبہ کی تکمیل قانونی راستہ سے نہ ہوتو آدمی غیر قانونی راستہ اختیار کرنے لگتا ہے، اس سے معاشرہ میں گندگی پھیلتی ہے، بے حیائی جنم لیتی ہے اور اخلاق کے لباس تار تار ہونے لگتے ہیں، بالغ ہونے کے ساتھ ہی انسان کا یہ فطری جذبہ بیدار ہونے لگتا ہے، نکاح کے ذریعہ ایک قانونی راستہ فراہم ہوجاتا ہے اور انسان اپنے آپ کو غیر قانونی

راستہ سے محفوظ کر لیتا ہے؛ اسی لئے قرآن مجید میں شادی شدہ شخص کے لئے ''محصن'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کے اصل معنیٰ ''قلعہ بند'' کے ہیں، یعنی جو شخص نکاح کر لیتا ہے؛ گویا وہ اپنے آپ کو عفت وعصمت کے قلعہ میں محفوظ کر لیتا ہے۔

نکاح کا تیسرا اہم مقصد انسان کو ایک پُرسکون زندگی فراہم کرنا ہے، دنیا کا نظام کچھ اس طرح ہے کہ اس میں بہت سی باتیں طبیعت ومزاج کے خلاف پیش آتی ہیں، انسان جو کچھ کرنا چاہتا ہے، نہیں کر پاتا، جن کاموں کو نہیں کرنا چاہتا ہے، ان کو انجام دینا پڑتا ہے، مختلف ایسے لوگوں سے اس کا سابقہ پیش آتا ہے، جن سے مزاج کی موافقت نہیں ہوتی، ان حالات میں ہر شخص کو ایسے مونس وغم خوار کی ضرورت پڑتی ہے، جس کو وہ اپنا دکھ سنا سکے، اسی کیفیت کو قرآن مجید نے ''سکون'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اور نکاح کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ یہ تمہارے لئے سکون کا ذریعہ ہے: ﴿لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا﴾ (الروم:۲۱)

یہ تمام مقاصد وہ ہیں، جو بالغ ہونے کے ساتھ ہی انسان سے متعلق ہو جاتے ہیں، بالغ ہونے کے بعد وہ اس لائق ہو جاتا ہے کہ نسل انسانی کی افزائش کے نظام میں اپنا کردار ادا کر سکے، ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کے بعد اس کی نسل باقی رہے اور اس کا نام چلتا رہے، اگر ایک انسان کا نکاح بالغ ہونے کے بعد جلد ہو جائے؛ لیکن قدرت کی طرف سے ان کو زیادہ عمر نہ مل پائے تب بھی اس کا امکان ہوتا ہے کہ اس کی نسل کا سلسلہ چل پڑے، بالغ ہونے کے ساتھ ہی ایک لڑکے یا لڑکی کو پاکدامن رہنے کے لئے رفیق سفر کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے، بعض دفعہ جوان ہوتے ہی مرد کو اکثر اور اب تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے بعض لڑکیوں کو بھی گھر کی ذمہ داری سنبھالنی پڑتی ہے، اور اس میں اس کی زندگی ٹینشن اور تناؤ کا شکار ہونے لگتی ہے، جس کی وجہ سے اس کو سکون، ضرورت ہوتی ہے، غرض کہ نکاح کے تینوں مقاصد انسان سے بالغ ہونے کے ساتھ ہی متعلق ہو جاتے ہیں؛ اسی لئے شریعت میں افضل طریقہ یہ ہے کہ بالغ ہونے کے بعد جب بھی نکاح کی ضرورت محسوس کرے، نکاح کر لے، خواہ مخواہ تاخیر نہ کی جائے؛ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے نوجوانو! تم میں سے جس کے اندر نکاح کے بعد کی ضروریات پوری کرنے کی صلاحیت ہو، اسے نکاح کر لینا چاہئے، اس سے تمہاری آنکھیں بھی پاکدامن رہیں گی اور تمہاری شرمگاہیں بھی: **''یا معشر الشباب من استطاع منکم الباء**

ۃ فلیتزوج فإنه أغض للبصر وأحصن للفرج" (صحیح مسلم, کتاب النکاح, باب استحباب النکاح لمن تاقت نفسه إلیه۔۔۔، حدیث نمبر:۳۴۸۵)۔

اِس وقت مغربی معاشرہ میں شرح نکاح کم ہوتی جارہی ہے اور جو لوگ نکاح کرتے ہیں، وہ بھی ایسی عمر میں کہ شباب ڈھلنے لگتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شرح پیدائش میں بھی خوفناک حد تک کمی ہوتی جارہی ہے، اگر تارکین وطن کی آمد نہ ہوتو ان کی صنعت ومعیشت ٹھپ ہوکر رہ جائے، شادی نہ کرنے یا کافی تاخیر سے کرنے کی وجہ سے عفت وعصمت مغربی سماج میں ایسے الفاظ ہوکر رہ گئے ہیں، جن کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے، اگر ہم اپنے سماج کو اس لعنت سے بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں بالغ ہونے کے بعد جلد شادی کرنے کے رجحان کو بڑھانا چاہئے، ورنہ یہی مفاسد ہمارے یہاں بھی آ پہنچیں گے؛ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ایک طرف ہمارے ملک میں اٹھارہ سال سے کم عمر کی لڑکی کی شادی نہیں ہوسکتی، اگر شادی ہوئی تو لڑکا اور لڑکی کے والد دونوں مجرم قرار پاتے ہیں، دوسری طرف سولہ سال یا اس سے زیادہ عمر کی لڑکی سے جبر واکراہ کے بغیر جنسی تعلق قائم کیا جائے تو وہ جرم نہیں، گویا سولہ سال کی عمر کی لڑکی زنا کا ارتکاب تو کرسکتی ہے؛ لیکن نکاح نہیں کرسکتی، اگر نکاح کرے تو یہ جرم ہوگا، غور کیا جائے کہ یہ کتنا غیر فطری، اخلاق کے لئے تباہ کن اور عورتوں کے ناموس سے کھیلنے والا قانون ہے، جو حیاباختگی کی اجازت تو دیتا ہے؛ لیکن جائز طریقہ پر عزت وآبرو کی حفاظت کے ساتھ فطری ضرورت کو پوری کرنے کی اجازت نہیں دیتا؛ اس لئے ایسی قانون سازی ہونی چاہئے، جس میں اٹھارہ اور اکیس سال سے پہلے نکاح کرنا ممنوع نہ ہو؛ بلکہ ہر شخص کو اس کی ضرورت وخواہش کے مطابق نکاح کرنے کی اجازت حاصل ہو، اس کو اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھنا چاہئے کہ نکاح کب کیا جائے اور کس سے کیا جائے؟ یہ ایسے امور میں نہیں ہے، جس میں تمام لوگوں کی خواہش یکساں ہو، ہر شخص ایک ہی عمر میں شادی کرنا نہیں چاہتا، اسی طرح نکاح کی ضرورت تمام لوگوں کو ایک ہی عمر میں اور ایک ساتھ پیش نہیں آتی؛ اس لئے اس میں کسی خاص عمر کی قدغن لگادینا غیر فطری بات ہے۔

شریعت اسلامی کا تصور یہ ہے کہ بالغ ہونے کے بعد جلد نکاح کرنا افضل ہے، خود قرآن مجید میں اس کا اشارہ موجود ہے، فرمایا گیا کہ تم یتیموں کو امانت اس وقت حوالہ کرو، جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں: ﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ﴾ (النساء:٦) مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد بالغ ہونا ہے

(أحکام القرآن للجصاص: ۲/۶۳، جلالین،ص:۷۰)؛ چنانچہ عام طور پر عہد نبوی اور عہد صحابہ میں بالغ ہونے کے بعد ہی نکاح کا معمول رہا ہے،اس کے دو فائدے ہیں: ایک یہ ہے کہ نکاح میں اصل یہ ہے کہ نکاح خود عاقدین کے اختیار اور اس کی رضا مندی سے ہو،اس پر اولیاء کی طرف سے کوئی رشتہ تھو پا نہیں جائے،اور یہ بات اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب لڑکے اور لڑکی کے بالغ ہونے کے بعد نکاح ہو،دوسرے: نابالغی کی حالت میں جو نکاح ہوتا ہے،اس میں لڑکے اور لڑکی کی مستقبل کی شخصیت کا صرف اندازہ کیا جاتا ہے، ابھی شخصیت تکمیل و ارتقاء کے مرحلہ میں ہوتی ہے اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت جو توقعات کی جاتی ہیں، وہ بعد کو پوری نہیں ہو پاتیں؛اس لئے افضل طریقہ یہی ہے کہ بالغ ہونے کے بعد نکاح ہو اور عمر نکاح کا انتخاب کرنے میں عاقدین کی صحت کے پہلو کو بھی ملحوظ رکھا جائے،لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔

اسلام کی نظر میں نابالغ لڑکے اور لڑکی کا نکاح بھی ولی کی وساطت سے ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ بعض دفعہ بچوں کا مفاد اسی میں ہوتا ہے،مثلاً: آپ ایک ایسی لڑکی کا تصور کیجئے،جس کی ماں دنیا سے رخصت ہوچکی ہو،اس کے بھائی بہن نہ ہوں، یا بھائی ہو تو اپنی بہن کے ساتھ اس کا رویہ ہمدردانہ نہ ہو، رشتہ دار حضرات اس کی دولت پر نظریں گڑائے ہوئے ہوں، اندیشہ ہو کہ یہ کسی نامناسب لڑکے سے لڑکی کا رشتہ کر کے پوری دولت پر قابض ہوجائیں گے،ان حالات میں بستر مرگ پر پڑے ہوئے باپ کے سامنے لڑکی کا مناسب رشتہ موجود ہے، وہ چاہتا ہے کہ اپنی لڑکی کو جو ابھی بالغ نہیں ہوئی ہے، اس کے حوالہ کردے؛ تاکہ اس کے مفادات کا تحفظ ہو اور اس کی چھوڑی ہوئی دولت سے اس کی لڑکی کو محروم نہ کیا جاسکے، ان حالات میں مصلحت کا تقاضہ کیا ہے، یہ کہ وہ اس لڑکی کو بے سہارا چھوڑ کر چلا جائے یا یہ کہ وہ اس کے لئے ایک غمگسار و مددگار فراہم کرکے دنیا سے جائے ؟ ظاہر ہے کہ ہر صاحب عقل کا جواب یہی ہوگا کہ یہ دوسری صورت زیادہ بہتر ہے؛اس لئے یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ نابالغی کا نکاح ہر حال میں نقصان دہ ہوتا ہے؛ اسی لئے اسلام میں پسندیدہ طرز عمل تو یہ ہے کہ بالغ ہونے کے بعد خود لڑکے اور لڑکی کی پسند کے مطابق نکاح ہو، ولی اس میں تعاون کرے، اور ان کو مناسب مشورہ دے؛ لیکن شریعت نے حالت نابالغی میں بھی نکاح کی گنجائش رکھی ہے، اگر رشتہ کے انتخاب میں لڑکے اور لڑکی کے مفادات کو سامنے نہیں رکھا گیا ہو تو اس کی تلافی کے لئے انہیں اس رشتہ کو

رد کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، جس کو فقہ کی اصطلاح میں ''خیار بلوغ'' کہتے ہیں، اگر باپ اور دادا کے علاوہ کسی اور نے نکاح کیا ہو تب تو بہر صورت عاقدین کو اس کا اختیار حاصل ہوتا ہے، اگر باپ اور دادا نے ہی نکاح کیا ہو تب بھی چار صورتوں میں عاقدین نکاح کو رد کر سکتے ہیں: اول: یہ کہ نکاح کرنے میں واضح طور پر زیر ولایت لڑکے اور لڑکی کے مفاد کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہو، دوسرے: ولی پہلے سے اپنے اختیارات کے غلط استعمال میں معروف ہو — فقہ کی اصطلاح میں اس کو ''معروف بسوء الاختیار'' کہتے ہیں — تیسرے: ولی نہایت بے حیا اور آوارہ قسم کا آدمی ہو — جس کو فاسق متہتک کہا جاتا ہے — چوتھے: اس نے ایجاب وقبول حالت نشہ میں کیا ہو، ان تمام صورتوں میں بالغ ہونے کے بعد لڑکے یا لڑکی کو حق حاصل ہے کہ زمانہ نابالغی کے نکاح کو رد کر دے، اس طرح حالت نابالغی کے نکاح میں جن نقائص کے رہ جانے کا امکان ہے، ان کی تلافی کی صورت بھی رکھی گئی ہے۔

پس، عدالت کے اس فیصلہ کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ قانون شریعت کو نصف حد تک اس نے تسلیم کر لیا ہے:

شرما گئے، لجا گئے، دامن چھڑا گئے
اے عشق! مرحبا کہ وہ یہاں تک تو آ گئے

نکاح کا لازمی رجسٹریشن

خدا نے انسان کی فطرت میں انس ومحبت رکھی ہے، وہ خود محبت کا پیکر اور دوسروں کی محبت کا بھوکا ہے؛ اسی لئے انسان کو قدرت نے ایک وسیع خاندان عطا کیا ہے، جس میں اس کا دادیہال بھی ہے، نانیہال بھی ہے اور سسرال بھی، یہ تمام رشتے بنیادی طور پر نکاح ہی کی دَین ہیں، دادیہال اور نانیہال ماں باپ کے نکاح سے وجود میں آتا ہے اور سسرال خود اس کے نکاح سے؛ اس لئے اسلام میں نکاح کی خاص اہمیت ہے، اس کی بڑی حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور تجرد کی زندگی سے منع کیا گیا ہے، قرآن مجید میں نکاح سے متعلق مضامین اتنی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں کہ نماز کے احکام بھی اتنی تفصیل سے وارد نہیں ہوئے، یہاں تک کہ ہمارے فقہاء نے شادی شدہ زندگی گزارنے کو نفل عبادت کی کثرت سے بھی بہتر قرار دیا ہے۔

شریعتِ اسلامی میں نکاح بنیادی طور پر ایک معاہدہ ہے، جس میں میاں بیوی ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے اور زندگی کے سرد وگرم میں ایک دوسرے کے ساتھ رفاقت کو نباہنے کا وعدہ کرتے ہیں؛ اسی لئے جیسے تمام معاہدات ایجاب وقبول کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں، نکاح بھی ایجاب وقبول کے ذریعہ ہی منعقد ہوتا ہے، ایجاب سے مراد ہے ایک فریق کی طرف سے کسی معاملہ کی پیش کش، اور قبول سے مراد ہے دوسرے شخص کی طرف سے اس پیشکش کو تسلیم کر لینا اور فریقین کا اس پر راضی ہو جانا؛ البتہ نکاح میں معاہدہ ہونے کے ساتھ ساتھ تقدس کا پہلو بھی ہے؛ کیوں کہ اس سے نسل انسانی کی بقا متعلق ہے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کی مبارک سنت ہے اور اس میں عزت و آبرو کی حفاظت اور گناہ سے بچاؤ بھی ہے، اسی لئے یہ ایک مقدس اور اہم ترین معاہدہ ہے؛ چنانچہ نکاح سے بعض ایسی شرائط اور آداب متعلق کئے گئے ہیں، جو دوسرے معاہدات میں نہیں ہیں۔

جیسے نکاح میں مہر کو ضروری قرار دیا گیا ہے، یہاں تک کہ اگر عورت بغیر مہر کے نکاح کرنے پر راضی ہو جائے، تب بھی مہر واجب ہوگا، اسی طرح عام معاملات میں گواہان کا ہونا مستحب تو ہے واجب نہیں؛ لیکن نکاح میں ایجاب وقبول کے وقت دو مسلمان مردوں اور مرد نہ ہو تو ایک مرد اور دو عورتوں کا

ہونا ضروری ہے، سیدنا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے لئے جو شرطیں نقل فرمائی ہیں، ان میں ایک یہی گواہان کا ہونا ہے، (**اعلاء السنن: ۱۱/۱۷، بحواله صحیح ابن حبان**) اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ نکاح بغیر گواہان کے نہیں ہوسکتا ''**لا نكاح إلا ببينة**'' (**ترمذی: ۱۱۰۴**) نیز نکاح کے مستحبات میں سے یہ بھی ہے کہ خطبہ ہو، نکاح اظہار واعلان کے ساتھ ہو اور اس میں دعوتِ ولیمہ کا اہتمام ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمولِ مبارک معاہدات کو تحریر میں لانے کا تھا، صلح حدیبیہ میں جو معاہدہ طے ہوا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو املاء کرایا اور انھوں نے اسے لکھا، حدیث وسیرت کی بیشتر کتابوں میں اس کا ذکر ہے، اسی طرح جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی اور مدینہ تشریف لے گئے تو مسلمان اور یہودی کے قبائل کے درمیان کچھ اُصول پر معاہدہ ہوا، جس کا حاصل یہ تھا کہ سب لوگ ایک دوسرے کی جان و مال اور عزت وآبرو کا احترام کریں گے اور اپنے اپنے طریقہ پر زندگی گزاریں گے؛ البتہ اگر کوئی باہر سے حملہ آور ہو تو سب مل کر مدافعت کریں گے، اس معاہدہ کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوایا ہے اور تمام قبائل کے نمائندوں سے اس پر دستخط لیا ہے، یہ معاہدہ 'میثاقِ مدینہ' کہلاتا ہے، جو ۵۲ دفعات پر مشتمل تھا، بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاہدے لکھوائے ہیں، ان کی تعداد ساڑھے چار سو کے قریب ہے۔ (دیکھئے: ڈاکٹر محمود احمد غازی کی محاضراتِ حدیث: ۲۷۳)

''معاہدات'' اجتماعی اور بین الاقوامی سطح کے بھی ہوتے ہیں کہ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ اجتماعی حیثیت میں کوئی معاملہ طے کرے، اور معاہدات شخصی اور انفرادی بھی ہوتے ہیں کہ فرد فرد کے ساتھ معاہدہ کرے، جیسے خرید وفروخت، ہبہ، وغیرہ، ایسے معاہدات کو لکھنا بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؛ چنانچہ حدیث کی کتابوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خرید وفروخت کے معاہدہ کو تحریر میں لانے کا ذکر آیا ہے، ایسے ہی انفرادی اور شخصی معاملات کے بارے میں —— خاص کر اس وقت جب اس معاہدہ سے متعلق کسی شئ کی ادائیگی باقی ہو —— تحریر میں لے آنے کی قرآن مجید نے ترغیب دی ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْہُ ﴾ (البقرہ: ۲۸۲) جب ایک متعین مدت کے لئے دَین کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو، اسی لئے قضاء پر جو

کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں اہل علم نے ایک مستقل باب ''شروط'' کا قائم کیا ہے، ''شروط'' سے مراد دراصل یہی دستاویزات ہیں جو کسی معاملہ سے متعلق لکھی جاتی ہیں۔

اس پس منظر میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ معاہدۂ نکاح کو تحریر میں لانا مستحب ہے، اس کے ذریعہ نکاح کا ریکارڈ محفوظ ہوجاتا ہے، اگر خدانخواستہ زوجین میں سے کوئی نکاح کا انکار کردے، بچہ کے نسب کو مشکوک کرنے کی کوشش کی جائے، مہر کے سلسلہ میں نزاع پیدا ہو یا میراث کے مستحق ہونے اور نہ ہونے کی بابت کوئی اختلاف کھڑا ہو، تو نکاح کا لکھا ہوا دستاویز ان مواقع پر صحیح نتیجہ تک پہنچنے اور نزاع کو ختم کرنے میں معاون ہوسکتا ہے؛ اس لئے نکاح کا رجسٹریشن اور اس کو تحریر میں لے آنا شریعت کے مزاج و مذاق کے عین مطابق ہے؛ چنانچہ مسلم معاشرہ میں طویل عرصہ سے نکاح کی تفصیلات کو درج رجسٹر کرانے کا معمول رہا ہے، اور' آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ' نے بھی اپنی بعض تجاویز میں مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ وہ اپنے طور پر نکاح کے رجسٹریشن کا نظام قائم کریں، نیز بورڈ نے اس سلسلہ میں ایک ''نکاح نامہ'' بھی مرتب کیا ہے۔

سپریم کورٹ نے حکومتِ ہند کو حکم دیا ہے کہ نکاح کے رجسٹریشن سے متعلق قانون سازی کی جائے اور مرکزی حکومت اب اس سلسلہ میں پیش قدمی کرنا چاہ رہی ہے، جہاں تک رجسٹریشن کی بات ہے تو مسلمان اس کے مخالف نہیں ہیں، بلکہ ہندوستان کے بعض علاقوں خاص کر دکن اور بھوپال میں پہلے سے وقف بورڈ کے ذریعہ نکاح کے اندراج کا نہایت منضبط طریقہ موجود ہے اور اس پر عمل بھی کیا جاتا ہے، اسی طرح ملک کے بڑے شہروں میں ائمۂ مساجد کے پاس نکاح کے رجسٹروں موجود ہوتے ہیں، لوگ ان رجسٹروں میں نکاح کی تفصیلات درج کراتے ہیں، لیکن ہم اس کو لازم قرار دینے کے مخالف ہیں، اور یہ بات کہ نکاح کے ثبوت کے لئے صرف رجسٹریشن ہی کو تسلیم کیا جائے اور اس کے بغیر نکاح کو معتبر نہیں سمجھا جائے، قطعاً نا قابل قبول ہے؛ کیوں کہ شریعت میں کسی امر کو ثابت کرنے کے اُصول مقرر ہیں، اگر دو معتبر مسلمان مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں اپنے مشاہدہ یا خاندان اور محلہ میں شہرت کی بنیاد پر نکاح کی گواہی دیں تو یہ نکاح کے ثابت ہونے کے لئے کافی ہے؛ اس لئے نکاح کے رجسٹریشن کو ثبوتِ نکاح کے لئے لازم قرار دینا اور جس نکاح کا رجسٹریشن نہیں ہوا اس کو غیر معتبر قرار دیا جانا درست نہیں ہے اور اس میں بہت سے مفاسد کا اندیشہ ہے۔

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے، اس کی آبادی بہت زیادہ ہے، اس ملک کی اکثریت دیہات و قریہ جات میں رہتی ہے، غربت اور وسائل کی کمی کی وجہ سے بہت سے علاقے ایسے ہیں، جہاں حکومت کی انتظامیہ کی بھی رسائی نہیں ہے، خواندگی کی کمی کی وجہ سے لوگوں میں شعور بھی کم ہے، ان حالات میں اگر نکاح کے رجسٹریشن کو اس طرح لازم قرار دیا جائے کہ اسی پر نکاح کی صحت موقوف ہو اور اس کے بغیر نکاح کو معتبر ہی نہ سمجھا جائے تو اندیشہ ہے کہ اس سے ظلم و زیادتی کا راستہ کھل جائے گا، بعض خدا نا ترس لوگ نکاح سے متعلق ذمہ داریوں سے راہِ فرار اختیار کریں گے، ورثہ کے ساتھ حق تلفی کی جائے گی اور حقیقی ورثہ کو وارث ماننے سے انکار کر دیا جائے گا، بہت سے میاں بیوی کے تعلق کو غیر قانونی تعلق قرار دے دیا جائے گا، اس لئے مغربی ممالک کے طرز پر نکاح کے رجسٹریشن کو نکاح کے معتبر ہونے کے لئے لازمی قرار دینا نہ اسلامی نقطۂ نظر سے درست ہے اور نہ ہندوستان کے موجودہ سماجی حالات سے ہم آہنگ۔

مغربی ممالک کا مزاج اور ہے، وہاں مرد وعورت کے تعلق کے لئے نکاح کو ضروری نہیں سمجھا جاتا، غیر قانونی رشتوں سے وجود میں آنے والے بچوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ اب یہ ان کے یہاں باعثِ عار نہیں رہا، مردوں اور عورتوں کے حقوق کی تعیین میں اس درجہ عدمِ توازن ہے کہ لوگ نکاح کی ڈوری میں بندھنے سے بہتر اس بات کو سمجھتے ہیں کہ غیر قانونی طریقہ پر ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزاریں اور جب جی چاہے کسی اور سے آشنائی کر لیں، اس لئے وہاں کسی نکاح کا ثابت نہ ہونا کوئی بڑی پریشانی کی بات نہیں، ہمارے ملک ہندوستان میں ایسے اخلاق سوز اور حیا باختہ رویوں کو قبول نہیں کیا جا سکتا، جس سے مستقبل میں خاندانی نظام کے تار و پود بکھر کر رہ جائیں۔

اس لئے نکاح سے متعلق رجسٹریشن قوانین میں چند باتوں کی رعایت ضروری ہے:

(۱) جن مقامات پر وقف بورڈ کے ذریعہ نکاح خواں مقرر ہے، یا جہاں ائمۂ مساجد نکاح نامے جاری کرتے ہیں، وہاں ان کو قانونی طور پر رجسٹرار تسلیم کیا جائے اور مختلف قوموں کے مذہبی اداروں کو نکاح کے رجسٹریشن کے لئے مجاز مانا جائے۔

(۲) رجسٹریشن قوانین میں مسلمانوں کے حق میں اسلامی قوانین کو بھی ملحوظ رکھا جائے، جیسے: محرماتِ نکاح، گواہان کی موجودگی، نابالغوں کے نکاح میں ولی کا موجود ہونا، عاقدین کا مسلمان ہونا،

مہر کا ذکر وغیرہ؛ کیوں کہ اس کی رعایت کے بغیر جو نکاح ہوگا، وہ اسلامی نقطۂ نظر سے غیر معتبر ہوگا۔

(۳) نکاح کے ثبوت کے لئے رجسٹریشن کو لازم قرار نہیں دیا جائے؛ بلکہ اگر شرعی اُصولوں کے مطابق نکاح کا ثبوت مہیا ہو تو اسے معتبر تسلیم کیا جائے۔

(۴) نکاح کے رجسٹریشن کے نظام کو گاؤں گاؤں کی سطح تک پہنچایا جائے؛ تاکہ رجسٹریشن کے لئے لوگوں کو گاؤں سے شہر تک آنا نہ پڑے اور جو لوگ نکاح کو رجسٹرڈ کرنے کے مجاز ہیں، وہ لوگوں کا استحصال نہ کرسکیں اور ان سے من مانی فیس وصول نہیں کریں۔

(۵) رجسٹریشن کے لئے مہلت دی جائے، یعنی اس بات کی گنجائش ہو کہ اگر عقد کے وقت رجسٹریشن نہیں ہوسکا، تو ایک مخصوص مدت جیسے تین ماہ یا چھ ماہ کے اندر زوجین رجسٹرار کے پاس جا کر گواہان کے ساتھ اقرار کریں کہ ہم دونوں نے فلاں تاریخ کو فلاں مقام پر فلاں فلاں گواہوں کے سامنے نکاح کی تمام شرطوں کی رعایت کرتے ہوئے آپس میں نکاح کرلیا ہے؛ تاکہ جہاں رجسٹریشن کی سہولت موجود نہیں ہے، وہاں کے لوگوں کو دقت نہ ہو۔

(۶) نکاح کے رجسٹریشن کو لازم قرار دینے کے بجائے اس کی ترغیب دی جائے، اس کے فوائد لوگوں کو بتائے جائیں اور اس کے لئے ماحول تیار کیا جائے۔

(۷) رجسٹریشن کی فیس بہت ہی معمولی ہونی چاہئے، جس کا ادا کرنا عام لوگوں کے لئے بھی دشواری اور زیر باری کا باعث نہ ہو۔

یہ نکات جہاں اسلامی نقطۂ نظر سے اہم ہیں، وہیں ہندوستان کے سماجی حالات اور ذرائع و وسائل کے اعتبار سے بھی اہمیت کے حامل ہیں، اگر ان کی رعایت نہ کی جائے اور نکاح کے رجسٹریشن کو لازمی قرار دے دیا جائے تو اندیشہ ہے کہ اس سے فائدہ کم ہوگا اور نقصان زیادہ۔

اوقاف اور مسلمان

اسلام میں جیسے اللہ تعالیٰ کی عبادت و بندگی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، اسی طرح انسانوں کی مدد کی بھی بڑی اہمیت ہے؛ اسی لئے نماز، روزہ کے ساتھ ساتھ زکوۃ وصدقہ فطر کے احکام بھی دیے گئے ہیں، اگر انسان سے کوئی کوتاہی ہوجائے تو اس کی تلافی کے لئے مالی کفارہ یعنی فقراء ومساکین کو کھانا کھلانے اور کپڑے پہنانے کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے، مثلاً اگر کسی نے جان بوجھ کر روزہ توڑ دیا ہو تو اس کے بدلہ اسے ساٹھ روزے رکھنا ہوگا، یا ساٹھ مسکین کو کھانا کھلانا ہوگا، گویا روزہ جیسی عبادت اور مسکین کو کھانا کھلانا دونوں کا اجر برابر ہے، صدقہ وانفاق کی ایک صورت تو یہ ہے کہ وقتی طور پر کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کردی جائے، جیسے کسی بھوکے کو کھانا کھلا دیا، کسی کو کپڑے کی ضرورت تھی، اس کا کپڑا بنا دیا، کسی مریض کا علاج کرا دیا، دوسری صورت یہ ہے کہ ایسا کارِ خیر کیا جائے کہ جس کا نفع بہت سے لوگوں کو پہنچے، اور بہت دنوں تک پہنچتا رہے، اگرچہ یہ دونوں ہی صورتیں اجر وثواب کی ہیں؛ لیکن دوسری صورت میں زیادہ اجر ہے؛ اس لئے کہ جس چیز کا نفع جتنے لوگوں کو پہنچے گا اور جتنی دیر تک پہنچتا رہے گا، اسی قدر زیادہ اس کا اجر ثواب بھی ہوگا۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب انسان کا انتقال ہوجاتا ہے تو اس سے عمل کا رشتہ کٹ جاتا ہے، سوائے تین صورتوں کے: صدقہ جاریہ، ایسا علم جس سے بعد کے لوگ نفع حاصل کرسکیں، صالح اولاد جو اس کے لئے دعا کا اہتمام کرتی ہو: ''**صدقة جارية أو علم ينتفع به من بعده أو ولد صالح يدعو له**'' (**مسلم، کتاب الوصية، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته، حدیث نمبر: ۴۳۱۰، أبو داؤد، کتاب الوصايا، باب ما جاء في الصدقة من الميت، حدیث نمبر: ۲۸۸۲**)۔

علم نافع سے مراد کسی صاحب علم کی کتابیں اور اس کے تلامذہ ہیں، جن سے طویل مدت تک لوگوں کو نفع پہنچتا رہتا ہے، صالح اولاد کی مراد ظاہر ہے، ایسے بچے جن کی دینی تعلیم وتربیت کی گئی ہو اور اس تربیت کی وجہ سے وہ اپنے والدین کے لئے دعاؤں کا اہتمام کرے، اور صدقہ جاریہ سے مراد یہ

ہے کہ کوئی ایسا کام انسان کر جائے جس کا نفع اس کے بعد بھی جاری رہے، جیسے کنواں کھدائے، بورویل کرائے، مسجد اور تعلیمی ادارہ کی تعمیر میں حصہ لے، دینی کتاب شائع کرادے، مسافروں اور یتیموں کے لئے کوئی کارِ خیر کردے، اس طرح کے جو بھی خیر کے کام ہیں۔ وہ سب صدقہ جاریہ میں شامل ہیں۔

ایسے ہی صدقۂ جاریہ کی ایک شکل ''وقف'' کہلاتی ہے، وقف کے اصل معنیٰ 'روکنے' کے ہیں، وقف میں اصل شئ کو روک کر اس سے حاصل ہونے والا نفع وقف کرنے والے کے منشا کے مطابق مستحقین پر خرچ کیا جاتا ہے۔ چوں کہ اس میں اصل شئ بچی رہتی ہے اور اس کو روکے رکھا جاتا ہے؛ اس لئے اس کو 'وقف' کہتے ہیں، وقف اور عام صدقات کے درمیان بنیادی فرق یہی ہے، کہ عام صدقات میں غرباء وضرورت مندوں کو اصل شئ کا بھی مالک بنادیا جاتا ہے اور کسی اور مستحق کے لئے اس سے استفادہ کی گنجائش نہیں رہتی، اور وقف میں ایسا نہیں ہوتا— بہر حال اس سے وقف کی اہمیت اور اس کا اجر وثواب معلوم ہوتا ہے۔

یوں تو مذہبی اور خیراتی کاموں کے لئے عطایا دینے کا تصور بہت قدیم ہے، اسلام سے پہلے عربوں کے یہاں کعبۃ اللہ کے لئے نذرانے پیش کرنے کا ذکر ملتا ہے، جسے کعبہ کے اندر دفینہ کی شکل میں محفوظ کر دیا جاتا تھا، بائبل میں بھی خدا کے نام پر چیزوں کے نذر کرنے کا ذکر ہے، حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے پیدا ہونے والے بچہ کو خدا کی نذر کرنے کا عہد کیا تھا؛ اسی لئے حضرت مریم علیہا السلام بیت المقدس کی خدمت کے لئے اپنے خالو حضرت زکریا علیہ السلام کے حوالہ کردی گئیں (آل عمران: ۳۵-۳۷) لیکن اسلام نے مختلف خیراتی مقاصد کے لئے وقف کا جو وسیع تصور پیش کیا ہے، وہ اس سے پہلے نہیں ملتا، — کہا جاتا ہے کہ امت محمدیہ میں پہلا وقف حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا ہے؛ لیکن یہ وقف کی خاص نوعیت اور تفصیلی احکام کے اعتبار سے ہے، ورنہ وقف تو سب سے پہلے خود رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے، آپ ﷺ نے بہ نفس نفیس مدینہ کے دو یتیم بچوں— حضرت سہل اور حضرت سہیل— کا باغ خریدا، جس میں مسجد نبوی بنائی گئی اور اس سے متصل تعلیمی ضرورت کے لئے چبوترہ بنایا گیا، جسے عربی میں ''صفہ'' کہتے ہیں، یہ اسلامی تاریخ کا پہلا دار العلوم تھا، مسجد اور یہ درسگاہ دونوں آپ ﷺ کی وقف کی ہوئی زمین میں قائم ہوئے، اسی طرح حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے میٹھے پانی کا کنواں ''بئر رومہ'' خرید کیا اور اسے مسلمانوں کے لئے وقف فرما دیا، (**صحیح البخاری فی ترجمۃ الباب، کتاب**

المساقاة، باب في الشرب، و کتاب فضائل الصحابة، باب مناقب عثمان بن عفان ﷺ)، حضرت جابر ﷺ نے اپنا ایک باغ اللہ کے راستہ میں وقف فرمادیا، جس کا ذکر متعدد حدیثوں میں موجود ہے، غرض کہ مختلف اوقاف ہیں، جو'وقف فاروقی' سے پہلے کے ہیں۔

حضرت عمر فاروق ﷺ نے نہ صرف وقف قائم فرمایا؛ بلکہ حضور ﷺ کی ہدایات کی روشنی میں اس کے قواعد وضوابط بھی مقرر فرمائے، حضرت عبداللہ بن عمر ﷺ سے مروی ہے کہ حضرت عمر ﷺ کے حصہ میں خیبر کی ایک زمین آئی، انہوں نے حضور ﷺ سے اس کے سلسلہ میں مشورہ کیا، حضور ﷺ کی شفقت ومحبت اور دلداری وغمخواری چوں کہ ماں باپ سے بھی بڑھ کر تھی؛ اس لئے عام طور پر صحابہ ﷺ اپنے نجی معاملات میں بھی آپ ﷺ سے مشورہ کیا کرتے تھے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایسا ہوسکتا ہے کہ اصل شیٔ کو باقی رکھتے ہوئے اسی کی آمدنی کو صدقہ کردو کہ اصل زمین نہ خرید وفروخت کی جائے، نہ ہبہ کی جائے اور نہ اس میں میراث جاری ہو؛ چنانچہ حضرت عمر ﷺ نے اس مشورہ پر عمل کرتے ہوئے فقراء، قرابت دار، غلام، مسافر اور مہمانوں کو اس کا مصرف قرار دیا، آپ نے یہ بھی فرمایا کہ متولی کو اس میں سے کھانے یا اپنے دوستوں کو کھلانے کی اجازت ہوگی، ذخیرہ کرنے کی اجازت نہ ہوگی، (بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الوقف، مسلم، کتاب الوصیۃ، باب الوقف) بعض روایتوں میں یہ وضاحت بھی ہے کہ ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ان کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر ﷺ متولی ہوں گے اور ان کے بعد وہ شخص متولی ہوگا، جو آل فاروقی میں سب سے بڑا ہو۔

اس طرح یہ پہلا وقف تھا، جس کے مصارف واضح کئے گئے، وقف کرنے والے کی طرف سے شرائط مقرر ہوئیں اور وقف کی تولیت کے سلسلہ میں صراحت کی گئی؛ چنانچہ شریعت اسلامی میں وقف کے قوانین کی اصل بنیاد یہی وقف فاروقی ہے، اس کے بعد صحابہ کی جانب سے بہ کثرت وقف کا اہتمام کیا گیا، حضرت جابر ﷺ کی روایت ہے کہ جن صحابہ کو بھی مالی گنجائش تھی، انہوں نے وقف کیا ہے: **''لم یکن أحد من أصحاب صلی اللہ علیہ وسلم ذو مقدرة إلا وقف''** (المغنی لابن قدامۃ: ۸/ ۱۸۵) مشہور فقیہ علامہ ابن قدامہ نے متعدد صحابہ کے اوقاف کا ذکر کیا ہے، حضرت ابوبکر ﷺ نے اپنا مکان اپنے لڑکے پر وقف کردیا تھا، حضرت عمر ﷺ نے مروہ کے پاس واقع اپنی ایک زمین اپنے لڑکے پر وقف کی تھی، حضرت عثمان ﷺ کے بارے میں گذر چکا ہے کہ انہوں نے بڑی قیمت ادا

کر کے ایک کنواں خرید کیا اور اسے وقف کر دیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ''ینبع'' میں ایک زمین وقف کی تھی، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے مکہ میں، مصر میں اور مدینہ میں اپنے مکانات و جائیداد اپنی اولاد پر وقف کئے تھے، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے مدینہ اور مصر میں اپنا گھر اپنی اولاد پر وقف کیا تھا، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ''وہط'' نامی مقام کی اراضی اور مکہ کے مکان کو وقف علی الاولاد فرمایا تھا، حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے مکہ و مدینہ کے مکانات کو وقف علی الاولاد کیا تھا، (المغنی: ۱۸۶/۸) —— اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ میں وقف کرنے کا عام ذوق تھا، یہ بھی معلوم ہوا کہ خود اپنی اولاد پر بھی وقف کیا جاسکتا ہے؛ کیوں کہ اولاد کے ساتھ حسن سلوک کرنا بھی باعث اجر وثواب ہے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اولاد کو خوش حال و مستغنی چھوڑ کر جانا فقیر و محتاج چھوڑ کر جانے سے بہتر ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وقف کے لئے جو شرائط مقرر کی تھیں، ان سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ وقف کی ہوئی چیزوں میں وقف کرنے والے کے منشاء کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ وقف کی ہوئی چیز سے وقف کنندہ کی شرط کے دائرہ میں رہتے ہوئے متولی بھی استفادہ کرسکتا ہے؛ البتہ وہ اسے فروخت نہیں کرسکتا، اور متولی چوں کہ خود وقف کرنے والا بھی ہوسکتا ہے؛ اس لئے یہی روایت اس بات کی دلیل ہے کہ خود وقف کرنے والا بھی وقف کی ہوئی چیز سے استفادہ کرسکتا ہے؛ البتہ مسجد کے سوا جو بھی وقف ہو، اس کا آخری مصرف فقراء و حاجت مند ہوں گے، چاہے وقف کرنے والے نے اس کی صراحت کردی ہو یا نہیں کی ہو؛ کیوں کہ وقف کا اصل مقصد اجر وثواب کا حصول ہے اور اجر و ثواب حاصل کرنے کا اعلیٰ طریقہ یہ ہے کہ اللہ کی بندگی کے لئے اس کا استعمال ہو یا اس سے ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کی جائے۔

اگر غور کیا جائے تو وقف کی طرف اشارہ خود قرآن مجید میں بھی موجود ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے بار بار ''انفاق''، یعنی اچھے کام میں مال خرچ کرنے اور صدقہ کرنے کی تلقین فرمائی ہے، حدیث میں صراحۃً آپ ﷺ کی ترغیبات موجود ہیں؛ کیوں کہ یہ صدقۂ جاریہ کی سب سے اعلیٰ صورت ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے بہ کثرت اس کارِ خیر میں حصہ لیا ہے اور بعض اہل علم کی رائے ہے کہ اس پر ان کا اجماع واتفاق ہے؛ (المغنی: ۱۸۷/۸) اس لئے فقہاء اسلام کی رائے ہے کہ یہ مستحب کے درجہ کی عبادت ہے، (حوالہ سابق: ۱۸۷/۸)۔

وقف کی اسی اہمیت کی وجہ سے مسلمان ہمیشہ سے مختلف کار خیر کے لئے وقف کرتے رہے ہیں، اور اس سلسلہ میں امت مسلمہ کی ایک روشن تاریخ رہی ہے، مسلمانوں نے نہ صرف مسجدوں، عیدگاہوں، قبرستانوں اور درگاہوں پر وقف کئے ہیں اور یتیم خانے اور مسافر خانے بنائے ہیں؛ بلکہ بیماروں، معذوروں، تیمارداروں یہاں تک کہ جانوروں اور پرندوں کے چارے کے لئے بھی وقف کیا ہے، جس سے خدمت خلق کا غیر معمولی جذبہ ظاہر ہوتا ہے؛ اسی لئے مسلمان جہاں کہیں آباد ہوئے، وہاں آج بھی اوقاف کی بے شمار زمینیں اور جائدادیں موجود ہیں، ہندوستان میں وقف کی اتنی املاک ہیں کہ اگر ان کا صحیح استعمال ہو اور اس کے فوائد مسلمانوں کو دئے جائیں تو مسلمانوں کے تمام تعلیمی اور معاشی مسائل حل ہو جائیں اور اس وقت مسلمان جس زبوں حالی اور پسماندگی سے دوچار ہیں اور حکومت کے سامنے ان کو کاسہ گدائی پھیلانا پڑتا ہے، اس کی نوبت نہ آئے، مگر افسوس کہ مسلمانوں کے پچاس فیصد کے قریب اوقاف وہ ہیں جن پر حکومت اور برادران وطن کا قبضہ ہے اور جو جائیدادیں خود مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں، ان میں سے بیشتر جائدادیں بھی ناجائز قبضہ سے دوچار ہیں، بہت سے قبرستان مسلمان لینڈ گرابرس نے بیچ دیئے ہیں، مسجدوں کی اراضی پر تو ناجائز قبضہ کیا ہی جاتا ہے، اللہ سے بے خوفی کی حد یہ ہے کہ بعض پرانی مسجدوں کو بھی بیچ کھانے میں تکلف نہیں، اخبارات میں بکثرت ایسے واقعات آتے رہتے ہیں۔

اوقاف کے ساتھ ناجائز طرز عمل کا ایک حصہ یہ ہے کہ جو لوگ موقوفہ جائدادوں کو کرایہ پر لیتے ہیں، وہ اس کا کرایہ ادا کرنا نہیں چاہتے، جس عمارت کا کرایہ پانچ ہزار دس ہزار ہونا چاہئے، پچاس روپے، سو روپے اس کا کرایہ ادا کیا جاتا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود تو سوڈیڑھ سو کرایہ ادا کرتے ہیں اور وہ دوسروں سے لاکھوں روپے پگڑی لے کر ماہانہ ہزاروں روپے کرایہ اٹھاتے ہیں، وقف پر ناجائز قبضہ اور اس سے ناجائز استفادہ کی فہرست اتنی طویل ہے اور اتنے بڑے اور نمایاں لوگ اس میں شامل ہیں کہ سن کر حیرت ہوتی ہے، ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ کے کسی بندے نے اوقاف کی جائداد کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا ارادہ کیا، اس کو تعلیمی مقاصد کے لئے کارآمد بنانے پر کمر بستہ ہوئے اور دوسری طرف کچھ بدنیت لوگ ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گئے۔

وقف کا یہ غلط استعمال اور اس پر یہ ناجائز قبضہ خود مسلمانوں کی طرف سے ہے؛ حالاں کہ

وقف ایک دائمی صدقہ ہے، شریعت اسلامی کے اصول کے مطابق وقف کی جائداد اللہ کی ملکیت ہوتی ہے، اور اس آمدنی سے تمام ضرورتمندوں کا حق متعلق ہوتا ہے؛ اس لئے وقف پر ناجائز قبضہ گویا اللہ سے لڑنے اور تمام غریبوں کے حقوق غصب کرنے کے مترادف ہے؛ اس لئے اِس کا گناہ عام ظلم و زیادتی سے بڑھ کر ہے، جو قوم خود اپنے دل میں اپنے بھائیوں کے لئے گوشۂ ہمدردی نہیں رکھتی ہو اور اسے اپنی ملت کا غم نہ ہو، کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ دوسرے اس کی بھلائی کے بارے میں سوچیں گے، ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ مسلم اوقاف کا تحفظ کیا جائے اور یقیناً ہمارا یہ مطالبہ درست ہے؛ لیکن سوال یہ ہے کہ چوری کرنے والا دوسروں کو چوری کرنے سے روکے اور ڈاکہ ڈالنے والا دوسرے ڈاکہ ڈالنے والوں پر انگلی اٹھائے تو اس کی اس کوشش کا کیا اثر ہوسکتا ہے؛ اس لئے اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ حکومت سے تحفظ اوقاف کا مطالبہ کرنے کے ساتھ ساتھ خود مسلمانوں کا شعور بیدار کیا جائے، ناجائز قابضین سے اوقاف کو آزاد کرنے کی مہم چلائی جائے اور جو اوقاف مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں، ان کو بہتر طور پر استعمال کیا جائے، اس کے بغیر صرف حکومت سے تحفظ اوقاف کا مطالبہ کرنا اونٹ کو نگل جانے اور مچھر کو چھاننے کے مترادف ہوگا۔

ہندوستان میں کم وبیش ایک ہزار سال تک مسلمانوں کے اقتدار کا سورج پوری آب وتاب کے ساتھ چمکتا رہا ہے، برطانوی غلبہ کے بعد بھی ملک میں مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستیں موجود تھیں، جو مسلمان نوابوں اور ہندو راجاؤں مہاراجاؤں کے زیر اقتدار تھیں، مسلمان حکمرانوں نے اگرچہ کہ دعوت اسلام پر برائے نام توجہ دی اور وہ ہمیشہ اپنے پایۂ اقتدار کو مضبوط کرنے کی فکر میں رہے؛ لیکن انھوں نے خالص اسلامی اور خیراتی مقاصد کے لئے بہت سی اراضی اور تعمیرات وقف کیں، اور ان کو پائیدار نفع رسانی کا ذریعہ بنایا، اسی طرح ہندو راجاؤں نے بھی اپنی مسلمان رعایا کے لئے مسجدیں بنوائیں، مزارات تعمیر کئے، قبرستانوں کے لئے جگہیں مہیا کیں، اور دوسرے مقاصد کے لئے جائیدادیں وقف کیں، جب اس ملک میں انگریز آئے تو انھوں نے اولاً تو مسلمانوں کے بہت سے اوقاف کو ہڑپ لیا؛ لیکن آہستہ آہستہ اوقاف بازیاب ہوئے اور ایسی جگہوں کے سوا جو حکومت کے تصرف میں آچکے تھے، دوسری جائدادوں کو حکومت نے وقف تسلیم کرلیا۔

ملک کے آزاد ہونے کے بعد بجا طور پر مسلمان یہ توقع رکھتے تھے کہ تمام موقوفہ جائدادیں

انہیں واپس مل جائیں گی؛ مگر تقسیم ملک کے سانحہ نے مسلم اوقاف پر بڑا منفی اثر ڈالا اور جن علاقوں سے مسلمان پاکستان چلے گئے، وہاں کی موقوفہ جائدادوں پر غاصبانہ قبضہ ہوگیا، خاص طور پر مشرقی پنجاب اور اس کے مضافات نیز مغربی بنگال میں مسلمانوں کو یہ صدمہ زیادہ سہنا پڑا اور افسوس کہ یہ زخم اب تک مندمل نہ ہوسکا، حکومت ہند نے کبھی اس بات کی سنجیدہ کوشش نہیں کی کہ ایسے اوقاف کو ناجائز قبضے سے آزاد کرایا جائے اور مسلمانوں کو ان کی چیز واپس کی جائے، یہ بات خوش آئند ہے کہ آزادی کے بعد ہمارے یہاں مرکز اور ریاستوں میں اوقاف کی وزارتیں قائم ہوئیں اور وقف کا مستقل محکمہ وجود میں آیا۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق رجسٹرڈ وقف املاک ۶۹ لاکھ ہیں، لیکن غیر رجسٹرڈ اوقاف کو شامل کرلیا جائے تو بعض اہل خبر کے اندازہ کے مطابق ان کی تعداد چھ لاکھ ہے، سب سے زیادہ اوقاف مغربی بنگال میں اور اس کے بعد اتر پردیش میں ہیں اور ریلوے اور دفاع کے بعد سب سے زیادہ اراضی محکمہ اوقاف کے پاس ہے۔

وقف کے لئے پارلیمنٹ کے ذریعہ غالباً پہلی بار ۱۹۵۴ء میں مستقل قانون بنا، اس سے پہلے وقف کا الگ قانون نہیں تھا، اور وقف کے مسائل مسلم ایکٹ ۱۹۲۳ء کا حصہ تھے، لیکن مسلمانوں کا احساس تھا کہ یہ قانون وقف کے تحفظ کے لئے ناکافی ہے، پھر ۱۹۸۴ء میں اس کی جگہ نیا قانون وقف آیا، لیکن یہ بھی ان مطالبات کو پورا نہ کرسکا، پھر ماضی قریب میں ۱۹۹۵ء میں ایک نیا قانون وقف سامنے آیا، جس میں اگرچہ بعض دیرینہ مطالبات کو ملحوظ رکھا گیا؛ لیکن یہ قانون بھی مسلمانوں کے مطالبات کو پورا نہیں کرتا تھا؛ چنانچہ اس کو جوائنٹ کمیشن کے حوالہ کردیا گیا، اب ۲۰۱۰ء میں نہایت عجلت کے ساتھ لوک سبھا سے ترمیم شدہ وقف قانون پاس ہو چکا ہے، جسے جمعہ کے دن آخری وقت میں کسی بحث ومباحثہ کے بغیر پاس کرالیا گیا، نہ معلوم اس کے پیچھے حکومت کے کیا مقاصد کارفرما تھے اور اس میں کیوں اتنی جلد بازی سے کام لیا گیا؟ افسوسناک بات یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ اس مجوزہ قانون کے سلسلہ میں تفصیل سے اپنے اعتراضات پیش کر چکا تھا، اور ارباب حکومت نے یقین دہانی بھی کرائی تھی کہ وہ اس کو ملحوظ رکھیں گے؛ لیکن حکومت نے اس وعدہ کو وفا نہیں کیا اور نقائص کی اصلاح کے بغیر یہ قانون پاس ہوگیا، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اعتراض پر دوبارہ یہ قانون سلیکٹ کمیٹی کے حوالہ کیا گیا ہے، خدا کرے کہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کے تحفظات کو ملحوظ رکھا جائے اور انصاف

کے تقاضوں کو پورا کیا جائے۔

اس نئے قانون میں غیر مسلموں کی جانب سے کئے جانے والے وقف کو 'وقف' تسلیم نہیں کیا گیا ہے؛ حالانکہ ۱۹۵۴ء اور ۱۹۸۴ء کے قانون میں وقف کی ایسی تعریف کی گئی تھی جو غیر مسلموں کی جانب سے اسلامی مقاصد کے لئے کئے جانے والے اوقاف کو بھی شامل تھی، اصل میں جو افعال خالص عبادت ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج، زکاۃ، یہ تو مسلمانوں ہی کی جانب سے معتبر ہیں؛ لیکن جن امور میں خدمت کا پہلو بھی ہے، ان میں غیر مسلموں کے افعال کو بھی معتبر مانا گیا ہے، جیسے غیر مسلم کسی مسلمان شخص یا مسلمان ادارہ کو کوئی چیز ہبہ کرسکتا ہے، وقف بھی ایسے ہی نیک کاموں میں شامل ہے، اسی لئے فقہاء نے صراحت کی ہے کہ غیر مسلموں کا وقف بھی درست ہے، اگر وہ کام اپنی اصل کے اعتبار سے ثواب کا ہو اور غیر مسلم اپنی نیت کے اعتبار سے ثواب کا کام سمجھ کر وقف کریں تو یہ وقف معتبر ہوگا، اسی بنیاد پر فقہاء نے بیت المقدس کے لئے یہودیوں اور عیسائیوں کے وقف کو درست قرار دیا ہے، ہندوستان میں برادران وطن تمام ہی مذاہب کی مقدسات کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کے لئے خرچ کرنے کو باعث اجر تصور کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مزارات پر مسلمانوں کی طرح ہندو بھائی چادر چڑھانے اور نذر و نیاز پیش کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، ان کے اوقاف کو اسی اصول کے اعتبار سے معتبر اور درست ہونا چاہئے۔

غیر مسلموں کے وقف کے معتبر و درست ہونے کا اشارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے عمل سے بھی ملتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبۃ اللہ میں نماز بھی پڑھی اور اس کا طواف بھی فرمایا اور نماز و طواف کا یہ عمل فتح مکہ سے پہلے بھی ہوا اور فتح مکہ کے بعد بھی؛ حالانکہ کعبۃ اللہ کی تعمیر زمانہ جاہلیت کی تھی اور غیر مسلموں کے ذریعہ عمل میں آئی تھی، کم سے کم مکہ فتح ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی جگہ نئی تعمیر فرما سکتے تھے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے سے گریز فرمایا اور سابقہ عمارت کو کافی سمجھا، اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانے میں بیت المقدس فتح ہوا، یہ تعمیر عیسائیوں کی کی ہوئی تھی؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی عمارت کو باقی رکھا اور اس کی تجدید کی ضرورت محسوس نہیں کی، ان نظائر سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ غیر مسلموں کا وقف بھی درست و معتبر ہے۔

ایک اہم مسئلہ وقف کی حیثیت کو ثابت کرنے کا ہے، ہندوستان میں وقف کی تاریخ بہت قدیم

ہے بہت سی جائدادیں سیکڑوں سال سے وقف کے طور پر استعمال ہوتی آئی ہیں، اگرچہ ان کی دستاویزات محفوظ نہیں ہیں؛ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ نسلہا نسل سے وقف کے طور پر استعمال ہوتی آئی ہیں، یہ چیز وقف کے ثبوت کے لئے کافی ہے،لیکن یہ قانون اسے وقف کے ثبوت کے لئے کافی نہیں مانتا،اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ شرعاً وقف کے لئے تحریر ضروری نہیں، زبانی بھی وقف ہوسکتا ہے،اس لئے ہر وقف کے ثبوت کے لئے تحریری دستاویز کا مطالبہ بے معنی ہے۔

عرصہ سے مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ وقف کو وہی تحفظ دیا جائے جو قانوناً پبلک جائداد کو حاصل ہے؛ تاکہ وقف کی جائداد کو ناجائز قبضہ سے بچایا جاسکے اور اس کی بازیافت کو آسان کیا جاسکے؛ مگر اس مجوزہ قانون میں بھی مسلمانوں کے اس دیرینہ مطالبہ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، عجیب بات یہ ہے کہ وقف سے استفادہ کے اصل مستحق مسلمان ہیں؛ لیکن وقف بورڈ کی تشکیل کا ایسا خاکہ پیش کیا گیا ہے؛ جس میں مسلمانوں کے منتخب نمائندوں کا رول بہت محدود ہوجاتا ہے اور حکومت کے نامزد ارکان و عہدہ داران کی نمائندگی بڑھ جاتی ہے اور ان کے اختیارات بھی، یہ واضح طور پر وقف کے مفادات کے خلاف ہے،اسی طرح وقف جائداد کی تبدیلی یا فروخت کے سلسلہ میں فقہاء نے بے حد احتیاط سے کام لیا ہے؛ لیکن اس قانون میں وقف جائداد کے رہن، تبدیلی، نزول اور خرید وفروخت کو آسان کر دیا گیا ہے، یہ ساری باتیں وہ ہیں جو اوقاف کے تحفظ میں رکاوٹ ہیں اور شریعت کے قانون وقف سے مختلف، خطرناک پہلو یہ ہے کہ قومی اقلیتی مالیاتی کارپوریشن نے ''وقف ڈیولپمنٹ ایجنسی'' کے قیام کی تجویز پیش کی ہے، جو اوقافی جائدادوں کی ترقی کے لئے کام کرے گی، اس میں 26% فیصد حصص حکومت کے ہوں گے اور 74% فیصد ملٹی نیشنل کمپنیوں کے، اس کا ایک نقصان تو یہ ہوگا کہ ہماری وقف کی جائدادیں بتدریج بڑی بڑی کمپنیوں کے حوالہ ہوجائیں گی اور وقف بورڈ کے لئے اس کو لینا آسان نہیں ہوگا، دوسرے وقف کی آمدنی میں تمام اقلیتیں شامل ہوجائیں گی۔ حالانکہ یہ املاک مسلمانوں کی ہیں، ایک طرف مسلمانوں کے لئے زبردست معاشی نقصان ہے اور دوسری طرف یہ شرعی نقطۂ نظر سے بھی قابل قبول نہیں ہے؛ کیونکہ وقف کو واقف کے منشاء کے مطابق استعمال کرنا ضروری ہے، اور واقف کا منشاء مسلمانوں کو فائدہ پہنچانا تھا نہ کہ غیر مسلم اقلیتوں کو۔

حکومت کا فریضہ ہے کہ جیسے شخصی املاک کا احترام کیا جاتا ہے اور جیسے پبلک جائداد کے تحفظ کو

گورنمنٹ قانونی اہمیت دیتی ہے، اسی طرح وہ وقف جائداد کا بھی تحفظ کرے اور قانونی طور پر اس کی بازیابی کو آسان اور یقینی بنائے، یہ ایک حقیقت ہے کہ وقف کی اراضی پر ایسے بڑے بڑے ہوٹل تعمیر ہو گئے ہیں، کمپنیاں قائم ہوگئی ہیں کہ شاید ان کی واپسی آسان نہ ہو، لیکن ایسا تو ہوسکتا ہے کہ گورنمنٹ انہیں کرایہ ادا کرنے پر مجبور کرے؛ تا کہ وقف کے مقاصد میں اور مسلمانوں کے مفاد کے لئے اس کا استعمال ہو سکے، اسی طرح خود گورنمنٹ کے بہت سے دفاتر اور سرکاری بلڈنگیں وقف کی زمین میں بنی ہوئی ہیں، محل وقوع کے اعتبار سے ان کا کرایہ بہت خطیر ہونا چاہئے، خود حکومت ایسی زیر استعمال جائدادوں کا کرایہ وقف بورڈ کو ادا کرے، اگر ایسی مقبوضہ اراضی کا مناسب کرایہ وقف بورڈ کو ادا کیا جائے تو غریب مسلمانوں کی تعلیم، یتیموں کی کفالت، مطلقہ و بیوہ عورتوں کی پرورش، بے روزگار نوجوانوں کے لئے روزگار پر مبنی تربیت اور خود روزگار بنانے جیسے مسائل بہ آسانی حل کئے جاسکتے ہیں اور انہیں حکومت کے سامنے کاسۂ گدائی پھیلانے سے نجات مل سکتی ہے۔

ضرورت ہے کہ مختلف تنظیمیں ایک متحدہ پلیٹ فارم بنا کر تحفظ اوقاف کے مسئلہ کو ایک مہم کی حیثیت سے اٹھائیں اور ریاست سے مرکز تک سیاسی اور قانونی سطح پر اس کے لئے کوشش کریں، اس طرح ہم اپنے بہت سے مسائل کو بطور خود حل کر سکتے ہیں اور تعلیم و معیشت کے میدان میں مسلمانوں کو اونچا اٹھا سکتے ہیں، یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب مسلمان سیاست داں اور سرکاری عہدہ دار شخصی مفادات اور وقتی مصلحتوں پر ملت کے مفادات کو قربان نہ کریں؛ اس لئے کہ تجربہ ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے مقرر کردہ عہدہ دار اور بعض دفعہ وزیر بے ضمیر خود ملی مفادات کو نقصان پہنچاتے ہیں اور حکومت کے آلہ کار کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔

اوقاف پر ٹیکس کا مسئلہ

دنیا میں انسان کے علاوہ بے شمار جاندار مخلوقات ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی ضرورت کے مطابق انہیں عقل وشعور سے بھی نوازا ہے، یہی عقل ان کی رہنمائی کرتی ہے کہ وہ کس طرح اپنی غذائی ضرورت کو پورا کریں، اپنے وجود کی حفاظت کے لئے کیا تدبیریں اختیار کریں اور کس طرح اپنی نسل میں تسلسل کو باقی رکھیں؟ بہت سی مخلوقات وہ ہیں، جو اپنے جسم و جثہ، طاقت وقوت، کسی خاص نوع کی صلاحیت اور حسن و جمال کے کسی پہلو کے اعتبار سے انسان سے فائق نظر آتی ہیں؛ لیکن انسان کو جو چیز دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے، وہ ہے عقل وشعور کی بلندی اور اس کی فطرت میں پائی جانے والی اخلاقی قدریں، یعنی انسان جسم و جثہ کے اعتبار سے تو ایک معمولی درجہ کی مخلوق ہے؛ لیکن عقل وخرد کی فتح مندیوں کا یہ حال ہے کہ اس نے چاند اور مریخ تک رسائی حاصل کر لی ہے اور سمندر کی گہرائیوں کو چھولیا ہے، اگر ان صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اس میں اخلاق کا جوہر نہ ہوتا تو وہ ایک ایسی مخلوق ہوتا، جس کا ظلم و جور درندوں کو بھی شرمائے اور جس کی بے حیائی سے شاید شیطان کی پیشانی بھی عرق آلود ہو جائے۔

یہ اخلاقی قدریں انسانیت کی روح ہیں، اخلاق کی وجہ سے ایک طرف اس کا رشتہ اپنے خالق سے قائم ہوتا ہے، شکر گذاری اور احسان مندی اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کو راضی کرنے کی کوشش کرے، خواہ جسمانی عبادت کے ذریعے ہو یا مالی عبادت اور بندگانِ خدا کی اعانت کے ذریعہ، دوسری طرف انسان اور دوسری مخلوقات کے لئے محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور انسان بے غرض ہو کر دوسرے انسانوں کی خدمت اور راحت رسانی کے کام کرتا ہے، خدا کی خوشنودی کی طلب اس جذبہ کو اور پروان چڑھاتی ہے؛ اس لئے جن لوگوں کا فکری رشتہ مذہب سے استوار رہتا ہے، وہ خیر اور بھلائی کے کام میں آگے رہتے ہیں؛ اس لئے کہ انسانی خدمت کو ہر مذہب میں اہمیت دی گئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت مؤثر تعبیر میں اس کا ذکر فرمایا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائیں گے: اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا تم نے عیادت نہیں کی، بندہ کہے گا: اے میرے پروردگار! میں کیسے آپ کی عیادت کرتا آپ تو تمام جہانوں کے پروردگار ہیں؟ اللہ تعالیٰ

فرمائیں گے: تمہیں معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا، تم نے اس کی عیادت نہیں کی، کیا تم نہیں جانتے کہ اگر تم اس کی عیادت کرتے تو مجھے اس کے پاس موجود پاتے؟ اے ابن آدم! میں نے تم سے کھانا مانگا اور تم نے مجھے کھانا نہیں کھلایا، بندہ کہے گا: اے میرے پروردگار! میں آپ کو کیسے کھانا کھلاتا؛ حالاں کہ آپ تمام عالم کے رب ہیں، اللہ فرمائیں گے: تمہیں معلوم نہیں، میرے فلاں بندے نے تم سے کھانا مانگا تھا، اگر تم اسے کھانا کھلاتے تو اس کو میرے پاس پاتے؟ اے ابن آدم! میں نے تم سے پانی مانگا، تم نے مجھے نہیں پلایا، بندہ کہے گا: اے میرے پروردگار! میں کیسے آپ کو پانی پلاسکتا تھا؛ حالاں کہ آپ تمام عالم کے رب ہیں، اللہ فرمائیں گے: میرے فلاں بندے نے تم سے پانی مانگا تھا، تم نے اسے نہیں پلایا، اگر تم اس کو پلاتے تو اس کو میرے پاس پاتے، (**صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب فضل عیادة المریض،** حدیث نمبر: ۶۷۲۱) یعنی انسان کی خدمت سے صرف انسان کی محبت ہی حاصل نہیں ہوتی؛ بلکہ انسان خدا کی محبت وخوشنودی کو بھی پاتا ہے۔

اسی لئے مذہبی جذبہ کے تحت انسانی فلاح اور خدمت خلق کے کام کی قدیم روایت رہی ہے، اس کی ایک شکل تو وقتی مدد کرنے کی ہے، کبھی کسی کو کھانا کھلادیا، کسی کا علاج کرادیا، کوئی اور ضرورت پوری کردی، اور ایک صورت یہ ہے کہ کوئی ایسا کام کیا، جس کا نفع ہمیشہ باقی رہے اور جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں، نفع رسانی یا صدقہ کی یہ صورت زیادہ اجر وثواب کا باعث ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب انسان دنیا سے گذر جاتا ہے تو عمل کا رشتہ اس سے کٹ جاتا ہے، سوائے تین صورتوں کے، یا تو صالح اولاد کو چھوڑ کر جائے، جو اس کے لئے دعاء کا اہتمام کرے، یا اس نے کوئی ایسا علمی کام چھوڑا ہو جس سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہے، خواہ یہ شاگردوں کی صورت میں ہو، تصنیفات کی صورت میں ہو یا تعلیمی اور اشاعتی اداروں کی صورت میں، تیسرے: صدقہ جاریہ، یعنی انسان کوئی ایسی مادی چیز چھوڑ کر جائے، جس کا نفع لوگوں کو پہنچتا رہے، جیسے کنواں کھدادے، کوئی ایسی بلڈنگ بنادے جس کا کرایہ فقراء پر صرف ہو، مسجد تعمیر کردے، جس میں لوگ نماز پڑھتے رہیں: ”**إذا مات الإنسان انقطع عنه عمله إلا من ثلاثة إلا من صدقة جارية أو علم يُنتفع به أو ولد صالح يدعو له**“ (**صحیح مسلم، کتاب الوصية، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته،** حدیث نمبر: ۴۳۱۰)

صدقہ جاریہ کی صورت کو شریعت اسلامی میں 'وقف' کہتے ہیں، حدیث وسیرت کی کتابوں سے

معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلا وقف خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلے تعمیر مسجد کی فکر فرمائی اور حضرت سہل وسُہیل رضی اللہ عنہما کی زمین خرید کر مسجد کے لئے وقف کردی، مسجد کے علاوہ انسانی خدمت کے لئے بھی وقف کا سلسلہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع فرمایا،مُخَیریق نامی صاحب نے اپنی اراضی کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وصیت کی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے وقف فرمادیا: **''أول صدقة موقوفة كانت في الإسلام أراضي مُخيريق التی أوصابها إلي النبي صلی اللہ علیه وسلم فوقفها النبی صلی الله عليه وسلم''** (فتح الباري: ۵/۴۰۱) اس کے علاوہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اراضی وقف کی ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے اپنے سات باغات کو بنو ہاشم اور بنو مطلب پر وقف فرمادئے تھے: **''جعل سبعة حيطان له بالمدينة صدقة علی بني هاشم وبني المطلب''** (سنن بیہقی: ۶/۱۶)۔

اکثر اکابر صحابہ نے اپنی اپنی گنجائش اور صلاحیت کے مطابق وقف فرمایا ہے، حدیث کی کتابوں میں اس کا ذکر موجود ہے؛ لیکن وقف سے استفادہ کے لئے شرائط وحدود کی تعیین اور تولیت کے سلسلہ میں اصول مقرر کرتے ہوئے سب سے پہلے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وقف فرمایا، جب انہیں خیبر کی زمین میں حصہ ملا تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ سے اسے وقف فرمادیا؛ بلکہ اس کے لئے باضابطہ وقف نامہ بھی تحریر فرمایا، (إعلاء السنن: ۱۳/۱۲۵، بحوالہ دارقطنی) آپ نے وضاحت کردی کہ کھجور کے اس باغ کو جو ''ضمغ'' کہلاتا تھا، نہ بیچا جاسکے گا نہ کسی کو ہبہ کیا جاسکے گا اور نہ اس میں میراث جاری ہوگی، فقراء، قرابت دار، غلام، مہمان اور مسافر پر اس کی آمدنی خرچ ہوگی، متولی کے لئے بھی گنجائش ہوگی کہ وہ اس میں سے کھائیں یا دوست واحباب کو کھلائیں؛ لیکن جمع کرکے رکھنے کی اجازت نہیں ہوگی (نیل الأوطار: ۵/۲۶۲)۔

آپ نے تولیت کے بارے میں بھی متعین فرمادیا کہ ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اس کی متولی ہوں گی اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے بعد خاندان کے اہل رائے متولی ہوں گے (إعلاء السنن، حدیث نمبر: ۴۴۹۹)؛ چنانچہ غالباً حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ متولی ہوئے، وہ اس میں سے مکہ سے مدینہ آنے والے ضرورت مندوں کو تحائف بھی

دیا کرتے تھے، (حوالہ سابق، حدیث نمبر: ۴۴۹۳) اسی تفصیل و وضاحت کے اعتبار سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وقف کو پہلا وقف قرار دیا جاتا ہے: ''**أول صدقة كانت في الإسلام صدقة عمر**'' (فتح الباری: ۵/۱۰۳، بحوالہ مسند احمد)۔

وقف پر نہ وقف کرنے والے کی ملکیت باقی رہتی ہے، نہ اس پر متولی کی ملکیت ہوتی ہے اور نہ ان لوگوں کی جن کو اس سے نفع اٹھانے کا حق دیا گیا ہے؛ بلکہ وقف کے بارے میں شریعت اسلامی کا تصور یہ ہے کہ وہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہوتی ہے: ''**هو حبسها على حكم ملك الله تعالى**'' (درمختار مع الرد، کتاب الوقف: ۳/۴۹۳) چوں کہ اسلام میں صرف عبادت ہی کارِ ثواب نہیں ہے؛ بلکہ انسانی خدمت بھی باعث اجر وثواب ہے؛ اس لئے وقف کا دائرہ بہت وسیع ہے، جیسے فقراء کو نفع پہنچانے والی چیزوں کا وقف درست ہے، اسی طرح ایسا وقف بھی درست ہے جس سے فقراء اور مال دار دونوں فائدہ اٹھا سکیں، یہاں تک کہ خود اپنی اولاد پر وقف کرنا بھی درست ہے، (دیکھئے: **در مختار، فصل فيما يتعلق بوقف الأولاد**: ۳/۴۰۲) چنانچہ مدارس، مساجد، یتیم خانے، غرباء کی امداد کے لئے قائم کئے ہوئے ادارے، دینی یا عصری تعلیم کے خیراتی ادارے، مریضوں کے علاج، بیواؤں کی کفالت اور اس طرح کے مقاصد کے لئے قائم ہونے والے ادارے، جن کا مقصد تجارت کرنا اور کسی خاص فرد کے لئے مادی نفع حاصل کرنا نہ ہو، وہ سب کے سب اوقاف میں داخل ہیں۔

اس لئے اگر ایسی املاک یا ایسے اداروں پر ٹیکس عائد کیا جائے جو وقف کے ہوں تو گویا یہ خدا پر ٹیکس لگانے کے مترادف ہوگا؛ کیوں کہ وقف کا براہ راست اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے، برطانوی عہد کی حکومتِ بہار نے ۱۹۷۳ء میں زرعی آمدنی پر ٹیکس کے لئے بل پیش کیا، امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ (پہلے جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) اس وقت بہار اسمبلی کے رکن تھے، اس بل میں اوقاف پر بھی ٹیکس کی تجویز تھی، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ کی ہدایت پر آپ نے اس کے خلاف اسمبلی میں مدلل تقریر فرمائی، نیز قرآن و حدیث اور فقہِ اسلامی کے حوالہ سے ثابت کیا کہ اوقاف پر ٹیکس عائد کرنا شریعت اسلامی کے خلاف ہے، آخر کانگریس پارٹی نے مولانا ابوالکلام آزادؒ پر اس کا فیصلہ چھوڑ دیا، مولانا آزاد نے مولانا سجاد صاحبؒ اور مولانا رحمانیؒ وغیرہ سے تبادلۂ خیال کے بعد طے کیا کہ اوقاف پر ٹیکس عائد کرنا شریعتِ اسلامی کے خلاف ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے آزاد ملک کی جمہوری حکومت برطانوی آقاؤں کے تصور کو دہرانا چاہتی ہے، اس وقت موجودہ انکم ٹیکس قانون کی جگہ ڈائریکٹ ٹیکسیس کوڈ کا بل زیرغور ہے، اس بل کے تحت ایک طرف مذہبی اداروں کو ٹیکس سے مستثنیٰ بھی کیا گیا ہے اور دوسری طرف ان پر ٹیکس لاگو بھی کیا گیا ہے، یعنی (Public religious) اگر نان پروفیٹ آرگنائزیشن ہوتو انہیں ٹیکس سے استثناء حاصل رہے گا؛ لیکن نان پروفیٹ آرگنائزیشن کی تعریف ایسے اداروں سے کی گئی ہے، جو کسی ایک مذہبی گروہ کی نہ ہو اور جس سے تمام مذاہب کے لوگ فائدہ اٹھاتے ہوں، اب غور کیجئے کہ مندروں میں ہندو بھائی عبادت کرتے ہیں، ویدک پاٹھ شالوں میں ہندو فرقہ کو مذہبی تعلیم دی جاتی ہے، مساجد میں مسلمان عبادت کرتے ہیں، مدارس میں مسلمان بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں، اسی طرح گرد وارے، آتش کدے اور چرچ سکھوں، پارسیوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہیں ہیں، یہ بھی فطری بات ہے کہ ایک فرقہ کے لوگ اپنے فرقہ کے پسماندہ اور پریشان حال لوگوں کی زیادہ فکر کرتے ہیں اور ان کے لئے خیراتی ادارے قائم کرتے ہیں، یہ ادارے درحقیقت حکومتوں کی مدد کرتے ہیں، اور کسی خاص گروہ سے متعلق حکومت کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹاتے ہیں، اس قانون کے تحت ایسے تمام اداروں پر ٹیکس عائد ہوں گے اور وہ بھی ۳۰ فیصد، اس کا اثر عطیہ دہندگان پر بھی پڑے گا؛ کیوں کہ جب اصحاب ثروت کے علم میں یہ بات آئے گی کہ ان کے تعاون کا ۳۰ فیصد حصہ حکومت کی جیب میں چلا جائے گا تو وہ بھی عطیہ دینے سے گریز کریں گے، اس طرح ان خیراتی اور فلاحی اداروں کو دوطرفہ نقصان اٹھانا پڑے گا، ایک طرف انہیں ۳۰ فیصد رقم گورنمنٹ کو دینی ہوگی، دوسری طرف عطیہ دینے والوں کی طرف سے بھی ان کا تعاون کم ہوجائے گا۔

موجودہ قانون میں چیرٹیبل ادارے اگر اپنی پندرہ فیصد آمدنی بچا کر رکھیں تو پانچ سال تک اس بجٹ پر کوئی ٹیکس عائد نہیں ہوگا؛ لیکن مجوزہ قانون میں اس مدت کو گھٹا کر تین سال کردیا گیا ہے، یعنی ۱۵ر فیصد کی پس انداز رقم جس کا ٹیکس ایک بار ادا کیا جاچکا ہے، اگر تین سال تک خرچ نہیں کی گئی تو دوبارہ اس کا ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ایک طرف ہماری موجودہ حکومت بیرونی سرمایہ کاروں کو غیر معمولی رعایتیں دیئے جارہی ہے اور اس طرح ہماری مقامی صنعتیں اور تجارتی کمپنیاں ختم ہوتی جارہی ہیں،

دوسری طرف خیراتی اور فلاحی اداروں پر گھیرے تنگ کئے جار ہے ہیں، ایک طرف سبسڈ یاں ختم کی جارہی ہیں اور دوسری طرف ٹیکس کے دائرے کو اس طرح وسیع کیا جارہا ہے کہ اب خدا سے بھی ٹیکس وصول کرنے کی کوشش ہورہی ہے اور مذہبی اداروں کے تقدس کو مجروح کیا جارہا ہے؛ اس لئے نہ صرف مسلمانوں کو؛ بلکہ تمام محب وطن شہریوں کو حکومت کے اس رویہ کے خلاف آواز بلند کرنی چاہئے اور زندگی کے ہر شعبہ میں امریکہ اور یورپ کے طرز فکر کو مسلط کرنے کی جو کوشش جاری ہے، حکومت کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے، ورنہ یہ اس ملک کے لئے بے حد نقصان دہ اور اس کی مذہبی اور اخلاقی قدروں کے لئے حد درجہ تباہ کن بات ہوگی۔

مطلقہ خواتین کو شوہر کی نصف جائیداد

اردو اور ہندی کا ایک مشہور محاورہ ہے ''کوّا چلا ہنس کی چال، اپنی چال بھول گیا'' —— یہ بات اس موقع پر کہی جاتی ہے جب کوئی شخص بغیر سمجھے دوسرے کی نقل کرنے لگتا ہے، اور اپنی شناخت بھی کھو دیتا ہے، آج کل ہندوستان نے مغرب کی نقالی میں یہی طریقہ کار اختیار کر رکھا ہے، ابھی چند ہفتہ پہلے حکومت کی جانب سے سپریم کورٹ میں جواب تحریری داخل کیا گیا ہے کہ اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ ہم جنسی کو جرم کے دائرہ سے باہر کر دیا جائے اور اگر کوئی شخص باہمی رضامندی سے اس فعل کا مرتکب ہوتو اسے قابل گرفت نہیں سمجھا جائے، لاکمیشن کی سفارش پر یہ بات بھی بڑی حد تک تسلیم کر لی گئی کہ اگر نکاح کے بغیر مرد وعورت ایک ساتھ زندگی گذاریں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور وہ حقوق اور ذمہ داریوں کے اعتبار سے شوہر و بیوی کی طرح سمجھے جائیں گے، یہ سب انہیں اسباق کا آموختہ ہے، جو امریکہ کی طرف سے ہمارے حکمرانوں کو پڑھایا جاتا ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی مہاراشٹر میں ''حقوق مطلقہ بل'' ہے اس بل کو ''میٹری مونیل پراپرٹی رائٹس آف ویمن'' سے موسوم کیا گیا ہے، اس بل کے مطابق خواتین کو اپنے شوہر سے علاحدگی یا طلاق کی صورت میں شوہر کی جائداد اور اثاثہ کا ۵۰ فیصد حصہ ملے گا اور اس بل کا اطلاق ریاست کے تمام شہریوں پر ہوگا، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یا کسی اور مذہب کے ماننے والے، شاید یہ بل پاس بھی ہو گیا ہوتا؛ لیکن اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطاء فرمائے مہاراشٹر کے وزیر اقلیتی بہبود عارف نسیم صاحب کو کہ انہوں نے اس پر اعتراض کیا؛ اس لئے عارضی طور پر اس بل کو مہاراشٹر حکومت نے روک دیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تلوار ابھی بھی لٹک رہی ہے اور کبھی بھی دوبارہ اسے قانون کی شکل دی جاسکتی ہے۔

یہ مجوزہ قانون بلا شبہ شریعت اسلامی میں کھلی ہوئی مداخلت ہے، اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مرد وعورت دونوں مستقل حیثیت کے مالک ہیں؛ اسی لئے شوہر اپنی املاک میں تصرف کا پورا پورا حق رکھتا ہے اور بیوی اپنی املاک میں؛ البتہ جب تک کوئی عورت کسی مرد کے نکاح میں ہو، اس عورت کا نفقہ اس مرد کے ذمہ میں واجب رہتا ہے، جونہی میاں بیوی کے درمیان علیحدگی واقع ہوجاتی ہے تو سوائے نفقۂ عدت کے

اور کوئی چیز شوہر کے ذمہ باقی نہیں رہتی اور نکاح کی بنیاد پر جو رشتہ قائم ہوا تھا، وہ ختم ہو جاتا ہے۔

بیوی کو شوہر کی جائیداد میں جو حق ملتا ہے، وہ ''حق میراث'' ہے، اسلام میں میراث کا استحقاق قرابت داری سے حاصل ہوتا ہے اور چوں کہ قرابت داری کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے، اگر دور و نزدیک کے تمام رشتہ داروں میں ترکہ کی تقسیم عمل میں آئے تو جوتیوں میں دال بٹنے کی نوبت آئے گی، تقسیم بھی دشوار ہوگی اور حصہ کی مقدار بھی اتنی کم ہو جائے گی کہ ترکہ پانے والوں کو اس سے کوئی خاص نفع نہیں ہوگا؛ اس لئے پھر رشتہ داری میں ترجیحات مقرر کی گئی ہیں کہ ترکہ کے حقدار قریب ترین رشتہ دار ہوں گے، قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور کے رشتہ دار کا کوئی حصہ نہیں ہوگا، جیسے باپ کی موجودگی میں دادا، دادی، ماں کی موجودگی میں نانا نانی، اولاد کی موجودگی میں اولاد کی اولاد حصہ نہیں پائے گی، قرآن نے اس کو ﴿اَلْاَقْرَبُوْنَ﴾ (النساء: ۷) سے تعبیر کیا ہے۔

رشتہ داری ہی کی ایک صورت نکاح کی بھی ہے؛ چنانچہ اگر شوہر کا انتقال پہلے ہو جائے تو بیوی کو اس کے ترکہ میں سے حصہ ملے گا اور بیوی کا انتقال پہلے ہو جائے تو شوہر کو اس کے ترکہ میں سے ملے گا، پھر صورت حال یہ ہے کہ ولادت کی بنیاد پر جو رشتہ قائم ہوتا ہے، یعنی والدین و اولاد کا اور دونوں کے متعلقین کا، وہ فطری رشتہ ہے، انسان چاہے بھی تو اس رشتہ کو ختم نہیں کر سکتا؛ لیکن نکاح کا رشتہ ایسا رشتہ ہے جسے انسان اپنے بول کے ذریعہ وجود میں لاتا ہے؛ اس لئے جیسے وہ اس رشتہ کو اپنی مرضی سے وجود میں لایا ہے، اپنی مرضی سے ختم بھی کر سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی مذہب اور کسی بھی معاشرہ میں والدین اور اولاد کے درمیان طلاق کا تصور نہیں؛ لیکن شوہر و بیوی کے درمیان طلاق کے تصور کو قبول کیا گیا ہے، دنیا کے دو بڑے مذاہب عیسائیت اور ہندومت میں طلاق کی گنجائش نہیں تھی؛ لیکن چوں کہ یہ ایک غیر فطری قانون تھا؛ اس لئے آج پوری دنیائے عیسائیت میں طلاق کی گنجائش پیدا کی گئی ہے، اسی طرح ہندوستان میں بھی ساٹھ کی دہائی میں ہندوؤں کے لئے طلاق کا قانون بنایا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب میاں بیوی کے درمیان نکاح ختم ہو گیا تو اب وہ ایک دوسرے کے رشتہ دار نہیں رہے؛ لہٰذا ازدواجی رشتہ کی بنیاد پر مرد و عورت میں سے ایک کو دوسرے کے ترکہ سے جو میراث مل سکتی تھی، اس کا استحقاق ختم ہو گیا، شرعاً بیوی ایک مرد کے نکاح میں رہتے ہوئے بھی صرف نفقہ یعنی ضروریات زندگی کی کفالت ہی کی حقدار ہوتی ہے اور اگر وہ شوہر کی موت تک اس کے نکاح میں رہی

ہو تب بھی اس کے ترکہ میں سے صرف حصۂ میراث کی مستحق ہوتی ہے، جب رشتۂ نکاح ختم ہو چکا تو اب تو نفقۂ عدت کے علاوہ وہ نفقہ کی بھی حقدار نہیں ہے؛ چہ جائے کہ شوہر کی نصف جائداد کی حقدار بن جائے؛ اس لئے یہ مجوزہ قانون پوری طرح شریعت اسلامی سے متصادم ہے۔

یہ قانون انصاف کے تقاضوں کے بھی خلاف ہے، میاں بیوی کی علاحدگی میں ہمیشہ مرد ہی قصور وار نہیں ہوتا، بہت سی دفعہ عورتیں اس کی ذمہ دار ہوتی ہے اور بہت سی دفعہ خود خواتین کی طرف سے علاحدگی کا مطالبہ کیا جاتا ہے، ایسی صورت میں صرف مرد کو قصور وار سمجھتے ہوئے اس کی طلاق شدہ بیوی کو نصف جائداد کا حقدار قرار دیدینا کھلی ہوئی زیادتی ہے، ایسی صورت میں اگر اس عورت نے دوسرا نکاح کیا تو اب وہ سابق شوہر سے بھی نصف جائداد کی مالک ہو جائے گی اور موجودہ شوہر سے بھی، کیا یہ مرد کے ساتھ انصاف ہے؟— ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ جس شوہر سے اس کی علاحدگی ہوئی ہو، اس کی کوئی اور بیوی بھی ہو، ایسی صورت میں طلاق شدہ بیوی تو آزاد ہو کر آدھی جائداد اور اثاثہ کی مالک ہو جائے گی اور بقیہ نصف جائداد میں شوہر، اس کی دوسری بیوی اور بچوں کا گزر بسر ہوگا تو کیا اسے دوسری بیوی اور بچوں کے ساتھ انصاف کہا جاسکتا ہے؟— عجیب بات ہے کہ اس قانون میں پوری طرح مغربی ملکوں کی پیروی بھی نہیں کی گئی ہے، امریکہ اور یورپ میں جیسے عورت کو اُس مرد کی جائداد میں سے نصف حصہ مل جاتا ہے، اسی طرح مرد بھی مطلقہ عورت کی جائیداد و اثاثہ میں سے نصف کا حقدار قرار پاتا ہے، اگرچہ یہ قانون بھی درست اور منصفانہ نہیں ہے؛ لیکن مہاراشٹر کے مجوزہ قانون میں جس طرح انصاف کا خون کیا گیا ہے، کہا جاسکتا ہے کہ یہ اس کے مقابلہ میں غنیمت ہے!

ہندو اکثریت کے لئے بھی پارلیمنٹ ایک ترمیم شدہ میرج ایکٹ بنانے کیلئے تیار ہے، جسے دو سال پہلے راجیہ سبھا میں پیش بھی کیا گیا تھا، اس میں بھی مطلقہ عورت کو شوہر کی جائداد میں حصہ دار بنایا گیا ہے، حکومت کو چاہئے کہ ایسے قوانین کے سماجی اثرات پر بھی غور کرے، اس طرح کے قوانین کے نتیجے میں طلاق دشوار ہو جائے گی اور طلاق کو دشوار بنانا خود عورتوں کے مفاد میں نہیں ہے؛ اس لئے کہ جب طلاق دشوار ہو جائے گی، تو جسمانی اعتبار سے بالا دستی رکھنے والا مرد ایک طرف اس عورت سے بے رغبت ہوگا اور دوسری طرف نجات کا کوئی راستہ نہیں پائے گا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ عورت سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے غیر قانونی راستے اختیار کرنے لگے گا، اور عورتوں کو جلانے اور مار ڈالنے کے واقعات بڑھ

جائیں گے،''وکی پیڈیا'' کی معلومات کے مطابق ۲۰۰۷ میں یومیہ ۲۲ خواتین کوان کے شوہروں نے جلاکر مارڈالا ہےاور سال بھر میں ایسی خواتین کی تعداد ۷۰۹۲ ہے، یہ توان خواتین کا معاملہ ہے، جن کے شوہروں پر فرد جرم عائد کی جاسکی، مگر اعداد وشمار کی زبان بتاتی ہے کہ بیویوں کے قتل کے واقعات میں ۳۰ فیصدافراد پر ہی فرد جرم عائد ہو پاتی ہے، ۷۰ فیصد مجرم قانون کی گرفت میں آنے سے بچ جاتے ہیں۔

اس کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ لوگ نکاح سے اپنے دامن بچانے لگیں گے، وہ سوچیں گے کہ یہ ساری مصیبت نکاح کے نتیجہ میں آرہی ہے؛ اس لئے رشتۂ نکاح استوار کرنے کے بجائے غیر قانونی تعلق رکھا جائے، جیسے انسان پیٹ کی بھوک کبھی ایک ہوٹل اور کبھی دوسرے ہوٹل جا کر مٹالیتا ہے، اسی طرح انسان اپنی جنسی خواہشات کی بھوک بھی کبھی ایک گرل فرینڈ اور کبھی دوسری گرل فرینڈ کے ذریعہ کیوں نہ مٹالے، نہ نکاح کرے، نہ ذمہ داریوں کا نامنصفانہ بوجھ اس کے سر آئے، امریکہ اور مغربی ملکوں میں اس وقت یہی صورت حال ہے، ۱۹۶۰ء میں امریکہ میں نکاح کا تناسب ۷۲ فیصد تھا، جبکہ ۲۰۱۰ء میں نکاح کی شرح ۵۱ رفیصد رہ گئی ہے اور تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ نکاح کی شرح میں یہ کمی بڑھتی ہی چلی جائے گی، گویا اس وقت امریکہ کی نصف آبادی نکاح سے آزادرہ کر زندگی گذارتی ہے، کم وبیش یہی صورت حال مغرب کے دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی ہے۔

کسی سماج کا نکاح سے محروم ہوجانا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے، اس کی وجہ سے خاندانی نظام بکھر جاتا ہے، جن عورتوں کا حسن ڈھل گیا ہو، وہ اس سماج میں بے قیمت کوڑے کرکٹ کی طرح ہوجاتی ہیں، جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا، مرد وعورت دونوں کے لئے بڑھاپا ایک بوجھ بن جاتا ہے اور انہیں کس مپرسی اور تنہائی کی حالت میں سسکتے ہوئے زندگی کے آخری ایام گذارنے پڑتے ہیں، شرح پیدائش کم سے کم ہوجاتی ہے؛ کیوں کہ غیر شادی شدہ مرد وعورت بچوں کا بوجھ اٹھانا نہیں چاہتے، بچے اپنی شناخت سے محروم ہوجاتے ہیں، زنا کی کثرت ہوجاتی ہے، اور پھر اس برائی کے بطن سے طرح طرح کی بیماریاں جنم لیتی ہیں، یہ سب کچھ محض اندیشہ ہائے دور دراز نہیں ہیں؛ بلکہ ایسی حقیقتیں ہیں جنہیں مغرب میں آج بھی سر کی آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے، کیا ہماری حکومت اسی آفت کو اپنے گھر میں دعوت دینا چاہتی ہے؟

بعض خلاف شریعت قوانین کا تجزیہ

ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ بہت قدیم ہے، بعض روایتوں کے مطابق خود رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں مالا بار کے ساحلی علاقوں تک اسلام کی روشنی پہنچ چکی تھی، یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ کم سے کم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں اہل ہند کا قافلہ مدینہ منورہ پہنچ گیا تھا، پھر ایک وقت ایسا آیا کہ داعیان اسلام کا قافلہ جوق در جوق ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر خیمہ زن ہونے لگا، دوسری طرف عرب فاتحین نے سندھ کے علاقہ کو فتح کرلیا، وہ صرف زمین ہی کے فاتح نہیں تھے؛ بلکہ انہوں نے اپنے اخلاق اور اسلام کی بہترین تعلیمات کے ذریعہ لوگوں کے قلوب کو بھی فتح کرلیا تھا، پھر افغانستان کی پہاڑیوں کی طرف سے عجمی نژاد کشور کشاؤں کی یلغار شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ اس ملک کے چپہ چپہ پر مسلمانوں کے اقتدار کا سورج چمکنے لگا، مسلمانوں نے اس ملک میں بیرونی قابضین اور غیر ملکی غاصبین کا سا رویہ اختیار نہیں کیا؛ بلکہ وہ اسی زمین کا حصہ بن گئے، انہوں نے اس سرزمین سے پیار کیا، اس پر اپنی محبت کے نقوش ثبت کئے اور اسے ترقی کے اوج کمال پر پہنچانے کی کوشش کی، انہوں نے ہندوستان کی وحدت کا تصور دیا اور اس کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ملاکر ایک ایسا عظیم الشان ہندوستان بنایا، جو افغانستان کی سرحدوں سے لے کر برما کی آخری سرحد تک محیط تھا۔

پھر ایک ایسا وقت آیا کہ انگریز تاجروں کے بھیس میں ہندوستان میں اترے، انہوں نے ہندوستان میں مذہبی، نسلی اختلاف کو ابھارا، اتفاق و اتحاد کی فضاء کو تہہ و بالا کردیا اور بالآخر بتدریج پورے ملک پر برطانوی اقتدار کا جھنڈا لہرانے لگا، انگریز چاہتے تھے کہ وہ اس خطہ کو پوری طرح یورپ کے رنگ میں رنگ دیں اور نہ صرف تخت اقتدار پر قابض ہوجائیں؛ بلکہ فکری اور تہذیبی اعتبار سے بھی اس ملک کو اپنا غلام بنالیں؛ لیکن انہیں اس بات کا بھی پاس ولحاظ تھا کہ ملک کے باشندوں میں نفرت کے جذبات پیدا نہ ہوں؛ اس لئے انہوں نے بادل ناخواستہ سہی ایک حد تک اس بات کی کوشش کی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے سے بچا جائے؛ چنانچہ ان کا طریقہ یہ تھا

کہ مسلمانوں کے باہمی مقدمات کے فیصلے قانون شریعت کے مطابق اور ہندوؤں کے دھرم شاستر کے مطابق کئے جاتے، مسجدوں اور مندروں، دینی مدارس اور ویدک پاٹھ شالوں، خانقاہوں، درگاہوں اور امام باڑوں وغیرہ کے سلسلہ میں حکومت بلا وجہ مداخلت نہیں کرتی، ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر ملک کی آزادی کی لڑائی لڑی اور اپنے جذبہ سرفروشی کے ہتھیار سے غلامی کی زنجیریں کاٹ پھینکنے میں کامیاب ہوئے۔

ملک کے آزاد ہونے کے بعد دستور بنا اور ملک کے معماروں نے سیکولرزم کا راستہ اختیار کیا؛ کیوں کہ ایک کثیر مذہبی، کثیر تہذیبی، کثیر نسلی اور کثیر لسانی معاشرہ کے لئے یہی قابل قبول صورت ہوسکتی تھی؛ لیکن سیکولرزم ایک ایسی اصطلاح ہے، جس میں خاصا تنوع ہے، بعض ملکوں میں سیکولرزم کا مطلب مذہب سے مکمل بغاوت ہے اور وہاں کسی مذہبی علامت اور شناخت کا وجود بھی ناقابل برداشت ہے، بعض ممالک وہ ہیں جن میں نجی زندگی کی حد تک تو مذہب پر عمل کی اجازت ہے، یعنی آپ اپنے مذہب کے مطابق عقیدہ رکھیں، عبادت کریں، مذہبی تہوار منالیں؛ لیکن عملی زندگی سے مذہب کا کوئی تعلق نہیں ہو، سیکولرزم کا یہی تصور آج کل مغربی دنیا میں کارفرما ہے، اس کے برخلاف ہمارے ملک کے معماروں نے ہندوستان کی تاریخ، یہاں کے مزاج، اور مذہب سے اس ملک کے لوگوں کی گہری وابستگی کے پس منظر میں سیکولرزم کا ایسا تصور اختیار کیا، جس میں حکومت کا اپنا کوئی مذہب نہ ہو؛ لیکن عوام کو مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ہو، معاشرہ میں مذہب کو زندہ رکھا جائے، اخلاقی قدروں کی وقعت باقی رہے؛ چنانچہ دستور کے بنیادی حقوق میں اس بات کو تسلیم کیا گیا کہ ہر شخص کو اپنے مذہب کے مطابق عقیدہ رکھنے، اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کا حق حاصل ہوگا، اسی طرح اقلیتوں کو اپنی پسند کے ادارے بنانے اور چلانے کا بھی حق حاصل ہوگا، یہ تمام حقوق ہمارے دستور کا حصہ اور عوامی امنگوں کے آئینہ دار ہیں۔

ہندوستان کے عوام بجا طور پر توقع رکھتے تھے کہ ہمارا ملک زر و زمین ہی کے اعتبار سے آزاد نہ ہوگا؛ بلکہ وہ دل و دماغ کی غلامی سے بھی آزاد رہے گا اور وہ مغربی تہذیب اور مغربی فکر کا اسیر نہ بن جائے گا؛ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ ابھی مجاہدین آزادی کا لہو شاید خشک بھی نہ ہوا ہو کہ ملک کے موجودہ حکمرانوں کے تیور بدلنے لگے اور وہ پوری طرح مغربی تہذیب، مغربی فکر اور مغربی نظام کو اس

ملک پر مسلط کرنے کے لئے کوشاں ہیں، اب سیکولرزم کے اس مفہوم کونظر انداز کیا جارہا ہے، جسے اس ملک کے معماروں نے اختیار کیا تھا؛ بلکہ اب سیکولرزم کے اس مغربی تصور کو اختیار کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، جس میں مذہبی شناخت اور اخلاقی اقدار کی کوئی قیمت نہیں ہو۔

اس سوچ کا عکس ان بہت سے معاملات میں دیکھا جاسکتا ہے، جو ادھر سال دو سال میں منظر عام پر آئے ہیں، جیسے ہم جنسی کے تعلق کو جائز ٹھہرانا، جس کے بارے میں حکومت نے اب تک اپنا واضح موقف پیش نہیں کیا ہے، جیسے ناجائز رشتہ پر مبنی تعلق کو لیونگ پارٹنر کے نام سے قانونی حیثیت دینا، یہ بات ذرائع ابلاغ میں آچکی ہے کہ لاء کمیشن ایسی سفارش پر غور کررہا ہے، جیسے پرائمری سطح سے بارہویں جماعت تک سیکس ایجوکیشن، جس پر حکومت نے سخت عوامی دباؤ کے بعد خاموشی اختیار کی ہے، جیسے خواتین کے لئے نائٹ ڈیوٹی کی پابندی کو ختم کیا جانا، جس سے خواتین کی جنسی ہراسانی کے واقعات میں اضافہ ہوا اور جس سے بڑے اخلاقی مفاسد کا اندیشہ ہے۔

ادھر ماضیٔ قریب میں دو ایسے قوانین سامنے آئے ہیں اور ایک ایسا قانون زیر تجویز ہے جو مذہب مخالف، اقلیت کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف، ملک کے لئے نہایت نقصاندہ اور ہندوستان کی اخلاقی روایات کے لئے تباہ کن ہے، ان میں پہلا قانون 'رائٹ ٹو ایجوکیشن' (R T E) ہے، جو یکم اپریل ۲۰۱۰ء سے نافذ ہو چکا ہے، یہ قانون اگر اپنی موجودہ تفصیلات کے ساتھ باقی رہا تو دینی مدارس جو پہلے سے موجود ہیں وہ بند کردئے جائیں گے اور نئے دینی مدارس قائم نہیں ہوسکیں گے؛ بلکہ دینی مدارس میں تعلیم دینا اور دلانا ایک قابل سرزنش جرم قرار پائے گا اور اس سلسلہ میں طلبہ و طالبات کے اولیاء بھی سزا کے مستحق ہوں گے اور مدرسہ کے اساتذہ اور ذمہ داران بھی، اسکول قائم کرنے والی انتظامیہ بے دست و پا ہوجائے گی، انہیں ۲۵ رفیصد بچوں کی تعلیم کا نظم کرنا ہوگا، بارہویں جماعت تک ہر طالب علم کو لازماً پاس کرنا ہوگا، کسی کو فیل کرنے کی اجازت نہیں ہوگی اور داخلے عمر کے لحاظ سے لینے پڑیں گے نہ کہ صلاحیت کے لحاظ سے، یہ بھی امکان موجود ہے کہ 'تعلیم صحت' کے نام پر مستقبل میں بچوں کے لئے سیکس ایجوکیشن کا دروازہ کھولا جائے اور صحت کے نام پر مغربی درس گاہوں کی طرح مخلوط طریقے پر مختصر لباس میں لڑکوں اور لڑکیوں سے تیراکی کرائی جائے، اگرچہ قانون میں اس کی صراحت موجود نہیں ہے؛ لیکن جو تعبیرات اختیار کی گئی ہیں، مغربی نظام تعلیم کے پس منظر میں ان

کا یہی مفہوم نکلتا ہے، اس طرح یہ قانون نہ صرف دینی مدارس کو متاثر کرتا ہے؛ بلکہ اقلیتوں کے تعلیمی اداروں پر بھی شب خوں مارنے کا راستہ فراہم کرتا ہے، تعلیمی معیار کے لئے نہایت نقصاندہ ہے اور ملک کی اخلاقی روایات کے لئے بھی تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔

دوسرا قانون ’وقف‘ سے متعلق ہے، وقف ایکٹ ۲۰۱۰ء کو جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ نہایت عجلت میں پاس کرایا گیا، جس سے حکومت کی بددیانتی واضح ہوتی ہے، اس مجوزہ قانون کے تحت عوامی جائداد سے متعلق جو اختیارات حاصل ہونے چاہئیں حاصل نہیں ہوں گے؛ حالاں کہ یہ مسلمانوں کا اور مسلم پرسنل لا بورڈ کا دیرینہ مطالبہ رہا ہے، جو جائز بھی ہے اور انصاف کے مطابق بھی، اس قانون کے مطابق جو اوقاف درج رجسٹر نہیں ہیں، وہ اوقاف نہیں مانے جائیں گے اور انہیں عدالتی چارہ جوئی کا حق حاصل نہیں ہوگا، یہ نہایت خطرناک بات ہے؛ کیوں کہ تقسیم ملک کے وقت وقف کے بہت سے ریکارڈ ضائع ہوگئے اور اب بھی شہروں اور دیہاتوں میں بہت سی مسجدیں بنتی ہیں، یتیم خانے اور قبرستان وقف کئے جاتے ہیں؛ لیکن ان کا رجسٹریشن نہیں ہوتا، اس قانون کی رو سے یہ سب غیر موقوفہ قرار پائیں گے، شرعی نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگرچہ کسی وقف کا تحریری ثبوت موجود نہ ہو اور گواہاں بھی نہ ہوں؛ لیکن اگر وہ وقف کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے تو یہی اس کے وقف قرار پانے کے لئے کافی ہوگا، اس قانون کے مطابق مسجدوں، قبرستانوں، امام باڑوں اور درگاہوں کو گورنمنٹ ایکوائر کرسکتی ہے، شریعت کے اصولوں کی روشنی میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا مطالبہ ہے کہ ان سب کو ایکوزیشن کے دائرے سے باہر رکھا جائے، موجودہ قانون کے تحت وقف بورڈ میں مسلمان تنظیم کی کوئی نمائندگی نہیں ہوگی اور عملاً وہ حکومت کا نمائندہ ہوگا، ہندوستان میں بہت سے غیر مسلم راجاؤں اور حکمرانوں نے مسجد، قبرستان اور دوسرے اوقاف اپنی مسلمان رعایا کے لئے وقف کئے ہیں جو شرعاً وقف کے دائرے میں آتے ہیں؛ لیکن موجودہ قانون میں وقف کی ایسی تعریف کی گئی ہے کہ غیر مسلموں کے اوقاف وقف سے باہر نکل جاتے ہیں۔

افسوس کہ وقف کا یہ مجوزہ قانون لوک سبھا سے پاس ہو چکا ہے اور اس بارے میں بورڈ کی نمائندگی کے باوجود حکومت ٹھوس مثبت اقدام نہیں کررہی ہے، حکومت کے نمائندے زبان سے تو بورڈ کی مجوزہ ترمیمات کے معقول ہونے کا اعتراف کرتے ہیں؛ لیکن عملاً اسے قبول نہیں کرتے، اس وقت

بھی یہ سلیکٹ کمیٹی کے حوالہ ہے۔

ابھی انکم ٹیکس کی جگہ ایک نیا قانون 'ڈائریکٹ ٹیکسز کوڈ' کے نام سے زیر غور ہے، حکومت کے اعلان کے مطابق یکم اپریل ۲۰۱۲ء سے یہ قانون نافذ ہوجائے گا، اس قانون میں لفظوں کا کھیل کھیل کر دھوکہ دیا گیا ہے، اس میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ نان پروفٹ آرگنائزیشن پر ٹیکس نہیں لگے گا، ظاہر ہے کہ مساجد و مدارس وغیرہ اسی زمرہ میں آتے ہیں؛ لیکن Non Profit Orgnisation کی تعریف عجیب وغریب کی گئی ہے کہ وہ ایک ذات اور ایک مذہب کے ماننے والوں کے لئے نہ بنایا گیا ہو، اس لحاظ سے مساجد، مدارس، خانقاہیں، درگاہیں ان سب کو ٹیکس ادا کرنا پڑے گا، اور وہ بھی ۳۰ر فیصد کی شرح سے!

یہ تمام قوانین مسلمانوں کے لئے قطعاً ناقابل قبول ہیں، احکام شریعت سے متصادم ہیں اور مسلمانوں کے مفادات کو مجروح کرتے ہیں، اسی پس منظر میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے رائے عامہ کو بیدار کرنے، حکومت تک صدائے احتجاج پہنچانے اور حکومت کو اپنے بے جا طرز عمل سے باز رکھنے کے لئے ایک ملک گیر مہم شروع کی ہے اور اسے ''آئینی حقوق بچاؤ تحریک'' کا عنوان دیا ہے، مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے کہ وہ پوری قوت کے ساتھ اس تحریک میں شامل ہوں، مسلکی، تنظیمی اور جماعتی تنگنائیوں سے اوپر اٹھ کر اس تحریک میں شریک ہوں، ان کی آواز ایک آواز ہو اور ان کا قدم ایک ساتھ اٹھے، جمہوری نظام میں اپنی ناراضگی کا اظہار اور اپنے جائز مطالبات پر اصرار کی پوری گنجائش ہے، زندہ قومیں حقوق کی بھیک نہیں مانگتیں؛ بلکہ آگے بڑھ کر اپنے حقوق کو حاصل کرتی ہیں؛ اس لئے بحیثیت امت ہماری ذمہ داری ہے کہ پوری ملت اسلامیہ ہند اس تحریک میں شامل ہوجائے، بورڈ کی آواز پر لبیک کہے، ہر قسم کی قربانی کے لئے اپنے آپ کو آمادہ رکھے اور حکومت کو مجبور کرے کہ وہ ان قوانین میں مناسب ترمیم لائے اور مبہم الفاظ کے تاریک سایہ میں مسلمانوں اور اقلیتوں کے حقوق پر شب خوں نہ مارے۔

مرد وعورت کا غیر شرعی تعلق

ابھی چند دنوں پہلے دہلی ہائی کورٹ کا ایک اہم فیصلہ آیا ہے، جو اخلاقی اعتبار سے سنگین اثرات کا حامل ہوگا، اس فیصلہ میں کہا گیا ہے کہ شادی سے پہلے مرد وعورت کے درمیان جسمانی رشتہ کوئی جرم نہیں ہے، اس فیصلہ کے جو اخلاقی اثرات مرتب ہوں گے، وہ محتاج اظہار نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے نر و مادہ کا نظام تمام ہی جان دار مخلوقات میں رکھا ہے؛ بلکہ سائنس کی جدید تحقیق کے مطابق تو نباتات میں بھی مذکر و مؤنث موجود ہیں، نباتات ہوں یا حیوانات، ان دونوں کے اختلاط سے ہی نسل کی افزائش اور پھولوں اور پھلوں کی پیدائش متعلق ہے؛ لیکن ان میں نکاح کا کوئی نظام نہیں ہے، معلوم تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ایک نر اور مادہ جانور کا نکاح ہوا ہو اور انہیں دونوں کے درمیان اختلاط کا عمل ہوا ہو؟ یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے عفت وعصمت کے جوہر سے نوازا ہے، عفت و پاک دامنی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ جنسی تعلقات میں کچھ حدود وضوابط کے پابند رہیں، اسی کا ایک حصہ نکاح ہے، نکاح کا مقصد یہ ہے کہ جنسی تقاضے کو شوہر اپنی بیوی اور بیوی اپنے شوہر ہی کے ذریعہ پورا کرے اور کسی ایسے شخص سے اس کا تعلق نہ ہو، جس سے اس نے نکاح نہیں کیا ہے۔

شادی سے پہلے جسمانی رشتہ قائم کرنا اور شادی کے بعد اپنے شوہر و بیوی کے علاوہ کسی اور سے جسمانی تعلق زنا اور بدکاری ہے، یہ عفت وعصمت کے تقاضوں کے خلاف ہے؛ اسی لئے تمام مذاہب نے زنا سے منع کیا ہے اور مرد وعورت کے پاکیزہ تعلق کو جائز ٹھہرایا ہے، ہندو مذہب کی کہانیوں میں دیکھئے کہ سیتا جی جب اپنی گرفتاری سے آزاد ہوئیں تو ان سے شری رام جی نے پاک دامنی پر باقی رہنے کا حلف لیا اور اس کے بعد ہی مطمئن ہوئے، عیسائی مذہب میں حضرت مریم علیہا السلام کو ایک ایسی پاک دامن خاتون کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، جنہیں کسی مرد نے چھوا تک نہیں تھا اور جو اللہ تعالیٰ کی مشیت خاص سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں بنیں، قرآن مجید نے بھی اسی کی تصدیق کی ہے۔

جہاں تک اسلام کی بات ہے تو اسلامی تعلیمات اس سلسلہ میں بہت ہی واضح اور بے غبار ہیں، قرآن مجید نے نہ صرف زنا سے منع کیا ہے؛ بلکہ زنا کے قریب جانے سے بھی منع کیا ہے: ﴿وَلَا

تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی﴾ (الاسراء: ۳۲) زنا کار مرد وعورت کو اتنا برا سمجھا گیا کہ فرمایا گیا کہ ایسے مرد کے لئے پاک دامن عورت اور ایسی عورت کے لئے پاک دامن مرد موزوں نہیں ہیں: ﴿اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً٘ وَّالزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ٘ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (النور: ۳) زنا کی سزا تمام جرائم کے مقابلہ سخت رکھی گئی ہے، غیر شادی شدہ لڑکے اور لڑکی کے لئے سو سو کوڑے سزا مقرر کی گئی ہے: ﴿اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (النور: ۲) اور چوں کہ سماج میں ایسے شخص کے رہنے میں برائی کا چرچا ہوتا ہے اور برائی کے چرچے سے بھی برائی بڑھتی ہے؛ اس لئے بطور مصلحت ایسے شخص کی ایک اور سزا ایک سال کی جلاوطنی بھی ہے، یعنی زنا کے مرتکب کو ایک سال کے لئے شہر بدر کر دیا جائے گا: ''**عن زید بن خالد ﷜ عن رسول اللہ ﷺ أنہ أمر فیمن زنی ولم یحصن بجلد مائة وتغریب عام**'' (**صحیح البخاری، کتاب الشھادات، باب شھادة القاذف والسارق والزانی**، حدیث نمبر: ۲۶۴۹) تا کہ وہ لوگوں کی نظر سے اوجھل ہو جائے اور اس برائی کا ذکر معاشرہ سے ختم ہو جائے، نیز شادی شدہ مرد وعورت اگر اس کے مرتکب ہوں تو ان کی سزا سنگساری مقرر کی گئی: ''**۔۔۔ الشیخ والشیخة إذا زنیا فارجموھما البتة، رجم رسول اللہ ﷺ ورجمنا بعدہ**'' (**سنن ابن ماجة، کتاب الحدود، باب الرجم**، حدیث نمبر: ۲۶۵۰) اتنی سخت سزا تو ارتداد یعنی کسی مسلمان کے کفر کو اختیار کر لینے کی بھی نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی قوم میں زنا کی کثرت ہو جاتی ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خطرناک بیماریوں کا عذاب نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت بریدہ ﷜ سے مروی ہے کہ جب کسی قوم میں زنا کا عموم ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ ان پر موت کو مسلط کر دیں گے: ''**ولا ظھرت الفاحشة فی قوم قط إلا سلط اللہ علیھم الموت۔۔۔**'' (**مستدرک حاکم، کتاب الجھاد**، حدیث نمبر: ۲۵۷۷) شارحین نے لکھا ہے کہ یہاں موت سے مراد وبائی امراض ہیں، جن کی وجہ سے بکثرت اموات کی نوبت آتی ہے، حضرت عبداللہ بن عمر ﷜ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پانچ گناہوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جب کسی قوم میں زنا عام ہو جائے گا،

یہاں تک کہ لوگ علی الاعلان اس کا ارتکاب کرنے لگیں گے تو ان میں پلیگ اور ایسی بیماریاں پیدا ہوں گی، جن سے ان کے آباؤ واجداد واقف بھی نہ ہوں گے: ''۔۔۔ **لم تظهر الفاحشة في قوم قط حتى يعلنوا بها إلا فشا فيهم الطاعون والأوجاع التی لم تكن مضت في أسلافهم الذين مضوا**'' (**سنن ابن ماجة، كتاب الفتن، باب العقوبات، حدیث نمبر: ۴۱۵۵**)۔

یہ تو غیر قانونی جسمانی رشتہ کا مذہبی اور اخلاقی پہلو ہے، اب فطرت انسانی کے اشاروں کو دیکھئے، اللہ تعالیٰ نے ہر کنواری لڑکی کے جسم میں ایک ایسا پردہ رکھا ہے، جو اس کے کنوار پن کو ظاہر کرتا ہے اور جو اس کی عفت و پاک دامنی کی علامت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، یہ قدرت کی طرف سے اس بات کا اظہار ہے کہ کسی عورت کا نکاح سے پہلے کسی مرد سے تعلق نہیں ہونا چاہئے اور اسے اپنے آپ کو پوری طرح اپنے ہونے والے شوہر کے لئے محفوظ رکھنا چاہئے۔

انسان کی فطرت اور اس کی نفسیات میں یہ ہے کہ مرد چاہتا ہے کہ اس کی بیوی کسی دوسرے مرد کے تعلق سے پاک وصاف ہو اور یہی جذبہ ایک عورت میں اپنے شوہر کے تئیں بھی پایا جاتا ہے، یہاں تک کہ اکثر اوقات ایک مرد بیوہ اور مطلقہ عورت کے مقابلہ ایک کنواری لڑکی سے اور عورت شادی شدہ مرد کے مقابلہ غیر شادی شدہ مرد سے نکاح کرنے کو ترجیح دیتی ہے، جب جائز تعلق کی بنیاد پر ایک مرد یا عورت کی رغبت ایسے فریق کی طرف کم ہو جاتی ہے تو ناجائز رشتے نکاح سے پہلے یا اس کے بعد کس طرح انسان کے لئے قابل قبول ہو سکتے ہیں؟ —— عدالت نے اس مسئلہ کو غالباً اس نقطۂ نظر سے دیکھا ہے کہ عورت کا غیر قانونی تعلق سے بچنا شوہر کا حق ہے؛ اس لئے اگر شادی سے پہلے کسی مرد و عورت کے درمیان جسمانی رشتے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن اس میں ایک تو اخلاقی پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے؛ حالاں کہ تمام مذاہب میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ عفت و پاک دامنی انسان کے حق میں بنیادی اور مطلوب اوصاف میں سے ہے اور کسی انسان کا اس اخلاقی جوہر سے خالی ہونا نہایت ہی مذموم اور ناپسندیدہ ہے، دوسرے انسان کا پاکباز اور عفیف ہونا صرف اس رفیق حیات کا حق نہیں، جس سے رشتۂ نکاح استوار ہو چکا ہے؛ بلکہ ہونے والے شوہر یا بیوی کا بھی حق ہے، اگر اس کی رعایت نہ کی جائے تو سلیم الفطرت انسان کی طبیعت ایسے رشتہ کو قبول کرنے سے اِبا کرتی ہے۔

دوسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ زنا کی ممانعت صرف شوہر کا حق نہیں؛ بلکہ اس سے زانی مرد یا

عورت کے خاندان، اولاد، اور سماج کا حق بھی متعلق ہے، خاندان سے اِس کا تعلق یوں ہے کہ ایسے لوگ پورے خاندان کے لوگوں کے لئے شرم و عار کا باعث ہوتے ہیں، انسان اپنے خاندان سے اس کے تعلق کو اپنے لئے اہانت اور حقارت کا باعث خیال کرتا ہے اور اس کے برخلاف کردار کی پاکیزگی کو باعث افتخار تصور کرتا ہے، عیسائی دنیا میں راہبات اور ہندوؤں کے یہاں دیوداسیوں کا تصور موجود ہے، جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ایسی خواتین ہیں، جن کا کسی مرد سے جسمانی رشتہ قائم نہیں ہوسکتا، اور ان کو تقدس کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اگر کبھی ان کا کوئی غیر اخلاقی واقعہ سامنے آتا ہے تو یہ اتنا خلاف توقع سمجھا جاتا ہے کہ ذرائع ابلاغ میں بحث کا موضوع بن جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ کسی بھی مرد یا عورت کا غیر قانونی تعلق باعث ننگ و عار ہوتا ہے اور خاندان کے لوگوں کو اس سے شرم سار ہونا پڑتا ہے؛ لہٰذا پاکباز ہونا انسان پر اس کے خاندان کا بھی حق ہے۔

اس سے اولاد کا حق بھی متعلق ہے، ہر انسان کا حق ہے کہ اس کی شناخت محفوظ ہو؛ کیوں کہ ہر انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ اپنے نسبی تعلق سے واقف ہونا چاہتا ہے، کئی ماہرین نفسیات کا تجزیہ ہے کہ جن لوگوں کے والد یا والدہ کی شناخت محفوظ نہ ہو، یا انہیں گود لے لیا گیا ہو اور ماں باپ کا پتہ نہ ہو تو ان کے اندر اپنے والدین کو پانے کی شدید خواہش ہوتی ہے، اور اس خواہش کے پوری نہ ہونے کی صورت میں اکثر اوقات وہ سنگین قسم کے جرائم کا ارتکاب کرنے لگتا ہے، ایسے لوگ اپنے آپ کو کٹی پتنگ کی طرح سمجھتے ہیں، جس کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں ہوتی، اگر مرد یا عورت غیر قانونی رشتوں کے مرتکب یا اس کی عادی ہوں تو ان کی خاندانی شناخت گم ہوجاتی ہے؛ اس لئے زنا خواہ مرد کرے یا عورت، یہ بچوں کو ان کی حقیقی شناخت سے محروم کردینے کے مترادف ہے۔

تیسرا پہلو سماجی ہے، معاشرہ کا عفیف و پاک دامن ہونا سماج کا حق ہے، ایسے معاشرہ میں لوگ اپنے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے عافیت اور حفاظت محسوس کرتے ہیں، جب کسی سماج میں بدکردار افراد پیدا ہوجاتے ہیں تو پھر انسان ہر وقت خطرہ محسوس کرنے لگتا ہے اور امن وآشتی سے محروم ہوجاتا ہے، اس سے سماج کی صحت بھی متعلق ہے، غیر قانونی جسمانی رشتوں میں نہ تعلقات کے دائرہ کی کوئی حد ہوتی ہے او نہ لذت اندوزی کے طریقوں میں کوئی تحدید، ایک سے طبیعت اکتا گئی، دوسرے سے رابطہ استوار کرلیا، زندگی ایک رہ گذر بن جاتی ہے اور لذت چشتی کی بے شمار منزلوں سے

انسان گذرتا چلا جاتا ہے، اسی کو حدیث میں ''متذوقین'' اور ''متذوقات'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی ذائقہ چکھنے والے مرد اور ذائقہ چکھنے والی عورتیں؛ کیوں کہ جب کسی برائی کے برائی ہونے کا احساس مٹ جائے اور آدمی اس کو درست سمجھنے لگے تو پھر اس کو کسی حد تک محدود کرنا دشوار ہوجاتا ہے، پھر انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ اگر مختلف ہوٹلوں سے کھانا کھایا جاسکتا ہے، بود وباش کے لئے بار بار مکانات بدلے جاسکتے ہیں اور مختلف درزیوں سے نئے نئے لباس سلوائے جاسکتے ہیں تو صنفی تعلق بھی تو ایک انسانی ضرورت ہے، اس میں تحدید کی کیا ضرورت ہے؟ پھر جب انسان لذت چشتی اور ہوسنا کی میں آگے قدم بڑھاتا چلا جاتا ہے تو اسے صنفی تعلق کا فطری طریقہ ناقص و ناتمام نظر آنے لگتا ہے اور وہ انتہائی غیر فطری راہوں کو بھی اختیار کرنے سے نہیں چوکتا، یہ ساری حرکتیں اگر چہ بظاہر اس کے انفرادی افعال ہوتے ہیں؛ لیکن اس سے ناقابل علاج بیماریاں وجود میں آتی ہیں اور عام طور پر یہ بیماریاں متعدی اور پھیلنے والی ہوتی ہیں؛ اس لئے ان کا نقصان پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، جس کی طرف حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے، کسی زمانہ میں آتشک اور سوزاک جیسی بیماریوں سے لوگ پریشان تھے، اب مہلک ترین بیماری ایڈس سے پوری دنیا پریشان ہے، جس کو طبی ماہرین قدرت کی طرف سے ''ایٹم بم'' قرار دیتے ہیں، یہ نہایت تیزی کے ساتھ پھیلنے والی بیماری ہے، جس سے اب غیر متعلق لوگ بھی متاثر ہورہے ہیں؛ لیکن اس بیماری کا نقطۂ آغاز جنسی انحراف ہی بنتا ہے۔

غرض کہ زنا اگر چہ ایک انفرادی فعل نظر آتا ہے؛ لیکن اس سے موجودہ یا آئندہ ہونے والے شوہر کے، مرد وعورت کے خاندان کے، اولاد کے اور سماج کے حقوق بھی متعلق ہیں، ایک ایسے فعل پر انسان کی اپنی رضا مندی پر چھوڑ دینا ایسا ہی ہے جیسے گھنی آبادی میں مقیم کسی شخص کو اپنے مکان میں آگ لگانے کی اجازت دی جائے کہ اس کا گھر تو جلے ہی، پوری آبادی بھی جل کر خاکستر ہوجائے، افسوس کہ ہندوستان اس وقت پوری طرح مغربی تہذیب وافکار کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کررہا ہے، ہم ہندوستانی اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ علمی ومعاشی ترقی کے لئے اخلاقی زوال، ثقافتی انحطاط اور تہذیبی گندگی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہمیں چاہئے کہ ہم مغرب سے ان کے علوم وفنون کو حاصل کریں؛ لیکن اخلاقی اقدار کی تباہی کا جو تجربہ مغرب کرچکا ہے اور جس تجربہ کی کڑواہٹوں سے وہ خود تڑپ رہا ہے، ہم اسے آزمانے کی کوشش نہ کریں، کہ جس چیز کی آزمائش کی

جا چکی ہے، اسے آزمانا جہالت ہے نہ کہ علم، اور بے وقوفی ہے نہ کہ تہذیب۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کو اس کی خواہشات کی غلامی کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تو یہ ایسے ہی ہے، جیسے کسی پاگل کے ہاتھ میں تیز اور دھار دار چاقو دے دیا جائے، جو خود اس کے لئے بھی ہلاکت کا باعث ہوگا اور دوسروں کے لئے بھی، انسان علم وتحقیق کے اعتبار سے ترقی کی کتنی ہی منزلیں طے کر لے، وہ فضاؤں کو فتح کر سکتا ہے، سمندر کی تہوں کو مسخّر کر سکتا ہے اور برق و بخارات کو قید کر سکتا ہے؛ لیکن اپنے خالق ومالک کی ہدایات سے محروم ہو کر سکینت بخش زندگی گزار نہیں سکتا:

وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

❁

مذہبی پیشواؤں کی بے حرمتی کے سلسلہ میں قانون کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو بنایا اوراس کو بہت سی مخلوقات سے بسایا ہے، ان میں جاندار بھی ہیں اور بے جان بھی، طاقتور بھی ہیں اور کمزور بھی، چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی؛ لیکن ان سب کا مخدوم حضرت انسان کو بنایا گیا ہے، پوری کائنات اس کی خدمت گذار ہے اور ہر شئ اس کو راحت پہنچانے میں لگی ہوئی ہے، انسان کا یہ اعزاز و اکرام اس لئے ہے کہ خالق تعالیٰ نے اس کو اپنی بندگی اور اطاعت وفرمانبرداری کے لئے پیدا کیا ہے، وہ ہر وقت امتحان کی حالت میں ہے، اس کا ایک ایک لمحہ ریکارڈ ہورہا ہے، اس پر مسلسل نگرانی کی جارہی ہے کہ وہ کس حد تک اپنی ڈیوٹی کو مکمل کرتا ہے؛ لیکن کیا تعلیم و تربیت کے بغیر کسی طالب کا امتحان لیا جاسکتا ہے؟ اگر آپ کسی بچہ کو پڑھائیں نہیں اور اسے امتحان ہال میں بٹھادیں اور پرچۂ سوال حل کرنے کا حکم دیں تو یہ بات قطعاً قابل قبول نہیں ہوسکتی، پھر انسان اپنی ساٹھ ستر سال کی عمر کا امتحان دے، آخرت میں اس کے ایک ایک عمل کو تولا جائے اور قیامت کے دن اس کے ایک ایک لمحہ کا جائزہ لیا جائے، یہ سب کچھ اس کے بغیر کیوں کر ہوسکتا ہے کہ پہلے ان سے وہ باتیں بتائی جائیں، جن سے ان کا مالک راضی ہوتا ہے، ان باتوں سے آگاہ کیا جائے، جن سے ان کا پروردگار ناراض ہوتا ہے، انہیں دنیا میں زندگی گذارنے کا طریقہ بتایا جائے، جب ہی ان کا امتحان لینا تقاضۂ انصاف کے مطابق ہوگا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم اس قوم کو اپنے عذاب میں مبتلا نہیں کرتے جو غافلین یعنی بے خبر ہو (الانعام: ۱۳۲)۔

اللہ تعالیٰ ہر انسان کو براہ راست اپنی مرضیات کے بارے میں بتادیں، یہ ممکن نہیں تھا؛ اس لئے کہ ہر انسان کے اندر کلام خداوندی کو اٹھانے کی صلاحیت نہیں تھی، بادل کی غیر معمولی گرج کو سننے اور کوندتی ہوئی بجلی کو دیکھنے کی انسان کے اندر طاقت نہیں ہے تو کیا اس کا حقیر وجود براہ راست خدا کا کلام سننے کا متحمل ہوسکتا تھا؟ نیز اس لئے بھی کہ ہر انسان جب براہ راست خدا کی بات سنتا تو پھر امتحان کی کیفیت باقی نہیں رہتی، امتحان تو اسی وقت ہے، جب اَن دیکھی حقیقتوں پر ایمان لایا جائے،

—— دوسری طرف یہ بات بھی ضروری تھی کہ اللہ کا پیغام اس کے پاس کسی انسان ہی کے ذریعہ پہنچے؛ کیوں کہ ایک انسان دوسرے انسان ہی کو اپنے لئے نمونہ بنا سکتا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان ہی میں کچھ برگزیدہ ترین بندوں کو منتخب کیا اور انہیں اپنی نبوت سے سرفراز فرمایا، پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام پہلے نبی بھی تھے، اور ختمی مرتبت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی بنائے گئے اور آپ کی ذات والا صفات پر نبوت کا یہ سلسلۃ الذہب مکمل ہو گیا۔

نبوت اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ ہے، اس میں انسان کے کسب اور محنت کا کوئی دخل نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ کوئی شخص زیادہ محنت کرتا ہو تو اس کو نبوت مل جاتی ہو، زیادہ لکھتا پڑھتا ہو تو اسے نبوت سے نواز دیا جاتا ہو؛ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی انتخاب ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ اس عظیم الشان کام کے لئے اپنے ان ہی بندوں کا انتخاب فرمایا کرتے تھے، جو حسن اخلاق کے اعتبار سے امتیازی شان کے حامل ہوں، عقل و دانش کے لحاظ سے اوج کمال پر پہنچے ہوئے ہوں، کردار کی پاکیزگی میں اپنی مثال آپ ہوں، جسمانی قویٰ کے لحاظ سے بھی اعلیٰ معیار پر ہوں، تخلیقی اعتبار سے بھی مکمل ترین شخصیت ہوں، غرض وہ ہر لحاظ سے کامل و مکمل ہوتا تھا، ایک ملک جب دوسرے ملک میں اپنا سفیر بھیجتا ہے تو اس میں بھی یہ بات ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ذہین، باصلاحیت، قوت فیصلہ اور سلیقۂ اظہار کا مالک ہو تو اللہ تعالیٰ اپنی نمائندگی کے لئے کن اعلیٰ ترین صفات کی حامل شخصیتوں کا انتخاب کریں گے؟ یہ ظاہر ہے، اور جو شخصیتیں خدا کی منتخب کی ہوئی ہوں، ان پر انگلی اٹھانا اور ان کی شان میں کوئی بدگوئی کرنا یقیناً چاند پر تھوکنے اور بدنصیبی و کم بختی کے مترادف ہے۔

اسی لئے تمام انبیاء کا احترام، ان سے محبت، ان پر ایمان، ان کی تعظیم و توقیر اور ان کے ساتھ ساتھ ان کے متعلقین اور رفقاء کا احترام بھی شرعاً واجب ہے، کسی بھی نبی کی شان میں بے احترامی ایمان سے محرومی کا باعث ہے، اسلام میں اس کی سزا قتل ہے؛ بشرطیکہ اہانت کا یہ واقعہ ایسی جگہ پیش آیا ہو، جہاں اسلامی حکومت ہو، یہ وہ بات ہے جس پر تمام فقہاء متفق ہیں، یہ حکم نہ صرف پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کا ہے؛ بلکہ کوئی بھی پیغمبر -جن کی قرآن مجید نے تصدیق کی ہے- کے سلسلہ میں یہی حکم ہے، ایسے مذہبی پیشوا جن کا قرآن مجید نے کوئی ذکر نہیں کیا ہے، نہ تصدیق کی ہے، نہ تکذیب، ان کے بارے میں بھی قرآن مجید نے تلقین کی ہے کہ ان کو برا بھلا نہ کہا

جائے؛ کیوں کہ اس سے لوگوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں، اور عمل اور ردعمل کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے: ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (الانعام:۱۰۸)۔

چنانچہ دنیا کے مختلف ملکوں میں بجا طو پر ایسے قوانین بنائے گئے ہیں، جو مذہب اور مذہبی پیشواؤں کی توہین کو جرم قرار دیتے ہیں، ہمارے ملک ہندوستان میں بھی ایسا قانون موجود ہے اور یہ بالکل مبنی برانصاف قانون ہے، یقیناً ہر شخص کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ جس عقیدہ کو درست سمجھتا ہے، اس پر یقین رکھے اور جس شخصیت کی محبت وعظمت اس کے دل میں ہے، اس سے عقیدت واحترام کا تعلق رکھے، اس کی ستائش کرے؛ لیکن اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ دوسرے کی محبوب شخصیت کو برا بھلا کہہ کر ان کے معتقدین کے جذبات کو مجروح کرے؛ مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ مغربی ممالک ایک طرف تو انصاف، رواداری اور انسانی حقوق کی پاسداری کی باتیں کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ اظہار خیال کی آزادی کے نام پر دوسروں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، اولاً تو یہی بات قابل غور ہے کہ کیا آزادیٔ اظہار کا بے قید ہونا انسان کے حق میں بہتر ہے؟ — یقیناً ایسا نہیں ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے سڑک پر بائیں جانب سے چلنے کا قانون ہو اور آپ آزادی کی دہائی دے کر اپنی سواری دائیں جانب سے چلائیں اور راہ گیروں کو کچل ڈالیں، سرکار کے عہدیداران دفاع کی حساس رپورٹیں منظر عام پر لے آئیں اور کہیں کہ ہم نے آزادی اظہار سے فائدہ اٹھایا ہے تو یہ ایک نامعقول بات ہی ہوگی؛ کیوں کہ آزادی اظہار اسی وقت تک ہے جب تک کہ آپ کا عمل دوسرے کے لئے مضرت رساں اور تکلیف دہ نہ ہو، اگر آپ کا عمل دوسرے کے لئے تکلیف دہ ہو تو یہ آزادی نہیں ہے؛ بلکہ ایک شیطانی حرکت ہے۔

پھر اظہار خیال کی آزادی کے لئے ایک ہی پیمانہ ہونا چاہئے، مغربی ممالک کا یہ رویہ عجیب ہے کہ کوئی عیسائی مذہب اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین کرے تو وہ مجرم ہے اور دوسرے مذاہب اور دوسرے مذہبی پیشواؤں کی اہانت کی جائے تو وہ جائز ٹھہرے؛ بلکہ حضرت عیسیٰ کی توہین تو کجا، اگر کوئی شخص یہودیوں کے ہولوکاسٹ کا انکار کردیا جائے تو وہ بھی مجرم ہے، فرانس کے نئے قانون کے مطابق اگر کوئی ترکوں کی طرف سے آرمینیاؤں کے قتل عام کا انکار کرے تو اس کی شہریت ختم کردی جائے گی،

نیز کوئی شخص 'نائن الیون' والے واقعہ کو امریکہ کی فریب کاری قرار دے تو وہ بھی مجرم سمجھا جائے گا، ان قوانین سے اظہار خیال کی آزادی پر کوئی آنچ نہیں آتی ہے؛ لیکن دوسرے مذاہب اور مذہبی پیشواؤں کی اہانت پر پابندی سے اظہار خیال کی آزادی کا حق پارہ پارہ ہوجاتا ہے، یہ ایسا غیر منطقی و نامعقول، نامنصفانہ اور جانبدارانہ طرز عمل ہے، جس کو کوئی صاحب انصاف قبول نہیں کرسکتا۔

ایک بد نام زمانہ شخص سلمان رشدی ہے، جس کے شیطانی دماغ نے 'شیطانی کلمات' نامی کتاب لکھی ہے، جو انتہائی غیر مہذب، خلاف واقعہ، بدتمیزی اور گستاخی پر مبنی کتاب ہے، مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے کی وجہ سے اس کتاب پر مؤلف کو یورپ نے انعام سے نوازا ہے، اس کی پیدائش ممبئی کی ہے اور اس وقت انگلینڈ اس کا ملجا و ماوی ہے، خوشی کی بات ہے کہ اس کی اس بیہودہ کتاب پر ہندوستان نے سب سے پہلے پابندی لگائی اور اس وقت کے وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی نے انصاف سے کام لیتے ہوئے یہ قدم اٹھایا؛ لیکن بے حد افسوس کی بات ہے کہ سلمان رشدی اور اس جیسے آوارہ خیال لوگوں کو بیس کروڑ مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ کئے بغیر اس ملک میں آنے کی اجازت دی جاتی ہے، وہ ۲۰۰۰ء میں دولت مشترکہ ادیبوں کے ایوارڈ کی تقریب میں اور ۲۰۰۷ء میں جے پور میں منعقد ہونے والے لٹریری فیسٹول میں شرکت کرچکا ہے اور اب پھر راجستھان میں ایک ادبی پروگرام میں آمد کی بات چل رہی ہے، خدا کرے کہ حکومت عقل کے ناخن لے اور اس کو ہندوستان آنے سے روک دے، یہ یقیناً مسلمانوں کے زخم پر نمک رکھنے کے مترادف ہے اور یہ بات قابل غور ہے کہ کانگریس ایک طرف اپنے آپ کو مسلمانوں کا دوست ٹھہراتی ہے اور دوسری طرف وہ ان کے جذبات کو مجروح کرنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی، ابھی کچھ عرصہ پہلے جب 'گیتا' پر پابندی لگانے کی بات آئی تو اس کے خلاف ہماری حکومت کی چوکسی قابل دید تھی؛ لیکن جب خود اپنے ملک میں مسلمانوں کے جذبات سے متعلق یہ مسئلہ سامنے آیا تو ایسا لگتا ہے کہ حکومت کے کان بہرے ہوچکے ہیں اور اس کی آنکھیں بینائی سے محروم ہیں۔

مسلمانوں نے نہ صرف ہندوستان میں؛ بلکہ پوری دنیا میں اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ وہ دوسروں کے مذہبی جذبات سے کھلواڑ نہ کریں، وہ بین الاقوامی طاقتوں اور اقوام متحدہ سے بجا طور پر اس بات کے طالب ہیں کہ تمام مذاہب کے احترام کے سلسلہ میں قانون سازی کی جائے اور تمام

مذہبی گروہوں کے احترام کو یکساں طریقہ پر ملحوظ رکھا جائے، اظہار رائے کی آزادی کے حق کو اتنا بڑھا نہ دیا جائے کہ وہ لوگوں کے لئے نفع کی بجائے نقصان کا اور دنیا کے لئے امن وسکون کی بجائے بدامنی کا سبب بن جائے، خاص کر حکومت ہند کا فریضہ ہے کہ وہ اندرون ملک بھی مذہبی جذبات اور مذہبی شعائر کے احترام کے سلسلہ میں مؤثر قانون سازی کرے اور اس کی مرتکب ننگ انسانیت شخصیتوں کی ملک میں آنے پر پابندی کے سلسلہ میں بھی مؤثر قدم اٹھائے؛ کیوں کہ ایک شخص کی آزادی کے مقابلہ کروڑوں انسان کی جذبات کی اہمیت کہیں زیادہ ہے، مسلمان سب کچھ برداشت کرسکتا ہے اور کررہا ہے؛ لیکن یہ بات اس کے لئے ناقابل برداشت ہے کہ اس کے پیغمبر کی شان میں کوئی گستاخی کی جائے کہ یہ براہ راست اس کے ایمان سے متعلق ہے، مسلمان رگِ گلو کٹا سکتا ہے، زر وزمین کے نقصان کو برداشت کرسکتا ہے، ابتلاء وآزمائش کے ہر زخم کو سہہ سکتا ہے؛ لیکن وہ اس بات کو گوارہ نہیں کرسکتا کہ کوئی اس کے نبی کی حرمت وعظمت پر معاندانہ نظر اٹھائے۔

طلاق کو مشکل بنانا خود عورت کیلئے نقصاندہ

انسان کے لئے زندگی کی ایک اہم ضرورت نکاح ہے، نکاح انسان کے لئے عفت و پاکدامنی کا ذریعہ بھی ہے، محبت وسکون کا باعث بھی اور افزائش نسل کا وسیلہ بھی؛ اسی لئے اسلام میں نکاح کو پسندیدگی کی نظر دیکھا گیا ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے اس کی ترغیب دی ہے اور تجرد کی زندگی کو ناپسند فرمایا ہے، اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نکاح کے رشتہ کو مستحکم اور پائیدار ہونا چاہئے، ایک بار جب ازدواجی زندگی کی عمارت تعمیر ہو جائے، تو پھر اس میں توڑ پھوڑ نہ ہو؛ بلکہ میاں بیوی ہمیشہ اُسی کے زیر سایہ زندگی گزاریں؛ کیوں کہ جب یہ رشتہ ٹوٹتا ہے تو خاندان بکھر جاتا ہے، جو فریق ایمانداری سے رشتہ کو باقی رکھنا چاہتا ہو، اس کو اس سے شدید صدمہ پہنچتا ہے، بچوں کے لئے ماں اور باپ دونوں ہی کا وجود ضروری اور اہم ہے؛ لیکن رشتۂ نکاح کے ٹوٹنے کے نتیجہ میں بچے یا تو باپ کی شفقت سے محروم ہو جاتے ہیں، یا ماں کی ممتا سے؛ اسی لئے اسلام کی نظر میں نکاح جتنا پسندیدہ عمل ہے، طلاق اسی قدر ناپسندیدہ عمل ہے۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر مکان کی بنیادیں کھوکھلی ہو گئی ہوں یا چھت بوسیدہ ہو گئی ہو، تو اس کو گرا دینا ضروری ہوتا ہے، اسی طرح اگر میاں بیوی کے درمیان کسی بھی وجہ سے نفرت پیدا ہو گئی ہو، تعلقات میں کڑواہٹ ہو، دونوں کا یا کسی ایک فریق کا دوسرے کے ساتھ رہنا دشوار ہو گیا ہو تو پھر ایسے رشتے کو ختم کر دینے میں ہی بھلائی ہوتی ہے؛ اسی لئے اسلام میں اگرچہ رشتۂ نکاح کو ختم کرنا ایک ناپسندیدہ عمل ہے؛ لیکن پھر بھی ایک معاشرتی ضرورت اور مجبوری کے درجہ میں اسلام نے اس کی گنجائش رکھی ہے، دنیا کے دو بڑے مذاہب ہندومت اور عیسائیت میں رشتۂ نکاح کے انقطاع کا کوئی تصور نہیں تھا؛ لیکن بالآخر انھیں بھی اس کی گنجائش پیدا کرنی پڑی۔

رشتۂ نکاح قائم ہونے کے بعد میاں بیوی کے درمیان علاحدگی کی بنیادی طور پر دو صورتیں ہیں، طلاق اور شرعی عدالت کے ذریعے تفریق، علاحدگی کی بعض اور صورتیں بھی ہیں، جیسے خلع، لعان، ایلاء وغیرہ؛ لیکن یہ سب انھیں دو بنیادی صورتوں کے اندر داخل ہے، اب طلاق کے سلسلے میں تین

صورتیں ہوسکتی تھیں، ایک یہ کہ اس کا اختیار صرف عدالت کو حاصل ہوتا، شوہر و بیوی میں سے جو بھی علاحدگی چاہیں، وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں اور جب تک عدالت کا فیصلہ نہ ہوجائے، ان میں علاحدگی نہ ہو پائے، آج کل اکثر غیر مسلم ممالک میں اسی طریقۂ کار کو اختیار کیا گیا ہے، خود ہمارے ملک میں بھی برادرانِ وطن کے لئے یہی قانون ہے؛ لیکن اس میں ایک نقصان تو یہ ہے کہ اگر میاں بیوی متفق ہوں اور دونوں علاحدہ ہونا چاہتے ہوں، نیز اس سے ان کی کوئی مصلحت وابستہ ہوتو باوجود دونوں فریق کے متفق ہونے کے مسئلہ کا حل نکلنے میں اچھی خاصی تاخیر ہوسکتی ہے اور ہوا کرتی ہے، دوسرا نقصان اس میں یہ ہے کہ اگر عدالت کے واسطہ کے بغیر علاحدگی ممکن نہ ہوتو جو فریق عدالت میں پہنچے گا، وہ دوسرے فریق کی ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کو بیان کرنے پر مجبور ہوگا، جن کی وجہ سے وہ علاحدگی چاہتا ہے، ہمارے مشرقی معاشرہ میں خاص طور پر جب کسی عورت کے اخلاق و کردار کے بارے میں کوئی اعتراض سماج کے سامنے آجاتا ہے، تو اس کی زندگی اس کے لئے بوجھ بن جاتی ہے اور آئندہ کوئی دوسرا شخص اسے اپنانے کے لئے تیار نہیں ہوتا، آج کل جہیز اور ہراسانی وغیرہ سے متعلق جو قوانین آگئے ہیں، —— جن کا زیادہ تر بیجا استعمال ہوتا ہے، —— کی وجہ سے مرد بھی پھونک پھونک کر قدم اُٹھانے پر مجبور ہیں اور اگر کسی لڑکی کے بارے میں تھوڑا بھی شبہ ہوا تو لوگ احتیاط برتنے کو ہی مناسب خیال کرتے ہیں، ان حالات میں اگر عدالت کے واسطہ سے طلاق تک پہنچنے کو لازمی قرار دے دیا جائے، تو اس سے عورتوں کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوسکتا ہے۔

دوسری شکل یہ تھی کہ شوہر اور بیوی دونوں کو طلاق کا اختیار حاصل ہو، اس سلسلے میں ایک فطری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں میں جذبات کا عنصر زیادہ رکھا ہے؛ کیوں کہ ایک ماں کی حیثیت سے ان کو جو کردار ادا کرنا ہے، اس کے لئے وفورِ جذبات ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ اولاد سے محبت ماں اور باپ دونوں کو ہوتی ہے؛ لیکن ماں کی محبت میں جو جذباتیت کارفرما ہوتی ہے، وہ باپ میں نہیں ہوتی اور اسی لئے بچوں کو اپنی ماں سے زیادہ قربت ہوتی ہے، جہاں جذبات بڑھے ہوئے ہوں گے، وہاں جلد خوش ہونے اور جلد ناراض ہونے کی کیفیت بھی پائی جائے گی اور زود رنجی کا مزاج ہوگا؛ اس لئے اگر عورتوں کو یکطرفہ طور پر طلاق کا اختیار دے دیا جائے، تو طلاق کے واقعات بڑھ جائیں گے، بعض دفعہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر طلاق کی نوبت آئے گی اور پھر بعد میں پچھتاوا ہوگا؛ چنانچہ مغربی

ممالک کی صورتحال یہی ہے کہ زیادہ تر طلاق کے دعوے عورتوں ہی کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں اور بہت معمولی باتوں پر، اس بات پر کہ شوہر کے خراٹے کی آواز تیز ہے، اس بات پر کہ مجھے ٹی وی کا فلاں پروگرام پسند ہے اور میرے شوہر کو پسند نہیں، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلام نے عورت کو یکطرفہ طور پر طلاق کا حق تو نہیں دیا؛ لیکن اس کے لئے تین باتوں کی گنجائش رکھی، ایک یہ کہ اگر شوہر و بیوی دونوں رضامند ہوں تو شرعی عدالت کے واسطہ کے بغیر طلاق کا معاملہ طے کرلیں، اس کو فقہ کی اصطلاح میں 'خلع' کہتے ہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ عورت نے نکاح کے وقت یا نکاح کے بعد یا نکاح سے پہلے باہمی معاہدہ کے تحت شوہر سے حق طلاق حاصل کرلیا ہو، اس صورت میں بیوی اپنی مرضی سے اپنے آپ پر طلاق واقع کرسکتی ہے، اس کو فقہ کی اصطلاح میں 'تفویض طلاق' کہا جاتا ہے، تیسری صورت یہ ہے کہ وہ شرعی عدالت سے رُجوع ہوکر ان اسباب کی وضاحت کرے، جن کی وجہ سے علاحدگی چاہتی ہے اور پھر ان کو ثابت کرے، ایسی صورت میں قاضی ان کے درمیان تفریق کردے گا اور علاحدگی واقع ہوجائے گی۔

طلاق کے اختیار کے سلسلہ میں تیسری شکل یہ ہوسکتی تھی کہ شوہر کو طلاق کا اختیار دیا جائے، اسلام نے اسی کو اختیار کیا ہے، اگرچہ شوہر کا کسی مناسب سبب کے بغیر طلاق دینا معصیت اور ناپسندیدہ عمل ہے؛ لیکن مرد چوں کہ نسبتاً بردبار اور حلیم الطبع ہوتا ہے، وہ اپنے بچوں کی پرورش میں بیوی کا محتاج ہوتا ہے، شادی کی وجہ سے ساری مالی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے اور اسے زیادہ سوچ سمجھ کر طلاق کے بارے میں فیصلہ کرنا پڑتا ہے؛ لہٰذا مرد کو حق طلاق دیا گیا؛ کیوں کہ اس سے زیادہ محتاط طریقہ پر حق طلاق کو استعمال کرنے کی توقع کی جاسکتی تھی، اس میں ایک دوسری مصلحت بھی ہے کہ نکاح کے دو فریق میں سے مرد جسمانی اعتبار سے زیادہ طاقتور ہے، اگر شوہر و بیوی کے درمیان نفرت پیدا ہوجائے، شوہر ازدواجی رشتہ کو باقی رکھنا نہ چاہے اور اس کے لئے اس معاہدہ سے باہر نکلنے کا کوئی قانونی راستہ باقی نہ رہے، تو وہ غیر قانونی راستہ اختیار کرے گا اور عورتوں کو جلانے، پھانسی پر چڑھانے اور قتل کرنے کے واقعات پیش آئیں گے اور خدا ناترس شوہروں کے لئے اس پر پردہ رکھنا چنداں دشوار نہ ہوگا؛ لہٰذا اگرچہ طلاق ایک ناخوشگوار واقعہ ہے؛ لیکن وہ اس سے زیادہ ناشگوار واقعات کو روکنے کا ذریعہ ہے، پھر اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر دونوں فریق طلاق پر متفق ہوجائیں تو کسی طویل العمل

عدالتی کارروائی کے بغیر بعجلت فیصلہ کر سکتے ہیں۔

اس وقت عدالتوں کا ایک رجحان یہ ہوگیا ہے کہ طلاق کو زیادہ سے زیادہ دشوار بنایا جائے؛ چنانچہ پہلے تو مختلف ہائی کورٹوں اور پھر سپریم کورٹ نے نفقہ مطلقہ سے متعلق قانون کی ایسی توضیح کی، جس کے مطابق طلاق دینے والے شوہر پر یہ بات لازم قرار دی گئی کہ جب تک عورت کا دوسرا نکاح نہ ہوجائے یا اس کی موت نہ ہوجائے، شوہر اول نفقہ ادا کرتا رہے؛ حالاں کہ قرآن وحدیث سے صراحتاً ثابت ہے کہ عدت گزرنے کے بعد مطلقہ کا نفقہ سابق شوہر کے ذمہ باقی نہیں رہتا، دوسرے: بعض اخلاقی اور ترغیبی احکام کو قانونی اور ضروری احکام کا درجہ دے دیا گیا، جیسے بہتر طریقہ یہ ہے کہ جب میاں بیوی میں اختلاف ہو تو خاندان کے سمجھ دار لوگ معاملہ کو حل کرنے کی کوشش کریں، یہ طلاق کے لئے نہ شرط ہے اور نہ لازم؛ بلکہ اس حکم کا براہ راست طلاق سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے، اس کا تعلق زوجین کے باہمی اختلاف سے ہے، چاہے طلاق کی نوبت نہ ہو؛ لیکن ملک کی بعض معزز عدالتوں نے طلاق کے واقع اور معتبر ہونے کے لئے اس بات کو لازم قرار دے دیا کہ پہلے کسی حَکم کے ذریعے معاملہ کو سلجھانے کی کوشش بھی کی گئی ہو، اس کے بغیر جو طلاق دی گئی ہو اس کو غیر معتبر ٹھہرایا گیا؛ حالاں کہ حدیث میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ طلاق کے واقعات پیش آئے اور اس سے پہلے حَکم بنانے کا واقعہ پیش نہیں آیا، یا حضور ﷺ کے سامنے طلاق دینے کی بات آئی اور آپ ﷺ نے حکم بتادیا؛ لیکن یہ دریافت نہیں فرمایا کہ کیا اس نے طلاق سے پہلے حَکم کے ذریعے مسئلہ حل کرنے کی کوشش بھی کی تھی؟

اب ایک نیا فیصلہ جموں کشمیر ہائی کورٹ کا محمد نسیم بھٹ بنام بلقیس اختر کا آیا ہے، اس میں آگے بڑھ کر یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ چوں کہ آپ ﷺ نے حیض کی حالت میں یا ایسے طہر میں جس میں بیوی سے ہم بستری ہوچکی ہو، طلاق دینے سے منع فرمایا ہے؛ اس لئے ایسی طلاقیں واقع نہیں ہوں گی؛ حالاں کہ ''طلاق نہیں دینی چاہئے'' یہ الگ بات ہے اور ''طلاق دے دی جائے تو معتبر نہ ہو'' یہ دوسری بات ہے، فاضل جج حسنین مسعودی نے جس حدیث سے اس مسئلہ میں استدلال کیا ہے اس سے جہاں حالتِ حیض میں طلاق پر ناپسندیدگی کا اظہار ہوتا ہے، وہیں یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ حالتِ حیض کی طلاق بھی واقع ہوجائے گی؛ بلکہ جب حضور ﷺ کو اطلاع ہوئی کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حالتِ حیض

میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے، تو آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ طلاق واقع نہیں ہوئی؛ بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ عبداللہ کو رجعت کر لینی چاہئے اور رجعت ہوتی ہی ہے طلاق واقع ہونے کے بعد۔

فاضل جج نے طلاق واقع ہونے کے لئے اس بات کو بھی ضروری قرار دیا ہے کہ طلاق دیتے وقت گواہان ہوں اور گواہان بھی انصاف پسند ہوں، جج صاحب کا یہ استنباط بھی حیرت انگیز ہے، قرآن یا حدیث میں احکام طلاق کے ذیل میں کہیں بھی گواہان کی شرط نہیں لگائی ہے؛ بلکہ استحباب کے درجہ میں کسی بھی مالی یا غیر مالی معاملہ میں گواہان رکھنے کو بہتر قرار دیا گیا ہے، اس میں کوئی طلاق کی تخصیص نہیں ہے؛ بلکہ خرید وفروخت اور دوسرے معاملات خاص کر دَین پر مبنی معاہدات شامل ہیں، (البقرۃ: ۲۸۲) — اسی طرح طلاق رجعی کے بعد رجعت پر گواہ بنانے کی تلقین کی گئی ہے، (الطلاق: ۲) — صرف نکاح ایک ایسا معاملہ ہے جس میں ایجاب وقبول کے لئے گواہان کا ہونا لازم ہے اور یہ حدیث سے ثابت ہے، اگر معزز جج طلاق کے گواہی سے مشروط ہونے پر قرآن وحدیث یا فقہاء کی عبارتوں سے کوئی دلیل پیش کرتے تو یہ معلومات میں اضافہ کا موجب ہوتا؛ مگر افسوس کہ یہ تازہ فیصلہ قرآن وحدیث کی غلط تشریحات پر؛ بلکہ بڑی حد تک جہل وناواقفیت پر مبنی ہے، جس پر آئندہ انشاء اللہ کسی موقع سے گفتگو کی جائے گی؛ لیکن یہ اور اس طرح کے دوسرے فیصلوں سے دو باتیں اُبھر کر سامنے آتی ہیں۔

اول: یہ کہ عدالتیں طلاق کو مشکل سے مشکل تر بنانا چاہتی ہیں؛ حالاں کہ اس کا نقصان عورتوں ہی کو پہنچے گا، یہ ظالم اور خدا ناترس شوہروں کے لئے بیویوں کو جان سے مار ڈالنے یا ان کو عزت وآبرو کے پہلو سے بدنام کرنے کے لئے محرک بن جائے گا اور سماج میں بکثرت ایسے واقعات پیش آنے لگیں گے؛ کیوں کہ جب انسان کسی بندھن سے باہر نکلنے کے لئے قانونی راستہ نہیں پاتا اور اس کے دل میں خدا کا خوف بھی نہیں ہوتا تو وہ غیر قانونی راستہ اختیار کرنے لگتا ہے، یہ کوئی مفروضہ نہیں ہے؛ بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو اخبارات میں روز پڑھا اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے روز دیکھا جا سکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انگریزوں کے عہد میں بھی اور اس کے بعد بھی طویل عرصہ تک عدالتوں کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ مذہبی مآخذ سے براہ راست احکام کا استنباط نہیں کرتے تھے؛ بلکہ اس مذہب

کے ماہرین کی تشریحات ہی کو اپنے فیصلے کی بنیاد بنایا کرتے تھے اور یہ ایک معقول بات ہے؛ کیوں کہ جو شخص کسی مذہب سے پوری طرح واقف نہ ہو، اس زبان سے واقف نہ ہو، جس میں وہ مذہبی مأخذ پائے جاتے ہیں، تو وہ کیسے اس قانون کے ساتھ انصاف کرسکتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سی دفعہ عدالتی فیصلے تشریح قانون کی بجائے وضع قانون کے درجہ میں آجاتے ہیں اور خود انصاف کرنے والوں کے سامنے انصاف کو شرمسار ہونا پڑتا ہے، معزز عدالتوں کو چاہئے کہ وہ ان پہلوؤں کو بھی پیش نظر رکھیں، احکامِ شریعت کی مصلحتیں بھی سامنے رہیں اور شریعت میں مختلف احکام کے جو درجات مقرر ہیں، ان کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔

محروسین کی مدد

اخبارات میں آئے دن اس طرح کی خبریں آتی رہتی ہیں کہ فلاں مسلم نوجوان کو —— جو عرصہ سے جیل کی کال کوٹھری میں بند تھے اور جنہیں پولس کی طرف سے سنگین الزامات کا سامنا تھا، —— باعزت رہا کردیا گیا ہے، مثلاً اسی مارچ ۲۰۱۳ء میں بنگلور میں گرفتار کئے گئے صحافی مطیع الرحمن صدیقی، ان کے ساتھ یوسف نعل بند اور ڈی، آر، ڈی، او کے سائنس داں اعجاز احمد مرزا کو رہا کردیا گیا اور وہ بے گناہ پائے گئے، ۲۰۰۲ء کے فساد میں کلیان (مہاراشٹرا) سے ۳۲ مسلمانوں کو گرفتار کرلیا گیا تھا، جن میں سابق کارپوریٹر بھی شامل تھے، پولیس نے ان ۳۲ نوجوانوں پر اقدام قتل اور فساد مچانے کی دفعات لگائی تھیں، گیارہ سال تک کاروائی چلتی رہی اور بالآخر یہ تمام ملزمین باعزت رہا کردیئے گئے، مالیگاؤں اور مکہ مسجد بم دھماکہ میں بے قصور مسلمانوں کو گرفتار کیا گیا تھا؛ لیکن ایک ایماندار پولس افسر کی تحقیق نے اس بات کا انکشاف کیا کہ ان واقعات اور ان جیسے متعدد دوسرے واقعات میں ہندو دہشت گردوں کا رول ہے، اس کے فوراً بعد بے قصور مسلم نوجوانوں سے مقدمہ اٹھالیا جانا چاہئے تھا، لیکن کافی لیت ولعل اور تگ ودو کے بعد ان بے گناہوں کو چھوڑا گیا۔

اس وقت بھی ملک میں ایک اندازہ کے مطابق تقریباً دس ہزار مسلمان نوجوان سلاخوں کے پیچھے ڈال دیئے گئے ہیں، ان کی اکثریت تعلیم یافتہ ہے اور ان ہی کے ذریعہ پورے خاندان کی معاشی ضروریات پورا ہوا کرتی تھیں، کئی والدین ہیں جو اپنے بچوں کی دید کی حسرت آنکھوں میں سجائے ہوئے دنیا سے رخصت ہوگئے، کئی بیویاں ہیں کہ سالہا سال سے انہوں نے خوشی کا چہرہ نہیں دیکھا، کتنے ہی لڑکے اور لڑکیاں ہیں جن کی معصوم آنکھیں اپنے والد کے انتظار میں آنسو بہا رہی ہیں، اور گھر کے ذمہ دار فرد کے جیل میں چلے جانے سے وہ نہ صرف تعلیم وتربیت سے محروم ہیں؛ بلکہ حلق تر کرنا بھی ان کے لئے دشوار مرحلہ ہے، افسوس یہ ہے کہ ان گرفتار نوجوانوں میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے، جن پر اب تک کوئی فرد جرم عائد نہیں ہوئی ہے، پولس اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے سے عاجز آچکی ہے؛ لیکن قانون کی تفصیلات اور عدالتوں کی ہدایتوں کے برخلاف حکومت ان بے قصوروں کو نا

کردہ گناہ کی سزا دے رہی ہے، بظاہر ان کا قصور صرف مسلمان ہونا اور دیندار ہونا ہے۔

یہ صورتِ حال انتہائی تکلیف دہ، مادر وطن کے دامن انصاف پر بدنما دھبہ، ملک کی جمہوریت اور سیکولرزم پر زبردست حملہ، انسانی حقوق کے ساتھ کھلا ہوا مذاق اور اخلاقی اقدار کی پامالی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ فرقہ پرستی کا یہ زہر زندگی کے تمام شعبوں میں خون کی طرح شامل ہو رہا ہے، پھر بھی عدلیہ کا نظام بڑی حد تک غنیمت ہے اور دیر سے سہی مظلوموں کو انصاف مل جاتا ہے؛ لیکن یہ انصاف بھی دو پہلوؤں سے ادھورا ہے، ایک تو انصاف میں حد سے گذری ہوئی تاخیر، جرم و سزا کے مقدمات کے لئے ایک مدت مقرر ہونی چاہئے کہ اس مدت کے اندر اندر پولس اپنے ثبوت پیش کر دے اور ملزم کو اپنی صفائی کا موقعہ مل جائے؛ کیوں کہ انصاف میں تاخیر خود ایک ناانصافی ہے، اگر کسی شخص کی عمر کے دس دس سال صرف معاملہ کی تحقیق میں جیل میں گذر جائیں تو اکثر اوقات پولس کی اذیت رسانی اور ذہنی تناؤ کی وجہ سے ایسا شخص کوئی کام کرنے کے لائق نہیں رہتا، اور ذرائع ابلاغ کی ''عنایت'' سے وہ اس قدر بدنام ہو جاتا ہے کہ اسے لوگ ملازمت دینا پسند نہیں کرتے، دوسرے ایسے بے قصور لوگوں کو صرف رہا کر دینا کافی نہیں ہے، عدالت کو چاہئے کہ وہ ایسے لوگوں کو بے قصور گرفتار رکھے جانے کا ہرجانہ ادا کرے، ان کو اچھے شہری ہونے کا سرٹیفکٹ دے، ان کو ان کی صلاحیت کے مطابق ملازمت مہیا کرے، تب جا کر یہ خود انصاف کے ساتھ ''انصاف'' ہوگا، ورنہ تو وہ انصاف ادھورا ہی سمجھا جائے گا جس میں سالہا سال نوجوانوں کو قید کی صعوبت سے دوچار رکھا جائے، ان کا کیریئر تباہ ہو جائے اور پھر انہیں باعزت بری تو کر دیا جائے؛ لیکن انہیں ایک ایسے مستقبل کی طرف دھکیل دیا جائے، جو ایک تاریک سرنگ کی طرح ہو اور جس کے آگے کوئی روشنی نہ ہو۔

اس سلسلے میں خود ملت اسلامیہ کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ ہمیں اس پر بھی نظر رکھنی چاہئے، رسول اللہ ﷺ نے ہمیں صرف ظلم کرنے سے بچنے کا ہی حکم نہیں دیا ہے؛ بلکہ ہمیں مظلوم کی مدد کرنے کا بھی حکم دیا ہے، حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سات باتوں کا حکم دیا ہے، اِن سات باتوں میں ایک مظلوم کی مدد کرنا ہے (بخاری: حدیث نمبر: ۲۴۴۵، مسلم: حدیث نمبر: ۲۰۶۶) ایک بار آپ ﷺ راستے سے گذر رہے تھے، کچھ انصار راستے میں بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے ارشاد فرمایا: اگر تم کو ایسا ہی کرنا ہے تو سلام کا جواب دو، مظلوم کی مدد کرو اور

گذرنے والے کو راستہ بتاؤ (سنن ترمذی عن براء بن عازب، حدیث نمبر:۲۷۲۶) حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اپنے بھائی پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے ظلم ہوتا ہوا چھوڑ دیتا ہے، پھر آگے ارشاد فرمایا: جو کسی مسلمان سے مصیبت کو دور کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کے بھی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو دور فرمائیں گے **''من فرج عن مسلم کربة فرج الله عنه کربة من کربات القیامة''** (بخاری، حدیث نمبر:۲۴۴۲)

یوں تو ظلم سے بچانے کی کسی بھی مظلوم کی مدد کرنے کی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں؛ لیکن اس میں نہایت اہم صورت کسی قیدی کو آزاد کرانا ہے، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بھوکوں کو کھلاؤ، بیمار کی عیادت کرو اور قیدی کو رہا کراؤ... **فکوا العانی، قال سفیان: والعانی الأسیر** (بخاری: باب وجوب عیادة المریض، حدیث نمبر:۵۶۴۹)

''قید'' سے ملتی جلتی شکل غلامی کی تھی، جو اسلام سے پہلے مروج تھی اور جسے اسلام نے بتدریج ختم کیا، غلام گویا اپنے مالک کی قید میں ہوتا تھا، وہ نہ اپنی ذات میں مالک کی اجازت کے بغیر تصرف کرسکتا تھا اور نہ اپنے کمائے ہوئے مال میں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے کسی غلام کو آزاد کرایا تو یہ اس کے لئے دوزخ سے آزادی کا فدیہ ہوگا (سنن ابی داؤد، باب أی رقاب أفضل؟ حدیث نمبر:۳۹۶۶) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جس نے کسی مسلمان غلام کو آزاد کیا، اللہ تعالیٰ اس غلام کے ایک ایک عضو کے بدلے اس آزاد کرنے والے کے ایک ایک عضو کو یہاں تک کہ اُس کی شرمگاہ کے بدلے اِس کی شرمگاہ کو دوزخ کی آگ سے آزاد کردیں گے (مسلم عن ابی ھریرة، حدیث نمبر:۱۵۰۹) اس مضمون کی متعدد روایتیں حدیث کی کتابوں میں نقل کی گئی ہیں، غور کیا جائے تو بے قصور قیدیوں کی غلامی ان زرخرید غلاموں کی غلامی سے بڑھی ہوئی ہے؛ اس لئے کسی بے قصور مسلمان قیدی کو آزاد کرانا بلاشبہ ایک غلام کو آزاد کرنے سے کم اجر وثواب کی بات نہیں۔

مسلمان مختلف طریقوں پر اپنے ان مظلوم بھائیوں کی مدد کرسکتے ہیں:

الف: تمام مسلمان متحد ہوکر بیک آواز اپنے اپنے علاقہ میں سیاسی نمائندوں پر دباؤ ڈالیں اور ان سے مطالبہ کریں کہ ان کا ووٹ اس بات سے مشروط ہوگا کہ وہ بے قصور نوجوانوں کو رہا کرانے میں

تعاون کریں اور پولس کو ان قوانین کا پابند بنانے میں اپنا کردار ادا کریں، جنہیں قانون ساز اداروں نے پاس کیا ہے، یا جن کے بارے میں عدالتوں کی ہدایات موجود ہیں۔

ب: جمہوری نظام میں عوامی احتجاج کی بڑی اہمیت ہے، اس لئے پورے ملک میں پُرامن احتجاج منظم کیا جائے اور قانون اور آئین کی حدود میں رہتے ہوئے ریلیاں نکالی جائیں، جلسے کئے جائیں، سیمینار منظم کئے جائیں، احتجاجی خطوط لکھے جائیں اور جو بھی کوشش ہوسکتی ہے، ان کو روبہ عمل لایا جائے۔

ج: مختلف ریاستوں کی سطح پر بھی اور مرکزی سطح پر بھی ایسے بےقصوروں کے لئے لیگل سیل قائم کئے جائیں، مسلمان وکلاء اس عظیم کاز کے لئے اپنی مفت خدمات پیش کریں یا کم سے کم فیس لینے کو قبول کریں، سیکولرزم کے حامل غیر مسلم وکلاء سے بھی مدد لی جائے، اہل ثروت مسلمان قانونی چارہ جوئی کے لئے مالی تعاون پیش کریں، قانونی کوششوں کا ہدف صرف ان کی رہائی نہ ہو؛ بلکہ یہ بھی ہو کہ جن پولس والوں نے نوجوانوں کو پھنسایا ہے، انہیں قرار واقعی سزا ملے، نیز قانونی کارروائی کو درمیان میں چھوڑ نہ دیا جائے؛ بلکہ اپنے نتیجہ تک پہنچایا جائے اور اس کے لئے مسلسل جدوجہد جاری رکھی جائے۔

د: جو لوگ قید ہیں، ان کے اہل خانہ کی دیکھ ریکھ کا معقول انتظام کیا جائے، اگر ان کے بچے دینی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو دینی مدارس ان کے ساتھ خصوصی رعایت کریں اور پوری کفالت اپنے ذمہ لیں، اگر وہ عصری تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو مسلم انتظامیہ کے تحت چلنے والے ادارے ان کے لئے مفت تعلیم مہیا کریں، اگر ان کی لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ ہو تو مسلمان تاجرین آگے بڑھ کر ان کے لئے اشیاءِ ضرورت فراہم کریں، ایسے فنڈ قائم کریں جن کے ذریعہ ان کے گھر والوں کی ضروریات متوسط درجہ میں پوری ہوجائیں، اگر ان کے بچے بے روزگار ہیں تو ان کی صلاحیت کے لحاظ سے ان کے لئے روزگار فراہم کرنے کی کوشش کی جائے، ایک ایسی ملت جو بیس کروڑ افراد پر مشتمل ہو، اگر وہ اپنی قوم کے ستم رسیدہ، مظلوم اور مسلمان ہونے کی وجہ سے ستائے جانے والے دس ہزار گھروں کی کفالت نہ کرسکیں تو اس سے بڑھ کر غیرت کی اور کیا بات ہوگی؟

ھ: ان کاموں کے لئے مسلمانوں کو ایک منظم ادارہ کی بنیاد رکھنی چاہئے یا مختلف ریاستوں میں مختلف تنظیموں کو خالص دینی اور ملی جذبہ کے ساتھ اس کام کا بیڑا اٹھانا چاہئے، نیز جیسے تحفظ شریعت

کے لئے ’’مسلم پرسنل لا بورڈ‘‘ قائم ہے، اسی طرح تحفظ مسلمین کے لئے ایک ’’اعانت مظلومین بورڈ‘‘ بننا چاہئے، افسوس کہ ہمارا ایک مرض یہ ہوگیا ہے کہ اگر مصیبت کے وقت اللہ کی توفیق سے ہم سے کچھ کام ہوجاتا ہے تو اس کے لئے بھی یہ جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ اس کام میں کس کا کتنا حصہ ہے؟ یہیں سے بہتر کوششوں کے تانے بانے جاتے ہیں، ہونا یہ چاہئے کہ اگر اللہ کسی سے کچھ کام لے لیں تو ہم اپنی خدمات کو اخبارات کے صفحات اور میڈیا کی اسکرین پر رقم کرنے کے بجائے اللہ کے رجسٹر میں درج کرانے کو تیار ہوجائیں، اگر ایسا ہو تو ہم دنیا میں بھی ایک باعزت قوم کی طرح جی سکتے ہیں اور آخرت میں بھی اللہ کی خوشنودی سے ہم کنار ہوسکتے ہیں۔

ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ فرقہ وارانہ فسادات، دھماکے اور ان دھماکوں کے نام پر بڑی تعداد میں بے قصور مسلمانوں کی گرفتاری کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے؛ بلکہ یہ ایک منصوبہ بند سازش ہے، جس کا مقصد مسلمانوں کو پست ہمت کرنا، انہیں یک وتنہا کر دینا، انہیں رسوا وخوار کرنا، ان کو ایک بے اثر، احساس کمتری سے دوچار، بے حوصلہ، مقاومت کے جذبہ سے خالی، شکست کی نفسیات سے دوچار، غریب ومفلس، جاہل واَن پڑھ، اپنی تاریخ پر شرمسار اور اپنے دین سے بے زار اقلیت بنا کر رکھنا ہے، اگر ہم نے اجتماعیت، مومنانہ فراست، جرأت وہمت، خطرات کا مقابلہ کرنے کی ہمت، ایمانی اخوت، تعلق مع اللہ، ایک داعی کی حیثیت سے برادرانِ وطن کے ساتھ حسن سلوک اور جو مواقع حاصل ہیں ان سے بھر پور استفادہ کے ساتھ اپنے قدم آگے نہیں بڑھائے تو منزل دور سے دور تر ہوتی چلی جائے گی اور ہماری مظلومیت کی داستاں بھی دراز سے دراز تر ہوتی رہے گی، پس ضروری ہے کہ ہم اپنے چہرے سے غفلت کی چادر اٹھائیں اور شعور کی آنکھیں کھولیں، عزم وحوصلہ کو اپنا ہتھیار بنائیں اور اجتماعیت کا طریقۂ کار اپنائیں۔

❁

مسلمانوں کا تحفظ اور قانونی جدوجہد

قدرت کا نظام یہ ہے کہ اہم نتائج حاصل کرنے کے لئے مسلسل اور دیر تک جدوجہد کرنی پڑتی ہے، تخریبی کاموں میں تو کچھ زیادہ وقت نہیں لگتا؛ لیکن تعمیر کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے اندر برداشت کی صلاحیت، انتظار کی قوت اور جہد مسلسل کی عادت ہو، درخت گھنٹے دو گھنٹے میں کاٹا جاسکتا ہے؛ لیکن بیج سے پودا اور پودے سے تناور درخت بننے میں سالہا سال مطلوب ہوتے ہیں، ہر ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچے کو جوان ہوتا ہوا اور شادی بیاہ کے مرحلے سے گذرتا ہوا دیکھے، یہاں تک کہ اس کی اولاد خود صاحب اولاد ہوجائے، یہ منظر اس کی آنکھوں کے لئے ٹھنڈک اور دل کے لئے سرور کا باعث ہوتا ہے؛ لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لئے مدتوں صبر کی راہ سے گذرنا پڑتا ہے، محض وقتی جذبہ اور چیخ و پکار سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات جس طرح مادی نتائج کے حصول کے لئے ضروری ہے، اسی طرح سماج میں اپنے حقوق کو حاصل کرنے اور بدخواہوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے بھی ضروری ہے۔

جب سے ہندوستان کے روابط اسرائیل سے بڑھے ہیں، ہندوستان نے ناطرفدار بلاک سے اپنے آپ کو الگ کرکے امریکہ اور مغرب کی متابعت قبول کی ہے، روس میں اشتراکیت نے دم توڑ دیا ہے اور مغربی ملکوں نے عالمی غنڈہ گردی اور خوں آشامی کی خو کو پوری کرنے کے لئے اسلامی دہشت گردی کا ہوّا کھڑا کیا ہے، صورت حال یہ ہے کہ آئے دن تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کا انکاؤنٹر کیا جاتا ہے، مسلمانوں کے خلاف فرضی مقدمات دائر کئے جاتے ہیں، کسی جواز کے بغیر نوجوانوں کو گرفتار کیا جاتا ہے، گرفتار کرنے میں ملک کی اعلیٰ عدالتوں کی ہدایات کا پاس و لحاظ تک نہیں رکھا جاتا، دہشت گردی کا کوئی بھی واقعہ ہو، کسی مسلم تنظیم (جو اکثر فرضی ناموں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی) کو ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے، مندر میں کوئی دھماکہ ہو تب بھی مسلمانوں کو مجرم گردانا جاتا ہے اور مسجد میں ہو تب بھی مسلمان ہی قصوروار سمجھے جاتے ہیں، ملزموں کی مجرموں کی طرح تشہیر کی جاتی ہے اور ذرائع ابلاغ میں کچھ اس طرح معاملات کو پیش کیا جاتا ہے کہ گویا یہ ایک ثابت شدہ حقیقت اور ناقابل انکار واقعہ ہو،

ابھی پچھلے دنوں بھی ملک کے مختلف حصوں سے گرفتاریوں کے کئی واقعات سامنے آئے، اس کے علاوہ دربھنگہ (بہار) سے تعلق رکھنے والے مسلمان نوجوان انجینئر کا خود جیل میں بے دردانہ قتل ہوگیا، امکانی قاتلوں کے نام بھی اخبارات میں آئے؛ لیکن پولیس نے اس پر عملاً کوئی کارروائی نہیں کی۔

بہت سے نوجوان وہ ہیں، جو طویل عرصہ سے جیل میں بند ہیں، نہ ان پر مقدمہ کی کارروائی ہوتی ہے اور نہ انہیں ضمانت ملتی ہے، ایسا بھی ہوا کہ کسی واقعہ کے سلسلہ میں پولیس نے کچھ نوجوان مسلمانوں کو گرفتار کیا، بعد کو انکشاف ہوا کہ جرم کے مرتکب بعض ہندو تنظیموں کے لوگ تھے؛ لیکن جو مسلمان گرفتار کئے گئے، انہیں رہائی نصیب نہ ہوسکی، یہ بھی ہوا کہ بہت سے نوجوان باعزت بری کئے گئے، محض شک کی بنا پر جب ان کی گرفتاری عمل میں آئی تھی تو میڈیا نے اسے شاہ سرخی بنایا تھا، حکومت کے عہدہ داران اور پولیس افسران نے بھی اس کے بارے میں گرم گرم بیانات دئے تھے؛ لیکن ان کے باعزت بری ہونے کی خبر کو نہ تو میڈیا میں کوریج مل سکا اور نہ حکومت اور پولیس کی طرف سے اس سلسلہ میں کوئی وضاحت ہوئی یا معذرت آئی، جن لوگوں کو شک کی بنیاد پر گرفتار کیا جاتا ہے، ان کے لئے وہ وقت نسبتاً اچھا ہوتا ہے، جب وہ جیل بھیج دیئے جاتے ہیں، ورنہ تو جب تک وہ پولیس تحویل میں ہوتے ہیں، ان کے ساتھ ایسا روح فرسا سلوک کیا جاتا ہے، جن کو سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے، اب تو حد یہ ہے کہ ایسے ملزمین کے خلاف مقدمہ کی پیروی کرنے والے وکیل بھی نہیں ملتے اور کوئی وکیل مقدمہ قبول کرتا ہے تو دوسرے اس کی پٹائی کر دیتے ہیں۔

غرض کہ عمومی طور پر اس وقت مسلمان عدم تحفظ کا شکار ہیں، فرقہ پرست ہندو تنظیمیں انہیں رسوا کرتی ہیں، پولیس بلاثبوت انہیں گرفتار کرتی ہے اور گرفتار کرنے کے بعد بھی انہیں ایذا رسانی کا شکار بناتی ہے، قانون ساز ادارے ٹاڈا پوٹا اور مختلف ناموں سے ایسے قوانین بناتے ہیں، جو لاقانونیت کا جواز فراہم کرتے ہیں، نیز ذرائع ابلاغ مسلمانوں پر جور وستم ڈھانے والے افراد اور اداروں کی پیٹھ تھپکتے اور ان کا حوصلہ بڑھاتے ہیں، ہمارا ردعمل اس سلسلہ میں یہ ہوتا ہے کہ ہم وقتی طور پر احتجاج کرتے ہیں، احتجاجی بیانات دیتے ہیں، اب کچھ لوگ دھرنا بھی دینے لگے ہیں؛ لیکن ہمارا یہ احتجاج اردو اخبارات تک محدود ہوتا ہے، جس کو حکومت کے ایوانوں میں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، سوال یہ ہے کہ ایسی صورت حال میں مسلمان کیا کرے؟

ایک راستہ تو پرتشدد ردعمل کا ہے، جیسا کہ ماؤوادی کر رہے ہیں، یا مختلف علاحدگی پسند تنظیمیں کر رہی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ اسلامی طریقہ نہیں ہے، اسلام نہ ابتداء تشدد کا قائل ہے اور نہ ردعمل میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لا ضرر و لا ضرار'' (ابن ماجہ) یعنی نہ ابتداءً نقصان پہنچایا جائے نہ جواباً، شریعت نے اس بات کی اجازت نہیں دی ہے کہ عوامی املاک کو نقصان پہنچایا جائے، غلطی ایک پولیس والے نے کی ہو اور نشانہ کسی بھی پولیس والے کو بنا دیا جائے، یہ اسلامی عمل نہیں ہوگا؛ بلکہ اسلام کو بدنام کرنے والا عمل ہوگا، ایسے ردعمل سے سماج میں نفرت کے جذبات پروان چڑھنے لگتے ہیں اور انصاف پسند لوگ بھی غلط رائے قائم کر بیٹھتے ہیں۔

دوسرا طریقہ قانونی ہے، ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے، یہاں کی عدلیہ آزاد ہے، بہت سے معاملات میں عدلیہ نے اقلیت کو انصاف فراہم کیا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے معاملات کو عدالت تک پہنچایا جائے اور اس کی مسلسل پیروی کی جائے، یہاں تک کہ مقدمہ اپنے انجام کو پہنچ جائے، بھاگل پور اور گجرات فسادات کے بعض ملزمین کو سزائیں ملی ہیں اور بیشتر مقدمات میں مسلمان نوجوان باعزت بری کئے گئے ہیں؛ لیکن اس میں مسلمانوں کی اجتماعی کوششوں کا بہت کم دخل ہے، اگر مسلمان باضابطگی کے ساتھ ایسے مقدمات کی پیروی کریں اور سیشن کورٹ سے ہائی کورٹ اور ہائی کورٹ سے سپریم کورٹ تک جانے کے لئے تیار ہوں، مجرم پولیس عہدہ داروں کا جرم ثابت ہوجائے اور ان کو سزا ملے، نیز مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے مظالم کو عوام کی عدالت میں پہنچانے کے لئے انسانی حقوق کی تنظیموں سے مدد لی جائے اور چند واقعات میں مجرمین کو سزا مل جائے تو اس کے گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔

لیکن اس کے لئے دو باتیں ضروری ہیں: ایک تو ثابت قدمی اور صبر کے ساتھ جہد مسلسل، دوسرے: کم سے کم ایسے مسائل میں ملت کا اتحاد واشتراک —— جیسا کہ شروع میں ذکر کیا گیا —— کسی بھی اہم کام کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے صبر و برداشت اور انتظار کی قوت ضروری ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعاء فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ہر کام میں ثابت قدمی عطا فرما: ''**اللهم إني أسئلک الثبات في الأمر الخ**'' (سنن الترمذی، عن شداد بن اوس، حدیث نمبر: ۳۴۰۷) ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی عمل کرتے تو تسلسل اور دوام کے

ساتھ اسے انجام دیتے: ''كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا عمل عملا أثبت'' (مسلم، حدیث نمبر: ۶/۴۷) قرآن مجید نے خود مسلمانوں کو جو دعاء سکھائی ہے، اس میں ثابت قدمی کی بھی دعا سکھائی گئی۔۔۔۔۔ ﴿وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا﴾ (آل عمران: ۱۴۷) مسلمانوں کو بار بار تلقین کی گئی کہ وہ صبر اور مصابرہ سے کام لیں اور اس بات کی بھی کہ وہ سرحدوں کی حفاظت کے بارے میں ہمیشہ چوکنا رہیں: ﴿يٰاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا﴾ (آل عمران: ۲۰۰) مصابرہ کے معنی کسی چیز پر پابندی کے ساتھ جمے رہنے کے ہیں، (مختار الصحاح، ص: ۸۳) اور قرآن کے حکم ''رَابِطُوْا'' کا اصل مقصد مسلمانوں کی حفاظت ہے، چاہے وہ کسی مسلم ملک میں ہو یا کسی غیر مسلم ملک میں، مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ نہ صرف امت کے دین وایمان کے لئے؛ بلکہ ان کی جان ومال اور عزت وآبرو کے تحفظ کے لئے جو تدبیریں کر سکتے ہیں، وہ ضرور کریں، ہوتا یہ ہے کہ وقتی طور پر تو ہم احتجاج کرتے ہیں، اخبارات میں بیان دیتے ہیں اور اپنی مظلومیت کی داستان سناتے ہیں؛ لیکن ہم ایف آئی آر درج نہیں کراتے، درج کراتے وقت پولیس والوں کی بد دیانتی پر نظر نہیں رکھتے، پھر جب معاملہ عدالت میں جاتا ہے تو تسلسل کے ساتھ مقدمہ کی پیروی نہیں کرتے، اگر ذیلی عدالت سے اپنے موقف کے خلاف کوئی فیصلہ ہو گیا تو اوپر کی عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتے، اس طرح ہم قانونی لڑائی ہار جاتے ہیں، جب تک ہماری قانونی کوششوں میں تسلسل نہیں ہوگا، ہمیں انصاف حاصل نہیں ہو سکے گا۔

دوسری ضروری چیز اتحاد واشتراک ہے، ملک بھر میں پیش آنے والے مقدمات کی پیروی غیر معمولی اخراجات کی متقاضی ہے، اس کے لئے تمام تنظیموں کو اکٹھا ہونا پڑے گا، مذہبی تنظیمیں جیسے جمعیۃ علماء، جماعت اسلامی، ملی کونسل، مجلس مشاورت، امارت شرعیہ، مجلس تعمیر ملت وغیرہ اور سیاسی تنظیمیں جیسے مسلم لیگ، مجلس اتحاد المسلمین، یوڈی ایف، پیس پارٹی اور علماء کونسل وغیرہ، اگر یہ تمام تنظیمیں مل کر ایک تحفظ مسلمین بورڈ بنائیں، مشترک طور پر افرادی اور مالی وسائل لگا کر ایسے مقدمات کی پیروی کریں اور اس انداز پر کام کریں کہ کسی معاملے میں کریڈٹ حاصل کرنے کا جھگڑا پیدا نہ ہو، مثلاً جس ریاست میں جو تنظیم زیادہ فعال ہو، وہاں کے مسائل کو حل کرنے کے لئے وہاں کی مقامی تنظیم کو ذمہ دار بنا دیا جائے، اس طرح بہ آسانی ان مسائل کو حل کیا جا سکے گا اور اِس وقت مسلمانوں کے خون کی جو ارزانی اور سماج میں ان کی بے وزنی وبے وقاری دیکھی جا رہی ہے، شاید اس کی نوبت نہ آئے، اگر

مسلمانوں نے اس سلسلہ میں کوئی لائحہ عمل طے نہیں کیا اور امت کے مشترک مفاد کے لئے جھوٹے وقار کی قربانی دینے کو تیار نہ ہوئے تو ان کی ذلت ورسوائی اور جان ومال کی ارزانی کی داستان طویل سے طویل تر ہوتی جائے گی، افسوس کہ طوفان ہمارے سروں سے گذر رہا ہے؛ لیکن ہماری بے شعوری اور بے حسی کی شام آئے نہیں آتی:

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

لو جہاد کا فسانہ اسلامی نقطہ نظر

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کچھ ایسی رکھی ہے کہ وہ محبت کا بھوکا ہے، اسی لئے اسے خوشی کے ماحول میں ایسے لوگوں کی جستجو ہوتی ہے جو اس کی مسرت میں شریک ہوسکیں، یہ شرکت اس کی خوشی کو دو بالا کر دیتی ہے، اسی طرح کسی انیس وغمخوار کی موجودگی اس کے غم کو ہلکا کرنے کا باعث بنتی ہے، یہ محبت اسے اکثر ایسے رشتوں سے حاصل ہوتی ہے جو فطری ہیں اور جس میں اس کے اختیار کو کوئی دخل نہیں اور ایک رشتہ ایسا بھی ہے جس کو انسان اپنی پسند اور اختیار سے وجود میں لاتا ہے، یہ ہے رشتۂ نکاح، نکاح کے بندھن میں بندھنے والے مرد وعورت کا ایک خاندان ایک علاقہ اور ایک زبان سے وابستہ ہونا ضروری نہیں، بہت سی دفعہ بالکل اجنبی لوگوں کے درمیان رشتہ طے پاتا ہے؛ لیکن یہ رشتہ ایسی محبت واُلفت کو جنم دیتا ہے جس کی گہرائی اکثر اوقات دوسرے تمام رشتوں سے بڑھ جاتی ہے، پرانے رشتے اس نئے رشتہ کے مقابلہ میں ہیچ ہوجاتے ہیں، یہ رشتہ یوں بھی اہم ہوتا ہے کہ دونوں فریق کا مستقبل بڑی حد تک موت تک ایک دوسرے سے جڑا ہوتا ہے، یہ ایک دوسرے کے ذریعہ ماں باپ بنتے ہیں اور باہمی تعاون کے ساتھ اپنے جگر پاروں کی پرورش کرتے ہیں، ایک زمانہ تک وہ خود ایک دوسرے کے لئے سنہرے خواب کی حیثیت رکھتے تھے اور اب دونوں مل کر اپنی آئندہ نسل کے لئے خواب دیکھتے ہیں۔

اسی لئے رشتۂ نکاح میں دونوں فریق کے درمیان زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی ہونی چاہئے، یہ ہم آہنگی رشتوں کو پائیدار بناتی ہے، جو لوگ وقتی طور پر کسی پر دل پھینک دیتے ہیں اور اس بنیاد پر ازدواجی رشتہ سے بندھتے ہیں، عموماً ان کے درمیان تعلق میں استحکام باقی نہیں رہتا، ہم آہنگی کے لئے اِک ضروری شرط فکر وعقیدہ کی موافقت بھی ہے، سوچئے کہ اگر ایک شخص اللہ کو ایک مانتا ہو اور اللہ کے سوا کسی کے سامنے اپنی پیشانی رکھنے کو سب سے بڑا جرم تصور کرتا ہو، اس سے اس شخص کے ساتھ چوبیس گھنٹے کی زندگی میں کیسے موافقت ہوسکتی ہے جو سینکڑوں مخلوقات کا پجاری ہو، جب دونوں کے مذہبی تہوار آئیں گے تو اگر وہ اپنے نظریہ میں سنجیدہ اور سچا ہو تو کیا ان کے درمیان نزاع پیدا نہیں ہوگی؟ جب

اولاد کی تعلیم وتربیت اوران کی مذہبی وابستگی کا مسئلہ آئے گا تو کیا آپس میں کھینچ تان کی نوبت نہیں آئے گی؟ یقیناً آئے گی، اسی لئے اسلام میں جو چیزیں نکاح میں رکاوٹ مانی گئی ہیں، جن کو فقہ کی اصطلاح میں موانع نکاح کہا جاتا ہے، ان میں ایک اختلاف دین بھی ہے۔

اس کی تفصیلات کو تین نکات میں سمیٹا جا سکتا ہے، اول یہ کہ مسلمان لڑکی کا نکاح کسی بھی غیر مسلم لڑکے سے نہیں ہوسکتا، خواہ وہ یہودی وعیسائی ہو یا کافر ومشرک، جیسے ہندو بدھسٹ وغیرہ، اوراس کی وجہ ظاہر ہے کہ ایک عورت کے لئے مخالف ماحول میں اپنے ایمان کی حفاظت دشوار ہوجائے گی، دوسرے کسی مسلمان مرد کا نکاح یہودی اور عیسائی عورت کے علاوہ کسی بھی غیر مسلم عورت سے نہیں ہوسکتا، ظاہر ہے اس میں ہندو خواتین بھی شامل ہیں، تیسرے مسلمان مرد کا نکاح یہودی اور عیسائی عورت سے ہوسکتا ہے؛ لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں، ایک یہ کہ یہودی اور عیسائی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نے حکومت کے مردم شماری کے خانہ میں اپنے ساتھ یہودی یا عیسائی لکھا ہو، جیسا کہ آجکل اہل مغرب کا حال ہے؛ بلکہ ضروری ہے کہ وہ حقیقتاً یہودی اور عیسائی ہو، یعنی خدا پر، نبوت پر، الہامی کتاب پر اور آخرت کے نظام پر ایمان رکھتی ہو، دوسرے اگرچہ یہودی اور عیسائی خواتین سے نکاح کی گنجائش ہے؛ لیکن یہ بھی کراہت سے خالی نہیں، سیدنا حضرت عمر فاروقؓ نے جب یہ بات سنی کہ شام کے علاقہ میں مسلمان مرد یہودی اور عیسائی عورتوں سے نکاح کررہے ہیں تو اس کو سختی سے منع کیا، اس کی دو مصلحتیں بالکل واضح ہیں، پہلی مصلحت یہ ہے کہ اس سے مسلم خاندانوں میں غیر اسلامی افکار اور اجنبی ثقافت کے گھس آنے کا اندیشہ ہے، دوسری مصلحت یہ ہے کہ سیاسی اور دفاعی اعتبار سے مسلمانوں کے حرم میں ایسی خواتین کا آنا نہایت نقصاندہ ہے، جنرل اکبرخان نے سیرت نبوی (ﷺ) پر اپنی کتاب ''حدیثِ دفاع'' میں اس پر بڑی چشم کشا گفتگو کی ہے، ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل کی کامیابی اور مصر وشام کی پسپائی کا بنیادی سبب یہی ہوا کہ بڑے بڑے کمانڈروں کی بیویاں عیسائی اور یہودی تھیں اور سارے جنگی راز لمحہ بہ لمحہ اسرائیل تک پہنچ رہے تھے، افسوس کہ عربوں کی آنکھ اب تک نہیں کھلی، مصر کے موجودہ ڈکٹیٹر سیسی کی ماں یہودی تھی، یہاں تک کہ اس کا ماموں طویل عرصہ تک اسرائیل کا وزیر تعلیم رہا، اسی طرح شاہ اُردن کی بیوی عیسائی ہے، یاسر عرفات مرحوم کی بیوی کا بھی یہی حال تھا، یہی بے راہ روی ہے جس نے مسلم ملکوں کو ایسا کمزور کردیا ہے کہ وہ یہودی اور

عیسائی طاقتوں سے آنکھ ملانے اور ان کے سامنے زبانِ احتجاج کھولنے کی بھی ہمت نہیں پاتے؛ اس لئے کوئی شبہ نہیں کہ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کو جو تنبیہ فرمائی تھی، وہ ان کی فراست ایمانی اور گہری بصیرت پر مبنی تھی۔

بہرحال اس میں تو کوئی دو رائے ہے ہی نہیں کہ مشرک مرد سے مسلمان عورت کا یا مشرک عورت سے مسلم مرد کا نکاح نہیں ہوسکتا، افسوس کہ اس روشن حقیقت کے باوجود اس وقت فرقہ پرست طاقتوں نے ''لَوْ جہادْ'' کا افسانہ چھیڑ رکھا ہے، اگر اسلام اس کا قائل ہوتا اور مسلمان نکاح کو اشاعت اسلام کا ذریعہ بنانا چاہتے تو غیر مسلم اقوام سے نکاح کی ممانعت نہیں کی گئی ہوتی؛ بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی، جیسا کہ آج کل عیسائی دنیا میں کی جاتی ہے؛ بلکہ اسلام میں تو یہ بات بھی پسندیدہ نہیں ہے کہ کوئی مرد یا عورت اس لئے اسلام قبول کرے کہ اس کی فلاں شخص سے شادی ہوجائے، اللہ تعالیٰ کی رضا اور ہدایت کو حاصل کرنا اس کا مقصد نہ ہو، عہد نبوی میں مکہ فتح ہونے سے پہلے تک یہ بات واجب قرار دی گئی تھی کہ وہ مدینہ منورہ ہجرت کر جائیں، ایک صاحب اسلام قبول کر چکے تھے؛ لیکن وطن سے جو فطری محبت ہوتی ہے، اس کی وجہ سے ان کا دل ہجرت کرنے پر آمادہ نہیں تھا؛ لیکن وہ جن خاتون سے نکاح کرنا چاہتے تھے، ان خاتون نے شرط لگادی کہ اس کے لئے ہجرت کرنی ہوگی، بالآخر انھوں نے ہجرت کی، رسول اللہ ﷺ کو یہ بات پسند نہیں آئی؛ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عمل کی قبولیت اور اس پر اجر وثواب کا مدار نیت پر ہے ''**إنما الأعمال بالنيات**'' جس کی نیت اللہ اور رسول کی خوشنودی حاصل کرنا ہوگا، اس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف سمجھی جائے گی، یعنی اللہ تعالیٰ اس کو اجر عطا فرمائیں گے، اور جس کی ہجرت نکاح یا کسی دنیاوی غرض کے لئے ہو اس کی ہجرت قابل اجر و ثواب نہیں ہے، تو اگر کوئی شخص دل کی آمادگی کے ساتھ اسلام قبول نہ کرے، صرف اس لئے مسلمان ہوجائے کہ فلاں لڑکے یا لڑکی سے میری شادی ہوجائے تو اندیشہ ہے کہ اس کو کما حقہ اجر وثواب نہ ملے اور اگر وہ اسی کیفیت پر قائم رہے تو یہ ایک طرح کا نفاق ہوگا اور عجب نہیں کہ آخرت میں اس کا ظاہری ایمان اس کے منھ پر مار دیا جائے۔

ہندوستان میں مسلمانوں نے ہمیشہ حلال وحرام کی سرحدوں کو باقی رکھا ہے اور معتبر اور دین دار مسلمانوں نے کبھی غیر مسلم لڑکیوں کو بحیثیت منکوحہ اپنانے کی کوشش نہیں کی، بعض لوگ اکبر کی

جودھا بائی سے شادی کا ذکر کرتے ہیں؛ لیکن یہ شادی راجپوتوں کی رضامندی؛ بلکہ رغبت کی بنیاد پر ہوئی تھی اور اکبر کوئی عالم یا دین دار مسلمان نہیں تھا کہ اس کے عمل کو مسلمانوں کے سرتھوپا جائے، حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی لڑکا یا لڑکی اپنے ضمیر کی آواز پر کسی مذہب کو قبول کرلے اور اپنے ہم مذہب سے نکاح کرنا چاہے تو ہمارے ملک کا قانون اس کی اجازت دیتا ہے اور اس کو تبدیلیٔ مذہب کے لئے شادی نہیں کہا جاسکتا، اور اگر موجودہ مخلوط ماحول میں کوئی اپنی پسند کی بناء پر دوسرے مذہب کی لڑکی یا لڑکے سے رشتہ کرتا ہے تو اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں، اور کم سے کم ہندوستان میں ایسے واقعات بہت پہلے سے ہوتے آئے ہیں اور اب بھی ہورہے ہیں، خود مہاتما گاندھی جی کے خاندان میں اس کی مثال موجود ہے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جس فرقہ پرست گروہ نے اس وقت اس افسانہ کو رائی سے پہاڑ بنادیا ہے، ان کے گھروں میں ایسے واقعات زیادہ پیش آتے رہتے ہیں، اشوک سنگھل جیسے تشدد پسند وی ایچ پی لیڈر کی بیٹی مختار عباس نقوی کے نکاح میں ہے، مرلی منوہر جوشی کی بیٹی کی شادی ایک دوسرے بی جے پی لیڈر شاہنواز حسین سے ہوئی ہے، لال کرشن اڈوانی کی بیٹی پرتیبھا اڈوانی نے دوسری شادی ایک مسلمان سے کی ہے، زہر اُگلنے والے فرقہ پرست لیڈر سبرامنیم سوامی کی بیٹی نے بھی مسلمان سے شادی کی ہے، مودی کی بھتیجی ایک مسلمان کے نکاح میں ہے، بال ٹھاکرے کی پوتی نیہا ٹھاکرے ڈاکٹر محمد نبی کے نکاح میں آئی ہے، پروین توگڑیا جیسے شدت پسند زہر اُگلنے والے شخص کی بہن کی شادی ایک رئیس مسلمان سے ہوئی ہے، وہیں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ بعض غیر مسلم مردوں نے مسلمان عورتوں سے شادی رچائی ہے اور ایسی مثال بھی موجود ہے کہ بعض دفعہ عشق کے متوالے مسلمان عاشق نے ہندو خاتون سے شادی کے لئے اسلام سے محرومی کو گوارا کرلیا، جیسے فلمی دنیا میں دھرمیندر اور ہیما مالنی، غرض کہ ایسی شادیاں مذہب کے اشاعت کے جذبہ سے نہیں ہوتیں؛ بلکہ نفسانی جذبات کے تحت ہوتی ہیں، اس میں ہندو مسلم کا کوئی امتیاز نہیں، ایسے واقعات کو ''لو جہاد'' کا نام دینا جھوٹ اور دھوکہ کی بنیاد پر اپنے سیاسی قد کو اونچا کرنا ہے۔

علماء اور خطباء کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمانوں کی نئی نسل کو نکاح کے سلسلہ میں اسلامی تصورات سے واقف کرائیں اور ایسے واقعات کو روکنے کی کوشش کریں جن میں ایک مسلمان لڑکا ایک

غیر مسلم لڑکی کو بیاہ کر لے آتا ہے یا مسلمان لڑکی غیر مسلم لڑکے کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں بندھ جاتی ہے کہ اس سے مسلم معاشرہ کو نقصان پہنچ رہا ہے، یہ گناہ کی زندگی ہے، شریعت کی نگاہ میں یہ نکاح ہے ہی نہیں اور اس سے معاشرہ کا امن بھی درہم برہم ہوتا ہے، ہاں اگر کوئی ہندو لڑکا یا لڑکی واقعی صدقِ دل سے اسلام قبول کر لے تو یقیناً شرعی طریقہ پر مسلمان لڑکے اور لڑکی کو اس سے نکاح کرنا چاہیے اور اسے اپنے خاندان کا حصہ بنالینا چاہئے، یہ شریعت کا حکم بھی ہے اور ہمارے ملک کا قانون بھی واضح طور پر اس کی اجازت دیتا ہے۔

اذان کا ایمان

بعض چیزیں علامتی حیثیت کی حامل ہوتی ہیں اور اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے، جیسے مختلف ممالک کے جھنڈے ہیں، یہ بظاہر کپڑے کا ایک ٹکڑا ہے؛ لیکن جھنڈے کے احترام اور توقیر سے متعلق باضابطہ قوانین مقرر ہیں، یہاں تک کہ اگر جھنڈا الٹا لہرا دیا جائے تو یہ بھی قابل مؤاخذہ ہے اور بے احترامی تو بہت ہی بڑا جرم ہے، یہ اس لئے قابل احترام ہے کہ اس سے لاکھوں اور کروڑوں لوگوں کے قلبی جذبات متعلق ہیں، ان کی بے احترامی ان کے گہرے جذبات کو مجروح کرتی ہے۔

جیسے ملکی اور قومی علامتوں سے انسان کے جذبات متعلق ہوتے ہیں، اسی طرح؛ بلکہ اس سے بڑھ کر مذہبی علامتوں سے ان لوگوں کی جذباتی وابستگی ہوتی ہے، جن کا اس مذہب پر یقین ہو؛ بلکہ ان جذبات کو انسان عقل وتحقیق سے بھی ماورا تصور کرتا ہے، مثلاً ہندو بھائیوں کے ایک بڑے طبقہ کا یقین شری رام جی پر ہے، ان کا عہد ۱۵ تا ۱۹ لاکھ سال پہلے کا بتایا جاتا ہے، یہ ماقبل تاریخ دور ہے، یہ خود اس بات کی علامت ہے کہ شری رام جی کے وجود پر تاریخ، علم الآثار اور عقل وسائنس کی کوئی دلیل موجود نہیں؛ اسی لئے بعض آزاد خیال ہندو محققین رامائن اور مہابھارت میں رام جی کے تذکرہ کو ایک خیالی کردار تصور کرتے ہیں؛ لیکن آج اگر کوئی مسلمان یا عیسائی ایسی بات کہے تو کروڑوں برادران وطن کے لئے یہ بات ناقابل قبول ہوگی اور اس سے ناگواری اور نفرت بھی پیدا ہوگی؛ کیوں کہ شری رام جی بہت سے لوگوں کے لئے ان کے مذہب کی علامت بن گئے ہیں؛ اس لئے یقیناً ان کی بے احترامی کو منع کیا جائے گا، خود قرآن مجید میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے، زمانۂ جاہلیت میں جن دیویوں اور دیوتاؤں کی عبادت کی جاتی تھی، وہ سب فرضی تھے، ان کی کوئی حقیقت نہیں تھیں؛ لیکن قرآن مجید نے ان کو برا کہنے سے منع فرمایا (الانعام: ۱۰۸)؛ کیوں کہ جب کوئی چیز مذہبی علامت بن جاتی ہے اور وہ فکر وعقیدہ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے، تو پھر اس کی بے احترامی دلوں کو توڑنے اور جذبات کو زخمی کرنے کا باعث بنتی ہے۔

اسلام میں ایسی علامتی چیزوں کو ''شعائر اللہ'' یا ''حرمات'' سے تعبیر کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ﴾ (الحج: ۳۰) یعنی جو اللہ کی حرمتوں کی توقیر کرے گا تو یہ اسی کے حق میں بہتر ہوگا، نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾ (الحج: ۳۲) کہ اللہ کے شعار کی تعظیم دراصل دلوں میں تقویٰ کے جاگزیں ہونے اور خشیت الٰہی کے پائے جانے کا ذریعہ ہے؛ چنانچہ قرآن مجید میں کعبۃ اللہ، حرام مہینہ اور قربانی کے جانور وغیرہ کے احترام کا بار بار حکم دیا گیا ہے، (دیکھئے: المائدہ: ۱۰۲) کیوں کہ یہ دین ابراہیمی اور شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علامتی حیثیت کے حامل ہیں، آپ نے مسجدوں کا اس درجہ احترام کرنے کا حکم دیا کہ وہاں گم شدہ چیز کے اعلان کو بھی ناپسند فرمایا اور فرمایا کہ مسجدیں اس کام کے لئے نہیں بنائی گئی ہیں، (**مسلم، عن أبي هريرة**ؓ، حدیث نمبر: ۵٦۸)۔

دین کے شعائر کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو مزاج تھا، اس کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تو ان میں سے آسان عمل کا انتخاب فرماتے؛ بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو، پھر فرمایا کہ خدا کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے سلسلہ میں کبھی کوئی انتقام نہیں لیا؛ لیکن اگر ''حرمات اللہ'' کی بے حرمتی کی جاتی تو اللہ کے لئے آپ انتقام لیا کرتے: ''**... و الله ما أنتقم بنفسه في شيء يؤتى إليه قط حتى تنتهك حرمات الله فينتقم فيه**'' (**بخاري**، حدیث نمبر: ٦۷۸٦) فقہاء نے بھی اپنے اجتہادات میں اس کو ملحوظ رکھا ہے، چنانچہ امام نوویؒ نے فرمایا کہ اس بات پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ مصحف قرآنی کا احترام اور اس کو صاف ستھرا رکھنا واجب ہے، اور قاضی عیاض نے لکھا ہے کہ جس نے قرآن مجید کے ساتھ بے حرمتی کا معاملہ کیا، وہ بالا جماع کافر ہے، (**الآداب الشرعية**: ۲/ ۲۸۵) قرآن مجید ہی کی طرح حدیث کی حرمت وعظمت بھی مسلمانوں کے نزدیک مسلّم ہے؛ اس لئے حدیث نبوی کا احترام بھی واجب ہے، مشہور محدث وفقیہ امام مالک کی کیفیت یہ تھی کہ جب حدیث کا درس دینے کے لئے تشریف لے جاتے تو صفائی ستھرائی کا خصوصی اہتمام کرتے، خوشبو ملتے، داڑھی میں کنگھی کرتے اور جو بہتر سے بہتر کپڑا ہوتا، اس کو زیب تن فرماتے، (**البداية والنهاية**: ۱۰/ ۳۸۰) غرض کہ وہ تمام چیزیں یا افعال جن سے اسلام اور مسلمانوں کی پہچان متعلق ہے،

مسلمانوں پر ان کا احترام واجب ہے اور مسلمانوں کے لئے ان کی اہانت نا قابل برداشت ہے۔

اسلام کے ایسے ہی شعائر میں ایک ''اذان'' ہے، عربی زبان میں اذان کے معنی اطلاع دینے اور اعلان کرنے کے ہیں؛ لیکن اب یہ لفظ اس لغوی معنی میں استعمال نہیں ہوتا؛ بلکہ یہ شریعت اسلامیہ کی ایک اہم اصطلاح ہے، جس سے مراد ہے: ''مخصوص الفاظ کے ذریعہ فرض نمازوں کا اعلان''، ''اذان'' صرف اعلان ہی نہیں ہے؛ بلکہ یہ عبادت بھی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر لوگوں کو اذان کی فضیلت معلوم ہو جائے تو اس کے لئے قرعہ اندازی کی نوبت آجائے: ''۔۔۔ **ثم لم يجدوا إلا أن يستهموا عليه لاستهموا۔۔**'' (**صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب الاستهام في الأذان، حدیث نمبر: ۶۱۵**) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ حضرت بلال اذان دینے کے لئے کھڑے ہوئے، جب وہ خاموش ہوئے، یعنی اذان سے فارغ ہو گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے یقین کے ساتھ اذان دی، وہ جنت میں داخل ہوگا: ''**من قال مثل هذا يقينًا دخل الجنة**'' (**سنن النسائي، كتاب الأذان، باب ثواب ذلک، حدیث نمبر: ۶۸۲**)، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ جس نے سات سال اخلاص کے ساتھ اذان دی، اللہ تعالیٰ اس کے لئے دوزخ سے نجات کا پروانہ لکھ دیں گے: ''**من أذن سبع سنين محتسبًا كتبت له براءة من النار**'' (**سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ما جاء في فضل الأذان، حدیث نمبر: ۲۰۶**)، متعدد روایتوں میں یہ بات آئی ہے کہ مؤذن کی آواز جہاں تک پہنچتی ہے، وہاں تک کی ہر چیز اس کے لئے دعاءِ مغفرت کرتی ہے اور ہر رطب و یابس اس کے لئے گواہ بنتی ہے (دیکھئے: جمع الفوائد، ص: ۲۴۲، ۲۴۳، ط: سہارنپور) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن سب سے اونچی گردن اذان دینے والوں کی ہوگی: ''**المؤذنون أطول الناس أعناقا يوم القيامة**'' (**مسلم عن معاوية، حدیث نمبر: ۳۸۷**) ایک ضعیف روایت میں ہے کہ جس آبادی میں اذان ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس دن اس آبادی والے کو عذاب سے محفوظ رکھتے ہیں (**مجمع الزوائد عن أنس: ۱/ ۳۲۷**، بحوالہ طبرانی)۔

غرض کہ ''اذان'' عبادت بھی ہے اور عبادت کی دعوت بھی، اس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی ہے اور یہ اسلامی شعائر اور مسلمانوں کی شناخت میں داخل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب جہاد کے لئے

کسی آبادی کی طرف جاتے تو فرماتے کہ صبح تک انتظار کیا جائے، اگر اذان کی آواز آئے تو حملہ کرنے سے بچا جائے، فقہاء نے لکھا ہے کہ اذان اگر چہ کہ سنت ہے، نماز کے درست ہونے کے لئے شرط نہیں ہے؛ لیکن اگر کسی آبادی کے لوگ اذان نہ دینے پر اتفاق کرلیں تو ان سے جہاد کیا جائے؛ کیوں کہ یہ اسلام کی پہچان اور شناخت پر حملہ کرنے کے مترادف ہے۔

افسوس کہ مغربی قومیں ایسی چیزوں کی بے احترامی کو بھی قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں، جن کو مصنوعی طور پر انہوں نے اپنی شناخت کا درجہ دے دیا ہے، جیسے اگر کوئی شخص ہولوکاسٹ کا انکار کر جائے تو یورپ کے بہت سے ملکوں میں یہ جرم ہے، اگر کوئی شخص اسامہ بن لادن کی توصیف کرے تو نا قابل قبول ہے، اگر ۱۱ ستمبر کے سلسلہ میں دلیل مانگی جائے تو وہ دہشت گرد اور امریکہ کا دشمن ہے؛ لیکن دوسری قوموں کے بارے میں ان کی یہ سوچ نہیں ہے، وہ مسلمان عورتوں کو نقاب اور اسکارف سے منع کرتے ہیں، سکھوں کو پگڑی اور داڑھی سے روک دیتے ہیں، برطانیہ میں شراب خانوں کا نام ''مکہ'' رکھا گیا ہے، اس کی وجہ سے سعودی عرب کو مکہ کا انگریزی تلفظ تبدیل کرنا پڑا، اسرائیل میں ایسے پیشاب خانے بنائے گئے ہیں، جن کو نقاب اوڑھی ہوئی مسلمان خاتون کے انداز پر ڈیزائن کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ سب مسلمانوں کی دل آزاری ہے؛ حالاں کہ مسلمانوں کا یہ مزاج نہیں ہے کہ وہ دوسری قوموں کی دل آزاری کریں۔

ہندوستان ایک مذہبی ملک ہے اور اس ملک کی سرشت میں تمام مذاہب اور اقوام کا احترام ہے، یہاں مغرب کی طرح زبان پر انسانی حقوق کا نعرہ اور دوسری طرف دوسری اقوام کی تحقیر وتذلیل کا مزاج نہیں؛ لیکن ہندوستان اور اسرائیل کے بڑھتے ہوئے تعلقات کا غالباً ایک اثر یہ بھی ہے کہ یہاں بھی اقلیتوں کی دل آزاری کی خصلت پروان چڑھ رہی ہے، وی ایچ پی کے لوگوں نے قرآن مجید کو نذر آتش کیا، مسجدوں اور چرچوں کی بے حرمتی کے واقعات دن رات اخبارات میں آتے رہتے ہیں، اب ایک نیا فتنہ یہ ہے کہ ''اذان'' کے نام سے ایک فلم آئی ہے، سنا ہے کہ یہ عام انداز کی فلم ہے، جس کا موضوع دہشت گردی ہے، اس میں رقص وسرود، گانا، بجانا اور پیار ومحبت کے مروجہ کردار سب کچھ موجود ہیں؛ لیکن اس کو نام دیا گیا ہے ''اذان'' کا، ظاہر ہے کہ یہ ایک اسلامی اصطلاح اور مسلمانوں کی دینی شناخت کی اہانت ہے اور بظاہر مسلمانوں کی دل آزاری اور ان کی تحقیر کے سوا اس کا کوئی اور مقصد

نظر نہیں آتا، ورنہ فلموں کے بہت سے نام رکھے جاسکتے ہیں اور رکھے جاتے رہے ہیں۔

حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا قانون بنائے جس میں مذہبی اصطلاحات کے بے جا استعمال، مذہبی شخصیتوں کی اہانت اور مذہبی مقامات کی بے احترامی کو جرم قرار دیا گیا ہو، ورنہ اس سے معاشرت میں نفرت کے شعلے سلگیں گے، اور پورے ملک کے امن وامان کو درہم برہم کردیں گے، میں یہ نہیں کہتا کہ ہندوستان جیسے سیکولر ملک میں صرف اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں قانون سازی ہو؛ لیکن تمام مذاہب کے سلسلہ میں اس طرح کا عمومی قانون ضرور بننا چاہئے؛ کیوں کہ یہ ملک کے مفاد میں ہے، رائے اور اظہارِ خیال کی آزادی کی حدیں اتنی بڑھ نہ جائیں کہ وہ ملک کی سلامتی، امن وامان اور اس کے تکثیری مزاج کے لئے نقصان دہ ہو جائے۔

مسلمانوں کا بھی فریضہ ہے کہ وہ پُرامن طور پر ایسے واقعات کے تدارک کی کوشش کریں، شیطانی طاقتیں چاہتی ہیں کہ مسلمانوں کو بھڑکایا جائے اور ان کے جذبات مشتعل کئے جائیں؛ تاکہ مسلمان نوجوان سڑکوں پر نکل آئیں اور ظالموں کو ظلم وجور کے لئے جواز پیدا ہو جائے؛ اس لئے ہمیں ایسے ماحول میں پھونک پھونک کر قدم اٹھانا چاہئے اور کبھی بھی حکمت اور حسنِ تدبیر کا دامن اپنے ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہئے۔

سیاست سے اخلاقیات کا اخراج

کچھ عرصہ پہلے دہلی ریپ واقعہ کے پس منظر میں منعقد ہونے والے ایک ایسے اجلاس میں شرکت کا موقع ملا، جس میں متعدد اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب علم ودانش اور مختلف مذاہب کے نمائندے بھی شریک تھے، مختلف حضرات نے اپنی اپنی سوچ کے مطابق واقعہ کا تجزیہ کیا اور سد باب کی تدبیروں پر روشنی ڈالی، عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ تعلیم کی کمی اور معاشی پسماندگی ایسے واقعات کا سبب بنتی ہے، اگر معاشرہ تعلیم یافتہ ہوجائے تو خیر وشر کی تمیز پیدا ہوگی، انسانی جان ومال اور عزت وآبرو کے احترام کا جذبہ پیدا ہوگا اور ایسے ناگفتہ حادثات وواقعات کا تدارک ہو سکے گا، جب اس حقیر کی باری آئی تو اس نے عرض کیا کہ تعلیم کی اہمیت اور شخصیت کی تعمیر میں اس کے مؤثر کردار سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح معاشی ترقی بھی یقیناً ایک خوش آئند بات ہے، لیکن یہاں مسئلہ ''تعلیم ودولت کے باوجود'' کا ہے؛ کیوں کہ اس وقت جرائم کی جو لہر پیدا ہو رہی ہے، اس میں نہ پڑھے لکھے لوگوں کے مقابلہ میں پڑھے لکھے لوگوں کا حصہ زیادہ ہے، غریبوں کے مقابلہ میں اہل ثروت جرائم کے ارتکاب میں زیادہ جری واقع ہوئے ہیں، جرائم کے سلسلے میں اعداد وشمار ہمیں بتاتے ہیں کہ طلبہ وطالبات یہاں تک کہ اساتذہ ومعلمات جرم کو انجام دینے میں پیش پیش ہیں، تعلیم یافتہ لوگ جرم کو انجام دینے میں ترقی یافتہ تکنیک کا استعمال کرتے ہیں، جو لوگ اعلیٰ مناصب پر ہیں، اونچی اونچی تنخواہیں پاتے ہیں، کرپشن کی دنیا میں انہیں کے وجود سے بہار آرہی ہے، جو بے چارہ کم پڑھا لکھا یا غریب ہو، اس کی خواہشات بھی محدود ہوتی ہیں، اور اگر وہ چاہے بھی تو اسے کوئی رشوت نہیں دیتا، یہی وجہ ہے کہ جرائم دیہاتوں سے زیادہ شہر میں اور چھوٹے شہروں سے زیادہ بڑے شہروں میں انجام دیئے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ملک کی راجدھانی جرائم کی بھی راجدھانی بن گئی ہے؛ اس لئے ضرورت ہے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کی اور معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ قلب وذہن کے تبدیل کرنے کی۔

ابھی بعض ایسے واقعات پیش آئے، جنھوں نے پرانے تأثر کو تازہ کردیا، ریاستوں کی اسمبلیاں اور ملک کی پارلیامنٹ اعلیٰ ترین قانون ساز ادارے ہیں، یعنی انہیں پورے ملک کا نمائندہ

سمجھا جاتا ہے، یہی ادارے لوگوں کی قسمتوں کے فیصلے کرتے ہیں اوران کے لئے قوانین بناتے ہیں؛ لیکن صورت حال یہ ہے کہ بدقسمتی سے ان قانون ساز اداروں میں کتنے ہی ممبران وہ ہیں، جن پر قتل، اقدام قتل، زنا، اغواء، رنگ داری وغیرہ کے مقدمات درج ہیں، موجودہ لوک سبھا کے پانچ سو تینتالیس (۵۴۳) میں سے ایک سو باسٹھ (۱۶۲) ارکان یعنی تیس فیصد پر کریمنل مقدمہ دائر ہے، ان میں سے (۷۶) یعنی چودہ فیصد سنگین مقدمات کا سامنا کررہے ہیں، پورے ملک میں ریاستی اسمبلیوں کے ارکان کی تعداد (۴۰۳۲) ہے، ان میں (۱۲۵۸) یعنی اکتیس فیصد افراد پر فوجداری مقدمات درج ہیں، شوسینا اس میں سب سے آگے ہے کہ اس کے ۷۵ فیصد ارکان پر فوجداری مقدمات ہیں؛ لیکن کسی بھی پارٹی کا دامن بے داغ نہیں ہے، گویا ملک وقوم کی قسمت کے فیصلے ایسے ادارے کرتے ہیں، جن کی ایک تہائی تعداد پر قاتل، زانی، چور، اچکے اور غاصب واغوا کنندہ ہونے کا الزام ہے، اور بادی النظر میں یہ الزام صحیح نظر آتا ہے؛ اسی لئے پولیس نے ان کے خلاف کیس کو قبول کیا ہے۔

عوامی نمائندہ قانون (R P A) کے جھول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ابھی تک صورت حال یہ ہے کہ جو لوگ کسی جرم کی وجہ سے جیل میں بند ہیں تو اگرچہ وہ لوگ ووٹ نہیں دے سکتے؛ لیکن الیکشن لڑ سکتے ہیں، یا اگر کسی معاملہ میں عدالت نے انہیں دو سال یا اس سے زیادہ کی سزا دی ہے تو اپیل کرنے کے بعد جب تک اونچی عدالت سے اپیل کا فیصلہ نہ ہوجائے، اسمبلی اور پارلیمنٹ کی رکنیت برقرار رہتی ہے، سپریم کورٹ عوام کے شکریہ کی مستحق ہے کہ اس نے دس اور گیارہ جولائی کے فیصلے میں اس جھول کو دور کرتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ اگر ایم پی، ایم ایل اے، ایم، ایل، سی کو فوجداری معاملہ میں دو سال یا اس سے زیادہ کی سزا ملتی ہے تو وہ نااہل سمجھا جائے گا، نیز جو شخص جیل کی سزا کاٹ رہا ہے، اسے الیکشن لڑنے کا اختیار نہیں رہے گا، یقیناً یہ عدالت کی ایک مناسب ہدایت ہے اور قانون میں پہلے سے ایسی لچک نہیں ہونی چاہیے تھی، جس سے مجرموں اور جرم پیشہ لوگوں کو عوامی نمائندگی کے اس اعلیٰ ترین ادارے تک رسائی حاصل ہو۔

عام طور پر ایوان قانون میں ارکان کے درمیان کسی مسئلہ پر اتفاق رائے نہیں ہو پاتا، حکومت کتنا ہی معقول قدم کیوں نہ اٹھائے؟ اپوزیشن اس کی مخالفت کو اپنا فریضہ تصور کرتی ہے، اور اپوزیشن کی طرف سے کتنی ہی بہتر سے بہتر تجویز پیش کی جائے، حکومت اسے قبول کرنے کو اپنی اہانت تصور کرتی

ہے؛لیکن عوام دیکھتے ہیں کہ ایک موقع پر پارلیمنٹ اوراسمبلیوں میں وسیع تر اتفاق رائے ہوجاتا ہے، اور وہ موقع ہوتا ہے ارکان کی یافت، سہولتوں اور فنڈ میں اضافہ کا، اس میں حزب اختلاف ہو یا حزب اقتدار، دونوں دوش بدوش کھڑے ہوکر بل کو پاس کراتے ہیں، نہ اس پر بحث کی نوبت آتی ہے اور نہ اختلاف رائے کی؛ اس لئے ذرائع ابلاغ اس پر شور بھی نہیں مچاتے اور دبے پاؤں یہ سارا مرحلہ طے ہوجاتا ہے، اب یہ دوسرا مسئلہ ہے جس پر پارلیمنٹ میں اتفاق پایا جاتا ہے اور تمام سیاسی پارٹیاں مل کر حکومت سے مطالبہ کررہی ہیں کہ عدالت کے اس فیصلہ کو بے اثر بنادیا جائے اور ایوان قانون میں مجرمین کے داخلہ کو روکا نہیں جائے،حکومت نے اس معاملہ میں نظر ثانی کی درخواست کی تھی،مگر عدالت عظمیٰ نے اس درخواست کو بھی مسترد کردیا اور سیاسی پارٹیاں غیر معمولی اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کررہی ہیں کہ پارلیمنٹ قانون سازی کرکے اس منصفانہ اہم اور تاریخی فیصلہ کو بے اثر کردے اور راجیہ سبھانے اسے پاس بھی کردیا ہے، بظاہر امید ہے کہ حکومت ایسا ہی کرے گی؛ کیوں کہ ہر پارٹی کا دامن داغدار ہے اور ہر پارٹی نے اپنی ڈکشنری سے اخلاقی اقدار کا نام ونشان مٹا ڈالا ہے۔

جمہوری نظام کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ عوام کی نمائندگی عوام ہی کے منتخب افراد کے ذریعہ ہو، یہ یقیناً ایک معقول اور مبنی برانصاف اصول ہے؛لیکن دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس نظام میں مقدار کی اہمیت ہوتی ہے، معیار کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، علامہ اقبالؒ کے بقول''جمہوریت میں سر گنے جاتے ہیں،تو لے نہیں جاتے''، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بدکردار سے بدکردار شخص بھی اگر پیسے خرچ کرکے اور غنڈہ گردی کا سہارا لے کر ووٹ کی زیادہ تعداد حاصل کرلیتا ہے تو وہ عوام کا نمائندہ بن جاتا ہے اور ملک وقوم کے لئے سیاہ وسفید کے فیصلہ میں شامل ہوجاتا ہے،معقول بات یہ ہے اور یہی اسلامی اصول ہے کہ کسی شعبہ میں نمائندگی کے لئے ووٹ کے ساتھ ساتھ مطلوبہ معیار کا بھی حامل ہونا چاہیے، اس کے بغیر کسی شخص کو کوئی ذمہ داری سونپی نہیں جاسکتی،قرآن مجید نے اس کے لئے ایک جامع اصول ذکر کیا ہے کہ آپ کسی بھی کام کا ذمہ دار اس شخص کو بنائیے، جس میں دو باتیں پائی جاتی ہوں، ایک یہ کہ وہ اس کام کی صلاحیت رکھتا ہو، دوسرے: اس میں امانت ودیانت ہو ﴿اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ﴾ (القصص:۲٦) قوی کے معنی طاقتور کے ہے؛لیکن طاقت صرف جسمانی طاقت ہی کا نام نہیں ہے؛ بلکہ اس میں ہر طرح کی طاقت شامل ہے،علم کی طاقت،عمل کی طاقت، اخلاق وکردار کی

طاقت اور انصاف پر اپنے آپ کو قائم رکھنے کی صلاحیت۔

امین کے معنیٰ ''امانت دار'' کے ہیں، امانت کا تعلق صرف حفاظت کے لئے رکھے گئے مال ہی سے نہیں ہے؛ بلکہ انسان کی پوری زندگی سے ہے، جو عبادتیں اللہ کی طرف سے فرض کی گئی ہیں، وہ اللہ کی طرف سے امانت ہیں، لوگوں کے جو حقوق ایک دوسرے کے ذمہ ہیں، وہ بھی ایک دوسرے کی امانت ہیں، حکومتوں پر رعایا سے متعلق جو ذمہ داریاں ہیں، یا رعایا پر حکومت کے تئیں جو فرائض ہیں، یہ سب امانت میں داخل ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ امانت ان کے اہل کے حوالہ کیا کریں: ﴿اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰی اَھْلِھَا﴾ (النساء:۵۸) مشہور مفسر علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ یہاں امانت کا حکم تمام لوگوں کو ان کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے شامل ہے، کہ جس کو جو ذمہ داری سونپی جائے، اس کے اندر اس ذمہ داری کو ادا کرنے کی صلاحیت ہو (تفسیر قرطبی:۵/۲۵٦) جو شخص کسی کام کا اہل نہ ہو، اس کو وہ ذمہ داری سونپ دی جائے، یہ خیانت ہے اور ذمہ داری جتنی اہم ہو، اس سے متعلق امانت داری بھی اسی طرح اہمیت کی حامل ہے، جس شخص سے قوم کے اجتماعی معاملات متعلق کئے جائیں، اس کی ذمہ داری دوسرے لوگوں سے کہیں بڑھی ہوئی ہے؛ کیوں کہ اسکے فیصلوں کے گہرے اور دوررس اثرات مرتب ہوں گے؛ اس لئے ذمہ داریوں کے معاملے میں امانت داری کا لحاظ کرنے کی اور زیادہ ضرورت ہے۔

اکثر امور میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ ذمہ داری جس سے متعلق کی جائے، اس میں اس کی صلاحیت ہو، صرف اکثریت کی تائید کو کافی نہیں سمجھا جاتا، اگر کسی شہر کی اٹھاون فیصد تعداد کسی کے حق میں ووٹ دے کر اسے ڈاکٹر کے عہدہ پر نامزد کردے؛ حالانکہ اس شخص نے میڈیکل تعلیم حاصل نہ کی ہو تو کیا اکثریتی ووٹ کے بنا پر اسے ڈاکٹر منتخب کرلیا جائے گا اور علاج کی ذمہ داری اس کے حوالے کردی جائے گی؟ ایک شخص کمپیوٹر سائنس کے بارے میں کچھ نہ جانتا ہو؛ لیکن کمپنی کی اکثریت اس کے حق میں ووٹ دے کہ اس کو سافٹ ویر انجینئر کی ذمہ داری دی جائے تو کیا کوئی عقلمند شخص اس کو قبول کرے گا؟ اسی طرح اگر کسی شخص کے بارے میں معلوم ہو کہ یہ لوگوں کی امانتیں ڈبو دیتا ہے اور کئی اسکینڈل کا مرتکب ہو چکا ہے تو کیا کسی شخص کو یہ بات پسند ہوگی کہ اپنا سرمایہ اس کے حوالہ کردے اور جس آدمی سے بار بار دھوکہ کھا چکا ہو، اس کے پاس سرمایہ کاری کا جوکھم مول لے، تو جیسے

زندگی کے دوسرے مسائل میں صرف اکثریت کی رائے پر اعتماد نہیں کیا جاتا، جب تک کہ وہ شخص کام کی صلاحیت نہ رکھتا ہو اور اپنے کام کے معاملے میں دیانت دار نہ ہو، تو پھر قوم کے اجتماعی مسائل کے فیصلے کیسے ان لوگوں کے حوالہ کئے جا سکتے ہیں، جنہوں نے کسی طرح نسبتاً زیادہ ووٹ حاصل کر لئے ہوں؛ حالانکہ وہ اخلاق ودیانت کے اعتبار سے اس لائق نہ ہوں کہ ذمہ داریاں ان کے سپرد کی جائیں، یہ بھی یقیناً بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے کسی مریض کو کسی ناواقف معالج کے حوالہ کر دیا جائے یا اپنی دولت وعزت پر کسی بے بھروسہ شخص کو ذمہ دار بنا دیا جائے۔

افسوس کہ لوگوں میں اور خود مسلمانوں میں بھی یہ سوچ عام ہوتی جا رہی ہے کہ سیاست میں سب کچھ چلتا ہے، جھوٹ، دھوکہ، مکاری، وعدہ خلافی، نفاق، گالی گلوچ اور دوعملی، رشوت کا لین دین، لوگوں کو بے آبرو کرنا اور مصنوعی طور پر اپنی عزت کرانا، یہ ساری باتیں اگرچہ بری ہیں؛ لیکن سیاست میں ان سب کی گنجائش ہے، یہ ایک انتہائی غلط تصور ہے، سیاسی قائدین ملک کے اعلیٰ ترین نمائندے ہوتے ہیں، وہ عوام کے ترجمان بھی ہوتے ہیں اور عوام کے حق میں فیصلے بھی کرتے ہیں، اگر بداخلاقی ان کے لئے روا ہو تو کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ زندگی کے کسی اور شعبے میں اخلاقی اقدار اور انصاف کے تقاضوں کو پناہ مل سکے گی؛ کیوں کہ رعایا کا وہی مزاج بنتا ہے، جو ان کے حکمرانوں کا ہوتا ہے، ”**الناس علی دین ملوکھم**“ اس کی واضح مثال ملک میں بڑھتا ہوا کرپشن اور لینڈ گرابنگ ہے، جب سے سیاست دانوں کے بڑے بڑے اسکینڈل سامنے آنے لگے، وہ لینڈ گرابر اور جبر کے ذریعہ عام لوگوں سے پیسے وصول کرنے والے اور ان کی زمینوں پر ناجائز قبضہ جمانے والے مجرمین کی شکل میں عوام کے سامنے آنے لگے، کرپشن اور لاقانونیت کا ذہن ہر شعبہ میں پیدا ہو گیا، سرکاری ادارے ہوں یا پرائیوٹ ادارے، پولیس ہو یا فوج، زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہا کہ جہاں رشوت کا بازار گرم نہ ہو، جب سیاسی لیڈروں نے غنڈوں کی ٹولیاں پالنی شروع کر دیں، یہاں تک کہ اتر پردیش کے ایک اسمبلی اور سابق وزیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے یہاں ایک بڑا تالاب بنا رکھا ہے اور اس میں مگرمچھ چھوڑ رکھے ہیں؛ تاکہ اپنے مخالفین کو اس طرح موت کی نیند سلا دی جائے کہ کہیں اس کا نام ونشان بھی باقی نہ رہے، ایوان سیاست میں غنڈہ گروؤں کی پرپیش کا نتیجہ یہ ہوا کہ بینکوں نے فائنانسروں نے اور دوسرے لوگوں نے بھی غنڈوں سے مدد لینے کو اپنے مسائل کا حل سمجھ لیا، اس طرح

لاقانونیت اوراخلاقی اقدار کی پامالی ملک کے رگ وریشے میں رچ بس کر رہ گئی۔

اسلام کا تصور اس سلسلہ میں بالکل واضح ہے کہ احکام خداوندی کی اطاعت اور انصاف کا قیام زندگی کے تمام مسائل میں ضروری ہے، خواہ اس کا تعلق دین سے ہو یا بظاہر دنیا سے، چاہے اس کا تعلق افراد سے ہو یا عامۃ الناس سے، اگر کوئی مسلمان یہ سوچے کہ سیاست میں سب کچھ چلتا ہے تو وہ اسلام کی بنیادی فکر کو پامال کرتا ہے، اسلام سے پہلے عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ جنگ میں کوئی قانون نہیں چلتا، جس طرح بھی ممکن ہو، دشمن کو مغلوب کرو اور اسے نقصان پہنچاؤ؛ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے لئے بھی قوانین مقرر کئے، صحابہ نے اس پر عمل کیا اور دشمن کی زیادتی کے باوجود کبھی نقطۂ عدل کو نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ غزوۂ بدر میں جب ایک ایک مجاہد کی اہمیت تھی اور مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کے مقابلہ بہت کم تھی، تب بھی یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک مسلمان دوسری سمت سے آرہے تھے، مشرکین مکہ نے انہیں پکڑ لیا اور اس شرط پر چھوڑا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوں گے، پھر وہ مسلمانوں کی طرف آئے اور سول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شریک جہاد ہونے کی درخواست کی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم ان سے وعدہ کر چکے ہو تو اپنے وعدے پر قائم رہو، غور کیجئے کہ ایسے نازک موقع پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہیں دی کہ مسلمانوں اخلاقی حدود سے آگے بڑھ جائیں اور عہد و پیمان کا پاس ولحاظ چھوڑ دیں، اس لئے تمام لوگوں کو خاص کر مذہبی قیادتوں اور ان میں بھی مسلمان کو اس بات کی جدوجہد کرنی چاہیے کہ سیاست کو اخلاق کے دائرے میں لایا جائے، مسئلہ فرقہ پرستی کا ہو یا ذات پات کی تفریق کا، یہ سب اسی کی دین ہے کہ سیاست کا رشتہ اخلاق سے کٹ چکا ہے اور اس بات کو جائز سمجھ لیا گیا ہے کہ انسانی لاشوں پر کھڑے ہو کر اپنے اقتدار کا محل تعمیر کیا جائے، یہاں تک کہ اب تو ایسے لوگ وزارت عظمیٰ پر فائز ہونے کا خواب بھی دیکھ رہے ہیں۔

ہمیں عوام میں بھی شعور پیدا کرنا چاہیے کہ وہ اپنا لیڈر منتخب کرنے اور اپنا سیاسی نمائندہ چننے میں صرف ذات پات، سیاسی یا مذہبی وابستگی پر نظر نہ رکھیں؛ بلکہ ان کو اخلاق کے ترازو پر بھی تولنے کی کوشش کریں، ایسے لوگ جو جرائم پیشہ ہیں، جنہوں نے ظلم وجور کا بازار گرم کر رکھا ہے، جن کے ہاتھوں انسان کی جان، اس کی دولت اور اس کی عزت وآبرو محفوظ نہ ہو، اقتدار کی کلید اس کے حوالے نہ کریں، اگر آپ کے ووٹ سے ایسے لوگ منتخب ہوئے تو آپ بھی ان کے جرائم میں شریک اور عنداللہ جواب دہ

ہوں گے، قرآن مجید نے صاف طور پر حکم دیا ہے کہ نیکی کے کام میں تعاون کرو اور گناہ اور ظلم کے کام میں تعاون نہ کرو: ﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَي الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (المائدۃ: ۲) نااہل لوگوں کو قوم وملک کے بارے میں فیصلے کی ذمہ داری سپرد کرنا یقیناً ظلم وعدوان میں تعاون کرنے کے مترادف ہے۔

عوام کو حکومت سے اس بات کا مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ ایسا قانون بنائے، جس سے مجرموں کو ایوان اقتدار تک پہنچنے کا موقع نہ ملے؛ بلکہ ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اس کا سد باب ہو، سیاسی پارٹیوں سے بھی مطالبہ کیا جانا چاہیے کہ وہ داغدار اور مجرمانہ ریکارڈ رکھنے والے افراد کو الیکشن میں امیدوار نہ بنائیں، جب تک عوام میں بیداری نہیں آئے گی اور جس طرح وہ زندگی کی بنیادی ضروریات کے سلسلے میں صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں، اس اہم مسئلہ پر اپنی آواز بلند نہیں کریں گے، ملک اخلاق وکردار سے محروم سیاستدانوں کی غلامی سے آزاد نہیں ہو سکے گا، اگر انصاف اور اخلاص کے ساتھ ایسی تحریک شروع ہو تو یہ جنگ ''جنگ آزادی'' سے کم مقدس نہیں ہوگی؛ البتہ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے اندر شخصی مفادات سے بڑھ کر قومی مفادات کو اہمیت دینے کا مزاج پیدا ہو اور لوگ سمجھنے لگیں کہ جیت یہ نہیں ہے کہ آپ نے جس امیدوار کو ووٹ دیا ہے، وہ کامیاب ہو جائے؛ بلکہ آپ کی جیت یہ ہے کہ جو امیدوار سب سے زیادہ اخلاق ودیانت کا حامل تھا، آپ نے ووٹ اس کے حق میں ڈالا ہے، اگر ایسا امیدوار ہار گیا، تب بھی آپ کی جیت ہے؛ کیوں کہ آپ کا ضمیر جیت چکا ہے اور آپ نے ایک ایسا کام کیا ہے، جس سے آپ کا قلب مطمئن ہے، اور اگر آپ نے قاتل، زانی، چور، غاصب امیدوار کو ووٹ دے دیا اور وہ جیت بھی گیا، تب بھی آپ کی شکست ہے کیوں کہ اب تمام فیصلوں اور نامنصفانہ اقدام میں عنداللہ آپ شریک سمجھے جائیں گے۔

❁

اخلاق سے آزاد جمہوریت

اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا ملک ایک آزاد ملک ہے، غلامی کا جو داغ ہماری تاریخ پر لگا تھا، وہ دُھل چکا ہے، اس آزادی کے لئے ہمارے بزرگوں نے بڑی قربانیاں دی ہیں، جان و مال اور عزت وآبرو کی متاع عزیز اپنے اس پیارے وطن پر نچھاور کی ہے، اگر انہوں نے اپنے لہو کا نذرانہ پیش نہ کیا ہوتا تو ہم آج اس ملک کے مالک نہیں ہوتے، کتنے ہی محبِ وطن تھے جن کی بوٹی بوٹی کردی گئی، کتنے ہی غریب وہ تھے کہ جن کے سر سے سایہ چھین لیا گیا، کتنی ہی ناز ونعم کی پروردہ شخصیتیں تھیں، جن کو ان کے وطن سے دور جزیروں میں قید کردیا گیا، آخر اس ظلم وجور کی گھٹا ٹوپ شب کے سینے سے کامیابی وفتح مندی کی صبح طلوع ہوئی اور آزادی کا سورج روشن ہوا۔

جن لوگوں نے اس ملک کو آزاد کرانے کے لئے اپنی جانیں قربان کی تھیں، اور اپنا تن من دھن لٹایا تھا، انہوں نے ہندوستان کے روشن مستقبل کا حسین خواب دیکھا تھا، ایک ایسا ہندوستان جس میں گھر گھر خوشحالی ہوگی، جس میں ہر شخص کو انصاف ملے گا، علم کے چراغ جلائے جائیں گے، امن وآشتی کا ماحول ہوگا، اخوت وبھائی چارہ کی خوشبو ہر سو مہکے گی، نفرت، ظلم وناانصافی اور ناروا داری کے لئے کوئی جگہ نہ رہے گی، راجا اور پرجا کا امتیاز نہ ہوگا، ملک کے آزاد ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر شخص کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی ہوگی، اپنی زبان اور ثقافت کی حفاظت کا حق ہوگا، وہ خود اس ملک کی تقدیر کے مالک ہوں گے، انگریزوں نے اسے اجاڑا تھا، ہم اسے سنواریں گے، انگریزوں نے اسے نفرت کا آتش فشاں بنادیا تھا، ہم اسے محبت کا گلستاں بنائیں گے، انگریزوں نے ظلم وناانصافی کا ریکارڈ قائم کیا تھا؛ تاکہ آزادی کے متوالے لرز اٹھیں اور ہم اخلاق وکردار کی ایسی مثال قائم کریں گے کہ دنیا اس ملک کو جنت نشان کہنے لگے۔

مگر افسوس کہ جن لوگوں نے اقتدار کی باگ وڈور حاصل کی اور حکومت کے بام ودر کے مالک ہوئے، انہوں نے آزادی کا بالکل مختلف تصور اپنے ذہنوں میں قائم کرلیا، شاید انہوں نے آزادی کا مطلب یہ سمجھا کہ حکمرانوں کو ملک کے خزانے لوٹنے کی آزادی ہوگی، اگر وہ اپنے حقیر

مقاصد کے لئے نفرت کی آگ سلگانا چاہیں تو کسی زبان کو ٹوکنے یا کسی ہاتھ کو روکنے کا حق حاصل نہیں ہوگا، ان کی مجرمانہ حرکتوں میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی، اگر عدالت ان کی مجرمانہ روش پر روک لگانا چاہے تو وہ پارلیمنٹ کی طاقت استعمال کر کے اسے بے اثر کر دیں گے، جب وہ ملک کے سب سے نمائندہ ایوان پارلیمنٹ میں پہنچیں گے تو نہ کسی قانون کے پابند رہیں گے اور نہ کسی اخلاق کے، وہ اپنے ساتھی ارکان کی پٹائی بھی کریں گے، ان پر سرخ وسیاہ مرچ کے اسپرے بھی چھوڑیں گے، چاقو اور اسلحہ بھی لہرائیں گے، ایوان کے صدر پر ہاتھ اٹھانے میں بھی انہیں کوئی تأمل نہیں ہوگا، اور ایک دوسرے کی حجامت بنادینے میں انہیں کوئی عار نہ ہوگی؛ کیونکہ وہ آزاد ہیں، پوری طرح آزاد، سامراجی آقاؤں سے آزاد، اخلاقی اقدار سے آزاد، تہذیب وشائستگی سے آزاد، قانون سے آزاد، اور ہر طرح کی روک ٹوک سے آزاد!

۱۳رفروری ۲۰۱۴ء کو پارلیمنٹ میں جو صورتحال دیکھی گئی، اس سے سیاسی قائدین کے ایسے ہی تصورِ آزادی کا اظہار ہوتا ہے، پارلیمنٹ کے معزز رکن راج گوپال دولت کے اعتبار سے ارکانِ پارلیمنٹ میں تیسرے نمبر پر ہیں، اور ان کے ظاہر کردہ اثاثہ جات کی مالیت دوسو ننانوے کروڑ ہے، انہوں نے تلنگانہ بل کے پس منظر میں سیاہ مرچ کا اسپرے بھی مارا، اور چاقو بھی لہرائے؛ لیکن کیا مجال کہ ان کی حیثیت پر کوئی آنچ آئے، اور کس کو ہمت کہ ان کے خلاف کوئی کیس درج کرے؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان حضرات نے آزادی کا مطلب یہی سمجھا ہے کہ ان پر قانون واخلاق کی کوئی پابندی نہیں ہے۔

یقیناً یہ صورتحال ملک وقوم کے لئے ایک سوالیہ نشان ہے، برائی کی جڑ یہ ہے کہ اقتدار کو امانت سمجھنے کے بجائے کمانے کا ایک ذریعہ سمجھ لیا گیا ہے، اور ملک کے امین ہونے کے بجائے ملک کے مالک ہونے کا تصور ذہن میں بیٹھ گیا ہے، اسلام سے پہلے بھی شاہی نظام اسی سوچ پر مبنی تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوچ کو بدلنے کی کوشش فرمائی، حضرت ابوذر غفاریؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عہدہ کی خواہش کی اور چاہا کہ آپ انہیں کسی ذمہ داری پر مامور فرمائیں، آپ نے ان کے مونڈھوں کو تھپتھپایا اور فرمایا: ابوذر! تم کمزور ہو، یہ امانت ہے، اور قیامت کے دن یہ ذلت وشرمندگی کا باعث ہے، سوائے اس کے جس نے اس کو جائز طریقے پر حاصل کیا اور اس کا جو حق تھا اس کو ادا کیا: ’’إلاَّ من

أخذ ها بحقها و أدى الذى عليه فيها (صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب كراهة الامارة بغير ضرورة، حدیث:نمبر:۱۸۲۵) ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو ولایت عطا فرمائی ہے، اس میں سے بعض حصوں پر مجھے بھی امیر بنا دیجئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: چچا جان! ایک ایسی سانس جو زندگی کو بچا لے، ایسی امارت سے بہتر ہے، جو اسے گھیر لے **(سنن بیهقی، کتاب آداب القاضی، باب کراهیةالامارة، حدیث نمبر: ۲۰۰۰۳)**۔

عہدہ ومنصب کتنی بڑی ذمہ داری ہے، اس کو واضح کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص دس آدمیوں پر بھی امیر ہو تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے ہاتھ اس کی گردن سے بندھے ہوئے ہوں گے، چاہے اللہ تعالیٰ اسے کھول دیں یا ہلاک کردیں، **(سنن دارمی، کتاب السیر، باب فی التشدید فی الامارة، حدیث، نمبر: ۲۵۱۵)**۔۔۔۔۔انسان کسی عہدہ کو ذمہ داری سمجھ کر قبول کرے، نہ کہ اعزاز اور مادی نفع حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھ کر، اس کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک اہم معیار یہ مقرر فرمایا کہ جو شخص کسی عہدہ کا طلبگار ہو، اسے عہدہ نہیں دیا جانا چاہئے، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ میں اور میرے دو چچا زاد بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان دونوں حضرات نے بعض عہدوں پر فائز کئے جانے کی درخواست کی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں یہ ذمہ داری کسی ایسے شخص کو سپرد نہیں کرسکتا جو اس کا طلبگار ہو یا اس کی حرص رکھتا ہو، **(صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب النهى عن طلب الامارة والحرص عليها، حدیث نمبر: ۱۷۳۳)** حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا کہ امارت کے طلبگار نہ بنو، اگر تمہارے مطالبہ پر تمہیں یہ عہدہ دیا جائے گا تو تم اپنے نفس کے حوالے ہو جاؤ گے، اور اگر بغیر طلب کے دیا جائے گا تو اس میں (اللہ کی طرف سے) تمہاری مدد ہوگی، **(صحيح بخارى، كتاب الامارة، باب النهى عن طلب الامارة والحرص عليها، حدیث نمبر: ۶۸۱۹)** حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت خاص طور سے عہدۂ قضا سے متعلق ہے کہ جو شخص منصبِ قضا کا طلبگار ہو، اور اس کے لئے کوشش اور پیروی کرے، تو وہ اپنے نفس کے حوالہ کردیا جائے گا، اور جو طلبگار نہ ہوگا، اور نہ اس کے لئے کوشش کرے، تو اللہ تعالیٰ اس

کی مدد کے لئے ایک فرشتے کو اتارتے ہیں، جو اس کو درست طریقے پر قائم رکھتا ہے۔ (سنن ابو داؤد، کتاب الامارۃ، باب فی طلب القضاء والتسرع إلیه، حدیث نمبر: ۳۵۷۸)۔

ہمارے جمہوری نظام کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ یہاں عہدوں کے طلب کرنے کو برا نہیں سمجھا جاتا؛ بلکہ ایوانِ قانون تک پہنچنے کے لئے اس کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق توفیق ربانی سے محروم ہو جاتا ہے؛ لیکن ظاہر ہے کہ مسلمان جہاں کسی نظام کو بدلنے پر قادر نہ ہوں، اور وہ بنے بنائے نظام کا حصہ ہوں، وہاں ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اہم تر مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کمتر درجہ کی برائی کو گوارہ کرلیں؛ اس لئے موجودہ جمہوری نظام میں یہی مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو ایوانِ اقتدار سے کنارہ کش نہ کریں؛ البتہ پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ اس میں شامل ہوں اور اپنا فریضہ ادا کریں؛ لیکن ہر محب وطن کی ذمہ داری ہے اور خیر امت ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کا خصوصی فریضہ ہے کہ وہ سیاست کو اخلاق کے دائرہ میں لانے کی کوشش کریں، وہ اس بات کی جدوجہد کریں کہ صرف اکیاون فیصد ووٹ لانا قانون ساز اداروں کی ممبری کے لئے کافی نہ ہو؛ بلکہ یہ بات بھی ضروری ہے کہ وہ قوم کے اہم ترین معاملات میں مشورہ دینے کا اہل ہو، اور مفوّضہ ذمہ داریوں کے معاملے میں امین ہو، ''معیار'' کے ساتھ ''مقدار'' کی اہمیت ہے؛ لیکن صرف تعداد کی کثرت اہم کام کو انجام دینے کے لئے کافی نہیں، قرآن مجید نے نہایت مختصر انداز میں عہدہ کے لئے مطلوبہ معیار پر روشنی ڈالی ہے: ﴿اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ﴾ (القصص: ۲۶) یعنی کسی کام پر ایسے شخص کو مامور کرنا چاہئے، جس میں یہ دونوں خوبیاں جمع ہوں، وہ اس کو انجام دینے کی صلاحیت وقوت بھی رکھتا ہو، اور اپنی ذمہ داریوں کے معاملے میں امانت دار وفرض شناس بھی ہو۔

موجودہ پارلیمانی نظام کی سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ اس میں سیاسی قائدین کے لئے کوئی اخلاقی معیار نہیں رکھا گیا ہے، نہ تعلیم کی شرط ہے اور نہ دیانت وامانت کی، ایسے لوگ نہ صرف ایوان حکومت کے لئے منتخب ہوتے ہیں؛ بلکہ وزارت حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں، جن پر فوجداری مقدمات ہوتے ہیں، جن کے خلاف کرپشن کی شہادتیں موجود ہوتی ہیں، جن کی غنڈہ گردی زبان زد عام ہوتی ہے، جو دولت کے انبار لٹا کر اور غنڈوں کی مدد لے کر ووٹوں کی اکثریت حاصل

کر لیتے ہیں، جب الیکشن کی مہم شروع ہوتی ہے، اورانتخابی معرکہ میں مختلف لیڈران قدم رکھتے ہیں، اسی وقت سے بداخلاقی کا مظاہرہ شروع ہوجاتا ہے،نفرت انگیزتقریریں کی جاتی ہیں،مخالف لیڈروں پر نام لے لے کر جملے کسے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی نجی زندگی کو بھی طشت ازبام کیا جاتا ہے، تقریریں ایسی ہوتی ہیں کہ حیا کوسر پیٹنا اورسچائی کو بار بار شرم سار ہونا پڑتا ہے، اگر الیکشن جیتنے کے لئے فساد کرانا پڑے تو اس سے بھی کوئی دریغ نہیں ہوتا۔

یہ ہماری آزادی اور جمہوریت پرایک بدنما دھبہ ہے،بعض شخصیتوں کی طرف سے کرپشن کے خلاف جوتحریک چلائی جارہی ہے، اگر وہ اس کے بجائے اس بات کی تحریک چلاتے کہ سیاست کو اخلاق کا پابند کیا جائے، الیکشن میں کھڑے ہونے کے لئے کچھ معیارات مقرر کئے جائیں، اشتعال انگیز تقریروں اور پارلیمنٹ کے اندر بے ہودہ حرکتوں کی بنا پر سیاسی قائدین کو الیکشن میں امیدواری کے لئے نااہل قرار دیا جائے تو شاید یہ زیادہ بہتر اور دورس اثر کا حامل قدم ہوتا، جوحرکت راج گوپال نے کی ہے، اگر عوام میں سے کسی شخص نے کی ہوتی تو اس پر فوجداری مقدمہ قائم ہوجاتا، اوراگر کسی نادان مظلوم مسلمان نے کی ہوتی تو فوراً اسے دہشت گرد قرار دے دیا جاتا؛ لیکن ہمارے ملک کی جمہوریت منوجی کے فلسفہ کے مطابق مختلف گروہوں کے لئے الگ الگ پیمانہ رکھتی ہے اورسیاسی قائدین کی سیہ کاروں کے لئے ڈھال کا کام کرتی ہے!

الیکشن اور مسلمان

''جہاد'' ایک ایسا لفظ ہے کہ جس کو مغربی اہل قلم اور حکومتوں نے بدنام کر کے رکھ دیا ہے، یہاں تک کہ مسلمانوں کی نئی نسل بھی جہاد کے تذکرہ پر شرمندگی اور احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی ہے؛ حالاں کہ یہ محض پروپیگنڈہ یا غلط فہمی ہے، امن اور انصاف قائم کرنے کی کوشش کو ''جہاد'' کہتے ہیں، جہاد کا تعلق صرف میدان کارزار اور فولادی و آتشی ہتھیاروں سے نہیں ہے؛ بلکہ انسان کی ان تمام صلاحیتوں سے ہے، جو امن و انصاف قائم کرنے کے مقصد کو پورا کر سکتی ہیں، جہاد زبان سے بھی ہے؛ چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کا کہنا جہاد کی سب سے افضل صورت ہے: ''**أفضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر**'' (سنن ابی داؤد، **کتاب الملاحم ن باب الأمر والنهي**، حدیث نمبر: ۴۳۴۴) اور جو کام زبان کرتی ہے وہی کام بعض اوقات زیادہ بہتر طور پر قلم کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے؛ اسی لئے قلم بھی جہاد کا ایک ذریعہ ہے، جہاد مال کے ذریعہ بھی ہے، خود قرآن مجید میں اس کا ذکر موجود ہے (التوبہ: ۴۱) جہاد کا تعلق انسان کے نفس اور جسمانی مشقتوں سے بھی ہے؛ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کو بھی جہاد قرار دیا: ''**الحج جهاد**'' (**سنن ابن ماجة، کتاب المناسک، باب العمرة**، حدیث نمبر: ۲۹۸۹) کیوں کہ حج میں انسان نفس کے خلاف مجاہدہ کرتا ہے، نہ اپنی مرضی کا لباس پہن سکتا ہے، نہ خوشبو کا استعمال کر سکتا ہے، اور اسے اپنی بعض اور جائز خواہشات کو بھی چھوڑنا پڑتا ہے، جہاد کی آخری شکل وہ ہے، جس کو ''جنگ'' کہا جاتا ہے، جس کا مقصد عدل و انصاف قائم کرنے اور شر و فساد کو دور کرنے میں آخری درجہ کی قوت کا استعمال کرنا ہے۔

غرض کہ جہاد کا مقصد متعین ہے؛ لیکن آلات و وسائل متعین نہیں ہیں، ہر زمانہ میں جو طاقت اور جو صلاحیت انصاف کو قائم کرنے میں مدد و معاون ہو سکتی ہے، ظالموں کو زیر کر سکتی ہے، اور سماج پر اثر انداز ہو سکتی ہے، ان وسائل کا استعمال کیا جانا چاہئے، اس سلسلہ میں قرآن مجید کا یہ ارشاد ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ ''جہاں تک ہو سکے، ان کے مقابلہ میں طاقت کو منظم کرو'' ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا

اسْتَطَعْتُمْ ﴾(الانفال:٦٠)

مشہور مفسر علامہ فخر الدین رازی نے لکھا ہے کہ یہ ہر ایسی چیز کو شامل ہے، جس کے ذریعہ دشمن سے مقابلہ کیا جا سکتا ہو: "**هذا عام فی کل ما یتقوّی به علی حرب العدوّ**" (**مفاتیح الغیب**: ۸/ ۵۲۳)— اس سے کون سے ہتھیار مراد ہیں؟ مفسرین نے اس کو بھی متعین کرنے کی کوشش کی ہے؛ چنانچہ بعض اہل علم نے تیز اندازی مراد لی ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے پڑھنے کے بعد تین دفعہ فرمایا کہ اصل قوت تیر اندازی ہی میں مضمر ہے: "**ألا إن القوة الرمي**" (**مسلم، عن عقبه بن عامر، کتاب الإمارة، باب فضل الرمي والحث علیه الخ**، حدیث نمبر: ۵۰۵۵) خود قرآن مجید کی اس آیت میں گھوڑوں کا ذکر کیا گیا ہے، جو گذشتہ زمانوں میں جنگ کے لئے ایک مفید، ذہین اور تیز گام سواری تھی، ذکر تیر کا ہو یا گھوڑے کا، یہ ایک علامتی لفظ ہے، جس کا مقصد ہے ہر دور کے مؤثر اور طاقتور ترین ہتھیار کا استعمال۔

اللہ کا شکر ہے کہ ہم لوگ جس دور میں زندگی گذار رہے ہیں، یہ جمہوری تصورات کے غلبہ کا عہد ہے، جس میں رائے عامہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوتی ہے، جس میں پُر امن طریقہ پر انقلاب لانا ممکن ہے، جس میں اکثریت کی رائے کا خاص وزن ہوتا ہے، جمہوری نظام حکومت کا ایک اہم اور بنیادی عمل الیکشن ہے، الیکشن میں زیادہ ووٹ حاصل کر کے اقتدار حاصل کیا جا سکتا ہے، اور ووٹ کی طاقت استعمال کر کے حکومتیں بدلی جا سکتی ہیں؛ اس لئے حکومتوں کو گرانے اور ختم کرنے اور حکومتوں کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کے لحاظ سے الیکشن بھی اس قوت میں شامل ہے، جس کے جمع کرنے کا قرآن مجید نے حکم دیا ہے، خصوصًا ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، الیکشن کی سیاست میں مسلمانوں کے حصہ لینے کی بے حد اہمیت ہے۔

الیکشن میں حصہ لینے کا ایک پہلو یہ ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ ووٹ ڈالنے کی کوشش کریں، یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ بعض اہل علم نے ووٹ کو گواہی کے حکم میں رکھا ہے، گواہی دینا بوقت ضرورت واجب ہے اور اس سے بڑی ضرورت کیا ہوگی کہ فرقہ پرست پارٹیوں کو بام اقتدار تک پہنچنے سے روکا جائے، عملی طور پر یہ بات دیکھی گئی ہے کہ جہاں کہیں مسلمانوں نے ووٹ ڈالنے کا اہتمام کیا، وہاں سیکولر طاقتوں کو آگے بڑھانے اور فسطائی قوتوں کو پیچھے ہٹانے میں مدد ملی ہے، یوپی کا

حالیہ الیکشن اس کی ایک بہترین مثال ہے، جس میں سماج وادی پارٹی برسر اقتدار آئی اور پہلی بار 71 مسلم ممبران اسمبلی منتخب ہوئے۔

اس طاقت کو استعمال کرنے کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ مسلمان اپنے ووٹ کو بکھراؤ سے بچائیں اور پورے شعور کے ساتھ متحد ہوکر کسی ایک پارٹی کو ووٹ دیں، اکثریت تو ووٹ تقسیم ہونے کے باوجود اپنی سیاسی قوت برقرار رکھ سکتی ہے؛ لیکن اس اقلیت کا کوئی وزن باقی نہیں رہ سکتا، جس کی صفیں شکستہ ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اجتماعیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد ہے: ''**يد الله على الجماعة**'' (نسائی، کتاب تحریم الدم ں باب قتل من فارق الجماعۃ الخ، حدیث نمبر: ۴۰۲۰) قرآن مجید کی ہدایت ہے کہ مسلمان مل جل کر رسی کو تھامیں اور پراگندہ ہونے سے بچیں، ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ (آل عمران: ۱۰۳) انتشار اور بکھراؤ، ہوا خیزی، شکست وریخت اور قومی کمزوری کا سبب ہوتا ہے ﴿وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ وَاصْبِرُوْا﴾ (الانفال: ۴۶)۔

الیکشن میں مسلمانوں کے ووٹ کو بے اثر کرنے کے لئے دوررس اور بظاہر دلفریب سازشیں بھی کی جاتی ہیں، اور مضبوط مسلمان امیدوار کے مقابلہ مسلمان امیدوار ہی کھڑے کئے جاتے ہیں، ایسے موقع پر ضروری ہے کہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کیا جائے اور جیسے اسلام دشمن طاقتیں عہد نبوی میں منافقین کو اپنا آلہ کار بناتی تھیں؛ لیکن مسلمان اس سے متأثر نہیں ہوتے تھے، اس اسوہ کو سامنے رکھا جائے، اگر کچھ مسلمان امیدوار پیسے لے کر مسلمان یا سیکولر امیدوار کو نقصان پہنچانے کے لئے کھڑے ہوں تو یہ یقیناً رشوت ہے اور بمقابلہ عام رشوتوں کے زیادہ گناہ کا باعث ہے؛ کیوں کہ اس کے نقصانات بہت زیادہ ہیں۔

ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی الگ سیاسی جماعت قائم کرنی چاہئے، جس کا رجحان بڑھ رہا ہے، یا دوسری سیاسی جماعتوں میں شرکت کو ترجیح دینی چاہئے؟ —— میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلہ میں ہر جگہ ایک ہی طریقہ کار کو اختیار نہیں کیا جاسکتا؛ بلکہ مختلف علاقوں کے حالات کے اعتبار سے الگ الگ طریقے مفید ہوسکتے ہیں، مسلم جماعتوں کے قیام میں یہ فائدہ ضرور ہے کہ وہ قانون ساز اداروں میں کسی تحفظ کے بغیر مسلمانوں کی بات پہنچا سکتے ہیں، ہندوستان کی بعض ریاستوں میں اس کا

بڑا فائدہ محسوس کیا گیا ہے، خاص کر جنوبی ہند اور مشرقی ہند کے بعض اور علاقوں میں بھی مسلمانوں کی ایسی سیاسی تنظیمیں فائدہ مند ثابت ہوئی ہیں؛ لیکن یہ ایسی جگہ پر ہی ممکن ہے، جہاں مسلم آبادی مرتکز ہو، جہاں مسلم آبادی مرتکز نہ ہو، وہاں مسلمانوں کی اپنی پارٹیوں کا قیام فائدہ مند کے بجائے نقصاندہ ثابت ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ اگر آپ کے ایک دو ممبر منتخب بھی ہو گئے؛ لیکن دوسری پارٹیوں نے یہ محسوس کرلیا کہ مسلمانوں کا ووٹ انہیں نہیں ملا تو آپ ان پر کوئی پریشر قائم نہیں کر سکتے اور صرف ایک دو ممبر کے ذریعہ آپ کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا، ایسی جگہوں میں یہ بات زیادہ مفید ہوتی ہے کہ اپنی علیحدہ پارٹی قائم نہ کی جائے؛ لیکن اپنے مطالبات کا ایجنڈہ مرتب کیا جائے، اور اس کو ان پارٹیوں کے سامنے پیش کیا جائے جو اپنے آپ کو سیکولر کہتی ہیں اور پھر ایسی پارٹی کے حق میں متحد ہوکر کوشش کی جائے، جو مسلم ایجنڈہ کو قبول کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے کام غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ مل کر اشتراک کے ساتھ کئے ہیں، آپ نے ظلم و ناانصافی اور لاقانونیت کو دور کرنے کے لئے ’حلف الفضول‘ میں شرکت فرمائی ہے، اگرچہ یہ واقعہ، نبوت سے پہلے کا ہے؛ لیکن نبی بنائے جانے کے بعد بھی آپ نے فرمایا کہ اگر مجھے اب بھی اس کی طرف دعوت دی جائے تو میں قبول کروں گا ’’**لو دعيت إليه لأجبت**‘‘ (مسند البزار، حدیث نمبر: ۱۰۲۴، ۱/ ۱۸۵) اسی طرح ہجرت کے بعد آپ نے مدینہ منورہ میں ایک ایسی مملکت کی داغ بیل ڈالی، جس میں مسلمانوں کو اور یہودیوں کو یکساں طور پر مذہبی آزادی حاصل ہو اور دونوں یکساں طور پر دفاع کی ذمہ داریاں ادا کریں، جب تک خود یہودیوں کی طرف سے بدعہدی کے واقعات پیش نہیں آئے، یہ معاہدہ باقی رہا، یہ ایک مثال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرورت و مصلحت کے مطابق غیر مسلم قوموں کے ساتھ اشتراک اختیار فرمایا کرتے تھے، اس لئے جن سیاسی پارٹیوں کا ایجنڈہ کھلے طور پر اسلام اور مسلمانوں سے عداوت پر مبنی نہ ہو، ان پارٹیوں میں شرکت اور ایک باعزت معاہدہ کے تحت ان کے حق میں ووٹ دینے میں کوئی حرج نہیں۔

جہاں مسلم پارٹیوں کا قیام اور ان کے امیدواروں کا کھڑا ہونا مسلمانوں کے لئے نقصان کا باعث ہو اور اس سے فرقہ پرست پارٹیوں کو تقویت پہنچتی ہو، وہاں مسلم پارٹیوں کا امیدوار کھڑا کرنا یقیناً ایک نادرست عمل ہی کہلائے گا، جیسے کہ اس وقت یوپی کے الیکشن میں تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ بہت سی سیٹیں بھارتیہ جنتا پارٹی کو مسلمان پارٹیوں کی بدولت حاصل ہوئیں، چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ بعض

دفعہ مسلم اکثریت جگہوں سے فرقہ پرست ممبران منتخب ہوجاتے ہیں، یہ ایمانی فراست، سیاسی شعور اور ملی حمیت کے مغائر ہے!

غرض کہ جمہوری نظام میں ووٹ ایک اہم طاقت اور ایک مؤثر ہتھیار ہے اور مسلمانوں کا ملی فریضہ ہے کہ وہ نہایت شعور، ہوش مندی اور سمجھداری کے ساتھ اس ہتھیار کا استعمال کریں، نہ اپنے دشمنوں کے آلہ کار بن جائیں اور نہ جذبات کی رو میں بہہ کر ایسا قدم اٹھائیں جو خود ان کے لئے نقصاندہ ہو۔

الیکشن کے بعد !!

الیکشن گیا، اور الیکشن کی ہماہمی گئی، وطن عزیز کے باشندوں نے اہل سیاست کے کیا کچھ کارنامے نہیں دیکھے؟ یہ بھی دیکھا کہ قوم کی نمائندگی کے لئے وہ لوگ امیدوار بن رہے ہیں، جن پر سنگین جرائم کی دفعات عائد ہیں، یہ بھی دیکھا کہ کرپٹ اور رشوت خور، ظلم وجبر کے ذریعہ سرکار اور عوام کی املاک پر قبضہ کرنے والے اور غنڈہ گردی کے ذریعہ اپنی دھونس جمانے والے، قومی اور مقامی پارٹیوں کی طرف سے کھڑے کئے گئے ہیں؛ کیوں کہ ان کے ذریعہ پارٹی کو فنڈ حاصل ہوتا ہے، تنہا ئیوں میں نہیں؛ بلکہ اسٹیج پر اخلاق کی دھجیاں بکھیری گئیں۔

ایک دوسرے کے نجی واقعات کو نمک مرچ لگا کر پیش کیا گیا، غرض کہ عمومی طور پر سیاسی قائدین نے اس بات کو واضح کر دیا کہ سیاست میں اخلاقی اقدار کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، بڑا لیڈر وہ نہیں ہے، جو قوم کا خادم ہو، ملک سے محبت رکھتا ہو؛ بلکہ بڑا لیڈر وہ ہے جو لفاظ ہو، پیسے بہا کر ووٹ خرید سکتا ہو، مظلوموں کی لاش پر چڑھ کر اپنا قد بلند کر سکتا ہو، اور اپنی زیادہ سے زیادہ تشہیر کرا سکتا ہو، یہ سب مفاسد وہ ہیں، جو صرف ابھی گذرنے والے الیکشن ہی کا حصہ نہیں ہیں؛ بلکہ یہ الیکشن کے لوازم میں شامل ہو گئے ہیں، ہر الیکشن میں یہ منظر سامنے آتا ہے، اور روز بروز اس میں ترقی ہوتی چلی جاتی ہے۔

مگر اس بار کے الیکشن میں دو ایسی باتیں سامنے آئیں جو حد درجہ افسوسناک اور نہایت تکلیف دہ ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ اس دفعہ واضح طور پر یہ بات محسوس کی گئی کہ ہمارے ذرائع ابلاغ جن کو جمہوریت کا ایک ستون کہا جاتا ہے، متاع خرید وفروخت بن گئے ہیں، وہ انصاف کے علمبردار نہیں؛ بلکہ مے خانۂ مال ومتاع کے قدح وخوار، اور اس کی قیمت اپنے ضمیر کی شکل میں ادا کرنے پر تیار ہیں، وہ مظلوموں کی صدائے فریاد نہیں ہیں، سرمایہ داروں کی آواز ہیں، پیسوں کے ذریعہ ان کو خریدا جا سکتا ہے، اور دولت کا استعمال کر کے ایک زرخرید کنیز کی طرح ان کا استعمال کیا جا سکتا ہے، خاص کر الکٹرانک میڈیا نے اس سلسلہ میں جو مذموم کردار ادا کیا، وہ ان کے پیشے پر ایک دھبہ سے کم نہیں، یہ

بات حد درجہ افسوسناک اور ملک کے مستقبل کے لئے خطرناک ہے۔

اگر اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ انتہائی ناروا طرزِ عمل ہے، اللہ تعالیٰ نے عدل وانصاف کا حکم دیا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ﴾ (النحل:۹۰) کسی بات کا فیصلہ کرنے میں بھی عدل ہونا چاہئے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "**اذاحکمتم فاعدلوا**" (**مجمع الزوائد**:۵/۱۹۷ عن أنسؓ) اور اگر نوبت مصالحت کی ہوتو اس میں بھی عدل کا دامن چھوٹنا نہیں چاہئے: ﴿فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا﴾ (الحجرات:۹)

عدل وانصاف کا تعلق صرف دوافراد کے جھگڑوں ہی سے نہیں ہے؛ بلکہ انسان کے رویہ اوراس کے اظہار خیال سے بھی ہے، سچائی کو پیش کرنا عدل ہے، اور جھوٹا پروپیگنڈا کرنا ظلم ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ اگر تمہارے اندر چار باتیں ہوں اور دنیا کی کوئی اور چیز تمہارے پاس نہ ہوتو تمہیں فکر مند نہ ہونا چاہئے، امانت کی حفاظت، گفتگو میں سچائی، خوش اخلاقی اور کھانے میں حرص وہوس سے دوری (مسند احمد: عن عبداللہ بن عمرو: ۲/۱۷۷) پس جھوٹ کو پھیلانا، واقعات کی غلط تصویر پیش کرنا، ظالم کے ظلم وجور کو نظر انداز کردینا، کسی رہنما کی شرح ترقی کو بڑھا چڑھا کر اس کی تشہیر کرنا، اور دوسروں کے کام سے آنکھیں موند لینا یہ عدل کے خلاف ہے، یہ صرف جھوٹ نہیں ہے؛ بلکہ جھوٹ کی تبلیغ واشاعت ہے، یہ لوگوں کو گمراہ کرنا، اوران کو ایک ایسے راستہ کی طرف لے جانا ہے، جو کھائیوں سے اور خطرات سے پر ہے۔

میڈیا کی حیثیت ہمارے معاشرہ میں گواہ کی ہے، وہ افراد واشخاص کے بارے میں، گروہوں اور پارٹیوں کے بارے میں، حکومت اور عوام کے بارے میں، سچائی اور حقیقت پر مبنی گواہی پیش کرتی ہے، اس کی شہادت وگواہی پر عوام رائے قائم کرتے ہیں اور حکومتوں کی سوچ بنتی ہے؛ اس لئے اس کی غلط بیانی شہادت زور یعنی جھوٹی گواہی ہے، اور جھوٹی گواہی اتنا بڑا گناہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب کبیرہ گناہوں کا ذکر فرمایا تو لیٹے ہوئے تھے؛ لیکن جب جھوٹی گواہی کا ذکر آیا تو اس کی اہمیت اور سنگینی کو بتانے کے لئے آپ بیٹھ گئے، اور تین بار اس گناہ کا ذکر فرمایا؛ کیونکہ گواہ کے بیان پر فیصلے ہوتے ہیں، اور معاملات طے ہوتے ہیں، اگر وہی جھوٹا بیان دینے لگیں تو ظاہر ہے کہ سارے فیصلے غلط قرار پائیں گے، اور سچائی کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہے گی، رسول اللہ ﷺ کے ارشادات صرف مسلمانوں

کے لئے نہیں ہیں؛ بلکہ پوری انسانیت کی فلاح سے متعلق ہیں؛ اس لئے ضروری ہے کہ میڈیا اپنے چہرے کو درست کرے، وہ اپنا محاسبہ کرے، وہ دیکھے کہ ایک غیر جانبدار گواہ کے بجائے کہیں اس نے باطل کے طرفدار کی حیثیت تو اختیار نہیں کر لی ہے، اگر ملک کے ذرائع ابلاغ پر سنگھ پریوار قابض ہو گیا تو سچائیاں اس طرح دفن ہو جائیں گی کہ وہ کبھی سامنے نہیں آسکیں گی، اور ملک میں ظالم اور بددیانت لوگوں کو ایسی ڈھال مل جائے گی کہ انصاف کا ہتھیار اس پر اثر انداز نہیں ہو سکے گا۔

دوسری افسوسناک بات جو اس الیکشن میں دیکھنے میں آئی وہ یہ ہے کہ ظالموں کا ساتھ دینا کوئی عار کی بات باقی نہیں رہی، ایک ایسا شخص جس پر گجرات کے ہزاروں مسلمانوں کا خون ہے، جس نے اعلانیہ طور پر اقلیتوں کے ساتھ ناانصافی کی، جس نے صرف مسلمانوں ہی پر ظلم نہیں کیا؛ بلکہ سیاسی حریفوں کے قتل کا الزام بھی اس کے سر پر ہے، اس کو میڈیا نے ایک ہیرو کی طرح پیش کیا، اور سیاسی بازیگروں نے اس سے دوستی کے ہاتھ ملائے، پہلے تو آر ایس ایس کی شہ پر بی جے پی نے تمام سینئر لیڈروں کو کنارے کر دیا، پھر مختلف وہ سیاسی پارٹیاں جو بار ہا اعلان کرتی تھیں کہ وہ فرقہ پرست پارٹی سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گی؛ بلکہ بعض وہ لیڈران جن کو سیکولرزم کا نمائندہ اور ترجمان سمجھا جاتا تھا، انہوں نے بھی صرف سیاسی مفادات کے لئے تمام اصول ونظریات کو پس پشت ڈال دیا، اور ان کا وہ حقیقی چہرہ عوام کے سامنے آگیا، جس کو انہوں نے چھپا رکھا تھا، یہ اس ملک کے لئے بڑی بدنصیبی کی بات ہے، یہ ایک کثیر مذہبی، کثیر تہذیبی، اور کثیر لسانی ملک ہے، یہ ملک کثرت میں وحدت کا نمونہ ہے، اس کی حیثیت اس خوبصورت گلدستہ کی ہے جس کو مختلف رنگ و بو کے پھولوں سے سجایا گیا ہے، یہ تنوع ہی اس کا اصل حسن ہے، اس سے اس کی شناخت ہے، اسی کی وجہ سے پوری دنیا میں اس کی ستائش کی جاتی ہے، اور اس حقیقت پر قائم رہنے میں بھی اس ملک کی سالمیت ہے؛ اسی لئے جنگ آزادی کے مجاہدین اور اس جنگ کے قائدین نے جو دستور دیا، اس میں اس رنگا رنگی کا پورا خیال رکھا؛ لیکن آزادی کے بعد ہی سے کچھ فرقہ پرست عناصر پیدا ہو گئے جن کو ملک کا یہ نظام اور اس کی رنگا رنگی پسند نہیں آئی، اس کے لئے آزادی سے پہلے آر ایس ایس قائم ہوئی، اور اس کے بطن سے مختلف فرقہ پرست پارٹیاں اور انتہا پسند تنظیمیں پیدا ہوتی رہیں، بی جے پی بھی اس کی پیداوار ہے، یہ ایک شجر خبیث ہے؛ لیکن اس کی جڑ وہی فرقہ وارانہ فکر ہے جس کا نعرہ آر ایس ایس لگاتی رہی ہے۔

اسی لئے شروع ہی سے بیش تر سیاسی جماعتیں بی جے پی، سے کنارہ کرتی رہی ہیں؛ تاکہ ان کے سیکولرزم کے دامن پر کوئی دھبہ نہ پڑ جائے، ایک زمانہ تھا کہ تلاش کے باوجود اس کو کوئی حلیف پارٹی نہیں ملتی تھی؛ لیکن اب حلیفوں کی لائن لگی ہوئی ہے، اور سیکولرزم کا دم بھرنے والے لوگ صرف اس امید پر اس کے دوش بدوش کھڑے ہیں کہ جب تختۂ اقتدار بچھے تو دو چار انچ ہی سہی، ان کو بھی اس پر بیٹھنے کی گنجائش مل جائے، تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ بعض نامی گرامی مسلمانوں نے بھی مودی کی حمایت شروع کردی، اور مودی کے قول وفعل کی تاویل کرنے لگے، بی جے پی کی حمایت کا اظہار کیا، کم سے کم کسی مسلمان سے بجا طور پر اس کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔

ظالم کو ظلم سے روکنا مسلمانوں کا شرعی فریضہ اور ایمان کے لوازم میں سے ہے، یہ کافی نہیں ہے، کہ آدمی خود اپنے آپ کو ظلم کرنے سے بچائے؛ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ظالموں کے ساتھ کھڑا نہ ہو: ﴿فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰي مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (انعام: ۶۸)؛ بلکہ مسلمانوں سے دعاء کرائی گئی کہ اے پروردگار! ہمیں ظالموں کا ساتھی نہ بنائیں: ﴿رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (اعراف: ۴۷) ظالموں کی تعریف اور ان کا تعاون تو دور کی بات ہے ان کی طرف انسان کا جھکاؤ بھی نہ ہونا چاہئے: ﴿وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ﴾ (ہود: ۱۱۳) بلکہ ظالم کو کیفر کردار تک پہنچا کر مظلوموں کی مدد کرنا چاہئے؛ کیونکہ مسلمانوں کو ان کے پیغمبر ﷺ نے مظلوموں کی مدد کرنے کا حکم دیا ہے: ''أعینوا المظلوم'' (سنن الترمذی عن البراء بن عازب، حدیث نمبر: ۲۷۲۶)

یہ دو ایسی باتیں اس الیکشن میں سامنے آئی ہیں جو اس ملک کے جمہوری کردار، سیکولرزم پر مبنی دستور اقلیتوں کے تحفظ، اور اس ملک کے تکثیری سماج میں امن قائم رہنے کے اعتبار سے نہایت خطرناک اور دوررس اثر کی حامل ہیں، اس کے تدارک کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان آگے بڑھیں، ذرائع ابلاغ کے اس جانبدارانہ رویہ کا مقابلہ اس کے بغیر نہیں ہوسکتا کہ مسلمان خود ذرائع ابلاغ میں حصہ دار بنیں، مسلمان سرمایہ دار اس شعبہ میں سرمایہ کاری کریں، ایسی قوتوں اور صلاحیتوں کو ابھاریں جو سیکولرزم پر یقین رکھتی ہوں، ان کا ضمیر بھی زندہ ہو، اور جو عدل وانصاف کے قیام کو ایک انسانی فریضہ سمجھتی ہوں، رسول اللہ ﷺ نے اپنے عہد کے وسائل ابلاغ کو استعمال کیا ہے، صفا کی پہاڑی پر چڑھ کر اپنی نبوت

کا اعلان کرنا کوئی اتفاقی واقعہ نہیں تھا؛ بلکہ اس زمانہ میں کم سے کم وقت میں تمام اہل مکہ تک اپنا پیغام پہنچانے کا یہی واحد ذریعہ تھا، اسی طرح آپ نے پورے جزیرۃ العرب تک اسلام کی دعوت پہنچانے کے لئے حج کے اجتماع کا، اور ان تجارتی میلوں کا استعمال کیا جہاں پورے جزیرۃ العرب کے لوگ جمع ہوتے تھے، اس طرح پورے جزیرۃ العرب میں آپ ﷺ نے اپنا پیغام پہنچایا، اسی طرح عالم عرب سے باہر دور دور تک دعوتی خطوط پہنچوائے، یہ اپنے زمانے کے ذرائع ابلاغ ہی تھے، جن کو آپ نے استعمال فرمایا؛ اس لئے مسلمان، اور ملک کے محب وطن شہریوں کی اولین ذمہ داری ہے کہ وہ غیر جانبدار، اور منصف مزاج ذرائع ابلاغ کو وجود میں لائیں، اور ایسے باصلاحیت نوجوان کو تیار کریں، جو میڈیا میں اپنی جگہ بناسکیں، اس کے بغیر سیکولرزم اور فرقہ پرستی کی جنگ میں فتح حاصل نہیں کی جاسکتی۔

دوسرے فرقہ پرستی کا مقابلہ کرنے کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ تمام اقلیتوں کو اور دلتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے؛ کیونکہ فرقہ پرستی کے پیچھے جو دماغ کارفرما ہے وہ برہمنوں کا ہے، برہمن اور اونچی ذات کے لوگ صدیوں سے دلتوں پر زیادتی بھی کرتے رہے ہیں، اور انہوں نے ان کو ذلیل ورسوا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے؛ لیکن وہ فرقہ پرستی کے لئے دھوکہ دے کر ان ہی کو استعمال بھی کرتے ہیں، اگر دلتوں کو قریب کیا جائے تو ایک ایسا اشتراک قائم ہوسکتا ہے جو اونچی ذات والوں کے ہاتھ سے ان کی لاٹھی کھینچ لے، رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں اس کی مثال حلف الفضول ہے، جس میں مظلوموں کی مدد، اور ظالموں کو ظلم سے روکنے کے لئے ایک ایسا پلیٹ فارم تیار کیا گیا تھا جس پر منصف مزاج طاقتیں اکٹھا ہوگئی تھیں، رسول اللہ ﷺ نے پوری سرگرمی کے ساتھ اس میں شرکت فرمائی، اور اگر چہ کہ یہ مکی زندگی کا واقعہ تھا؛ لیکن آپ پوری زندگی ایسی کوشش کے مؤید رہے، آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے: ''**لو دعیت إلیہ لأجبت**''۔

الیکشن کا سبق

۲۰۱۴ء کے نتائج سامنے آچکے ہیں، آزاد ہندوستان کی تاریخ میں یہ الیکشن کئی جہتوں سے منفرد نوعیت کا حامل تھا، تشہیری ذرائع کا جتنا زیادہ اس الیکشن میں استعمال کیا گیا، گذشتہ ساٹھ سالہ دور میں اس کی مثال نہیں ملتی، ذرائع ابلاغ خاص کر الکٹرانک میڈیا نے جس طرح یک جٹ ہو کر ایک ہی پارٹی کے لئے مہم چلائی ایسا بھی عام طور پر نہیں ہوا کرتا تھا، پھر اسے سوئے اتفاق ہی کہیں گے کہ ''جھاڑو'' تو عام آدمی پارٹی کا نشان انتخاب تھا؛ لیکن جھاڑو پھیرنے کا کام بھارتیہ جنتا پارٹی نے کیا، اور ایسا بھی ہوا کہ بعض پارٹیاں تو اپنا کھاتہ بھی نہیں کھول سکیں اور ملک کی سب سے بڑی نیشنل پارٹی کا بھی اتنا برا حال ہوا کہ گویا وہ علاقائی پارٹی کی سطح پر آگئی ہو۔

اس بات سے شاید کسی صاحب انصاف کو اختلاف نہ ہو کہ اس غیر معمولی نتائج کے دو بنیادی اسباب ہوئے، ایک: کانگریس کی بے عملی، اس نے ۲۰۰۹ء میں جو وعدے کئے تھے، ان کی طرف سے بے توجہی، اقلیتوں کے ساتھ ناانصافی اور نابرابری، کرپشن کا بڑھتا ہوا گراف جو کئی لاکھ کروڑ تک پہنچ گیا، ریکارڈ توڑ مہنگائی، ان سب باتوں نے ملا جلا کر عوام کو کانگریس سے حد درجہ بے زار کر دیا تھا، اور ان کی یہ خفگی اور بے زاری بجا بھی تھی —— دوسرا سبب سنگھ پریوار کی طرف سے تشہیری ذرائع کا بے دریغ استعمال تھا، اس کے پیچھے دماغ آر ایس ایس کا کارفرما تھا، وہ اس بات کے لئے بے قرار تھی کہ ہندوتوا کو اقتدار کی کلید حوالہ کر دی جائے اور وہ اپنے بل بوتے پر اپنا کام کر سکے، اس کے لئے سرمایہ کاری کارپوریٹ سیکٹر نے فراہم کیا، جس کی مودی نے حد سے زیادہ رعایتیں گجرات میں دی تھیں، اور جن کو امید ہے کہ مودی اقتدار میں ان کو منہ مانگی مراعات دستیاب ہوں گی، اور ذرائع ابلاغ نے بیک وقت دو چیزیں فروخت کیں، ایک اپنی تشہیری صلاحیت اور دوسرے اپنا ضمیر، بے چارے عوام اب کس پر اعتبار کریں؟

لیکن بحیثیت مجموعی اس الیکشن میں سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہنچا ہے، ایک ایسی پارٹی برسر اقتدار آئی، جس نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عناد کو کبھی چھپانے کی کوشش نہیں کی؛ بلکہ

اس کو اپنے منشور کا حصہ بنایا، ملک میں مسلم ممبران پارلیمنٹ کی تعداد صرف ۲۴ باقی رہ گئی ہے، چند ہی ریاستوں سے پارلیمنٹ میں مسلم نمائندگی ہوسکی بیشتر ریاستوں سے ایک بھی مسلم ممبر کی نمائندگی نہیں ہوسکی، جو علاقائی اور قومی پارٹیاں کم سے کم زبان سے اپنے آپ کو سیکولر کہتی تھیں اور اپنے آپ کو مسلم دوست ظاہر کرتی تھیں، انہوں نے بھی شکست فاش کھائی، ایک خیال پنپ رہا تھا کہ تیسری سیاسی طاقت وجود میں آئے گی، جو کسی حد تک بی جے پی کی فرقہ پرستی اور کانگریس کی منافقت سے محفوظ رہے گی، یہ خواب بھی چکنا چور ہوگیا، اس لئے یہ کہنا غالباً بے جا نہ ہوگا کہ سیاسی نقصان مختلف پارٹیوں نے اٹھایا ہے، اور سیاسی طالع آزمائی میں اس کی نوبت آتی ہی رہتی ہے؛ لیکن قومی وملی حیثیت سے سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو ہوا۔

ان حالات میں ہمیں جائزہ لینا چاہئے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اور اس الیکشن سے ہمیں کیا سبق حاصل کرنا چاہئے؟؟

پہلی بات یہ ہے کہ اس بار مسلمان اتحاد و اجتماعیت کا ثبوت دینے میں بڑی حد تک ناکام رہے، جہاں مسلمان اپنے ووٹ سے کسی مسلمان نمائندہ کو منتخب کر سکتے تھے، وہاں کئی کئی مسلم امیدوار کھڑے ہوگئے، بالآخر ان میں سے کوئی بھی کامیاب نہیں ہوا اس سے صرف ایک آدھ حلقہ کا استثناء کیا جاسکتا ہے، جہاں عام مسلمانوں پر دباؤ کی وجہ سے بعض امیدوار بیٹھ گئے اور وہاں اس کا فائدہ بھی ہوا، اسی طرح بہت سے حلقے وہ تھے جہاں مسلم ووٹ کی حیثیت پاسنگ کی تھی، ان کی اجتماعیت سیکولر امیدوار کو کامیاب بنانے اور فرقہ پرستوں کو کامیابی سے دور رکھنے میں اہم کردار ادا کرسکتی تھی، وہاں بعض مسلمانوں کے کھڑے ہوجانے کی وجہ سے یا رائے دہی کے سلسلہ میں کوئی واضح اور متحدہ نقطہ نظر نہ ہونے کی وجہ سے مسلم ووٹ تقسیم ہوگیا، اور فرقہ پرست قوتوں کو اس کا فائدہ پہنچا، الیکشن سے پہلے کیرالہ کے ایک فرقہ پرست لیڈر نے کہا تھا کہ ہمیشہ ہندوؤں کے ووٹ بٹ جاتے ہیں اور مسلمان متحد ہوکر کسی پارٹی کو ووٹ دیتے ہیں، اس بار ایسا نہیں ہوگا، اس بار ہندو ووٹ متحد ہوگا اور ہم مسلم ووٹ کو بانٹنے اور بے اثر کرنے کی کوشش کریں گے، بظاہر یہ ایک جذباتی گفتگو محسوس ہوتی تھی؛ لیکن حالات نے ثابت کردیا ہے کہ مذکورہ لیڈر کا یہ بیان ایک گہرے منصوبہ اور منظم کوشش کا نتیجہ تھا۔

جس امت کو قدم قدم پر اجتماعیت کی تعلیم دی گئی ہے، اس کا ان پُرخطر حالات میں بھی

اجتماعیت سے محروم رہنا اور افتراق و پراگندگی کا شکار بنے رہنا بے حد افسوس ناک ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ''اللہ کی ڈوری کو اجتماعی طور پر مضبوطی سے تھام لو، انتشار اور بکھراؤ سے بچو، اور اپنے آپ پر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اللہ کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے۔ (آل عمران: ۱۰۳) ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ''زمین کے اندر جو کچھ ہے، اگر تم یہ سب کچھ خرچ کر دیتے تب بھی تم آپس میں دلوں کو جوڑ نہیں سکتے تھے؛ لیکن یہ اللہ کی ذات ہے جس نے ان کے دلوں کے درمیان باہم الفت پیدا کر دی یقیناً اللہ غالب اور حکمت والے ہیں''۔ (انفال: ٦٣)

یہاں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جس نعمت کا ذکر کیا گیا ہے، وہ واقعی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، برادرانِ وطن کے درمیان ذات پات کی بنیاد پر آپس میں دوریاں ہیں، ان کو دیکھ کر اس نعمت کی اہمیت معلوم ہوتی ہے؛ لیکن اجتماعیت اور الفت یوں ہی پیدا نہیں ہو جایا کرتی؛ بلکہ اس کے لئے ضرورت ہوتی ہے ایثار اور قربانی کی اور اس کے لئے یہ بات ناگزیر ہے کہ اپنے وقتی مفادات کے مقابلہ میں ملی مفادات کو غالب رکھنے کا جذبہ ہو، مہاجرین و انصار کے درمیان، مہاجرین کے مختلف قبائل اور انصار کے دو مشہور قبیلے- اوس اور خزرج - کے درمیان یوں ہی الفت پیدا نہیں ہوئی، اس کے لئے مختلف گروہوں نے ایک دوسرے کے حق میں ایثار سے کام لیا اور مادی مفادات سے اپنے آپ کو کنارے کیا، تب جا کر نفرت کی جگہ محبت اور دشمنی کی جگہ دوستی کا دور دورہ قائم ہوا، اور پھر انہوں نے ایک دوسرے کے حق میں ایسی قربانیاں دیں کہ سورج کی آنکھوں نے کبھی ایسا نظارہ نہیں دیکھا تھا۔

اتحاد میں دو باتیں عام طور پر رکاوٹ بنتی ہیں، ایک: مفاد پرستی اور خود غرضی، دوسرے: یہ جذبہ کہ دوسرا گروہ اپنے وجود کو ہمارے ساتھ ضم کر دے، وہ اپنے وجود کو کھو دے اور ہمارے وجود کا حصہ بن جائے، یعنی اتحاد کے بجائے انضمام، انضمام کا مطلب یہ ہے کہ جو گروہ غالب ہو، دوسرے گروہ اس میں جذب ہو جائیں، یہ بات ظاہر ہے کہ کسی بھی حلقے کے لئے قابل قبول نہیں، اگر اس نے آپ کو اس لائق سمجھا ہوتا تو اختلاف ہی کیوں پیدا ہوتا، اختلاف کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ آپ کے نقطۂ نظر کو سو فیصد قابل قبول نہیں سمجھتا ہے؛ لہٰذا جب اس بات کو منوانے پر اصرار کیا جائے گا تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ اختلاف بڑھتا جائے اور اجتماعیت کا کوئی امکان باقی نہ رہے، رسول

اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک مؤمن کی مثال دوسرے مؤمن کے لئے ایسی عمارت کی ہے، جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو مضبوط کرتا ہو: ''**المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضه بعضا**'' (**بخاری عن أبی موسی اشعری رضی اللہ عنه**: حدیث نمبر: ۲۰۲۶) اور حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''باہمی محبت، مؤدت اور ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک میں مسلمان کی مثال ایک جسم کی سی ہے کہ اگر ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم اس کی وجہ سے بے خوابی کا شکار ہو جاتا ہے'' (بخاری: حدیث نمبر ۱۱) اس حدیث میں اصلاً تو ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان کے ساتھ حسن سلوک کی طرف اشارہ ہے؛ لیکن اس کی تہہ میں یہ بات بھی چھپی ہوئی ہے کہ آپ ﷺ نے ہر مسلمان کو ایک عضو قرار دیا، اور ہم سب جانتے ہیں کہ اگر چہ کہ تمام اعضاء جسم کا حصہ ہوتے ہیں؛ لیکن ہر ایک کی اپنی مستقل حیثیت اور اپنی شناخت ہوتی ہے، پس اس طرح اس حدیث میں انضمام کی بجائے اتحاد واشتراک کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کی اور امت کے ہر گروہ کو دوسرے گروہ کی انفرادیت کو تسلیم کرتے ہوئے اجتماعیت کی تکمیل کرنی چاہئے، اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب مشترک مسائل میں اشتراک عمل کا راستہ اختیار کیا جائے۔ اس طرح کی کوشش اگر عین الیکشن کے وقت کی جائے تو شاید وہ بہت مفید ثابت نہ ہو، اس کام کو اگلے الیکشن کے لئے ابھی سے شروع ہونا چاہئے، اس کے لئے ایک بورڈ مرکزی سطح پر ہو اور پھر ہر ریاست میں اس کی شاخیں ہوں، اس میں تمام فرق ومسالک – سنی، شیعہ، بوہرا، حنفی، غیر مقلدین – اور مسلمانوں کی تمام تنظیمیں شامل ہوں، یہ متحدہ پلیٹ فارم خود براہ راست انتخابی سیاست میں حصہ نہ لے؛ لیکن پورے ملک میں ہر علاقہ کی مصلحت کو دیکھتے ہوئے تائید کا فیصلہ کرے۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ آج کے دور میں انتخابی معرکہ کی حیثیت بھی ایک جنگ سے کم نہیں، روایتی ہتھیاروں کی جنگ سے تو تشدد اور خونی انقلاب آتے ہیں، مگر انتخاب کے ذریعہ پُرامن انقلاب آتا ہے، جنگ کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ اپنی تدبیر کو مخالفین سے خفیہ رکھا جائے، رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ میں کثرت سے اس کی مثالیں ملتی ہیں، فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے اپنی تشریف آوری کو اس درجہ مخفی رکھا کہ جب تک آپ مکہ کی سرحد پر پہنچ نہیں گئے، کسی کو کوئی اطلاع نہیں ہوسکی، غور کیجئے کہ اِس بار خاص طور پر یہ بات دیکھنے میں آئی کہ جہاں بھی مسلمانوں نے فرقہ

پرست امیدوار کوشکست دینے کے لئے کسی سیکولر امیدوار کی تائید کا فیصلہ کیا، وہاں اس کا حوالہ دے کر فرقہ پرست ووٹ کو متحد کیا گیا؛ اسی لئے ہمیں ایسا نٹ ورک بنانا چاہئے کہ مسلمانوں کو صرف یہ پیغام دیا جائے کہ اس مشترکہ پلیٹ فارم سے جس کو ووٹ دینے کی اپیل کی جائے، مسلمان اسی کے حق میں اپنا ووٹ استعمال کریں اور پھر الیکشن سے ایک دن پہلے عام مسلمانوں کو ایس ایم ایس اور انفرادی ملاقات وغیرہ کے ذریعہ ہدایت دی جائے کہ وہ کس کے حق میں اپنا ووٹ استعمال کریں گے؟ علی الاعلان خاص کر مذہبی قائدین کا کسی پارٹی اور امیدوار کی تائید کرنا اس کو فائدہ کے بجائے نقصان پہنچاتا ہے؛ اسی لئے تیز وتند بیان دینے، سخت سست کہنے اور مذہبی قائدین کی طرف سے کسی خاص پارٹی یا متعین امیدوار کی کھلے عام تائید کرنے سے گریز کرنا چاہئے اور اپنے نقطۂ نظر کو چھپانا چاہئے۔

تیسری ضروری بات یہ ہے کہ ظالم کے مقابلہ کی ایک مؤثر صورت مظلوموں کو متحد کرنا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت میں اس کی دو بہت واضح مثالیں ملتی ہیں، ایک ''حلف الفضول''، جس کا قیام مکی زندگی میں ہوا، اور جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوری سرگرمی کے ساتھ شرکت کی، اور جس کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ حوصلہ افزائی فرماتے رہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر اب بھی مجھے اس کی طرف دعوت دی جائے تو میں اس پر لبیک کہوں گا: ''**لو دعيت إليه لأجبت**'' (**أخبار مكة في قديم الدهر و حديثه للفاكهي**: ۵/۱۹۱، ط: دار خضر، بیروت) اسی طرح مدنی زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے بعد سب سے پہلا عمل یہ کیا کہ مسلمانوں، یہودیوں اور اس وقت مدینہ میں بچے کھچے مشرکین، غرض کہ تمام قبائل کے درمیان ایک دفاعی معاہدہ کرایا کہ تمام قبائل اپنی شناخت کے ساتھ بقائے باہم کے اصول پر مدینہ میں رہیں، اور اگر کوئی دشمن حملہ آور ہو تو سب مل کر مدافعت کریں۔

ہندوستان کے موجودہ حالات میں ایک ایسے حلف الفضول کی ضرورت ہے جو مسلمانوں، سکھوں، بدھسٹوں، عیسائیوں اور دلتوں کو مشترکہ ایجنڈوں کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر لائے، اس میں مسلمانوں کو قائدانہ کردار ادا کرنا پڑے گا، آگے بڑھ کر دوسری قوتوں کو ساتھ لینا ہوگا اور خود ان ہی میں سے ایک کو دوسرے کے قریب ملانے میں مسلمانوں کو اہم کردار ادا کرنا ہوگا، جیسے اتر پردیش میں ملائم سنگھ اور مایاوتی کو، بہار میں نتیش کمار اور لالو پرشاد کو، مغربی بنگال میں ممتا بنرجی اور کانگریس کو، اسی

طرح مختلف دوسری ریاستوں میں بھی متحارب سیکولر پارٹیوں کو یکجا کرنا پڑے گا؛ تاکہ متحدہ طور پر فرقہ پرست طاقت کا مقابلہ کیا جاسکے۔

سیاسی حقوق کی بازیابی، اور پارلیمنٹ میں مسلمان اور مسلم دوست ارکان کے اضافہ کے لئے نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے؛ کیوں کہ اگر ہم ایوان سیاست سے باہر کردئے گئے تو ہمارے لئے نہ صرف اپنی معیشت، تعلیم اور جان و مال کا تحفظ دشوار ہوجائے گا؛ بلکہ ہم اپنی مسجدوں، خانقاہوں، دینی درسگاہوں اور دوسرے مذہبی اداروں کا تحفظ بھی دشوار ہوجائے گا، خدا کرے امت کے اصحاب فہم وبصیرت اور ارباب فکر ونظر اس صورت حال پر غور کریں اور ایسا قدم اٹھائیں جو جذبات پر نہیں گہرے غور وفکر اور جوجوش پر نہیں انتہائی ہوشمندی پر مبنی ہو۔

مشکل حالات میں مسلمانوں کیلئے تین نکاتی منصوبہ

ایک ماں باپ کو ہرگز یہ بات پسند نہیں ہوتی کہ اس کی اولاد میں سے ایک کا رویہ دوسرے کے ساتھ ظالمانہ اور جور و جفا پر مبنی ہو، اپنی تمام اولاد کے ساتھ شفقت ومحبت کا یہ فطری تقاضا ہے، جو ہر والدین کے اندر پایا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی اپنے بندے سے محبت ستر ماؤں سے بڑھ کر ہے، اسے یہ بات کیوں کر پسند آسکتی ہے کہ اس کا ایک بندہ دوسرے بندے کے ساتھ ظلم وزیادتی کا سلوک کرے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ کو کفر کے بعد ظلم سے بڑھ کر کوئی بات ناپسند نہیں، اس نے ظلم کرنے والے کے لئے محرومی کا اعلان کر دیا ہے ﴿وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (ھود: ۴۴) اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ ظلم کرنے والے بالآخر ناکامیوں سے دوچار ہوں گے ﴿اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (الانعام:۲۱)

یہ تو ہوتا ہے کہ چوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں مجرموں کے لئے ڈھیل اور مہلت کا طریقہ رکھا ہے؛ اس لئے جو لوگ ظلم وجور کو اپنا طریقہ بنا لیتے ہیں، انہیں ابتداء مہلت دی جاتی ہے؛ لیکن پھر جب ان کی پکڑ کی جاتی ہے تو وہ اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں پاتے؛ چنانچہ حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالم کو ڈھیل دیئے جاتے ہیں، پھر جب پکڑتے ہیں تو اس کو اس سے نجات نہیں دیتے "**إن الله يمهل للظالم، حتى إذا أخذه لم يفلته**" (بخاری، حدیث نمبر: ۴۶۸۶) اللہ تعالیٰ کی اس شان کا ظہور آخرت میں تو ہوگا ہی، اس دنیا میں بھی ہوتا رہتا ہے۔

ہندوستان کی ریاست گجرات کے چیف منسٹر نریندر مودی اس کی ایک واضح مثال ہیں، گجرات کا فساد وقتی دنگا اور دو فرقوں کے درمیان اچانک ٹوٹ پڑنے والا تشدد نہیں تھا؛ بلکہ مسلمانوں کے قتل عام کی ایک منظم سازش تھی، جس کے تحت کم وبیش دو ہزار بے قصور لوگ تہہ تیغ کر دیئے گئے، آگ کا دریا بہایا گیا، انسانوں کو جلانے کے لئے بھٹیاں سلگائی گئیں، ان بچوں کو بھی نہیں بخشا گیا، جو ماں کے پیٹ میں تھے، گھر لوٹے گئے، عزت وآبرو کا خون کیا گیا اور افسوس کہ یہ سب کچھ ان لوگوں کے ہاتھوں ہوا، جن پر امن وامان قائم رکھنے کی اور لوگوں کی حفاظت وسلامتی کی ذمہ داری تھی اور یہ

سب کچھ مودی جیسے ''موذی'' شخص کی قیادت میں انجام پایا، بہ ظاہر اس ظالم شخص کو اس کا فائدہ بھی ہوا، اور اس نے انسانی لاشوں پر چڑھ کر اپنے اقتدار کی مدت کو لمبی کرنے کے مقصد کو پالیا؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مظلوموں کی آہ اس شخص کا مسلسل پیچھا کر رہی ہے؛ چنانچہ وزیر اعلیٰ ہونے کے باوجود مغربی ملکوں نے بھی اس کو ویزا دینے سے انکار کر دیا، ہندوستان میں بی جے پی اس کی وجہ سے ''NDA'' مختلف جماعتوں کے لئے اچھوت بنتی جارہی ہے، نتیش کمار نے صرف اسی وجہ سے بی جے پی کے ساتھ اپنا اتحاد ختم کر دیا اور اب صورت حال یہ ہے کہ خود پارٹی کے اندر بھی چھوٹے سے لے کر بڑے لیڈر تک سب اس شخص کے خلاف صف آراء ہیں، اتنے بڑے سیاسی عہدے پر ہونے کے باوجود خود اپنے بہی خواہوں کی طرف سے یہ بے زاری اللہ کی پکڑ نہیں تو اور کیا ہے؟

اب اس کی طرف سے مسلمانوں کو رِیجھانے اور پھنسلانے کی کوشش ہو رہی ہے اور اپنی فرقہ وارانہ شبیہ کو لیپ پوت کر سیکولر بنانے کی سعی کی جارہی ہے؛ تاکہ وزارت عظمی کی کرسی تک پہنچا جا سکے، مودی کی اس کوشش پر بے ساختہ اردو کا یہ شعر زبان پر آتا ہے:

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

ہائے، اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

مگر یہ ایک ایسا خواب ہے جو انشاء اللہ کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا اور مظلوموں کی آہ کبھی اس سفر کو طے نہیں ہونے دے گی، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مظلوم کی بد دعاء سے بچو؛ اس لئے کہ یہ آسمان کی طرف چنگاریوں کی طرح بڑھتی ہے ''**فإنها تصعد إلى السماء كأنها شرار**'' (مستدرک حاکم: ۱/ ۳۶) ایک اور روایت میں ہے کہ مظلوم کی بد دعاء اور اللہ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی ''**فإنه ليس بينها و بين الله حجاب**'' (بخاری: ۱۴۶۲)

بحیثیت مسلمان ہمارا یہ فریضہ ہے کہ ہم ایک ایسے ظالم کے ظلم کو فراموش نہ کریں، جس نے آج تک اپنے گناہ پر معذرت نہیں کی اور نہ مظلوموں کے زخم پر مرہم رکھنے، ان کے آنسو پونچھنے اور ان کے ساتھ ہونے والی غیر معمولی زیادتی کی تلافی کرنے کی کوشش کی، اللہ تعالیٰ نے صرف ظلم سے بچنے ہی کا حکم نہیں دیا ہے؛ بلکہ اس بات سے بھی منع فرمایا ہے کہ ہم ظالموں کا ساتھ دیں اور ان کا تعاون کریں؛

اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دعا کرائی گئی کہ بار الہا! مجھے ظالموں کے ساتھ نہ رکھئے ﴿وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (الاعراف:۱۵۰) یہاں تک کہ مسلمان کو اس بات کی تعلیم دی گئی کہ اگر تمہارا کوئی بھائی ظلم کرے تو اس کو بھی ظلم سے روکنے اور اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کرنی چاہئے۔۔۔(بخاری عن انس، حدیث نمبر:۲۴۴۴)

اسلام کی نظر میں تو یہ رویہ بھی قابل قبول نہیں کہ آدمی ظالم سے اتنا خوف زدہ ہوجائے کہ اسے ظالم کہنے کی ہمت بھی نہ کرپائے، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب تم اس امت کو دیکھو کہ وہ ظالم کی ہیبت میں یہ کہنے کی ہمت بھی نہیں کرتی ہے کہ تو ظالم ہے تو پھر ایسے لوگوں سے دوری اختیار کرو''**إذا رأيتم أمتي تهاب الظالم أن تقول له إنك أنت ظالم فقد تودع منهم**''(مسند احمد:۲/۱۶۳)

اسی لئے موجودہ حالات میں جب کہ نہ صرف فرقہ پرست جماعتیں؛ بلکہ نام ونہاد سیکولر پارٹیاں بھی مسلمانوں کو پست ہمت اور کم حوصلہ بنانے اور ظلم وجور کے راستہ سے ان کی زبان کو بند کرنے پر تلی ہوئی ہیں، مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ ہونے والے ظلم وجور کو فراموش نہ کریں، اپنے سرمایۂ غم کو تازہ رکھیں اور ایک جمہوری نظام میں ایسی طاقتوں کو اقتدار سے دور رکھنے کی بھرپور کوشش کریں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اپنے مسلمان بھائی پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے ظالموں کے حوالہ کرتا ہے''**المسلم أخو المسلم لا يظلمه ولا يسلمه**''(بخاری عن ابن عمر رضی اللہ عنہ، حدیث نمبر:۲۴۴۲) ایسے ظالموں کے ظلم کو فراموش کردینے کی دعوت دینا مسلمانوں کو ظالموں کے حوالہ کردینے کے مترادف ہوگا۔

ان حالات میں ملتِ اسلامیہ کا فریضہ ہے کہ وہ سہ رخی کوشش کریں، اول یہ کہ ایسے فرقہ پرستوں کے مظالم کو نمایاں کریں اور ان کا ریکارڈ ساری دنیا کے سامنے رکھیں، اس سلسلہ میں یہودیوں کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ انہوں''ہولوکاسٹ'' کے واقعہ کو عالمی سطح پر ہمدردی حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا، اس مظلومیت کی آڑ میں وہ آج خود فلسطینیوں پر شب وروز ظلم وجور ڈھا رہے ہیں اور پھر بھی دنیا میں ظالم کے بجائے مظلوم ہی سمجھتے جاتے ہیں، ہندوستان میں نیلی (آسام)، بھاگلپور، مرادآباد اور گجرات وغیرہ میں مسلمانوں کے کتنے ہی مقتل سجائے گئے، لیکن وقتی طور پر ہر ایک کو چھوٹی سی خبر بننے

سے بڑھ کران واقعات کواہمیت حاصل نہ ہوسکی اور بہت جلد انہیں فراموش کر دیا گیا،اس آئینہ میں ان لوگوں کو بھی اپنا چہرہ دکھانا چاہئے جو اپنے آپ کو سیکولر اور مسلمان دوست کہتے ہیں،لیکن خود ان کے دامن بھی مظلوم مسلمانوں کے لہو سے تر بہ تر ہیں۔

دوسرے: مسلمانوں کو اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنا چاہئے اور مسلکی اور فروعی اختلافات سے اوپر اٹھ کر اپنے سیاسی وزن کو بڑھانا چاہئے، پوری دنیا میں اسلام مخالف طاقتیں مسلمانوں کو آپس میں تقسیم کرنا اور آپسی اختلاف کی بنیاد پر انہیں کمزور اور بے وزن کرنا چاہتی ہیں، ہندوستان میں بھی شدومد کے ساتھ ایسی کوششیں ہورہی ہیں، ان حالات میں کم سے کم مسلمانوں کو اپنے مشترکہ مسائل کے لئے ضرور اتحاد کو فروغ دینا چاہئے اور خاص کر ایک جمہوری نظام میں سیاسی قوت کی جو اہمیت ہے، اسے محسوس کرنا چاہئے، اگر ہم نے اس سے غفلت برتی اور ان لوگوں کو اقتدار کے بام ودر پر مسلط ہوجانے کا موقع مل گیا جو مسلمانوں کے تئیں مخالفانہ جذبات رکھتے ہیں تو نہ صرف ہمیں مادی نقصان پہنچے گا اور جان ومال کے سلسلہ میں عدم تحفظ سے دوچار ہونا پڑے گا؛ بلکہ ہمارے لئے اپنے مذہبی تشخص کو باقی رکھنا بھی مشکل ہوجائے گا، اسلام نے تو غیر مسلموں کے ساتھ بھی مشترکہ ایجنڈے پر مل جل کر کام کرنے کی ہدایت دی ہے، پھر کیا ہم مسلمانوں کے ساتھ کم سے کم اس اصول پر بھی اتحاد نہیں کر سکتے؟

تیسرے: مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ ایک ہی سوراخ سے بار بار ڈسا نہیں جائے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**لا یلدغ المؤمن من جحر واحد مرتین**'' (صحیح البخاري، باب: **لا یلدغ المؤمن من جحر مرتین**، حدیث نمبر: ۶۱۳۳) اس لئے منصوبہ بنانا اور حکمتِ عملی تیار کرنا چاہئے کہ آئندہ کے الیکشن میں مسلمانوں کا ووٹ تقسیم نہ ہو اور وہ خوشنما فریبوں سے دھوکہ نہ کھائیں کہ یہ دن کے خواب ہیں جو شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتے، یہ وقت ہے کہ وہ ملی قائدین جو عملی طور پر سیاست کے میدان میں ہیں یا بالواسطہ رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں، وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور دانشمندانہ فیصلے کریں؛ کیوں کہ جو قوم خود اپنی قسمت کو سنوارنا نہیں چاہتی، تقدیر بھی اس سے روٹھ جاتی ہے ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ﴾ (الرعد: ۱۱)

تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں!

(ظالم طاقتوں کے مقابلہ میں ثابت قدمی)

صحت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے؛ لیکن کوئی بھی انسان یا جاندار ہمیشہ صحت مند نہیں رہتا، وہ بیماری سے بھی دو چار ہوتا رہتا ہے، انسان کے جسم میں بیماریاں دو طریقے پر آتی ہیں، کبھی باہر سے امراض کا حملہ ہوتا ہے، خواہ یہ حملہ کسی شخص کی طرف سے ہو، کسی جانور کی طرف سے ہو، یا کسی مشینی تصادم کی شکل میں ہو، یا نہ نظر آنے والے جراثیم یلغار کر دیں، دوسری صورت یہ ہے کہ جسم کے اندر ہی بیماری کے اسباب پیدا ہو جائیں، یہ اندر سے جسم کو کھوکھلا کر دیتے ہیں اور جیسے گھُن دانوں کو کھا جاتا ہے، اسی طرح اندر چھپی ہوئی بیماری انسان کے وجود کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیتی ہے، اکثر اوقات پہلی بیماری سے بچنا آسان ہوتا ہے، انسان اپنے آپ کی حفاظت کا اہتمام کرتا ہے، قبل از وقت اس کے لئے تیاری کرتا ہے اور پورا جسم مل جل کر اس کے مقابلہ کے لئے مستعد ہو جاتا ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ ہاتھ ہو تو دشمن سے بچاؤ کرنے میں مشغول ہو اور پاؤں ساتھ دینے کے لئے تیار نہ ہو یا دماغ کو منصوبہ بندی کرنے سے انکار ہو۔

جیسے افراد صحت مند بھی ہوتے ہیں اور بیماری سے دو چار بھی، اسی طرح قومیں بھی صحت اور بیماری کے مرحلوں سے گزرتی رہتی ہیں، یہ بیماری باہر کے حملہ سے بھی پیدا ہوتی ہے اور اندرون کمزوری سے بھی، جب باہر سے کوئی دشمن ان پر حملہ کرتا ہے تو یہ بات ان کو متحد کر دیتی ہے اور وہ مل جل کر مقابلہ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں؛ کیوں کہ افراد کا اپنی قوم سے وہی تعلق ہوتا ہے جو قطروں کا اپنے موجوں سے ہوتا ہے:

فرد قائم ربط ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

جو قطرے سمندر سے کٹ جائیں، انہیں ہوا کا معمولی سا جھونکا فضا میں تحلیل کر دیتا ہے؛ لیکن اگر وہ سمندر کا حصہ ہوں تو ان کی طاقت بے پناہ ہوتی ہے، اسی طرح جو افراد قوم کے اجتماعی شیرازہ

سے کٹ جاتے ہیں، وہ اپنی اہمیت بھی کھودیتے ہیں اور اپنی شناخت بھی، بیرونی حملہ انتہائی بے ضمیر لوگوں کو چھوڑ کر پوری قوم کو حملہ آور دشمنوں کے مقابلہ میں متحد کر دیتا ہے؛ لیکن جب کوئی بیماری اندر پیدا ہوتی ہے اور دبے پاؤں کسی گروہ کے قومی وجود میں سرایت کرنے لگتی ہے تو نہ اس کے دفاع کی طرف توجہ ہوتی ہے، نہ اس کے مقابلہ کے لئے اتفاق واتحاد کی صورت بنتی ہے اور نہ اس کے بارے میں فکرمندی اور بےقراری پیدا ہوتی ہے، یہ بیماری کسی بھی قوم وملت کے اجتماعی وجود کے لئے بے حد نقصاندہ ہے، اسے کوئی بیرونی طاقت نقصان نہیں پہنچاتی؛ بلکہ وہ خود اپنے آپ کو نقصان پہنچاتی ہے، اسے کوئی دشمن مقتل کی طرف کھینچ کر نہیں لے جاتا؛ بلکہ وہ اپنے آپ خودکشی کرتی ہے، وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ کبھی نادانستہ اور کبھی دانستہ دوسروں کا آلۂ کار بن کر اسی ٹہنی کو کاٹنے کی کوشش کرتی ہے، جس پر اس کا نشیمن بنا ہوا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک ارشاد میں اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے، یہ حدیث موجودہ حالات کی ایسی تصویر ہے کہ گویا بیان کرنے والے کی نگاہوں کے سامنے آج کے حالات نقشِ دیوار کی طرح موجود تھے؛ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے:

”سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول لثوبان: كيف أنت يا ثوبان! إذا تداعت عليكم الأمم كتداعيكم على قصعة الطعام، تصيبون منه؟ قال ثوبان: بأبي وأمي يا رسول الله! أمن قلة منا؟ قال: لا، بل أنتم يومئذ كثير؛ ولكن يلقي في قلوبكم الوهن، قالوا: وما الوهن؟ يا رسول الله! قال: حبكم الدنيا وكراهيتكم القتال“۔ (مسند أحمد، حديث نمبر: ۸۷۱۳)

”میں نے رسول اللہ ﷺ کو حضرت ثوبان سے فرماتے ہوئے سنا: ثوبان! تمہارا کیا حال ہوگا جب قومیں تم پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جیسے کہ تم کھانے کے برتن پر کھانا لینے کے لئے ٹوٹ پڑتے ہو؟ حضرت ثوبان نے عرض کیا: اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، کیا یہ ہماری تعداد کے کم ہونے کی وجہ سے ہوگا؟ ارشاد فرمایا: نہیں؛ بلکہ اس وقت تمہاری تعداد بہت ہوگی؛ لیکن تمہارے دلوں میں ”وہن“ پیدا ہوجائے گا، صحابہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ”وہن“ کیا ہے؟ آپ ﷺ

نے فرمایا: تمہارے اندر دنیا کی محبت اور دشمن سے پنجہ آزمائی سے گریز کا پیدا ہو جانا''

اس وقت عالمی سطح پر بھی اور خود ہمارے ملک ہندوستان میں بھی مسلمان بالکل اسی صورت حال سے دوچار ہیں، عالمی سطح پر دیکھئے تو امریکہ، یورپین یونین، روس اور چین کے درمیان بہت سے اختلافات موجود ہیں، ان کے درمیان مفادات کا خاصا ٹکراؤ ہے، اکثر یہ اختلاف ظاہر نہیں ہوتا؛ لیکن کبھی کبھی منظر عام بھی آجاتا ہے؛ لیکن ایک نقطہ ایسا ہے جس پر تمام عالمی طاقتیں متفق ہیں، اور وہ ہے مسلمانوں کی جان و مال اور عزت وآبرو کو بے وقعت کرنا، اسلام کو بدنام کرنا اور اسلام پسند طاقتوں کو خود یا مسلم حکمرانوں کے ہاتھوں انتہائی غیر اخلاقی طریقہ پر کچل ڈالنا، اگر فلسطین، افغانستان اور عراق میں امریکہ نے ظلم و جور کا بازار گرم کر رکھا ہے تو شام اور عراق جیسے ممالک میں روس اور چین مسلمانوں کے خلاف شمشیر بے نیام بنے ہوئے ہیں، اور افریقی ممالک میں فرانس اور دوسری سابق استعماری طاقتیں اس ایجنڈے کو پورا کر رہی ہیں، غرض کہ مقتل بہت سے ہیں اور قاتل بھی الگ الگ ہیں؛ لیکن ہر مقتل کو بے قصور مسلمانوں ہی کے سروں سے سجایا جاتا ہے اور انہیں کے لہو سے اس کی خوش رنگی اور سرخروئی قائم ہے۔

اب ہندوستان کی صورتحال دیکھئے، قومی سطح پر دو سیاسی اتحاد موجود ہیں، ان کے علاوہ مختلف ریاستی پارٹیوں کی اہمیت بھی دن بدن بڑھتی جارہی ہے؛ لیکن مسلمانوں کے بارے میں ان کے حقیقی موقف میں کوئی زیادہ فرق نہیں، کچھ لوگوں کا بغض اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ چھپائے نہیں چھپتا ہے اور دل کی بات زبان پر آجاتی ہے، کچھ لوگ وہ ہیں جن کے دو چہرے ہیں، جہاں جس چہرے کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں اسے سامنے لے آتے ہیں، کبھی مسلمانوں کے تئیں اتنی ہمدردی کی بات کی جاتی ہے کہ گویا ان سے بڑھ کر مسلمانوں کا کوئی بہی خواہ نہ ہو اور کبھی مسلمانوں کے خلاف کھل کر اپنے موقف کا اظہار بھی کر دیا جاتا ہے، جو لوگ اپنے آپ کو سیکولر کہتے ہیں وہ دراصل سیاسی نفاق کی بہترین مثال ہیں، وہ اپنے اندرونی جذبات اور حقیقی عزائم کو خوشنما الفاظ، محبت آمیز مسکراہٹوں اور وقتی مفاد کے لئے پہنی جانے والی سیاسی ٹوپیوں اور رومالوں کے اندر چھپائے ہوئے ہیں؛ لیکن اسلام دشمنی اور مسلمانوں سے عداوت سے شاید کوئی گروہ بھی خالی نہ ہو؛ اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جیسے بھوکے لوگ کسی دسترخوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں، فرقہ پرستی کی بھوک میں بے قرار افراد اور جماعتیں مسلمانوں پر ٹوٹی پڑ رہی ہیں۔

مسلمانوں کی زبون حالی کا اصل سبب یہی دو باتیں ہیں، جن کی طرف آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا: ایک دنیا کی بڑھتی ہوئی حرص وطمع، مال ومتاع کی لالچ، عہدوں کی حرص، سیاسی مقام ومرتبہ کی طلب، دوسرے: پست ہمتی، کم حوصلگی، خوشامد، ظالموں کے سامنے ہتھیار ڈال دینا اور ان سے پنجہ آزمائی کرنے سے کترانا اور گھبرانا، ابھی گزشتہ دنوں کیرالہ کے مشہور مسلم دشمن سیاسی قائد – جو اپنے اصل گھر بی جے پی میں پہنچ چکے ہیں – یعنی سُبرامنیم سوامی، انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں پوری صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ ہم مسلمانوں کے ووٹ کو زیادہ سے زیادہ باٹنا اور ہندوؤں کے ووٹ کو متحد کرنا چاہتے ہیں، انھوں نے یہ بھی کہا کہ ساٹھ فیصد مسلمان ہمارے ساتھ ہیں؛ کیوں کہ شیعہ اور بریلوی دونوں کی ہمیں تائید حاصل ہے اور تیسرا نام انھوں نے (احمدیوں) قادیانیوں کا لیا، قادیانی تو دائرہ ایمان سے باہر ہیں اور وہ قطعاً مسلمان نہیں ہیں؛ اس لئے ان کے بارے میں تو ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے، ان کا اسلام دشمن لوگوں کی تائید کرنا، ان کی فکر کے حسب حال اور ان کی سابقہ تاریخ کے عین مطابق ہے؛ کیوں کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے خاندان نے ۱۸۵۷ء میں اور اس کے بعد بھی ہمیشہ اہل وطن کے مقابلہ انگریزوں کی مدد کی اور ان کا نوالۂ تر کھاتے رہے؛ لیکن مجھے یقین ہے کہ بریلوی اور شیعہ بھائیوں کے بارے میں سوامی جی کا تصور غلط فہمی پر مبنی ہے، یا یہ ان کی غلط بیانی ہے، ہوسکتا ہے کہ کچھ افراد دشمن کے آلۂ کار بن جائیں؛ لیکن ایک پورے گروہ کے بارے میں ایسی بات کہنا خلافِ واقعہ ہے اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کی ایک سازش ہے۔

لیکن اُس وقت کلیجہ خون ہوتا ہے، جب ذرائع ابلاغ میں یہ بات دکھائی جاتی ہے کہ کچھ جبہ پوش ٹوپی پہنے اور عمامہ باندھے ہوئے لوگ نریندر مودی جیسے قاتل کی بارگاہ میں پہنچ کر اپنی تائید وحمایت کی دہائی دیتے ہیں، کچھ برقعہ پوش یا اسکارف باندھی ہوئی خواتین اس انسانیت دشمن شخص کے جلسوں میں دکھائی جاتی ہیں، یا یہ بات کہی جاتی ہے کہ یہ خواتین مودی کے حق میں دعائیں کررہی ہیں، ایک ایسا شخص جس نے اقتدار کے زینہ پر چڑھنے کے لئے بےقصور اور نہتے مسلمانوں کا قتل عام کیا، جس نے عورتوں کو بےآبرو کرایا، جس کی بربریت نے رحمِ مادر میں پلنے والے بچوں کو بھی نہیں بخشا، پھر اپنے اس جرم پر نہ اسے حیا آئی اور نہ اس نے برائے نام ہی سہی پشیمانی کا اظہار کیا، کیا کسی مسلمان کیلئے یہ بات روا ہوسکتی ہے کہ ایسے شخص کے سامنے اپنی پیشانی جھکا دے اور گویا اس کے ظلم وجور کو سند قبول عطا کردے؟

اس کا ایک سبب دنیا کی محبت ہے، جو مختلف انداز سے ظاہر ہوتی ہے، کبھی اس طرح کہ اس کو تجارت وصنعت کا لائسنس مل جائے، کبھی اس طرح کہ اس کو کوئی سرکاری عہدہ حاصل ہوجائے، کبھی اس لئے کہ سیاست کے آسمان پر اس کی تقدیر کا ستارہ بھی چمکنے لگے، کبھی اس طور پر کہ اسے تعلیمی، معاشی یا رفاہی اداروں کے قیام کی اجازت حاصل ہوجائے، اور کبھی اس طرح پر کہ اس کے مقدمہ کی فائل بند کردی جائے، غرض کہ طلبِ دنیا کی الگ الگ شکلیں ہوسکتی ہیں؛ لیکن ان سب میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ ایک مسلمان کی دینی غیرت، ملی حمیت، انصاف کی طرفداری، اخلاقی اقدار کی پاسداری اور عقل ومصلحت پر رعایت دنیا کی طلب کا جذبہ حاوی ہوجائے اور اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو جو زندہ ضمیری عطا کی ہے، وہ شخص اسے موت کی نیند سلا دے۔

دوسرا سبب وہی ہے کہ یا تو انسان اپنے مفادات کی وجہ سے قصداً ظلم وجور کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا چھوڑ دے یا ہمت ہار جائے اور جرأت وبہادری کی بجائے بزدلی اور خوشامد کو اپنا طریقہ بنالے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف یہی حکم نہیں دیا کہ انسان اپنے دامن کو ظلم سے بچائے رکھے؛ بلکہ اس بات کو بھی مسلمانوں کا فریضہ ٹھہرایا کہ وہ ظالم کو ظلم سے روکیں اور ستم گروں کے ہاتھ تھام لیں، وہ اپنی صلاحیت اور طاقت کے مطابق ظلم کرنے والوں کا مقابلہ کریں، مقابلہ صرف لاٹھی اور تلوار اور بندوق وبارود ہی سے نہیں ہوتا؛ بلکہ ہر اس طاقت سے ہوتا ہے جو دشمن کو ظلم سے روکنے میں مؤثر کردار ادا کرسکتا ہے، جمہوری ملکوں میں ووٹ بھی بہت بڑی طاقت ہے، اسی کے ذریعہ انسان تختِ اقتدار پر چڑھتا بھی ہے اور سیاسی اعتبار سے تختۂ دار پر چڑھایا بھی جاتا ہے، ایک مسلمان کے لئے اس سے زیادہ کوئی بات عزت کی نہیں ہوسکتی کہ وہ متاعِ دنیا کے معمولی مفادات کے لئے رات کی تاریکی کو دن کی روشنی کہنے لگے۔

مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ ان کے خلاف عالمی سطح پر جو منصوبہ بندی کی جارہی ہے اور شاید یہ غلط نہ ہو کہ ہندوستان بھی تیزی سے اس منصوبہ کا سرگرم پارٹنر بنتا جارہا ہے، وہ اس صورتحال کو سمجھیں اور کسی بھی قیمت پر فرقہ پرست اور فاشسٹ طاقتوں کے سامنے سر نہ جھکائیں کہ یہ ملک کے ساتھ بھی بے وفائی ہوگی اور قوم وملت کے ساتھ بھی غداری۔

ہر ہندوستانی کے ہندو ہونے کا مسئلہ

تبصرہ جب کسی پر کیا کیجئے - آئینہ سامنے رکھ لیا کیجئے

رسول اللہ ﷺ کے نبی بنائے جانے کے بعد دین حق کے اس چراغ کو بجھانے کے لئے اہل مکہ نے تمام تدبیریں کرلیں ؛ لیکن انھوں نے محسوس کرلیا کہ پھونکوں سے اس چراغ کو بجھایا نہیں جاسکتا ، اسلام کی خوشبو مسلسل پھیل رہی تھی اور لوگوں کو اپنی محبت کا اسیر بنا رہی تھی اور جو لوگ ایک دفعہ دامن اسلام میں آجاتے پھر ہزار مصائب کے باوجود ان کے قدم میں کوئی تزلزل نہیں آتا تھا ، یہ ایسا نشہ نہیں تھا ، جو چڑھ کر اُتر جائے ، اس لئے مشرکین مکہ نے صلح کا کوئی راستہ اختیار کرنا چاہا اور اس سلسلہ میں پیغمبر اسلام ﷺ کے سامنے دو فارمولے پیش کئے ، ایک فارمولہ یہ تھا کہ ہم سب لوگ ، جس میں آپ ﷺ بھی شامل ہوں ، ہمارے دیویوں اور دیوتاؤں کی پوجا کریں اور ایک دن یا ایک سال سب کے سب آپ کے خدا کی پوجا کرلیا کریں ، دوسری صورت یہ ہے کہ روزانہ ہم دونوں مل کر آپ کے معبود کی بھی عبادت کریں اور ہمارے معبودوں کی بھی ، اس طرح مسلمانوں کے معبود کی پوجا بھی ہو جائے اور ہمارے دیویوں اور دیوتاؤں کی بھی ۔

رسول اللہ ﷺ نے از راہ مصلحت فوراً ان کی بات کا جواب نہیں دیا اور فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کرتا ہوں ، اسی موقع پر سورۂ کافرون نازل ہوئی ، قرآن نے جو جواب دیا ، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ توحید اور شرک ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے ، اس لئے یہ تو ممکن نہیں کہ مسلمان تمہارے دیویوں اور دیوتاؤں کی پوجا کریں ، جن کو وہ عبادت کے لائق سمجھتے ہی نہیں ہیں ، قرآن مجید نے اس کے مقابلہ میں صلح کی ایک اور شکل پیش کی اور وہ یہ کہ ہر آدمی کو اپنے مذہب پر قائم رہنے اور اپنے عقیدہ اور دین کے مطابق عمل کرنے کا اختیار ہو اور وہ ایک دوسرے کے عمل میں رکاوٹ نہ بنیں ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ (الکافرون : ٦)

اسی فارمولہ کو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں اختیار فرمایا ، جہاں غالب تعداد مسلمانوں کی تھی ، یہودیوں کے بھی تین بڑے خاندان تھے اور اِکّا دُکّا مشرکین بھی تھے ، آپ ﷺ نے ہجرت کے فوراً

بعد ایک ایسا معاہدہ کرایا اور اس پر تمام قبائل کے سرداروں سے دستخط کرایا، جس میں اس بات کی ضمانت دی گئی تھی کہ تمام لوگ بقاء باہم کے اُصول پر زندگی گزاریں گے، ہر گروہ کو اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی ہوگی اور اگر باہر سے کوئی دشمن حملہ آور ہو تو سب مل کر مدینہ کا دفاع کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسا سماج جس میں مختلف مذہب، مختلف تہذیب وثقافت، مختلف رنگ و نسل اور مختلف زبان سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود ہوں، وہاں اس سے بہتر اور قابل عمل کوئی اور فارمولہ نہیں ہوسکتا، اسی لئے ہمارے ملک ہندوستان کے معماروں نے آزادی کے وقت قریب قریب ان ہی اُصولوں پر اس ملک کا دستور مرتب کیا اور ہندوستان کو ایک ایسا گلدستہ بنادیا، جس میں ہر رنگ و بو کے پھول موجود ہیں، یہ رنگارنگی ہی اس کا اصل حسن ہے، اسی سے اس کی پوری دنیا میں پہچان ہے، اسی بنیاد پر اس کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت قرار دیا جاتا ہے، اس کے دستور کی رُوح یہ ہے کہ اس میں اکثریت اور اقلیت کے تمام گروہوں کے وجود کو تسلیم کیا جائے، انھیں مذہبی اور تہذیبی آزادی حاصل ہو، نہ ان پر کسی مذہب کو مسلط کیا جائے، نہ تہذیب کو اور نہ زبان کو۔

یہ نہ صرف آزاد ہندوستان کے لئے مقرر کی ہوئی وہ راہ ہے، جس پر ہمارے ملک کو گامزن کیا گیا؛ بلکہ صدیوں سے ہندوستان کی یہی روایت رہی ہے، غور کیا جائے کہ مسلمانوں نے اس ملک پر آٹھ سو سال سے ایک ہزار سال تک حکومت کی ہے اور ظاہر ہے اس دور میں پوری دنیا میں شاہی حکومت کا نظام تھا، جس میں اقتدار کی کنجی ایک شخص اور ایک خاندان کے ہاتھ میں ہوتی تھی، یہی نظام یورپ سے لے کر ایشیاء تک ہر جگہ تھا، اگر مسلمان اس ملک پر ایک تہذیب اور ایک زبان کو نافذ کرنا چاہتے تو ان کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں تھی اور اقتدار کی یہ مدت اتنی طویل ہے کہ وہ آہستہ آہستہ اس کے خلاف اُٹھنے والی ہر آواز کو دبا کر رکھ دیتے، اس ملک میں مسلمانوں کے سوا کسی اور مذہبی گروہ کا وجود باقی نہیں رہتا اور مسلمانوں کے مذہبی آثار کے علاوہ دوسری مذہبی اکائیوں کے مذہبی آثار مٹ چکے ہوتے؛ لیکن مسلمانوں نے ہمیشہ اپنے پیغمبر ﷺ کا اُسوہ اختیار کیا، انھوں نے ملک میں بسنے والے تمام مذہبی گروہوں کو اپنے اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی دی، ان کے لئے مناسب سہولتیں فراہم کیں، حکومت اور فوج میں اعلیٰ عہدے دیئے، ان کے مذہبی مقامات کی نہ صرف حفاظت کی؛ بلکہ ان کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں؛ تاکہ ان عمارتوں کی اصلاح ومرمت اور ان میں انجام دی جانے والی

مذہبی رسوم کی ادائیگی میں سہولت ہو، اسی طرح ان پر کوئی زبان تھوپی نہیں گئی ؛ بلکہ ان کی زبانوں کو بھی فروغ دیا گیا، فارسی اور عربی کو زبردستی نافذ نہیں کیا گیا، دیوناگری رسم الخط کو باقی رکھا گیا اور اسی لئے اُردو کی شکل میں ایک ملی جلی زبان وجود میں آئی، کسی کی تہذیب وثقافت کو مٹانے کی کوشش نہیں کی گئی، یہی وجہ ہے کہ آج بھی یہ ملک مختلف تہذیبوں اور زبانوں کا گہوارہ ہے۔

مگر افسوس کہ انگریزوں کی شہ پر ہندوستان میں ایک قوم دشمن تحریک 'راشٹریہ سیوک سنگھ' نے جنم لیا، جس کا بنیادی ایجنڈا اکثریت اور اقلیت کے درمیان نفرت کی بیج بونا اور ہندوستانیوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر کے انگریزوں کو فائدہ پہنچانا تھا، آزادی کے فوراً بعد اسی گروہ کے ایک شخص کی طرف سے بابائے قوم مہاتما گاندھی کا قتل ہوا، مگر پھر بھی اس کی نفرت انگیز مہم کو روکنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی، مسلمان اور عیسائی اس مہم کا خاص نشانہ بنتے رہے اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے اس نے بھارتیہ جنتا پارٹی، بجرنگ دل، وشو ہندو پریشد اور اس طرح کی کئی تنظیموں کو جنم دیا، جو اس وقت اقتدار کے بام ودر پر قابض ہیں، نفرت پھیلانے کی اسی مہم کا ایک حصہ یہ ہے کہ ابھی کچھ عرصہ پہلے آر ایس ایس کے سربراہ موہن بھاگوت نے ایک ''اوڑیا ہفتہ وار'' کی گولڈن جوبلی تقریر سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہندوستان میں بسنے والے تمام افراد کو ''ہندو'' کہنا چاہئے، جیسے انگلینڈ میں بسنے والے کو انگریز اور جرمنی میں بسنے والے کو جرمن کہا جاتا ہے، ان کے اس بیان نے بجا طور پر محب وطن ہندوستانیوں کو تشویش میں مبتلا کر دیا ہے اور اس پر بحث چھڑ گئی ہے۔

موہن بھاگوت کا یہ خیال کئی پہلوؤں سے قابل غور ہے، اول یہ کہ اس ملک کا نام ہندو ہے، یا بھارت یا ہندوستان ؟ —— آئین کے اعتبار سے اس ملک کو ''بھارت'' کا نام دیا گیا ہے، اس اعتبار سے ملک کے باشندوں کو 'بھارتی' کہنے کا جواز ہوسکتا ہے؛ لیکن ان کو ہندو کیوں کر کہا جا سکتا ہے؟ مسلمانوں نے اس ملک کو ہندوستان کا نام دیا تھا؛ کیوں کہ جب مسلمان یہاں آئے تو یہ پورا خطہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر مشتمل تھا، مسلمانوں نے اس خطہ کو ایک وسیع ملک کی شکل دی؛ چوں کہ ملک کے اکثر لوگ اپنے آپ کو ہندو کہتے تھے، اس لئے انھوں نے اس ملک کو ہندوستان کا نام دیا، یہ ان کی انصاف پروری اور رواداری کی بات تھی کہ انھوں نے اس کو مختلف شاہی خاندانوں یا ان کے اپنے مذہب سے موسوم کرنے کے بجائے یہاں کے مقامی لوگوں کی رعایت ملحوظ رکھی، اگر ہندوستان کے لوگوں کو اس

نسبت سے پکارا جائے تو وہ ''ہندوستانی'' کہلائیں گے نہ کہ ہندو، انگلینڈ زمانۂ قدیم میں ایک نسل کے لوگوں کا ملک تھا، جرمنی میں بھی ایک نسل کے لوگ بستے تھے، اس لئے ان کی نسبت کا لحاظ کرتے ہوئے انھیں انگریز اور جرمن کہا گیا؛ لیکن ہندوستان کی نوعیت اس سے مختلف ہے، یہاں مختلف رنگ ونسل کے لوگ بستے ہیں، اس لئے ان کو ایسے ہی نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے، جس کی نسبت مقام کی طرف ہو نہ کہ مذہب یا رنگ ونسل کی طرف۔

دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ ہندو کا لفظ معنوی اعتبار سے کیا قابل احترام لفظ ہے؟—— اب تک اس سلسلہ میں کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی گئی، جو باتیں کہی جاتی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ہندو کے معنی اصل میں غلام کے ہیں، آرین جب اس ملک میں آئے تو انھوں نے یہاں کے لوگوں کو غلام بنالیا اور بطور تحقیر کے ان کا نام ہندو رکھا، ایک خیال یہ بھی ہے کہ ہند کے معنی فارسی زبان میں ''تِل'' کے ہیں جو سیاہ ہوتا ہے، اسی طرح ''ہندوئے چرخ'' اس سیارہ کو کہتے ہیں جو سیاہ رنگ کا ہے، آرین ایران کی طرف سے آئے، ان کا رنگ کھلا ہوا اور گورا تھا، اور اس خطہ کے مقامی لوگ کالے رنگ کے تھے، اس لئے انھوں نے یہاں کے مقامی باشندوں کو ''ہندو'' کا نام دے دیا، غرض کہ یہ آریہ لوگوں کا دیا ہوا نام ہے اور اس میں تعظیم واحترام کے بجائے تحقیر واہانت کا پہلو ہے اور عام طور پر جب کوئی نام معروف ہوجاتا ہے تو اس کے اصل پس منظر سے توجہ ہٹ جاتی ہے اور لوگ اس کو قبول کر لیتے ہیں، غور کیا جائے کہ اس لحاظ سے کیا ہندو ایک ایسا لفظ ہے جس سے کسی قوم کو یا کسی ملک کے باشندوں کو موسوم کیا جائے؟

تیسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ 'دستور ہند' ہندوستانی عدلیہ اور لوگوں کے موجودہ عرف میں ہندو کا لفظ نہ کسی نسل کی نمائندگی کرتا ہے نہ علاقہ کی اور نہ مذہب کی، یقیناً یہ ایک حقیقت ہے کہ مذہبی کتابوں میں مذہب کی حیثیت سے ہندو کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے؛ بلکہ ہندوستان کے قدیم دھرم کو ''ویدک دھرم'' کہا جاتا تھا، یعنی ایسا مذہب جس کی بنیاد ویدوں کی تعلیمات پر ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اصل میں ویدک دھرم کی بنیاد عقیدہ توحید پر تھی، کاش! ہمارے برادرانِ وطن انسان کی ملائی ہوئی خاکستر میں دبی ہوئی اس حقیقت کو سمجھ لیں، میں اس سلسلہ پر ویدوں کے بعض اقتباسات پیش کرتا ہوں جن کو پنڈت دیانند جی سرسوتی نے اپنی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' میں نقل کئے ہیں:

☆ وہ (خدا) محیط، پاک اور جسم سے خالی ہے۔ (یجر وید: ۴۰:۸)

☆ میں (خدا) افضل ترین قوت ونعمت کا منبع ہوں، سورج کی طرح تمام عالم کو منور کرتا ہوں، نہ میں کبھی مغلوب ہوتا ہوں، اور نہ مرتا ہوں، یہ تمام عالم جو نعمتوں کا مخزن ہے، اس کا خالق میں ہوں، تم مجھے ہی اس دنیا کا خالق اور مبدا سمجھو، اے اہل علم! تم نعمت وحشمت کے حصول کے لئے کوشاں رہ کر علم وغیرہ نعمتوں کے لئے مجھ سے ہی التجا کرو، میری رفاقت سے کبھی رُوگرداں نہ ہو۔ (رگ وید: ۵:۴۸:۱۰)

رگ وید ہی کے یہ ارشادات کس قدر بصیرت مندانہ اور عقیدۂ توحید کے بارے میں واضح ہیں:

اے بنی نوعِ انسان! میری حقیقی حمد وثنا، راست گوئی ہے، ایسی حمد کرنے والے انسان کو میں ازلی علوم وغیرہ نعمتیں عطا کرتا ہوں ...... اس لئے عالم میں جو اشیاء موجود ہیں، ان کا خالق اور قیوم میں ہوں، اس لئے تم مجھے چھوڑ کر کسی اور کی عبادت مت کرو اور نہ کسی کو میری جگہ معبود مانو اور جانو۔ (اتھر وید: ۱۰:۴۹:۱۰)

پنڈت سرسوتی جی نے کینونبشد (۶:۱) کے حوالہ سے اللہ تعالیٰ کی صفات کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

جسے آنکھ سے نہیں دیکھا جاسکتا؛ بلکہ آنکھ جس کی قدرت سے دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، اسے ہی تم خدا سمجھو، آنکھ سے دکھلائی جانے والی جن چیزوں کی لوگ عبادت کرتے ہیں، وہ خدا نہیں ہیں۔

دوسرے اہل مذاہب کی طرح ویدک دھرم پر یقین رکھنے والے بھی غالباً آہستہ آہستہ مذہب کی حقیقی تعلیمات سے دور ہوتے چلے گئے اور برہمن جو اصل میں آرین ہیں، انھوں نے ذہانت اور چالاکی کے ساتھ مذہبی پیشوائی کا مقام حاصل کرلیا، اصل مذہبی کتابوں سے لوگوں کو دور رکھا اور بت پرستی کو رواج دیا، برہمنوں کے لئے شرک وبت پرستی کو فروغ دینا اس لئے ضروری تھا کہ وہ ہندوستان میں جس طبقاتی نظام کو رواج دینا چاہتے تھے، انسان اور انسان کے درمیان تفریق کی دیوار اُٹھانا چاہتے تھے، اور برہمنوں کی عظمت اور شودروں کی تحقیر کو عقیدہ کا حصہ بنانا چاہتے تھے، وہ اس کے بغیر ممکن نہ تھی؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی توحید ایک ایسا عقیدہ ہے کہ اس کو قبول کرنے کے ساتھ ہی انسانی

وحدت کا تصور اُبھرتا ہے؛ کیوں کہ جب سب کے سب خدا کی مخلوق ہیں تو پیدائشی طور پر کوئی بڑا اور کوئی چھوٹا کیسے ہوسکتا ہے؟ ویدک دھرم کے نام پر اس دھرم سے بغاوت کرنے والا یہ نیا مذہب ''ہندو مذہب'' کہلایا، ویدیں تو پس پشت ڈال دی گئیں اور ان کی جگہ رامائن، گیتا اور منوسمرتی نے لے لی، جو شمالی ہند پر آریوں کے تسلط قائم ہوجانے کے بعد کی کتابیں ہیں اور جن کے بارے میں بہت سے ہندو محققین کا بھی خیال ہے کہ یہ دراصل تمثیلی کہانیاں ہیں، جن کے ذریعہ اخلاقی تعلیم دینے اور قومی جذبات کو اُبھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بہر حال اس طرح ہندو کا لفظ ایک خاص مذہب کی نمائندگی کرنے لگا اور اب وہ اسی اعتبار سے معروف ہے، ہندو اور ہندو مذہب کی کوئی جامع تعریف آج تک نہیں ہوسکی، اگرچہ کہ ہندوستان کے دوسرے صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن اور مختلف ہندو فلسفیوں نے اس کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی ہے؛ لیکن انھیں اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکی، بعض مصنفین نے ان تمام رسوم، عبادات، عقائد اور روایات کو ہندو مذہب قرار دیا ہے، جن کو برہمنوں کی تصدیق حاصل ہے، بعضوں کی رائے ہے کہ جو اسلام جین مت، بودھ مت، عیسائیت، یہودیت، پارسی مذہب یا دنیا کے کسی اور مذہب سے تعلق نہیں رکھتا ہے، وہ ہندو ہے، (الجہاد فی الاسلام: ۳۳۱)—— اسی لئے ڈاکٹر رادھا کرشنن کا خیال ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو ہندو کہے، وہ ہندو ہے، اور ظاہر ہے کہ ہندوستان میں ایک خاص گروہ ہی اپنے آپ کو ہندو کہتا ہے، اگرچہ ان کے درمیان عقیدہ و عمل کا اچھا خاصا اختلاف ہے؛ لیکن کچھ مشرکانہ رسوم و رواجات میں ان سب کے درمیان عملی طور پر اشتراک پایا جاتا ہے اور اس کی پہچان علاقہ، زبان، نسل یا ثقافت سے نہیں ہے؛ بلکہ مذہب سے ہے، پس حقیقت یہی ہے کہ ہندو کا لفظ اب ایک خاص مذہب کے ماننے والوں کی نمائندگی کرتا ہے؛ اس لئے ہندوستان کے تمام باشندگان کو ہندو کہا جانا دستور کے مغائر، دوسری مذہبی اکائیوں کے جذبات کو مجروح کرنے والی اور اس ملک کی تکثیریت کو تسلیم کرنے کے منافی ہے۔

فرقہ پرست طاقتوں کو سوچنا چاہئے کہ مسلمان یہ کہہ سکتے تھے کہ ہندوستان کے تمام لوگوں کو ''مسلم'' کہا جائے؛ کیوں کہ مسلم کے معنی خدا کے فرمانبردار اور اس کے سامنے سر جھکا دینے والے کے ہیں، ہر مذہب کی بنیادی تعلیم یہی ہے کہ انسان اپنے خالق و مالک کے سامنے سر تسلیم خم کردے اور یہ

بھی ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کی غالب ترین اکثریت مذہب سے تعلق رکھتی رہی ہے اور خدا پر اس کا یقین رہا ہے، خود ان کے دعویٰ کے لحاظ سے اگر ان کو ''مسلم'' کا نام دیا جاتا تو شاید خلاف واقع نہیں ہوتا؛ اگرچہ کہ وہ حقیقی اعتبار سے مسلمان نہیں ہیں، مگر یہ نام آہستہ آہستہ دوسری قوموں کو مسلمانوں کے ملی وجود میں جذب کر لیتا؛ لیکن مسلم حکمرانوں نے کبھی اس طرح کی کوشش نہیں کی اور اپنی پہچان دوسروں پر مسلط نہیں کی۔

آر ایس ایس چاہتی ہے کہ ہندوستان کی تمام قوموں کو ہندو مذہب اور ہندو تہذیب میں جذب کر لے اور برہمن بڑی ہوشیاری کے ساتھ یہ کرتے رہے ہیں، اس کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ''ہندوتوا'' ہندوستانی تہذیب ہے اور تمام ہندوستانیوں کو اسے قبول کر لینا چاہئے؛ لیکن موہن بھاگوت جی کو اس تہذیب کے خد و خال منوسمرتی میں دیکھنا چاہئے، جس کو موجودہ ہندو مذہب میں ''ہندو شریعت'' کا درجہ حاصل ہے، اس سلسلہ میں منوسمرتی کی چند اُن تعلیمات کا پیش کرنا مناسب ہوگا، جو انسانوں کے درمیان تفریق پر مبنی ہیں:

☆ برہما نے اپنے منھ سے برہمن کو، ہاتھ سے کشتری کو، ران سے ویش کو اور پاؤں سے شودر کو پیدا کیا۔

☆ برہمن کے نام کا پہلا حصہ تقدس کو ظاہر کرنے والا ہو، کشتری کا طاقت کو، ویش کا دولت کو اور شودر کا ذلت کو۔ (۲:۳۱)

☆ ہاتھی گھوڑے، شودر، قابل نفرت ملیچھ لوگ، شیر تیندوے اور سور (تناسخ کے) وہ ادنیٰ مدارج ہیں جو تاریکی سے حاصل ہوتے ہیں۔ (۱۲:۴۳)

☆ شودر کی لڑکی کو اپنے پلنگ پر بٹھانے سے برہمن نرک (دوزخ) میں جاتا ہے۔ (۳:۱۷)

☆ جو کوئی شودر کو دھرم کی تعلیم دے گا اور جو اسے مذہبی مراسم ادا کرنا سکھائے گا، وہ اس شودر کے ساتھ ہی ''اسم ورت'' نامی جہنم میں جائے گا۔ (۴:۸۱)

☆ وہ (اونچی ذات والا) شودر کا کھانا نہ کھائے۔ (۴:۲۱۱)

☆ اگر برہمن بھولے سے شودر کا کھانا کھالے تو تین دن تک روزہ رکھے اور اگر عمداً

کھالے تو اس کا وہی کفارہ ادا کرنا چاہئے جو حیض، پائخانہ یا پیشاب پینے اور کھانے والے کے لئے مقرر ہے۔(۳۲۲:۴)

☆ جس شخص نے چنڈال (دلت) کو چھولیا ہو، وہ صرف نہانے ہی سے پاک ہوسکتا ہے۔(۸۵:۵)

☆ اگر کوئی برہمن شودر کا جھوٹا پانی پی لے تو اسے تین دن، رات تک گھاس کے اُبلے ہوئے پانی کے سوا کچھ نہ پینا چاہئے۔(۴۹:۱۱)

☆ اگر کوئی برہمن شودر کا جھوٹا کھانا کھائے تو وہ سات دن تک جو کے آٹے کے سوا کچھ نہ کھائے پیئے۔(۱۵۳:۱۱)

☆ ایک برہمن بلا تامل اپنے شودر غلام کا مال لے سکتا ہے؛ کیوں کہ کوئی مال بھی شودر کی ذاتی ملک نہیں ہے، وہ ایک ایسی ہستی ہے کہ جس کی جائداد اس کا آقا لے سکتا ہے۔(۴۱۷:۸)

یہ ہے اس ہندو راج اور ہندو تہذیب کی جھلک، جس کی آر ایس ایس دعوت دیتی ہے اور جس کی طرف وہ اس ملک کو لے جانا چاہتی ہے، اس کو اپنے اس سفر میں اگر کسی طبقہ کی مزاحمت کا سامنا ہے تو وہ ''مسلمان'' ہیں، مسلمان یقیناً انسان اور انسان کے درمیان تفریق کے اس نظام کو قبول نہیں کرسکتا، افسوس کہ برادران وطن کی اکثریت نے کبھی بھی آر ایس ایس کے عزائم کے بارے میں غور نہیں کیا، اس لئے وہ ان خطرات کی طرف سے غافل ہے، جو وطن عزیز کو آر ایس ایس کی طرف سے درپیش ہیں، آر ایس ایس کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو خود احتسابی کے عمل سے گذارے اور دوسروں کو نشانہ بنانے سے پہلے اپنے سامنے آئینہ رکھ لے، بہ قول خمار بارہ بنکی:

تبصرہ جب کسی پر کیا کیجئے - آئینہ سامنے رکھ لیا کیجئے

بابری مسجد مقدمہ کا فیصلہ

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیت
نہیں کام آتی دلیل اور حجت

۳۰/ستمبر ۲۰۱۰ءکوالہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ کا فیصلہ مسلمانوں کے لئے ۶/دسمبر ۱۹۹۲ء کے واقعہ سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور دردانگیز ثابت ہوا، ۶/دسمبر کو کچھ دہشت گردوں نے ہندوستان کی جمہوریت اوراس کے سکولرزم پر کاری ضرب لگائی اور بابری مسجد کو عین دوپہر کی روشنی میں ظلم و جبر کے ساتھ شہید کردیا، ۳۰/ستمبر ۲۰۱۰ءکو قانون کے رکھوالوں کے ہاتھ عدل وانصاف کے نام پر گویا دوبارہ مسجد شہید کردی گئی، پہلے لوگ خیال کرتے تھے کہ اگران کے ساتھ ظلم وزیادتی ہوگی تو گو حکومت اور پولیس سے انصاف کی امید نہیں؛ لیکن عدالتیں ضرور ہمیں انصاف فراہم کریں گی اور ظالموں اور غنڈہ گردوں کو کیفر کردار تک پہنچائیں گی؛ لیکن افسوس کہ ۳۰/ستمبر کے واقعہ نے اس امید کو بھی خاک میں ملادیا، اور حالات نے ثابت کردیا کہ ہمارے ملک میں مظلوموں کے لئے یہ آخری سہارا بھی ٹوٹ چکا ہے، اگر دو افراد یا دو قوموں کے درمیان نزاع پیدا ہوجائے تو اس کا فیصلہ کرنے کے لئے تین ذرائع سے مدد لینا ممکن ہے، مذہب، تاریخ اور قانون —— سیکولر ملکوں میں اگر دو الگ الگ مذہب کے لوگوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو اور دونوں مذاہب کا نقطۂ نظر الگ الگ ہو تو ظاہر ہے کہ ان کے درمیان مذہب کی بنیاد پر فیصلہ نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ ایک تو سیکولر ملکوں میں مذہب کو قانون کا درجہ حاصل نہیں ہے، دوسرے: فیصلہ اور رفع الزام کی بنیاد ہمیشہ ایسی ہی چیز ہوسکتی ہے جو دونوں فریق کے نزدیک تسلیم شدہ ہو، جس بات کو ایک فریق مانتا ہو، دوسرا فریق نہیں مانتا ہو، اس سے کیوں کر نزاع دور ہوسکتی ہے؛ اس لئے ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں اگر کسی جگہ کے راج جنم بھومی ہونے اور نہ ہونے میں اختلاف ہو تو محض عقیدہ کی بنیاد پر کسی مقام کو کیسے رام جنم استھان قرار دیا جاسکتا ہے؟ اگر کسی فرقہ کے محض عقیدہ کو دلیل تسلیم کرلیا جائے اور اس کی بنیاد پر فیصلے ہونے لگیں تو جمہوریت کے لئے منہ چھپانے کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہے گا اور ملک کے دستور کو سولی پر چڑھا دینے کے مترادف ہوگا۔

اور اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض بھی کرلیں کہ نتیجہ تک پہنچنے میں مذہبی تصورات سے استفادہ کیا جائے تب بھی برادران وطن کی اصل مذہبی کتابیں وہ ویدیں ہیں، جن کو الہامی مانا جاتا ہے، ان ویدوں میں اجودھیا کا یا رام جی کے پیدا ہونے کا کوئی ذکر نہیں ملتا، رامائن میں اجودھیا کا ذکر ملتا ہے؛ لیکن اجودھیا کس مقام پر تھی اور رام جی کس جگہ پیدا ہوئے؟ اس کا کہیں کوئی ذکر نہیں؛ کیوں کہ بالمیکی رامائن کے مطابق اجودھیا سرجو ندی سے ساڑھے تیرہ میل کے فاصلہ پر تھی اور یہ آبادی ندی کے پورب جانب واقع تھی، جبکہ آج کا اجودھیا ندی سے لگا ہوا ہے اور اس سے پچھّم جانب میں واقع ہے، اس طرح بالمیکی رامائن کے بیان کے مطابق جس مقام کو اس وقت اجودھیا کہا جاتا ہے، وہ اجودھیا ہے ہی نہیں، تو پھر وہاں کیسے رام جی کی پیدائش ہوسکتی ہے؟ اگر وہ جگہ رام جی کی جائے پیدائش ہوتی تو ہمیشہ سے ہندو مذہبی شخصیتوں نے اس کا ذکر کیا ہوتا اور ہندو بزرگوں نے اس جگہ کو رام جنم استھان مانا ہوتا، تلسی داس جی جو سری رام جی کے بڑے مداح اور بھگت ہیں، انہوں نے اکبر کے عہد میں اپنی کتابیں لکھی ہیں، جبکہ بابر کا انتقال ۱۵۳۰ء میں ہو چکا تھا، اکبر کی ہندو نوازی تاریخ کی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے، تلسی جی ملیچھوں اور ناپاکوں یعنی مسلمانوں کی حکومت پر رنج واندوہ کا اظہار بھی کرتے ہیں، مگر انہوں نے 'رام جنم استھان' کے منہدم کئے جانے اور اس کی جگہ مسجد بنائے جانے کا ذکر نہیں کیا ہے، پنڈت دیانند سرسوتی، سوامی وویکانند، سوامی رام کرشن پرم ہنس، راجہ رام موہن رائے، لالہ لاجپت رائے، مہاتما گاندھی، ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر ولبھ بھائی پٹیل، ونوبا بھاوے وغیرہ راسخ العقیدہ ہندو رہے ہیں، ان میں سے اکثر مذہبی قائدین تھے اور بعض کا تعلق اگرچہ کہ سیاست سے بھی تھا، مگر ان پر مذہبی رنگ ہی غالب تھا؛ لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس جگہ کو رام کا جنم استھان نہیں کہا؛ بلکہ پہلی بار ۱۶/ جنوری ۱۹۵۰ء میں گوپال سنگھ نے دعویٰ کیا کہ بابری مسجد کا درمیانی گنبد جس میں عین محراب کے اندر کچھ شر پسندوں نے مورتی رکھ دی تھی، وہی جگہ رام کی جائے پیدائش ہے۔

اگر ہندو مذہب میں خاص اس جگہ کو رام جی کی جائے پیدائش مانا گیا ہوتا تو بہت سی کتابوں میں اس کا ذکر ہونا چاہئے تھا، اور اہم مذہبی شخصیتوں نے اس جگہ کے بارے میں اس طرح کے دعوے کئے ہوتے؛ لیکن ایسا نہیں ہوا، اور ۱۹۵۰ سے پہلے تک ہندو بھائیوں کی طرف سے کبھی اس قسم کے دعوے سامنے نہیں آئے، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ ہندو مذہب میں خاص اس جگہ کے جائے

پیدائش ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے، یہ حقیقت اس وقت اچھی طرح سامنے آگئی، جب سابق وزیر اعظم وی پی سنگھ نے پورے ملک سے کچھ منتخب مسلمان اور ہندو مذہبی قائدین کو جمع کیا —— جس میں یہ حقیر بھی شامل تھا —— اوران سے خواہش کی کہ وہ 'بابری مسجد، رام جنم بھومی' مسئلہ کا حل نکالیں، اس وقت ہندو مذہبی قائدین سے خواہش کی گئی کہ وہ اپنی مذہبی کتابوں سے خاص اس جگہ کا رام کی جائے پیدائش ہونا ثابت کریں تو پنڈت اویدناتھ نے کوئی واضح جواب دینے کے بجائے کہا کہ یہ ہماری ''بھاوناؤں'' (آرزوؤں) کا مسئلہ ہے، ظاہر ہے کہ مذہب کی بنیاد بھاوناؤں پر نہیں ہوتی؛ بلکہ مذہبی کتابوں میں منقول بیانات پر ہوتی ہیں؛ اس لئے اگر مذہبی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو بابری مسجد کی جگہ کے رام جی کی جائے پیدائش ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

دوسرا پہلو تاریخی ہے، کیا تاریخی طور پر اس جگہ کا رام کی جائے پیدائش ہونا ثابت ہے؟—— اس سلسلہ میں بہت سے ہندو دانشوروں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ رام جی کا کوئی حقیقی وجود ہی نہیں تھا؛ بلکہ رامائن کی حیثیت ایک ناول کی ہے اور رام جی کو اس کے بنیادی کردار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، ابھی چند دنوں پہلے تمل ناڈو کے چیف منسٹر کرونا ندھی کا بہت واضح بیان اس سلسلہ میں آچکا ہے، اگر ہندو بھائیوں کے تصور تاریخ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو شری رام چندر جی ''تر تیا یگ'' میں پیدا ہوئے اوران کے خیال کے مطابق موجودہ زمانہ 'کل یگ' کا ہے، تر تیا یگ کا آغاز اکیس لاکھ سال پہلے ہوا تھا، جو بارہ لاکھ سال تک چلتا رہا، گویا اس دور سے نو لاکھ سال پہلے وہ یگ ختم ہوگیا، جس میں رام جی پیدا ہوتے تھے، گویا ہندو حساب کے لحاظ سے کم سے کم نو دس لاکھ سال پہلے رام جی کی پیدائش ہوئی ہے اور امکان یہ بھی ہے کہ پندرہ بیس لاکھ سال پہلے پیدا ہوئے ہوں، یہ زمانہ یقینی طور پر ماقبل تاریخ کا ہے اور کسی ایسی تاریخ کا وجود نہیں، جس سے اِس عہد کے واقعات کو ثابت کیا جا سکے، بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ رام جی کا عہد ڈھائی ہزار سال قبل مسیح کا ہے اور مہا بھارت کا زمانہ حضرت عیسیٰ سے ایک ہزار سال پہلے کا ہے، چنانچہ مہا بھارت میں جن مقامات کا ذکر آیا ہے، ڈاکٹر آر ایل شکلا (استاذ دہلی یونیورسیٹی) کے بقول ان جگہوں کی کھدائی ۲۵ / سال پہلے بھی ہوئی اور دس سال پہلے بھی؛ لیکن سات سو قبل مسیح تک ہی وہاں انسانی آبادی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، اس سے پہلے کا نہیں، یہ بات ڈاکٹر شکلا نے ۱۹۸۴ء میں لکھی ہے (اٹیک سنواد ماہ نومبر ۱۹۸۴ ص: ۱۲، ۱۳) یہ بات بھی قابل

ذکر ہے کہ ایک زمانہ میں اجودھیا میں بدھسٹوں کی بہت سی خانقاہیں اور مندر تھے، جن کو برہمنوں نے منہدم کردیا تھا؛ اسی لئے بعض مؤرخین نے بابری مسجد میں لگے ہوئے بعض ستونوں کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ بودھ مندروں کے ہیں، جنہیں برہمنوں نے توڑ پھوڑ کر پھینک دیا تھا، ممکن ہے کہ اسے تعمیر مسجد کے درمیان استعمال کرلیا گیا ہو۔

بعض ہندو مؤرخین رام کی سلطنت کی جگہ اجودھیا کے بجائے 'بنارس' کو مانتے ہیں، چنانچہ اے ایل باشم کا دعویٰ ہے کہ رامائن کے قدیم ترین نسخہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ رام جی بنارس کے بادشاہ تھے اور تھوڑے زمانہ کے لئے یہ اس علاقہ کی ایک اہم حکومت تھی، (ہندوستان کا شاندار ماضی: ص: ۶۸-۶۷) اس طرح ہندو تاریخ میں کہیں کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ جس جگہ کو رام جنم استھان قرار دیا جارہا ہے، وہ رام جی کی جائے پیدائش ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس جگہ کے رام جی کے جائے پیدائش ہونے کا مسئلہ کس طرح اٹھ کھڑا ہوا؟ تو حقیقت یہ ہے کہ یہ انگریزوں کا پیدا کیا ہوا فتنہ ہے، تاریخی حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر میں ہندوؤں، بودھوں اور مسلمانوں کی بہت سی مذہبی عمارتیں اور عبادتگاہیں تھیں، بودھوں کے مندر اگرچہ پہلے ہی ختم ہو چکے تھے؛ لیکن ہندو اور مسلمان دونوں اس شہر میں امن و امان کے ساتھ رہتے تھے اور اپنے اپنے مذہب پر عمل کرتے تھے، مولانا حبیب الرحمن اعظمی (استاذ دارالعلوم دیوبند) نے ۲۷ علماء اور مشائخ کا ذکر کیا ہے، جن کا اس شہر سے تعلق رہا ہے، اور جن کی خانقاہوں نے اس شہر کو اللہ کے ذکر سے آباد کر رکھا تھا، اس کے علاوہ بہت سے بزرگوں کی قبریں بھی اس شہر میں موجود ہیں، ایک قبر حضرت شیث علیہ السلام کی بتائی جاتی ہے، جس کو ہندو ''شبث دیوتا'' اور مسلمان ''شیث پیغمبر'' (علیہ السلام) کہا کرتے تھے۔

انگریزوں کا یہ خاص مزاج تھا کہ وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان اختلاف پیدا کرکے جذبۂ آزادی کو دبانا چاہتے تھے، انہوں نے ایک پاسسٹ نجومی کے ذریعہ کہلایا کہ رام جنم استھان اور سیتا کی رسوئی بابری مسجد کے متصل احاطہ کے اندر ہے، پھر ایک طرف ہندوؤں کو اکسایا کہ وہ اس جگہ کا مطالبہ کریں، اور مسلمانوں کو کہا کہ وہ اس جگہ کی تقسیم پر راضی نہ ہوں، اس طرح ایک خونریز فساد کی نوبت آگئی، ۱۸۵۷ء میں جب تحریک آزادی نے ایک نئی انگڑائی لی تو سمجھ دار مسلمان اور ہندو

بزرگوں نے اس اختلاف کوختم کرنے کے لئے آگے بڑھ کرایک صلح کرائی کہ مسجد کے باہر کی اراضی ہندوؤں کو دیدی جائے اور آئندہ وہ کبھی بھی مسجد کی اصل عمارت پر دعویٰ نہ کریں، اس صلح میں مسلمانوں کے نمائندہ امیر علی تھے اور ہندوؤں کے نمائندہ رام چرن داس، لیکن انگریزوں کو یہ بات پسند نہیں آئی اور انہوں نے ان دونوں کو بابری مسجد کے قریب ریت کے ایک ٹیلے پر املی کے پیڑ پر لٹکا کر پھانسی دیدی، اس واقعہ سے انگریزوں کی بدنیتی پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ وہ کسی بھی قیمت پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد دیکھنا نہیں چاہتے تھے، چنانچہ اس کے بعد انگریزوں نے مختلف مرحلوں میں یہ لکھنا اور کہنا شروع کردیا کہ اجودھیا میں مندر کو گرا کر مسجد بنائی گئی ہے، چنانچہ ۱۸۷۷ء میں جب حکومت کے زیرنگرانی فیض آباد گزٹ مرتب ہوا تو اس میں کہا گیا:

> ''زبانی طور پر بتایا جاتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کے حملہ کے وقت تین اہم مندر تھے، جن میں کچھ بچاری بھی تھے؛ لیکن اجودھیا اس وقت ویران تھا، وہ تین مندر یہ تھے: (۱) رام جنم استھان (۲) سورگ دوار، جو رام دربار کے نام سے بھی جانا جاتا ہے (۳) ترتیاٹھاکر، پہلے مندر پر بابر نے مسجد بنائی، اس میں تاریخ ۱۵۲۸ لکھی ہوئی ہے، دوسرے مندر پر اورنگ زیب نے ایک مسجد اور تیسرے پر اسی بادشاہ یا اس کے کسی پیشرو نے ایک مسجد بنائی، مسلمانوں کا یہ جانا بوجھا اصول ہے کہ جب وہ کسی قوم کو مغلوب کرتے ہیں تو اس پر اپنا مذہب نافذ کردیتے ہیں''

غور کیجئے کہ بابری مسجد کی تعمیر اس پر نصب پتھر کے مطابق ۱۵۲۸ء کی تھی، اور یہ تحریر ۱۸۷۷ء کی ہے، یعنی ۳۴۹ سال کے بعد تاریخ لکھی جاتی ہے؛ لیکن محض زبانی بیان کا حوالہ دیا جاتا ہے، اور وہ بھی مبہم، یہ بھی واضح نہیں کہ کس نے یہ بات کہی نہ کوئی تحریری ثبوت پیش کیا جاتا ہے، اور نہ باضابطہ زبانی شہادت ہے، اس کو سوائے ہندو مسلم اختلاف بڑھانے کی کوشش کے اور کیا نام دیا جاسکتا ہے؟

انگریزوں کے اکسانے کے باوجود ہندو مذہبی قائدین نے ۱۹۴۹ء تک بابری مسجد کی اصل عمارت کی جگہ کو کبھی بھی رام جنم بھومی قرار دینے کی کوشش نہیں کی؛ بلکہ ان کا دعوی صحن مسجد سے متصل چبوترہ پر رہا، وہ اسی کو رام جی کا جنم استھان اور سیتا جی کی رسوئی قرار دیتے رہے، ۲۲، ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی شب ''ہنومان گڑھی'' کے مہنت ابھے رام داس اپنے چیلوں کے ساتھ دیوار پھاند کر

مسجد کے اندر گھس آئے اور درمیانی گنبد میں عین محراب کے نیچے ایک مورتی رکھدی — جس کی رپورٹ وہاں متعین کانسٹبل ماتو پرشاد کی تھانہ رپوٹ میں موجود ہے، اور الہ آباد ہائی کورٹ کے حالیہ فیصلے میں بھی اسے تسلیم کیا گیا ہے- پھر ۱۶ / جنوری ۱۹۵۰ء کو گو پال سنگھ نے حکومت اتر پردیش اور کچھ مسلمانوں کو فریق بناتے ہوئے وہاں پوجا کی اجازت طلب کی، اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ۱۹۵۰ء تک خود ہندوؤں نے بھی بابری مسجد کی جگہ کو رام جنم بھومی قرار نہیں دیا، اس جگہ کے رام جنم بھومی ہونے کا دعوی اس کے بعد شروع ہوا۔

غرض کہ تاریخی پہلو سے دیکھا جائے تو اولاً یہ بات ہی محتاج تحقیق ہے کہ شری رام جی کی حقیقت ایک تاریخی کردار کی ہے یا حقیقی شخصیت کی؟ دوسرے: رامائن میں جس اجودھیا کا ذکر آیا ہے، وہ موجودہ اجودھیا ہے یا کوئی اور جگہ، دریائے سرجو کی دوسری سمت میں؟ اگر رام جی وہیں پیدا ہوئے تو کس جگہ پیدا ہوئے؟ خاص اس جگہ پیدا ہونے کا کوئی ثبوت نہیں، ہندو تاریخ بہت قدیم ہے؛ لیکن ۱۹۵۰ء تک کسی نے اس جگہ کو رام کی جائے پیدائش قرار نہیں دیا، اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ رام جی بنارس میں پیدا ہوئے ہوں، اور وہیں ان کے اقتدار کا سورج چمکا ہو، جیسا کہ رامائن کے بعض قدیم نسخوں سے معلوم ہوتا ہے، آثار قدیمہ کی شہادت بھی نہیں ہے؛ کیوں کہ ہندو بھائیوں کے بیان کے مطابق رام جی کا زمانۂ پیدائش ۱۰ لاکھ سال پہلے کا ہے اور بعض ہندوؤں کے بیان کے مطابق ڈھائی ہزار سال قبل مسیح کا ہے؛ لیکن اجودھیا کی کھدائی سے اتنی قدیم آبادی کا کوئی ثبوت نہیں نکلا، بابری مسجد مقدمہ کے درمیان جب کھدائی کی گئی تو بعض ایسی دیواریں ملیں، جس میں چونے کا استعمال کیا گیا تھا، اور اس دیوار کی سمت شمال سے جنوب کی طرف تھی، چونے کا استعمال ہندوستان میں مغل عہد سے شروع ہوا؛ کیوں کہ یہ ایرانی طرز تعمیر کا حصہ ہے اور دیوار کی یہ وضع بمقابلہ مندر کے مسجد سے قریب معلوم ہوتی ہے، رہ گیا کھدائی میں کچھ مورتیوں کا مل جانا تو یہ کوئی ثبوت نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ پورا ڈھانچہ مسجد کے منہدم کئے جانے کے بعد فرقہ پرست ہندوؤں کے قبضہ میں تھا، اس درمیان ان کا کچھ پرانی مورتیوں کا اندر ڈالدینا چنداں باعث تعجب نہیں؛ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ اس مسجد کے نیچے مندر کے ہونے کا تاریخی طور پر کوئی ثبوت نہیں ہے۔ (اصحاب ذوق اس سلسلہ میں سید صباح الدین عبدالرحمان، مولانا عبدالسمیع ندوی اور مولانا حبیب الرحمن اعظمی وغیرہ کی کتابوں کا مطالعہ کرسکتے ہیں)

اگر قانونی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس مقدمہ کا موضوع یہ تحقیق کرنا نہیں تھا کہ رام جی یہاں پیدا ہوئے تھے یا نہیں؟ بلکہ مقدمہ ملکیت اراضی تھا کہ یہ سنی وقف بورڈ کی ملکیت ہے یا نرموہی اکھاڑے کی؟ ملکیت کا ثبوت دستاویز اور شہادت سے ہوتا ہے، دستاویزی اعتبار سے یہ زمین یوپی سنی وقف بورڈ کی املاک میں ہے، ۱۸۶۰ء میں یہ جگہ باضابطہ مسجد کی حیثیت سے رجسٹرڈ کرائی گئی تھی- مغلیہ عہد میں ۶۰/ روپے سالانہ مسجد کو سرکاری خزانہ سے ملتے تھے، پھر نوابان اودھ عہد کے زمانہ میں یہ رقم ۳۰۰ روپے ہوگئی، برطانوی عہد میں یہ رقم بحال رہی اور جب اس کی رجسٹری کرائی گئی تو نقد رقم کے بجائے دو گاؤں بطور جاگیر کے دیئے گئے، نیز جس شب مسجد کے اندر مورتی رکھی گئی، اس شب تک نمازوں کا سلسلہ جاری رہا، اور آخری امام مولوی عبدالغفار امامت کا فریضہ انجام دیتے رہے، غرض کہ ۱۵۲۸ء سے ۱۹۴۹ء تک ہمیشہ یہ مسجد مسلمانوں کے زیر قبضہ رہی اور یہاں نمازیں ادا کی گئیں، شخصی شہادتوں کی صورت حال یہ ہے کہ نہ صرف مسلمانوں؛ بلکہ اچھی خاصی تعداد ہندو گواہوں کی ہے، جنہوں نے اس مقام کے مسجد ہونے کی شہادت دی ہے-

اس طرح قانونی اعتبار سے بھی مسجد کی ملکیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، ۳۰/ستمبر ۲۰۱۰ء کو الہ آباد ہائی کورٹ کے لکھنؤ بنچ نے جو فیصلہ کیا ہے، قابل غور ہے کہ وہ فیصلہ انصاف ہے یا انصاف کا خون؟ اس نے ہندوستان کی جمہوریت پر ایسا شب خوں تو نہیں مارا ہے جس نے اس ملک کی روایات کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے، جس نے فتنہ اور تفرقہ اندازی کے ایک ایسے دروازہ کو تو نہیں کھول دیا ہے کہ اگر اس کا سد باب نہیں کیا گیا تو شہر شہر جنگ وجدال کا کارزار گرم ہوسکتا ہے اور پھر فرقہ وارانہ ہم آہنگی پاش پاش ہوسکتی ہے، نہ صرف مسلمانوں کے لئے؛ بلکہ ہر انصاف پسند اور محب وطن ہندوستانی کے لئے یہ انتہائی تکلیف دہ اور نا قابل قبول فیصلہ ہے، اور اسے پڑھ کر اور سن کر شاید لوگ مولانا اسماعیل میرٹھی کا وہ شعر پڑھیں کہ:

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیت
نہیں کام آتی دلیل اور حجت

❁

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے!

(فیصلۂ بابری مسجد کے پس منظر میں مسلمانوں کیلئے لائحہ عمل)

۳۰/ستمبر ۲۰۱۰ء کو بابری مسجد کا مقدمہ جس انداز پر الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ نے فیصل کیا، وہ جہاں قانون دانوں کے لئے ایک عجوبہ اور جمہوری قدروں کے پاسدار محب وطن شہریوں کے لئے باعث رنج وتشویش ہے، وہیں مسلمانوں کے لئے صدمہ انگیز، دل کے زخموں کے لئے نمک پاش، مظلوموں کے لہو کے ساتھ تمسخر، نہایت مایوس کن اور یاس انگیز ہے، اس موقع پر ملت اسلامیہ ہند نے جس صبر وبرداشت کا ثبوت دیا، وہ ان کی امن پسندی، قانون کے احترام، ملک کے تئیں محبت اور صبر و دانشمندی کی بہترین مثال ہے؛ لیکن ان ہمت شکن حالات میں بھی مؤمن کے لئے روا نہیں کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہوجائے، ہمت ہار جائے اور حوصلہ کھودے، اس موقع پر بے ساختہ علامہ اقبالؔ کا کلامِ حق ترجمان نوکِ قلم پر آتا ہے کہ:

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مئے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسبان مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
کشتی حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصر نَو رات ہے، دھندلا سا ستارا تو ہے

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو تو شکست ہوسکتی ہے؛ لیکن اسلام کو کبھی شکست نہیں ہوسکتی، مسجدوں کے در ودیوار اور گنبد ومینار تو شہید کئے جاسکتے ہیں؛ لیکن دل کی دنیا میں ایمان کی جو عمارت تعمیر ہوچکی ہے، اسے نہ کوئی آگ جلاسکتی ہے اور نہ کوئی ہتھیار زندگی سے محروم کرسکتا ہے، بعض ظالم اموی بادشاہوں کے ہاتھوں کعبۃ اللہ کے در ودیوار منہدم کردیئے گئے اور اس کے دروازے اور غلاف نذر آتش ہوگئے، قرامطہ حجر اسود کو لے کر چلے گئے؛ لیکن اِن دل فگار حادثات نے بھی اسلام کے قدم

نہیں رو کے، وہ بڑھتا گیا، بڑھتا گیا اور قیامت تک بڑھتا ہی رہے گا۔

حالیہ فیصلہ مسلمانوں کے لئے اخلاقی فتح اور ان کے خلاف کئے جانے والے پروپیگنڈوں کا مؤثر جواب بھی ہے، فیصلہ نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ فسطائی طاقتیں چاہے کسی بھی مقام پر پہنچ جائیں، ان سے انصاف کی امید نہیں رکھی جاسکتی اور فرقہ پرستی سے بیمار دل و دماغ صحت یاب نہیں ہوسکتا، چاہے وہ عدل وانصاف کی کرسیوں پر ہی کیوں نہ فائز ہو، پرانے زمانے میں کہا جاتا تھا کہ اگر چور کو چوکیدار بنا دیا جائے تو وہ محافظ بن جاتا ہے؛ لیکن ہمارے اس ترقی یافتہ دور نے اس مقولہ کو بھی غلط ثابت کر دیا ہے اور واضح کر دیا ہے کہ علم کے باوجود جو غلطی کی جاتی ہے، اس کا کوئی علاج نہیں، یہ ایسی حقیقت ہے جو پورے ملک کے سامنے آچکی ہے اور برادران وطن بھی اس پر افسوس کا اظہار کر رہے ہیں۔

مسلمانوں کے بارے میں تاثر دیا جاتا ہے کہ وہ بہت ہی مشتعل مزاج اور بے برداشت قوم ہیں، وہ اپنے مزاج کے خلاف ہونے والے معمولی واقعات پر بھی آمادۂ تشدد ہوجاتے ہیں اور سڑکوں پر نکل آتے ہیں، چوں کہ ہمارے یہاں میڈیا پر بھی سنگھ پریوار کے لوگوں کا غلبہ ہے، وہ بھی رائی کو پہاڑ بناتے ہیں اور مسلمانوں پر ہونے والے مظالم سے توصرف نظر کر جاتے ہیں، مگر جب مسلمانوں کی طرف سے کوئی ردعمل سامنے آتا ہے تو اسے خوب نمایاں کرتے ہیں، اس موقع پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور دیگر مذہبی قائدین کی ہدایت وتلقین پر مسلمانوں نے جس صبر وضبط کا مظاہرہ کیا، اس نے ان لوگوں کی زبان بند کر دی اور ان کے منصوبوں کو ناکام کر دیا، جو مسلمانوں سے اس طرح کا رد عمل چاہتے ہیں اور اپنی زیادتیوں کا جواز تلاش کرتے ہیں، یہی وہ طریقۂ کار ہے، جس کو قرآن مجید نے ''صبر'' سے تعبیر کیا ہے کہ جب انسان مصیبتوں اور آزمائشوں میں گھرا ہوا ہو تو اس وقت دو عمل کرے: رجوع الی اللہ اور صبر وتحمل، صبر وتحمل کی مزید اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (البقرۃ: ۱۵۳)

صبر بزدلی نہیں؛ بلکہ بہادری ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''**ليس الشديد بالصرعة، إنما الشديد الذي يملك نفسه عند الغضب**'' (**صحيح البخاري، كتاب**

الأدب، باب الحذر من الغضب، حدیث نمبر: ۶۱۱۴)''اصل بہادر وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے'' صبر شکست نہیں؛ بلکہ تدبیر ہے؛ کیوں کہ جب آدمی اپنے جذبات پر قابو رکھتا ہے تو وہ ٹھنڈے دل کے ساتھ غور کرنے کی صلاحیت کا حامل ہوتا ہے، وہ دشمن کی چال کا ادراک کر سکتا ہے، وہ مزید آزمائشوں سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہمیں صبر سے معمور ملتی ہے، آپ ﷺ نے صرف مکی زندگی ہی میں صبر نہیں فرمایا؛ بلکہ مدنی زندگی میں بھی صبر سے کام لیا؛ اسی لئے فتح مکہ سے پہلے تک ساری جنگیں مدینہ میں یا مدینہ کی سرحد پر ہوئیں، غزوۂ احد میں ستر صحابہ شہید اور خود رسول اللہ ﷺ زخمی ہو گئے؛ لیکن مسلمانوں نے آہ و واویلا نہیں مچائی اور ردعمل کے طور پر مکہ پر حملہ آور نہیں ہوئے، بدر میں ستر مشرکین ہلاک ہوئے اور اتنے ہی گرفتار، مسلمان ان قیدیوں سے جذبۂ انتقام بجھا سکتے تھے؛ لیکن آپ ﷺ نے صبر اور عفو و درگذر کا راستہ منتخب کیا، انہیں کچھ دن قید میں رکھ کر حضور ﷺ انہیں بتانا بھی چاہتے تھے کہ مسلمان کتنے بلند اخلاق، وسیع الظرف اور عفو پسند ہوتے ہیں، غزوۂ خندق میں اعداء اسلام نے اپنی پوری طاقت جھونک دی اور نا کام و نامراد واپس ہوئے، آپ ﷺ چاہتے تو اس کے بعد اہل مکہ پر فوج کشی کر سکتے تھے؛ لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا، غزوۂ احد اور غزوہ خندق دونوں میں یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ منافقین مسلمانوں کی آستین کے سانپ ہیں؛ اس کے باوجود آپ ﷺ نے صبر سے کام لیتے ہوئے درگذر کا راستہ اختیار فرمایا؛ اس لئے صبر شکست و ہزیمت نہیں؛ بلکہ یہ حسنِ تدبیر کے لئے حاصل ہونے والا ایک وقفہ ہے۔

موجودہ صورت حال ہمیں اس جانب متوجہ کرتی ہے کہ ہم ایک طرف استقامت کا ثبوت دیں، ہمت نہ ہاریں اور جس حد تک قانونی چارہ جوئی کر سکتے ہیں، ضرور کریں کہ ہم اسی کے مکلف ہیں اور اللہ کی ذات سے کامیابی کی امید رکھیں؛ کیوں کہ بہ حیثیت مسلمان ہمیں یقین ہے کہ اصل فیصلے زمینوں پر نہیں آسمانوں پر ہوتے ہیں، دوسرے ہم بابری مسجد مسئلہ کے تاریخی پہلو اور اس کی قانونی حیثیت سے لوگوں کو واقف کرائیں؛ کیوں کہ تاریخی شہادتیں پوری طرح ہمارے ساتھ ہیں، ہم انہیں بتائیں کہ مسلمان تمام مذاہب کے پیشواؤں کا احترام کرتے ہیں اور مذہبی رواداری قرآن مجید کی تعلیمات کا حصہ ہے؛ لیکن رام جنم بھومی کے نام پر جو قضیہ کھڑا کیا گیا ہے، اس کا حقیقت اور واقعہ سے کوئی تعلق نہیں، سچائی یہ ہے کہ اس کا مقصد صرف نفرت کی آگ سلگانا، سیاسی عزائم کو پورے کرنا اور

حقیقی مسائل کی طرف سے لوگوں کی نگاہیں پھیرنا ہے۔

تیسرا اہم کام ہے اسلام کی دعوت اور دین حق کی طرف لوگوں کو بلانا، ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ ہم ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ سے اس ملک میں ہیں؛ لیکن ہم اپنے ہم وطنوں تک اسلام کو پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوسکے، ہم آج تک انہیں مسجد کی حقیقت سے آشنا نہ کرسکے، اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ جن لوگوں نے شدت کے ساتھ دین حق کی مخالفت کی، انہوں نے ہی اسلام کی دعوت پر لبیک بھی کہا، چنانچہ یہ بات اخبارات تک آچکی ہے کہ بہت سے لوگ جو بابری مسجد کی شہادت میں شریک تھے، وہ خود دامنِ اسلام میں آچکے ہیں اور اب مسجدیں تعمیر کرکے اپنی اس غلطی کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کررہے ہیں؛ اس لئے کہ اسلام کی اصل طاقت اس کی سچائی اور اس کا عقل، انسانی ضرورت اور انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہونا ہے، مسلمانوں کے لئے جن لوگوں کے جسم وتن کو فتح کرنا ممکن نہیں ہوتا، اسلام ان کے دل و دماغ کو فتح کرلیتا ہے اور گھٹا گھور تاریکیوں سے امید کے چراغ جلاتا ہے۔

چوتھی قابل توجہ بات یہ ہے کہ انسان کی فطرت ہے کہ جب کوئی چیز اس کے ہاتھ سے کھو جاتی ہے تو وہ اس کا متبادل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے، اگر آم کا درخت سوکھ جائے تو نئے درخت لگائے جاتے ہیں، اگر انسان کا گھر اس سے چھین لیا جائے تو وہ نئے گھر کی تعمیر کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح بابری مسجد کے اس واقعہ میں ایک مثبت پہلو یہ تلاش کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان اس مسجد کی تلافی کے لئے دوسری مسجدیں تعمیر کریں، آج بھی ہمارے ملک میں ہزاروں دیہات ایسے ہیں، جہاں مسلمان مسجدوں سے محروم ہیں، اس محرومی نے ان کو صرف بے عملی اور بد عملی ہی سے دو چار نہیں کیا ہے؛ بلکہ ایمان سے محرومی تک پہنچا دیا ہے، مسجدوں کا وجود مسلم سماج کی شناخت ہے، مسلمان کتنا بھی جاہل اور بے عمل ہو؛ لیکن مسجدیں ان کے اندر ان کے مسلمان ہونے کا احساس جگائے رکھتی ہیں، اور اس طرح زندگی میں ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ وہ اپنے دین کی طرف لوٹ آتا ہے؛ اس لئے اس صدمہ انگیز واقعہ کو ایک نفع خیز اور عبرت آمیز واقعہ بنالینا چاہئے، اس میں ان شاء اللہ دنیا کی بھی بھلائی ہے اور آخرت میں بھی سرخ روئی وسرفرازی۔

❁

عالم اسلام اور مسلمان

غزہ کا مقتل اور ہماری ذمہ داریاں

اگر پہاڑوں کو جگر ہوتا تو بعید نہ تھا کہ وہ بھی شق ہو جاتا، اگر درختوں کو آنکھیں ہوتیں، تو عجب نہ تھا کہ وہ بھی آنسوؤں کا دریا بہا دیتیں، اگر زمین کو زبان ہوتی تو کیا عجب کہ اس کے نالۂ وفریاد سے کرۂ ارض میں کہرام برپا ہو جاتا اور اگر درندے ان انسان نما درندوں کو دیکھتے لیتے تو شاید وہ بھی شرمسار ہو جاتے اور درندگی میں صہیونیوں اور ان کی موافقت کرنے والوں کی بالادستی کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے، اس خوں آشامی، ظلم وبربریت، قتل وغارت گری کی وجہ سے جو اس وقت ''غزہ'' میں جاری ہے، جس کو سالہا سال سے اسرائیل کے ساتھ ساتھ مصر کی بے حمیت، کوتاہ ہمت، ضمیر فروش، منافق اور فرعون صفت حکومت نے ایک ایسے قید خانہ میں تبدیل کر رکھا ہے، جو بنیادی ضروریات سے بھی محروم ہے، کھانے، پینے اور دوا سے محروم ان محصور ومجبور افراد پر اب ایک طرف اسرائیل کی طرف سے آگ کی بارش جاری ہے، دوسری طرف مصر کی طرف سے سرنگیں اُڑائی جا رہی ہیں اور زخمیوں کو علاج تک کے لئے مصر میں داخلہ کی اجازت نہیں دی جا رہی ہے۔

سلامتی ہو غزہ کے ان مجاہدین پر، جنھوں نے اپنے لہو سے اسلام کے شجرِ طوبیٰ کو سینچنے کا عزم کر رکھا ہے، صد ہزار رحمتیں ہوں ان شہداءِ راہِ حق پر، جنھوں نے اپنے خون کا ایک ایک قطرہ دینِ حق کی سرخروئی کے لئے نچھاور کر دیا ہے، لاکھوں سلامِ شوق پہنچے ان معصوم نونہالوں پر جنھوں نے اسلام کی سربلندی کے لئے اپنی معصوم جانوں کا نذرانہ پیش کر دیا ہے اور اسی قدر لعنتیں ان صلیبی اور صہیونی ظالموں پر جو دین واخلاق اور بین الاقوامی قوانین کی دھجیاں بکھیر کر اپنی خوں آشامی کی خو پوری کر رہے ہیں اور ان خوفِ خدا سے عاری اور ہمت مردانہ سے خالی مسلم حکمرانوں پر جن کے سینوں میں شیطان نے ''دل'' کی بجائے پتھر کی سِل رکھ دی ہے، جن میں سے بعض علی الاعلان یا خفیہ طور پر اسرائیل کے ہم نوا ہیں اور بدترین قسم کی برادر کشی کے مرتکب ہو رہے ہیں —— بارِالٰہا! اپنے ان مظلوم بندوں پر رحم فرما، جن سے مغرب ومشرق کی عداوت صرف اس لئے ہے کہ وہ تیرے پاک نام سے نسبت رکھتے ہیں، اور پروردگارا! ہلاک وبرباد فرما، ان شقی وبدبخت حکومتوں کو، جو بے قصور انسانوں

کے خون میں ڈوبی ہوئی ہیں، یا اس میں مددگار ہیں!!

سوال یہ ہے کہ جو مسلمان اپنے ان مظلوم اور نہتے بھائیوں کی اخلاقی مدد کرنے کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتے، انھیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے؟ —— رسول اللہ ﷺ نے ایک اُصول بیان فرمادیا ہے، کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی برائی کو دیکھے تو اول اسے ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرے، اگر اس پر قادر نہ ہو تو زبان سے اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل سے، یعنی دل سے برا سمجھے، اور دل میں یہ ارادہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ جب بھی قدرت دیں گے، وہ اُسے روکنے کی کوشش کرے گا (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۳۴) —— ظلم و جور سے بڑھ کر کوئی منکر اور بُرائی نہیں، یہ تو دنیا میں شرک سے بھی بڑھ کر ہے؛ کیوں کہ دنیوی احکام کی حد تک شرک کو گوارا کیا جاسکتا ہے؛ لیکن ظلم ایسی بُرائی ہے، کہ وہ کسی طور پر قابل قبول نہیں، کفر وشرک بھی ایسا جرم نہیں کہ جو شخص پہلے سے اس عقیدہ پر ہو، اُسے قتل کرنا جائز ہو؛ لیکن اگر کوئی شخص کسی کا مال لے لے، کسی کی عزت وآبرو پر حملہ آور ہو، یا کسی کو قتل کردے تو وہ ضرور لائق سزا ہے، پس ظلم سب سے بڑی بُرائی ہے اور اپنی طاقت وصلاحیت بھر اس کی مخالفت واجب ہے!

مخالفت اور ناراضگی کے اظہار کا ایک طریقہ ترک تعلق بھی ہے اور ظالموں کے ساتھ ترک تعلق کی تعلیم خود قرآن مجید نے دی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (المائدۃ:۵۱)

اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو ان کو دوست رکھے گا، وہ ان ہی میں سے ہوگا، بے شک اللہ ظلم شعار لوگوں کو ہدایت نہیں دیتے۔

اس آیت میں ایک جامع لفظ ''دوست نہ بنانے'' کا استعمال کیا گیا ہے، یہ ایک معنی خیز تعبیر ہے، جس میں قلب ونگاہ کی محبت، فکر ونظر میں تاثر، سماجی زندگی کی مماثلت اور مالی معاملات وتعلقات سب شامل ہیں، یہ کوئی شدت پر مبنی حکم نہیں ہے؛ بلکہ ظلم کے خلاف ناراضگی کے اظہار کا ایک طریقہ ہے، اس آیت کے اخیر میں ظالموں کا تذکرہ کر کے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا گیا، کہ جو یہود و

نصاریٰ ظلم وجور پر کمر بستہ ہوں، مسلمانوں کے لئے اپنی طاقت وقدرت کے مطابق ان سے بے تعلقی برتنا واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع پر اس حکم کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، ارشاد ہے:

﴿اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (الممتحنہ:۹)

بے شک اللہ تم لوگوں کو ان لوگوں سے تعلق رکھنے سے منع کرتے ہیں، جنھوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی، تم کو تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی اور جو ان سے تعلق رکھیں، وہ بھی ظالم ہیں۔

گھروں سے نکالنا، محض دین کی بنا پر آمادۂ قتل وقتال ہونا اور جو لوگ مسلمانوں کے شہروں اور آبادیوں کو ویران کرنے پر تلے ہوئے ہوں، ان کو مدد پہنچانا، یہ وہ اوصاف ہیں جن کے حامل بد طینت یہودیوں اور نصرانیوں سے بے تعلقی برتنے کا حکم دیا گیا ہے، غور کیجئے کہ کیا آج امریکہ وبرطانیہ ان جرائم کے مرتکب نہیں ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بوسنیا میں مسلمانوں کے قتل عام میں در پردہ برطانیہ نے ظالم سربوں کی مدد کی ہے، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آج ان ممالک کی جفا کاریوں اور ستم انگیزیوں کی وجہ سے افغانستان کے بے آسرا مسلمان اپنے گھر چھوڑنے پر مجبور ہیں؟ کیا یہ اس ظالم اسرائیل کے ناصر ومددگار نہیں ہیں، جو آئے دن بے قصور فلسطینی مسلمانوں کا قتل عام کرتے ہیں؟ اور جنھوں نے لاکھوں فلسطینیوں کو اپنے مادر وطن میں رہنے کے حق سے بھی محروم کر دیا ہے؟ قرآن نے جن یہود ونصاریٰ سے بے تعلق ہونے اور رشتۂ محبت کاٹ لینے کا حکم دیا ہے، ان مغربی طاقتوں میں ان میں سے کون سی بات نہیں پائی جاتی؟ پھر کیا ایسے اعداء دین سے بے تعلقی واجب نہ ہوگی؟

﴿لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ (الممتحنہ:۸)

اللہ تعالیٰ تمہیں ان غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف سے نہیں روکتا،

جنھوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہ کی ہو اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہ نکالا ہو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے ہیں۔

جو غیر مسلم بھائی انصاف کی روش پر قائم ہوں، وہ ہمارے انسانی بھائی ہیں اور ہمارے برادرانہ سلوک اور حسن اخلاق کے مستحق ہیں اور ان کے ساتھ زیادتی کسی طور جائز نہیں—— بے تعلقی کا حکم ان لوگوں سے ہے، جنھوں نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جارحانہ اور نا منصفانہ روش اختیار کر رکھی ہو، یہ سمجھنا کہ کسی خاص شخص کی حوالگی یا کسی خاص مطالبہ کی تکمیل مغربی طاقتوں کو مطمئن کر دے گی اور اسلام کے خلاف بغض وعناد کی جو آگ ان کے سینوں میں سلگی ہوئی ہے، اسے بجھانے میں کامیاب ہو جائے گی، محض ایک طفلانہ خیال ہے، اس عناد کا اصل نشانہ اسلامی فکر وعقیدہ، اسلامی تہذیب وثقافت اور مسلمانوں کا قبلۂ اول مسجدِ اقصیٰ ہے، قرآن نے یہود ونصاریٰ کی نفسیات اور ان کے اندرونی جذبات کی خوب ترجمانی کی ہے اور یہ بات جس قدر رسول اللہ ﷺ کے عہد میں مبنی بر واقعہ تھی، اسی قدر آج بھی ہے کہ:

﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ﴾ (البقرۃ:۱۲۰)

یہود ونصاری آپ سے اس وقت تک راضی ہو ہی نہیں سکتے، جب تک آپ ان کے دین کے پیرو نہ ہو جائیں، آپ کہہ دیجئے کہ ہدایت تو وہ ہے جو اللہ کی ہے، اگر آپ علم حاصل ہونے کے بعد بھی ان کی خواہشات کی پیروی کرنے لگیں تو آپ کے لئے اللہ کے مقابلہ کوئی حامی ومددگار نہ ہوگا۔

قرآن نے اس میں یہود ونصاری کے اندرونی جذبات کو کھول کر رکھ دیا ہے اور خلافتِ عثمانیہ کے سقوط سے اب تک عالم اسلام میں جو جنگیں ہوئی ہیں، وہ سب اس کے واضح شواہد ہیں، اس لئے جب تک مسلمان اپنے مذہبی تشخصات اور اپنے ثقافتی امتیازات کو خیر باد نہ کہہ دیں، مسجدِ اقصیٰ سے اور اپنے مقدسات سے دستبردار نہ ہو جائیں، اور پوری طرح مغربی فکر اور مغربی ثقافت کے سامنے جبین تسلیم خم نہ کر دیں، ان کی تشفی نہیں ہو سکتی اور انشاء اللہ مسلمان کبھی اس کے لئے تیار نہیں ہوں گے؛ اس

لئے کہ وہ دین کے لئے سب کچھ کھونے کو' 'پانا' 'اور اللہ کی راہ میں رگِ گلو کٹانے کو' 'جینا' ' تصور کرتے ہیں اور یہ ان کے ایمان وعقیدہ کا حصہ ہے!

اس پس منظر میں ہم مسلمانانِ ہند قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ ملک کی رائے عامہ کو حقیقت پسند بنائیں اور انھیں حقیقی صورتِ حال کا ادراک کرنے میں مدد دیں، منصف مزاج ہندو بھائیوں (جن کی آج بھی اس ملک میں اکثریت ہے) کو ساتھ لے کر حکومت ہند سے خواہش کریں کہ وہ اپنی ناوابستہ پالیسی پر قائم رہے اور امریکہ واسرائیل کی آنکھ بند کر کے حمایت نہ کرے، وہ اس بات کو ملحوظ رکھے کہ ہمارے ملک کا مفاد عربوں کے ساتھ بہتر تعلق میں ہے، نہ کہ اسرائیل جیسے خود غرض اور قلاش ملک کی تائید میں۔

اس کے ساتھ ساتھ ہم امریکہ اور اسرائیل کی تجارتی اشیاء کا بائیکاٹ کریں، جس کی فہرستیں بھی اخبارات اور سوشل میڈیا میں آچکی ہیں، کہ یہ بھی منکر پر ناراضگی کے اظہار اور ظالم سے بے تعلقی برتنے کا ایک مؤثر طریقہ ہے اور شرعاً بہ حیثیت مسلمان ہم اس بات کے مکلف ہیں کہ اس سلسلہ میں جو طریقہ اختیار کرنا ہمارے لئے ممکن ہو، ہم اس سے دریغ نہ کریں، بعض حضرات کہتے ہیں کہ صرف مسلمانوں کے بائیکاٹ کرنے سے ان کا کیا نقصان ہوگا؟ یہ درست نہیں ہے، اول تو اگر مسلم ممالک بھی اس بائیکاٹ میں شامل ہوجائیں تو اس کے غیر معمولی اثرات مرتب ہوں گے، دوسرے: مسئلہ ان کو نقصان پہنچنے اور پہنچنے کا نہیں ہے؛ بلکہ اپنی طرف سے اظہارِ ناراضگی کا ہے، کتنے ہی واقعات پیش آتے ہیں کہ خاندان میں اختلاف پیدا ہوا اور اس کی وجہ سے ایک دوسرے کی دعوت میں شرکت سے گریز کرنے لگے، یہاں تک بعض اوقات بات چیت بھی بند ہوجاتی ہے؛ حالاں کہ معلوم ہے کہ اس کے دعوت میں شریک نہ ہونے اور بات نہ کرنے سے دوسرے شخص کا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے؛ لیکن مقصود اپنے جذبات کا اظہار ہوتا ہے، یہی جذبہ یہاں بھی ہونا چاہئے، غرض کہ یہ انسانی فریضہ ہے، یہ شرعی ذمہ داری ہے اور حمیتِ ایمانی اور غیرت اسلامی للکار کر ہم سے پوچھ رہی ہے کہ کیا ہم اس کے لئے بھی تیار نہیں ہیں؟؟

مظلومین برما اور مسلمانوں کی ذمہ داریاں

رمضان المبارک ہم پر سایہ فگن ہے اور جو لوگ توفیق وسعادت سے بہرہ ور ہیں اور معذور نہیں ہیں، روزے رکھ کر اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہیں، کسی پولیس آفیسر کی نگرانی اور چوکیداری کے بغیر وہ صبح کی پَو پھٹنے سے لے کر سورج کی آنکھیں بند کرنے تک خوشی خوشی بھوکا پیاسا رہنا گوارہ کرتے ہیں، اس میں جہاں تربیت کے دوسرے پہلو ہیں، وہیں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دنیا میں بہت سے انسان غربت وافلاس سے گذر رہے ہیں، لاکھوں افراد فاقہ مستی اور غذائی قلت کا شکار ہیں، انسان جب خود بھوکا رہتا ہے، فاقوں کی کرواہٹ کو چکھتا ہے اور پیاسے رہنے کی تکلیف کو سہتا ہے، تو اس کے لئے دوسرے غریب بھائیوں کی تکلیف کا سمجھنا اور ان کی مشقتوں کا ادراک کرنا آسان ہوجاتا ہے، انسان جگ بیتی کو تو نظر انداز کرسکتا ہے؛ لیکن آپ بیتی سے پہلوتہی نہیں کرسکتا؛ اسی لئے ماہ مبارک کو ''شھر المواساۃ'' یعنی غم گساری کا مہینہ کہا گیا ہے؛ کیوں کہ جس انسان نے خود غم کو دیکھا ہو اور مصیبت وآزمائش سے گزرا ہو، وہی دوسروں کے غم کو سمجھ سکتا ہے اور اس کا مداوا کرسکتا ہے، بقول شاعر حقیقت شناس پروفیسر کلیم عاجز:

پریشاں کی پریشانی پریشاں خوب جانے ہے
پریشانی ہماری کا کل محبوب جانے ہے

غم گساری ودلداری تو عام حالات میں بھی ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے؛ لیکن جب مسلمانوں کا کوئی گروہ اس صورت حال سے گزر رہا ہو کہ اس کی جان ومال اور عزت وآبرو کو اجتماعی حیثیت میں حلال کرلیا گیا ہو، لوگ ان کے خون سے اپنی پیاس بجھاتے ہوں، ان کے سر سے گھر کا سایہ بھی چھین لیا جاتا ہو اور ان کی عزت وآبرو کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہو تو ایسے بے چارہ اور بے سہارا مسلمانوں کے لئے چارہ گری ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ بن جاتا ہے۔

اس وقت ہمارے ملک سے قریب میں واقع ملک ''برما'' میں مسلمانوں اور خاص کر روہنگیا مسلمانوں پر ظلم وجور کا جو بازار گرم ہے، وہ انسانیت سوزی کی بدترین مثال ہے، اس ملک میں قدیم

زمانے سے عرب اور برصغیر کے مسلمانوں کی آمد ورفت رہی ہے، برما کا ایک صوبہ ''اراکان''، مسلم اکثریت صوبہ ہے، یہ صدیوں سے ایک آزاد ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشہ پر موجود تھا، ۱۷۸۴ء میں برما کے راجہ بودھو پیہ نے اس ریاست پر زبردستی قبضہ کرلیا، پھر جب برطانیہ ایشیاء کو روندتے ہوئے برما تک پہنچا تو ۱۸۲۶ء میں اراکان پر برطانیہ کا قبضہ ہوگیا، پھر جب بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں برطانیہ نے مختلف ملکوں سے بوریا بستر لپیٹنا شروع کیا تو ۴؍جنوری ۱۹۴۸ء کو برمانے بھی آزادی حاصل کی؛ لیکن صلیبی دنیا چوں کہ مسلمانوں کو اپنا سب سے بڑا حریف خیال کرتی رہی ہے؛ اس لئے اس نے ہر جگہ مسلمانوں کے لئے کرب وآزمائش کا راستہ کھلا رکھنے کی منصوبہ بند کوشش کی، مسلم ملکوں کو آزاد کیا تو ان کے ٹکڑے کردئے اور ان میں سرحدوں کے جھگڑے پیدا کردیئے، ہندوستان کو اس طرح آزاد کیا کہ ملک دو ٹکڑوں میں بٹ گیا، ان کے درمیان بھی سرحد کے جھگڑے باقی رکھے گئے اور کشمیر کا ایک ایسا مسئلہ وجود میں لایا گیا، جو آج تک ہندو پاک اور کشمیر کے درمیان نفرت کا سبب بنا ہوا ہے۔

اسی طرح جب انہوں نے ۱۹۴۸ء میں برما کو اپنی غلامی سے آزاد کیا تو اراکان کے مسلمانوں کو برمی حکمرانوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر چلے گئے اور جلد ہی اراکان اور برمی حکومت کے درمیان آویزیشیں شروع ہوگئیں، پھر جب فوجی حکومت آئی تو اس نے مسلمانوں کا جینا دوبھر کردیا، مسلمانوں کو برما کی کوئی شناخت نہیں دی جاتی، وہ تعلیم حاصل نہیں کرسکتے، انہیں ایک قصبہ سے دوسرے قصبہ میں اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں جانے کی اجازت نہیں ہے، حکومت سے اجازت لئے بغیر کوئی مسلمان شادی نہیں کرسکتا اور ۳۰؍سال سے کم عمر لڑکیوں کو شادی کی اجازت نہیں دی جاتی، مسلمان عورتوں کی عزت وآبرو فوجیوں اور بودھ انتہا پسندوں کے لئے ایک کھلونا ہے، اب تو مسلم آبادیوں کے چاروں طرف خاردار تار نصب کردیا گیا ہے، گویا وہ اپنے وطن میں بھی قید کی حالت سے گزر رہے ہیں، اس وقت وہاں ایک مصنوعی واقعہ کو بہانہ بنا کر ظلم وجور کی جونئی لہر شروع ہوئی ہے، اس میں تقریباً دو ہزار مسلمان شہید کئے جاچکے ہیں، آبادیوں میں قتل عام جاری ہے، اولاد کے سامنے ماں باپ کو اور ماں باپ کے سامنے اولاد کو قتل کیا جارہا ہے، سینکڑوں مظلوموں کو سمندر میں غرق کردیا گیا ہے۔

مہاتما بدھ امن کے داعی تھے اور ان کی تعلیم تھی کہ تمہارے قدموں سے کیڑے مکوڑے بھی

کچلے نہ جائیں؛ لیکن عجیب بات ہے کہ گوتم بدھ کے ماننے والے ایسے ظلم و بربریت پر تلے ہوئے ہیں کہ انہیں دیکھ کر درندے بھی شرم سار ہوں گے، افسوسناک بات یہ ہے کہ مسلمانوں پر یہ مظالم حکومت کی نگرانی، فوج کے اشارہ اور پولیس کی شرکت کے ساتھ ہو رہے ہیں، جمہوریت کی علم بردار اپوزیشن لیڈر آون سان سوچی بھی اس واقعہ پر چپ سادھے ہوئی ہیں، امریکہ و یورپ جو اپنے آپ کو پوری دنیا میں امن کا ٹھیکہ دار سمجھتے ہیں اور عالمی فوجدار کی حیثیت سے آدھمکتے ہیں، وہ بھی اس مسئلہ پر بالکل خاموش ہیں، نہ انہوں نے برما کی حکومت پر کوئی دباؤ ڈالا اور نہ ان مظلوموں کے حق میں ہمدردی کے دو جملے کہے؛ بلکہ الٹا مغربی میڈیا اسے ایک طرفہ قتل عام کی بجائے گروہ واری لڑائی قرار دے رہا ہے۔

مگر دوسروں سے کیا شکوہ، اصل شکایت تو اپنوں سے ہے، اس وقت دنیا کے نقشہ پر چھوٹے بڑے ستاون مسلم ممالک موجود ہیں، یہ رقبہ کے اعتبار سے انسانی آبادی کی صلاحیتوں سے مالا مال بڑے خطے کے مالک ہیں، نہایت زرخیز زمینیں، غیر معمولی اہمیت کی حامل آبی گزرگاہیں، بے پناہ قدرتی وسائل ان کے پاس موجود ہیں؛ لیکن ان کی بے حسی اور بے حمیتی کا حال یہ ہے کہ یہ سب کے سب مہر بلب ہیں، یہ اقوام متحدہ کا اجلاس بلا سکتے ہیں، یہ سلامتی کونسل کی مٹنگ طلب کرا سکتے ہیں، یہ چین اور ایسے ملکوں کے ذریعہ برما پر دباؤ ڈال سکتے ہیں، جو ان کے قریبی حلیف ہیں، یہ اپنے اپنے ملکوں میں برمی سفارتخانوں میں احتجاج درج کرا سکتے ہیں اور نہ ماننے کی شکل میں ان سے سفارتی تعلقات منقطع کر سکتے ہیں، ان کا معاشی بائیکاٹ کر سکتے ہیں، آسیان ممالک کی تنظیم کے ذریعہ برما پر دباؤ ڈال سکتے ہیں، جن میں کئی مسلم ممالک شامل ہیں، وہ امریکہ اور یورپ کے تھانے داروں سے کہہ سکتے ہیں کہ یہاں بھی انسانی حقوق کا تحفظ کریں؛ لیکن افسوس کہ عالم اسلام میں ایسا سناٹا ہے کہ گویا کوئی مسئلہ ہی پیش نہ آیا ہو۔

اس سلسلہ میں سب سے افسوس ناک رویہ ''بنگلہ دیش'' کا ہے، برما کے مظلوم اور مقہور مسلمان جب بنگلہ دیش کی سرحد کی طرف بڑھتے ہیں تو انہیں واپس دھکیل دیا جاتا ہے، تشدد کی تازہ لہر کے بعد ۳۰؍ ہزار برمی مسلمانوں نے خستہ حال کشتیوں کے ذریعہ بنگلہ دیش جانے کی کوشش کی تو بنگلہ دیش کے سرحدی محافظین نے انہیں نہایت بے رحمی کے ساتھ واپس کر دیا؛ حالاں کہ خود بنگلہ دیش کے لوگ دنیا بھر میں بسے ہوئے ہیں اور مسلم ممالک سے بہت زیادہ مدد حاصل کرنے والے ملکوں میں سے ایک

بنگلہ دیش ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اس اخوت کا تقاضا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر ظلم نہ کرے، ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر ظلم ہوتا ہوا چھوڑ نہ دے جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی ضرورت کو پوری کرتا ہے، اللہ اس کی ضرورت کو پوری فرماتے ہیں، جو شخص دنیا میں کسی مسلمان کی مصیبت کو دور کرے گا، اللہ آخرت میں اس کی مصیبت کو دور فرمائیں گے، جو دنیا میں کسی مسلمان کی کوتاہی پر پردہ رکھے گا اور اس کے عیب کو چھپائے گا، اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کی کوتاہیوں پر پردہ رکھ دیں گے: "**المسلم أخو المسلم لا يظلمه و لا يسلمه، و من كان في حاجة أخيه كان الله في حاجته، و من فرّج عن مسلم كربة فرج الله عنه كربة من كربات يوم القيامة، و من ستر مسلما ستره الله يوم القيامة**" (**صحيح البخاري، كتاب المظالم و الغصب، باب لا يظلم المسلم المسلم و لا يسلمه**، حدیث نمبر: ۲۲۶۲)۔

اس وقت عالم اسلام میں عموماً اور امت مسلمہ میں خصوصاً سب سے بڑا فتنہ وطنیت پرستی کا در آیا ہے، بہ قول علامہ اقبالؒ:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے!

ایک ہی مذہب، ایک ہی زبان اور ایک ہی نسل سے تعلق رکھنے والے جغرافیائی تقسیم کی بنیاد پر اس طرح بٹ گئے ہیں کہ گویا ان میں کوئی رشتہ ہی نہ ہو، خلیج کی چھوٹی چھوٹی بے اثر اور بے وزن ریاستوں کو دیکھئے کہ وہ کس قدر ایک دوسرے سے خلش رکھتی ہیں اور تقسیم در تقسیم کے باوجود سرحدوں کے جھگڑے ابھی بھی موجود ہیں، پڑوسی ملک پاکستان کا حال دیکھئے، اس ملک کی رسوائی اور بے وزنی نہایت قابل رحم ہے، اور اب کٹ کٹا کر چھوٹا سا ملک ہی باقی رہ گیا ہے؛ لیکن پھر بھی صوبوں کے جھگڑے اپنے شباب پر ہیں، خود ہمارے ملک ہندوستان کے بعض علاقوں میں مختلف صوبوں، یہاں تک کے مختلف ضلعوں اور مختلف شہروں کے درمیان بھی ایک تقسیم قائم ہے اور یہ تقسیم باہمی نفرت اور ایک دوسرے کے مسائل سے بے اعتنائی کو جنم دے رہی ہے، یہ مغرب کی طرف سے مسلمانوں میں داخل کیا ہوا ایک منصوبہ بند فتنہ ہے کہ اس آفاقی اور عالمی امت کو علاقہ کے نام پر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان کی وحدت کو توڑ دیا جائے، یہی وطنیت پرستی ہے جو اس وقت برما کے

مسلمانوں کی مظلومیت میں اضافہ کررہی ہے، ورنہ اگر بنگلہ دیش، انڈونیشیا، ملیشیا اور برونائی جیسے ممالک —— جو برما سے قریب ہیں —— وہ ان مسلمانوں کو پناہ دے دیتے تو وہ اس طرح بے آبرو نہ ہوتے؛ بلکہ برونائی جیسے کم آبادی والے ممالک کے افرادی وسائل میں اضافہ ہوتا اور انڈونیشیا اور ملیشیا انہیں بسا کر مسلم آبادی کے گھٹتے ہوئے تناسب میں اضافہ کرسکتے تھے۔

ہندوستان کے مسلمان یقیناً اپنے برمی مسلمان بھائیوں کی کوئی بڑی مدد نہیں کرسکتے؛ لیکن وہ برما کے سفارت خانے پر احتجاج کرسکتے ہیں، یہاں کی بدھسٹ کمیونٹی سے رابطہ کرکے ان کے ذریعہ دباؤ ڈالوا سکتے ہیں، دلائی لاما سے کہہ سکتے ہیں کہ انسانی بنیادوں پر وہ برما کے ظالموں کے نام اپنی اپیل جاری کریں، حکومت ہند سے اپیل کرسکتے ہیں کہ وہ برما پر اپنے اثر ورسوخ کا استعمال کرے، برما کے بہت سے مسلمان شہری وہ ہیں، جو ہندوستان سے وہاں گئے، اگر ہندوستان ماریشش اور فیجی کے ہندوستان نژاد ہندوؤں کے بارے میں دلچسپی لے سکتی ہے تو برما کے ہندوستانی نژاد مسلمانوں کے بارے میں کیوں نہیں؟ امریکہ اور یوروپی ملکوں کے سفارتخانوں سے بھی اس طرح کی خواہش کی جاسکتی ہے، ذرائع ابلاغ تک اپنی بات پہنچا کر رائے عامہ کو بیدار کیا جاسکتا ہے، بنگلہ دیش اور آسیان کے مسلم ملکوں سے اپیل کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے ملکوں میں ان مظلوموں کو پناہ دیں، کاش! ہم رمضان المبارک کے اس مبارک مہینے میں برما کے مظلوموں کی آہ وفغاں سن سکیں اور ہم اپنے ان ستم رسیدہ بھائیوں تک محبت وہمدردی کی کوئی سوغات پہنچا سکیں!

ایران میں اہل سنت پر ظلم وجور

دنیا کا کوئی بھی گروہ اس کے بغیر پُر امن زندگی نہیں گزار سکتا کہ وہاں حکومت کا نظام قائم ہو، جو انصاف کو قائم کرنے، امن برقرار رکھنے اور اس علاقہ وگروہ کو لاقانونیت سے بچانے کا فریضہ انجام دیتی ہو؛ کیونکہ حکومت ہی سماج میں رہنے والے افراد، خاندانوں اور مختلف مذہبی وسماجی گروہوں کو جوڑ کر رکھتی ہے اور نہ صرف ان کو باہم ایک دوسرے پر ظلم وتعدی سے روکتی ہے، عدل قائم کرتی ہے؛ بلکہ بیرونی دشمنوں سے بھی تحفظ کا فریضہ انجام دیتی ہے، اور عوام کی بہت سی ضروریات کو پورا کرتی ہے؛ اس لئے قدیم ترین معلوم تاریخ سے انسانی سماج میں حکومت کا نظام قائم رہا ہے، موجودہ دور میں صنعتی ترقی، تجارتی مسابقت، کچھ افراد اور گروہوں میں ملک کی دولت کے بڑے حصہ کا ارتکاز اور پسماندہ طبقات کے لئے رعایتوں کی ضرورت، نیز ملکوں اور قوموں کے باہمی تعلقات میں فروغ کی وجہ سے حکومتی نظام کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے، ایک اچھی حکومت کے بغیر کوئی ملک معاشی ترقی نہیں کرسکتا، عوامی مسائل اچھے حکمرانوں کے بغیر حل نہیں ہو سکتے، اور بین الاقوامی سطح پر ملک کو سربلندی حاصل نہیں ہوسکتی۔

اسلام میں اسی لئے نظام حکومت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں حکومت کا خصوصی کردار رکھا گیا ہے، یہاں تک کہ عبادات میں بھی؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء نے عیدین اور جمعہ کے قیام کے لئے سلطان کی اجازت کو ضروری قرار دیا ہے، چاند کے دیکھنے کا اعلان کرنا اور اس کے مطابق رمضان المبارک یا عید و بقرعید کا فیصلہ کرنا اصل میں حکومت کا حق ہے، زکوۃ وصول کرنے کا حق بھی ایسی اسلامی حکومت کو دیا گیا ہے، جہاں بیت المال قائم ہو اور کتاب وسنت کی ہدایات کے مطابق وہ زکوۃ وصول کرنے اور اس کے مصرف میں خرچ کرنے کا اہتمام کرتی ہو، حج بھی مسلمانوں کے امیر کی امارت میں ہونا چاہئے، اوقاف کی نگرانی بھی حکومت کی ذمہ داری ہے، یہاں تک کہ نماز کی امامت بھی — اگر حکومت کی نمائندہ شخصیت موجود ہو اور وہ امامت کرنے کی اہل ہو تو — اس کا حق ہے؛ اسی لئے خلفاء راشدین خود امامت فرمایا کرتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر جو اتفاق ہوا، اس میں صحابہ کی نظر میں یہ بات بڑی اہم قرار پائی کہ آپ

ﷺ نے مرض وفات کے درمیان اپنی زندگی ہی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے امامت کرائی تھی، خود انسان کی شخصی زندگی میں غور کیا جائے تو کسی قریبی رشتہ دار کے موجود نہ ہونے کی صورت میں حکومت کو ''حق ولایت'' سونپا گیا ہے، اور اگر شوہر بیوی کے ساتھ زیادتی کرتا ہو اور اسے رشتۂ نکاح سے آزاد بھی نہ کرتا ہو تو شوہر کی رضامندی کے بغیر فسخ نکاح کا حق حکومت کو حاصل ہے، غرض کہ اسلام میں نظام حکومت کے درست ہونے، مستحکم ہونے اور فعال ہونے کی ہمہ جہت لحاظ سے اہمیت ہے۔

اسلام کی نظر میں اسلامی حکومت کے دو اہم مقاصد ہیں، ایک: مسلمانوں کی اجتماعیت کا تحفظ، جیسے نماز میں امام تمام مقتدیوں کو مجتمع رکھتا ہے اور اس کے پیچھے تمام نمازی قدم سے قدم اور کاندھے سے کاندھے ملا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور نمازیوں کے قول وفعل میں یکسانیت، ان کی وحدت اور نظم و ضبط کو ظاہر کرتی ہے، اسی طرح حکومت نظام زندگی کے تمام شعبوں میں مسلمانوں کی اجتماعیت اور ان کی صفوں میں وحدت کا مظہر ہوتی ہے، اسی لئے حضرت عمرؓ کا مشہور قول ہے کہ اجتماعیت کے بغیر اسلام اپنے تمام شعبوں کے ساتھ نافذ نہیں ہو سکتا اور حکومت کے بغیر جماعت وجود میں نہیں آسکتی، ''لا إسلام إلا بجماعة و لا جماعة إلا بإمارة'' — حکومت کا دوسرا اہم مقصد عدل وانصاف کو قائم کرنا اور لوگوں کو ظلم وتعدی سے بچانا ہے، جو حکومت انصاف قائم کرنے سے قاصر ہو اور جس میں ظالموں کا پنجہ تھامنے کی صلاحیت نہ ہو، وہ اس لائق نہیں ہے کہ تخت اقتدار پر براجمان رہے؛ اسی لئے آپ ﷺ نے ایسے امیر پر لعنت کی ہے جو انصاف قائم کرنے سے مجبور و عاجز ہو۔

حکومت کی اصل طاقت اس کی عوام ہوتی ہے، حکومت کے پیچھے عوام کی طاقت نہ ہو تو نہ وہ عوام کے ساتھ انصاف کر سکتی ہے اور نہ اپنے خارجی دشمنوں سے مقابلہ کر سکتی ہے، اس مقصد کے لئے شریعت اسلامی نے ایک طرف بادشاہت کی بجائے خلافت کا نظام رکھا، خلیفہ اور بادشاہ میں چند بنیادی فرق ہے، خلیفہ مسلمانوں کا منتخب شخص ہوتا ہے اور بادشاہ یا ڈکٹیٹر خاندانی روایت یا فوجی طاقت کے ذریعہ ملک وقوم پر مسلط ہو جاتا ہے، خلیفہ اپنے فیصلوں میں قوم کے مشوروں کا پابند ہوتا ہے ﴿وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ﴾ (شوریٰ: ۸۳)، بادشاہ اور ڈکٹیٹر کو اس کی ضرورت نہیں، وہ اپنی سوچ اور زبان کو حرف آخر تصور کرتا ہے، خلیفہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ با کردار بھی ہو اور اس کی زندگی کا دامن فسق و فجور اور ظلم وتعدی سے داغدار نہ ہو، بادشاہ اور ڈکٹیٹر کے لئے اس کی ضرورت نہیں، قاتل،

زانی، چور، لٹیرا، کوئی بھی شخص بادشاہ اور آمر بن سکتا ہے، بادشاہت کی بجائے خلافت کا نظام اسی لئے رکھا گیا ہے کہ اس میں حکمراں کو عوام کی محبت حاصل ہوتی ہے اور وہ جذبۂ وفاداری کے ساتھ حکومت کے دست وباز وہوتے ہیں، آمرانہ نظام میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔

دوسری طرف شریعت نے عوام کو حکمراں کی اطاعت وفرمانبرداری کا حکم دیا ہے، آپ ﷺ نے ہدایت دی کہ حکمراں کا فیصلہ مزاج کے مطابق ہو یا نہ ہو، ہر حال میں اطاعت کرنی چاہئے؛ کیونکہ اس کے بغیر کسی حکومت کو استحکام حاصل نہیں ہوسکتا، اور نہ عوامی تائید واطاعت کے بغیر کوئی حکومت طاقتور ہوسکتی ہے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کی اطاعت کا بھی حکم دیا ہے: ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء:۵۹)

اسلام کی ان بنیادی تعلیمات کی روشنی میں عالم عرب میں حکمرانوں کے خلاف برپا ہونے والی تحریکات کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے، تیونس سے وہاں کے ڈکٹیٹر زین العابدین بن علی ڈھیر ساری دولت لے کر بھاگ کھڑے ہوئے، مصر میں حسنی مبارک خاصی کشمکش اور فوج کے تعاون سے محروم ہونے کے بعد اس وقت نظر بندی کی حالت میں ہیں، انہوں نے اسلام پسندوں پر ایسے ظلم وجور کئے ہیں کہ انہیں سو بار زندہ کیا جائے اور سولی پر چڑھایا جائے تب بھی ان کے گناہوں کا کفارہ ادا نہیں ہوسکتا، یمن میں بغاوت کی چنگاری آتش فشاں بن چکی ہے اور موجودہ ڈکٹیٹر بار بار زبان بدل کر اپنے اقتدار کو بچانے میں لگے ہیں، اور عوامی غیظ وغضب کے نشانہ پر ہیں، لیبیا کا خود ساختہ مردآہن کرنل قذافی اپنی ہی عوام کے خلاف ملک کے ہتھیار کا استعمال کر رہے ہیں، عملاً ملک کی پوری دولت پر ان کا اور ان کے بچوں کا قبضہ ہے، اس شخص کو جتنی نفرت اسلام سے ہے، شاید کسی اور چیز سے ہو، اس نے قرآن وحدیث کو اپنا رہنما بنانے کی بجائے اپنی ہی لکھی ہوئی کتاب ''الکتاب الاخضر'' کو ملک کے دستور کی حیثیت دے رکھی ہے، اللہ تعالیٰ جلد اس مجنون سے لیبیا کی عوام کو نجات دلائے، سب سے تکلیف دہ صورت حال شام کی ہے، جہاں نصیری اور دروزی تخت اقتدار کو ہتھیائے ہوئے ہیں، موجودہ حکمراں بشار الاسد کے باپ حافظ الاسد نے بھی ہزاروں علماء اہل سنت کو شہید کیا تھا، اور دینی مدارس ومراکز کو برباد کیا تھا، موجودہ حکمراں اپنی بدبختی اور ظلم وشقاوت میں باپ سے آگے نہ ہو تو پیچھے بھی نہیں۔

افسوس اس بات پر ہے کہ ایران کی موجودہ حکومت اسلام کے نام پر وجود میں آئی، نہ صرف

اہل تشیع بلکہ اہل سنت کی بھی بعض نمائندہ شخصیتوں نے اس پہلو سے اس کا استقبال کیا اور بڑی امیدیں باندھی گئیں، مگر افسوس کہ یہ ساری امیدیں خاک میں ملتی ہوئی نظر آتی ہیں، اندرون ملک عدل و انصاف کا یہ حال ہے کہ تہران میں بیس فیصد اہل سنت ہیں، لیکن وہ اپنی مسجد تعمیر نہیں کر سکتے، جناب خامنہ ای کے اپنے وطن میں بلا کسی جواز کے اہل سنت کی ''مکی مسجد'' شہید کر دی گئی، ایران کے ٹیلی ویژن پر اب بھی صحابہ کرام اور امہات المؤمنین پر سب وشتم کا سلسلہ جاری ہے، خارجہ پالیسی کا حال یہ ہے کہ اکثر مبصرین کی رائے کے مطابق عراق وافغانستان میں امریکی تسلط کے پیچھے ایران کی خفیہ تائید کارفرما تھی، لیکن بہرحال اس کے بارے میں یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جاسکتی، لیکن اس وقت ایک عجیب اور تکلیف دہ صورت حال یہ ہے کہ بحرین میں چونکہ حکومت کی مخالفت میں پیش پیش شیعہ ہیں اور ان کی آبادی بہ مقابلہ سنیوں کے پانچ دس فیصد زیادہ ہے، اس لئے ایران وہاں کھل کر احتجاج کرنے والوں کے ساتھ ہے اور شام میں نوے فیصد باشندگان ملک- جو اہل سنت ہیں -کو غلام بنا کر رکھا گیا ہے، لیکن ایران وہاں حکومت کے ساتھ ہے، شام میں مسلمانوں پر جس درجہ مظالم ہو رہے ہیں اور ان کا قتل عام ہو رہا ہے، ان کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا، اور ذرائع ابلاغ پر پابندی کی وجہ سے اخبارات میں یہ خبریں نہیں آ رہی ہیں، اس دوعملی کی وجہ سے ایران کا وحدت اسلامی کا نعرہ ایک سراب نظر آتا ہے۔

حکمرانوں کا کیا رونا رویا جائے کہ عالم اسلام پر عموماً جرم پیشہ بادشاہوں اور بدترین ڈکٹیٹروں کا تسلط ہے، سعودی عرب کے سوا نہ کہیں شرعی قوانین کا پاس ولحاظ ہے اور نہ وہاں اسلامی شعائر نظر آتے ہیں؛ بلکہ بعض اسلامی ملکوں میں ڈاڑھی اور نقاب پر بھی پابندی ہے، لیکن افسوس علماء اور سرکاری مفتیوں پر ہوتا ہے، شیخ یوسف القرضاوی نے بجا طور پر مصر کے قضیہ کے پس منظر میں حکومت کے خلاف بغاوت کو درست قرار دیا ہے، لیکن مصر کے ایک حکومت پروردہ عالم نے خود شیخ قرضاوی کے خلاف کفر اور قتل کا فتوی جاری کر دیا، اس سے بھی زیادہ قابل تعجب بعض سعودی مفتیوں کا فتوی ہے، جنہوں نے ڈکٹیٹر حکمرانوں کے خلاف مسلمان عوام کی بغاوت کو نادرست ٹھہرایا ہے، اس کو فساد فی الارض قرار دیا ہے اور اطاعت امیر کی دہائی دی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہر حال میں حکمراں کی اطاعت واجب ہے؟ -اسلام نے اطاعت امیر کا حکم

دیا ہے نہ کہ اطاعت آمر کا، امیر مسلمانوں کی رضا سے منتخب ہونے والا حکمراں ''امیر'' ہے، جسے ''خلیفہ'' کہتے ہیں اور آمر ازخود مسلط ہوجانے والا ڈکٹیٹر ہے، فقہاء نے اسی لئے امارت کی دو قسمیں کی ہیں؛ امارت عادلہ اور امارت قاہرہ، امارت عادلہ یہ ہے کہ شرعی اصولوں کے مطابق کوئی شخص حکمراں ہو اور امارت قاہرہ زبردستی قائم ہوجانے والی حکومت کو کہتے ہیں، امارت عادلہ کی اطاعت واجب ہے اور امارت قاہرہ کی اطاعت ہر حال میں واجب نہیں، اگر چہ کہ حکومتی نظم ونسق کے سلسلہ میں شرعاً اس کے تصرفات قابل قبول سمجھے جاتے ہیں؛ کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو ملک میں امن وامان اور نظم وضبط کا قیام مشکل ہوجائے گا؛ لیکن بشرط استطاعت و طاقت ایسی حکومت کے خلاف بغاوت کرنا بعض صورتوں میں جائز اور بعض میں واجب ہے، نواسۂ رسول ﷺ سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا عمل اس کی واضح شہادت ہے، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ امام جعفر صادقؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور متعدد علماء سلف کی نہ صرف حکومت وقت سے مزاحمت رہی؛ بلکہ انہوں نے باغیوں کا تعاون بھی کیا؛ اس لئے جو لوگ زبردستی حکمراں بن بیٹھے ہوں؛ ان کے خلاف پرامن بغاوت کو نادرست قرار دینا ہرگز درست نہیں ہے۔

دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ امیر کی اطاعت وفرمانبرداری کن باتوں میں ہے؟ جو حکمراں شریعت کے خلاف احکام دیتے ہوں، اور جنہوں نے بے حیائی اور فسق وفجور کا لائسنس دے رکھا ہو، بلکہ جو مسلمانوں کو کتاب وسنت پر عمل کرنے سے روکتے ہوں اور اسوۂ رسول ﷺ کو اختیار کرنا ان کے نزدیک قابل نفرت اور لائق سرزنش عمل ہو، کیا ان کی بھی اطاعت واجب ہے؟ قرآن میں کتنے ہی مقامات پر ''منکر'' یعنی خلاف شریعت باتوں سے روکنے کا حکم دیا گیا ہے، اور بدترین منکر وہ ہے جس کا ظہور ارباب اقتدار کی طرف سے ہو؛ کیونکہ حکومت کا عمل رعایا کے لئے آئیڈیل بن جاتا ہے، تو کیا ان کے خلاف پُرامن احتجاج کرنا بھی جائز نہیں ہوگا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا بہترین جہاد ہے: ''**أفضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر**'' (ابن ماجہ، ابواب الفتن، حدیث: ۴۰۱۱)، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ بری بات کو کھلے عام کہنا بہتر نہیں؛ لیکن اس سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو مظلوم ہوں؛ کہ ان کو ظالم کے خلاف احتجاج کا اور ان کے مظالم کو بیان کرنے کا حق حاصل ہے ﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ﴾ (النساء:

۱۴۸) آخر یہ احکام کس دن کے لئے ہیں اور کن حالات پر ان کا اطلاق ہوگا؟

رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ جب تم کسی برائی کو دیکھو تو اسے پہلے ہاتھ سے روکو، پھر زبان سے روکو، اگر یہ ممکن نہ ہو تو دل میں عزم رکھو کہ جب طاقت حاصل ہوگی تو اس کے خلاف آواز اٹھائیں گے، "**من رأى منكم منكرا فاستطاع أن يغيره بيده فليغيره فإن لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه**" (**ابن ماجه، ابواب الفتن،** حدیث نمبر: ۴۰۶۲)، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنے بھائی کی مدد کرو، ظالم ہو یا مظلوم، صحابہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! مظلوموں کی تو ہم مدد کریں گے، مگر ظالموں کی مدد کیوں کر کی جائے؟ آپ ﷺ نے ارشادفرمایا: ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کے ہاتھ تھام لو اور اس کو ظلم سے باز رکھو '**تاخذ فوق يديه**" (**بخاری مع فتح الباری: ۹۸/۵ کتاب المظالم**)۔ اب اگر علماء اور ارباب افتاء کہنے لگیں کہ ظالم کے ہاتھ تھامنے کے بجائے اس کو اور مضبوط کرو اور برائی کے خلاف زبان کھولنے کی بجائے اس کی شاباشی دو تو سوچئے کہ دین وشریعت کے ساتھ یہ کتنا بڑا ظلم ہوگا؟

عالم اسلام اور خاص کر عالم عرب پر ڈکٹیٹر حکمرانوں کے تسلط کی وجہ سے امریکہ، یورپ اور اسلام دشمن طاقتوں کو اپنے کٹھ پتلی حکمرانوں کو تخت اقتدار پر بٹھانے، ان کو اسلام کے خلاف قانون بنوانے اور مسلمان عوام کو بالواسطہ غلام بنا کر رکھنے کا موقع ملتا ہے، اسی چیز نے مشرق وسطی کے قلب میں اسرائیل کو طاقتور کینسر بنا دیا ہے، ایک ایسا کینسر جسے نا قابل علاج سمجھا جاتا ہے، صورت حال یہ ہے کہ مشرق وسطی کے عوام کو بجا طور پر یہودیوں سے نفرت اور فلسطینیوں سے محبت ہے؛ لیکن ان حکمرانوں کے اسرائیل کے ساتھ خفیہ تعلقات ہیں، اسرائیل نے تو فلسطینیوں پر عرصہ حیات تنگ کر کے بین الاقوامی قوانین کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے کنکریٹ کی دیوار تعمیر کی اور حسنی مبارک نے اپنے نامہ اعمال کو سیاہ سے سیاہ تر کرنے کے لئے آہنی دیوار چن دی اور فلسطینی بچوں کو دودھ کے ایک ایک قطرہ کے لئے ترسا دیا، اگر ایسے ظالموں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کو ناجائز قرار دیا جائے تو یہ یقیناً ظلم میں حصہ دار بننے کے مترادف ہے، اس سے بڑھ کر گناہ (اثم) اور ظلم (عدوان) میں تعاون کیا ہوگا؟

بظاہر یہ ممالک آزاد سمجھے جاتے ہیں اور یورپ سے آزادی کا قومی دن بھی مناتے ہیں؛ لیکن

حقیقت میں یہاں کے حکمراں مغرب کے غلامِ بے دام ہیں اورعوام آزادی کے نام پر اپنے آپ حکمرانوں کی بدترین غلامی میں مبتلا ہیں، ان مظلوم عوام سے ایک مسلمان اور دین کے مزاج شناس کا یہی پیغام ہوسکتا ہے کہ:

ایسی آزادی غلامی بھی ہو جس پر دم بخود
ایسی آزادی سے اب آزاد ہونا چاہئے

شام میں جور و جفا کی دوپہر

جس علاقہ کو ’’شرق اوسط‘‘ کہا جاتا ہے، وہ دنیا کی معلوم تاریخ میں انبیاء کرام کا مسکن ہونے کے لحاظ سے نہایت اہم اور مبارک خطہ ہے، عراق، فلسطین، شام، مصر اور حجاز مقدس وہ علاقے ہیں، جن کو زیادہ تر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغام کے نزول اور اس کی اشاعت کے لئے منتخب فرمایا ہے، ان میں شام کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص توجہ تھی، چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد جب آپ نے حجاز اور جزیرۃ العرب کے باہر اسلام کی دعوت واشاعت کی مہم شروع فرمائی تو خاص طور پر شام کو اپنا نمائندہ بھیجا، جو اس وقت ایک عیسائی ملک تھا، اور رومیوں کے زیر اقتدار تھا، جن شاہان مملکت کو خطوط لکھے گئے، ان میں حبش کے بادشاہ نجاشی کا رویہ تو سب سے بہتر رہا اور انہوں نے اسلام بھی قبول کرلیا؛ لیکن روم کے فرماں روا ’ہرقل‘ کا رویہ بھی بڑی حد تک مثبت رہا؛ اگرچہ اقتدار کی حرص اور فرماں روائی سے محروم ہوجانے کے خوف نے اسے دولت ایمان سے محروم رکھا؛ لیکن اس نے بھی آپ کے نمائندہ کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور اسے یقین ہوگیا کہ آپ نبی برحق ہیں اور آپ کی دعوت پر لبیک کہنے ہی میں خیر ہے، حدیث کی کتابوں میں تفصیل سے اس کا ذکر موجود ہے، بادشاہِ روم کے اس رویہ کو اس لئے خاص اہمیت حاصل تھی کہ اس وقت وہ دنیا کی دو سوپر طاقتوں میں سے ایک تھا، اور اپنے حریف یعنی ایرانی مملکت پر بھی اسے غلبہ حاصل ہو چکا تھا، گویا وہ اس وقت دنیا کی طاقتورترین حکومت تھی۔

اہل کتاب کی حکومت ہونے کی وجہ سے اس وقت کی دو بڑی طاقتوں —— ایران اور روم —— میں سے رومیوں کی طرف مسلمانوں کا رجحان تھا، ان کی فتح مندی مسلمانوں کے لئے خوشی کا اور شکست رنج کا باعث ہوتی تھی، اسی پس منظر میں قرآن مجید کی سورۂ روم کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں، یہ آیات مکہ میں اتریں، جب کہ ایرانیوں کو رومیوں پر غلبہ حاصل ہوگیا تھا، اس میں پیشین گوئی فرمائی گئی کہ چند سال کے اندر ہی رومیوں کو غلبہ حاصل ہوجائے گا؛ چنانچہ یہ پیشین گوئی اس شان سے پوری ہوئی کہ نہ صرف رومیوں نے اپنی مملکت کے مفتوحہ علاقے واپس حاصل کرلئے؛ بلکہ وہ ایران کے بھی بعض علاقوں پر قابض ہوگئے، جزیرۃ العرب کے مغرب میں یہی رومی سلطنت تھی، جس کا پایۂ تخت شام تھا اور

مشرق میں ایرانی سلطنت تھی، اسلام کے عالمی سطح پر غالب ہونے کے لئے ضروری تھا کہ مسلمان ان دونوں حکومتوں کو زیر کریں؛ لیکن آپ نے پہلے شام کی طرف قدم بڑھایا اور ۹ھ میں تبوک کے مقام پر رومیوں سے جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی، پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں بیت المقدس فتح ہوا اور بہ تدریج شام کے بہ شمول پوری رومی مملکت اسلام کے زیر سایہ آ گئی، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی نظر میں اس خطہ کو کس قدر اہمیت حاصل تھی؟

شام کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا بھی فرمائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! ہمارے لئے ہمارے شام میں اور ہمارے یمن میں برکت عطا فرما، لوگوں نے کہا: ہمارے نجد میں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبار شام اور یمن کے بارے میں دعاء کے کلمات ارشاد فرمائے، لوگوں نے پھر نجد کا ذکر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہاں زلزلے آئیں گے، وہاں سے فتنے اٹھیں گے اور وہیں سے شیطان کی سینگ طلوع ہوگی، (بخاری، عن ابن عمر، حدیث نمبر: ۷۱۰۳) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ جیسے مدینہ کی طرف ہجرت ہوئی ہے، ویسی ہی ایک اور ہجرت ہوگی اور یہ ہجرت وہاں ہوگی، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت فرمائی تھی، یعنی شام، وہاں ہجرت کرنے والے لوگ زمین کے سب سے نیک لوگ ہوں گے: **"ستكون هجرة بعد هجرة، فخيار أهل الأرض ألزمهم مهاجر إبراهيم"** (ابوداؤد، عن ابن عمر، حدیث نمبر: ۲۴۸۲)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا، جب تین بڑی فوجیں اٹھ کھڑی ہوں گی: شام کی، یمن کی اور عراق کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی عبداللہ بن حوالہ ازدی رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ اگر ہم لوگ اس وقت کو پالیں تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شام کا ساتھ دینا چاہئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بہترین سرزمین ہے اور اللہ کے نیک بندے سمٹ کر وہاں چلے جائیں گے: **"عليك بالشام، فإنها خيرة الله من أرضه، يجتبي إليها خيرته من عباده"** (ابوداؤد، عن ابن حوالہ، حدیث نمبر: ۲۴۸۳)، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت مسیح علیہ السلام جب زمین پر اتریں گے تو آپ کا نزول دمشق کی مسجد میں ایک سفید مینارے کے پاس ہوگا، (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۷۳۹۲)، قیامت کی علامتوں میں سے یہ بھی ہے کہ ایک آگ "حضر موت" سے نکلے گی اور لوگوں کو ہنکاتے ہوئے لے جائے گی، اس وقت تم لوگ شام کی پناہ

لو: ''**عليكم بالشام**'' (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر: ۷۳۰۵)— جہاں شام ایک مبارک جگہ ہے اور وہاں قیامت کے قریب اللہ کے مقبول بندے جمع ہوجائیں گے، وہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ جب اہل شام میں بگاڑ پیدا ہوجائے گا تو پھر تمہارے اندر خیر باقی نہیں رہے گا: ''**إذا فسد أهل الشام فلا خير فيكم**'' (سنن ترمذی، عن قرۃ، حدیث نمبر: ۲۱۹۲) یہ پیشین گوئیاں اصل میں قیامت سے متعلق ہیں۔ غرض کہ مملکت شام میں رہنے والوں کے ساتھ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں ہیں، قیامت کے قریب حق وباطل کا آخری معرکہ شام ہی میں ہوگا، جس میں آخری فتح حق کو حاصل ہوگی اور یہ معرکہ حضرت عیسی علیہ السلام کے نزول کے بعد ہوگا؛ اس لئے شام شروع سے اہل ایمان کی محبت کی سرزمین رہی ہے اور جب سے یہ علاقہ اسلام کے زیر نگیں آیا ہے، تب سے آج تک اس کی قسمت مسلمانوں سے مربوط رہی ہے۔

افسوس کہ ایسے بابرکت ملک میں مدتوں سے ایک بد دین، خدا ناترس، کمیونسٹ، ڈکٹیٹر خاندان برسراقتدار ہے، یہ حکومت قہر وتغلب اور زور زبردستی سے وجود میں آئی ہے، اور مذہب دشمن سیاسی تنظیم ''بعث پارٹی'' کی نمائندگی کرتی ہے، جو اصل میں عالم عرب میں کمیونسٹ پارٹی کا چربہ ہے، حکمرانوں کا تعلق ''فرقۂ نصیریہ'' سے ہے، اس فرقہ کا بانی محمد بن نصیر بصری نمیری (م: ۲۷۰ھ) ہے، انہوں نے علی ہادی، حسن عسکری، ائمہ شیعہ کا زمانہ پایا، اس شخص نے نبوت ورسالت کا بھی دعوی کیا تھا، یہ حضرت علی کو معبود مانتے ہیں اور کہتے کہ اللہ تعالیٰ نے –نعوذ باللہ– حضرت علی کے جسد انسانی میں ظہور فرمایا تھا، اس فرقہ کا اصل مرکز ''لاذقیہ'' (Lazikia) ہے، جو شام کا مشہور سیاحتی شہر ہے، اس فرقہ کے لوگ ترکی، ایران، البانیہ، لبنان اور فلسطین وغیرہ میں یہ مختلف ناموں سے جانے جاتے ہیں، شام میں جب ''**الكتلة السياسية**'' کے نام سے ایک سیاسی پارٹی بنی تو اس نے اس فرقہ کے لوگوں کی قربت حاصل کرنے کے لئے ان کو ''علویہ'' کا خطاب دے دیا، جس میں فرانس کا بڑا ہاتھ تھا، یہ لوگ اپنے آپ کو شیعہ کہتے ہیں؛ لیکن شیعوں کا سواد اعظم ''اثنا عشریہ'' بھی ان کو کافر کہتا ہے، حکمران وقت کے بارے میں بھی ان کا عقیدہ نہایت غلو پر مبنی ہے اور وہ فرمانروا کو قریب قریب خدا کے درجہ میں رکھتے ہیں، بشار الاسد اور ان کے والد حافظ الاسد کا تعلق اسی فرقہ سے ہے۔

موجودہ حکمراں بشار الاسد کا ظالم باپ 'حافظ الاسد' اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے دس ہزار

سے زیادہ افراد کوشہید کر چکا ہے، موجودہ حکمراں بھی آزادی کی تحریک اور شامی عوام کی امنگوں کو دبانے کے لئے کم وبیش ہزاروں بے قصور لوگوں کا خون بہا چکا ہے اور اب تک اس فرعون صفت شخص کی سفا کی اور خون ریزی ہے کہ تھمنے کا نام نہیں لیتی، شام کا ایک اہم علاقہ ''گولان کی پہاڑی'' عرصہ سے اسرائیل کے قبضہ میں ہے، مگر ۱۹۷۳ء کے بعد سے شام نے کبھی اس طرف اپنی ایک گولی بھی نہیں پھینکی، یہاں تک کہ اسرائیل نے اس کے زیر تعمیر نیوکلیر ری ایکٹر کی اینٹ سے اینٹ بجادی؛ مگر شام کی اس بزدل حکومت کو کوئی غیرت نہیں آئی، اس کی اس ''بردباری'' کی اسرائیل نے متعدد بار تعریف کی ہے؛ مگر خود اپنے نہتے عوام کے خلاف جونوے فی صد (%90) اہل سنت پر مشتمل ہیں، اس ظالم کی 'بہادری' قابل دید ہے اور درپردہ تمام مغربی طاقتیں اس کے ساتھ ہیں، یہی وجہ ہے کہ جن ملکوں نے عراق، لیبیا اور افغانستان میں فوج کشی کرنے میں کوئی تأمل نہیں کیا، شام کے معاملہ میں خاموش تماشائی ہیں اور کمیونسٹ اتحادی ہونے کی وجہ سے روس اور چین بھی اپنے طور پر اس ظالم و جابر، عوام دشمن اور قاتل انسانیت حکومت کی پشت پر کھڑے ہیں۔

سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ حکومت ایران جو بار بار اتحاد امت کی بات کرتی رہتی ہے، وہ ایک چھوٹے سے ملک بحرین میں شیعہ باغیوں کی حمایت میں کھڑی ہے، جہاں سنّیوں کی آبادی چالیس فیصد اور شیعوں کی ساٹھ فیصد ہے، اور جہاں شام کا ہزارواں حصہ بھی عوام پر ظلم نہیں ہوا ہے؛ لیکن شام میں نوے فی صد سنّیوں پر ظلم و جبر کے ساتھ حکومت کرنے والی نصیری حکومت کی مؤید ہے؛ کیوں کہ وہ اپنے آپ کو شیعوں کا ایک فرقہ کہتے ہیں، کیا یہی اسلامی اخوت ہے اور کیا یہی انصاف ہے کہ سنی اکثریت اور شیعہ اکثریت کے لئے دو الگ پیمانے ہوں؟؟ اگر اس موقع پر اسلامی جمہوریہ ایران، حزب اللہ اور شیعہ بھائی شام کے مظلوم اہل سنت کو انصاف دلانے کے لئے کھڑے ہوتے اور حقیقت پسندی سے کام لیتے تو اس سے واقعی اتحاد کی بہتر فضا پیدا ہوتی، سچ مچ اسلامی اخوت کا مظاہرہ ہوتا اور محسوس کیا جاتا کہ ہماری مسلم حکومتیں فرقہ بندیوں سے اٹھ کر ملت اسلامی کے لئے کام کرتی ہیں اور جادۂ انصاف پر قائم رہتی ہیں؛ ورنہ اگر معاملہ یہ ہو کہ معرکۂ حق و باطل میں دشمن کے مقابلہ تو ''ریشم کی طرح نرم'' بن جائیں اور حلقۂ یاراں کے لئے ''فولاد وآہن'' بننے کا مظاہرہ کریں تو مسلمانوں کے اتحاد اور اخوت کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

مسلم مما لک کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے تکلیف دہ وقت میں شام کے مظلوم عوام کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھائیں، ان کی اخلاقی مدد کرنے کے ساتھ ساتھ فوجی طاقت کے ذریعہ بھی ان کا تعاون کریں، شامی حکومت کو اپنا رویہ بدلنے، ملک میں جمہوری نظام قائم کرنے اور عوام کو اپنی پسند کا قائد منتخب کرنے کا حق دینے پر مجبور کریں، نہ یہ کہ مسلمانوں کو ایک ظالم، شقی القلب اور بد دین ڈکٹیٹر کے حوالہ کردیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اپنے مسلمان بھائی پر ظلم کرتا ہے اور نہ وہ اس کو ظلم سہنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے: "**المسلم أخو المسلم، لا یظلمه و لا یسلمه**" (بخاری، حدیث نمبر: ۲۴۴۲) ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو رسوانہیں کرتا: "**و لا یخذله و یحقره**" (مسلم، عن أبی ہریرۃ، حدیث نمبر: ۲۵۶۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پورے عالم اسلام کی طرف متوجہ ہے کہ وہ ظلم و جور کے اس طوفان کو تھامنے، ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچانے اور مسلمانوں کو اس ذلت و رسوائی اور ظلم و جور سے بچانے کے لئے کیا کردار ادا کرتے ہیں؟

یہ فریضہ ہر مسلمان سے اس کی صلاحیت اور قوت کے لحاظ سے متعلق ہے، ہندوستان کے مسلمان اپنے مظلوم شامی بھائیوں کی فوجی مدد تو نہیں کر سکتے؛ لیکن وہ اخلاقی مدد کر سکتے ہیں، وہ ہندوستان میں روس، چین اور شام کے سفارت خانوں پر اپنا احتجاج درج کرا سکتے ہیں، وہ بڑی طاقتوں سے خطوط، ای میل اور سفارت خانوں میں نمائندگی کے ذریعہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ وہ شامی عوام کو بچانے کے لئے اور انہیں ایک ظالم اور غیر جمہوری حکومت سے نجات دلانے کے لئے اپنی طاقت کا استعمال کریں، وہ حکومتِ ہند سے مطالبہ کر سکتے ہیں کہ دنیا کی یہ سب سے بڑی جمہوریت، شام میں برسر اقتدار آمریت کو ختم کرنے میں اپنا کردار ادا کرے، ہم پُرامن طریقہ پر قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنے شامی بھائیوں کا اخلاقی اور سفارتی تعاون اور ان کے لئے دعاؤں کا اہتمام کر سکتے ہیں، اگر اس عمل میں اہل سنت کے ساتھ ساتھ اہل تشیع بھی شریک ہوں تو یہ ملی اتحاد اور منصفانہ طرزِ عمل کی بہترین مثال ہوگی اور اس کے بڑے اچھے اثرات مرتب ہوں گے۔ **اللھم ارحمنا و لا تسلط علینا من لا یرحمنا**۔

صدر مرسی کے خلاف فرعونی فوج کی بغاوت

شریعت کے کچھ احکام وہ ہیں جو بالکل متعین ہیں، ان میں کوئی ابہام نہیں ہے، وہ معتبر طریقہ پر ثابت ہیں اور اتنے واضح و بے غبار الفاظ میں ان کو بیان کیا گیا ہے کہ کوئی عقل سلیم رکھنے والا اس کا کوئی اور معنی نہیں سمجھ سکتا، جیسے پانچ وقت کی نمازیں فرض ہیں، رمضان المبارک کے روزے ہر مسلمان پر فرض ہیں، توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان ضروری ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی اور آخری نبی ہونے پر ایمان رکھنا شرط نجات ہے، غرض کہ اکثر عقائد واحکام اس طور پر قرآن وحدیث سے ثابت ہیں کہ ان میں اختلاف کی گنجائش نہیں؛ اسی لئے پوری امت کا ان پر اتفاق ہے۔

کچھ احکام وہ ہیں، جن میں خود اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایسی لچک رکھی گئی ہے کہ ان کے بارے میں ایک سے زیادہ رائیں ہوسکتی ہیں، کبھی اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی عمل کو دو طریقوں سے انجام دیا، جس صحابی نے جس طریقہ کو دیکھا، اس کو روایت کیا اور جن لوگوں تک جو روایت پہنچی، انہوں نے اس کو ترجیح دیا، کبھی اس لئے کہ قرآن یا حدیث میں کسی بات کو بتانے کے لئے ایسا لفظ استعمال کیا گیا، جس میں دو معنوں کی گنجائش تھی، لوگوں نے پورے اخلاص کے ساتھ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس کا مفہوم متعین کیا، کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی نے الفاظ پر نظر رکھی اور کسی نے مقصد کو پیش نظر رکھا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں غزوۂ خندق کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفقاء کو حکم دیا کہ ہتھیار کھولا نہ جائے اور سارے لوگ بنو قریظہ کی طرف کوچ کریں، جنہوں نے اس معرکہ میں بغلی دشمن کا کام کیا تھا اور فرمایا کہ عصر کی نماز وہاں پہنچ کر ہی پڑھیں، اب بعض حضرات نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اہتمام کیا کہ بنو قریظہ پہنچ کر ہی عصر کی نماز پڑھی، اور بعض صحابہ نے مقصد پر نظر رکھی کہ مقصود یہ ہے کہ جلد سے جلد بنو قریظہ پہنچا جائے؛ چنانچہ انہوں نے عصر کا وقت شروع ہونے کے بعد جلدی جلدی عصر کی نماز پڑھی اور پھر بنو قریظہ پہنچ گئے، یقیناً یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں آئی ہوگی، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی پر نکیر نہیں فرمائی۔

عملی زندگی سے متعلق زیادہ تر احکام میں جو اختلاف رائے ہے، وہ ان ہی اسباب پر مبنی ہے،

عام طور پر اس میں زیادہ بہتر اور کم بہتر کا اختلاف ہے، یا وہ اختلاف نہیں ہے، تنوع ہے، تنوّع سے مراد یہ ہے کہ اس عمل کے لئے ایک سے زیادہ طریقے ثابت ہیں، اہل علم کو اس کا خوب اندازہ ہے، خود عہد صحابہ میں بھی اس طرح کا اختلاف پایا جاتا تھا، بخاری کی روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع سے منیٰ میں ہم میں سے بعض لوگ تلبیہ یعنی "**لبیک اللھم لبیک۔۔۔۔**" پڑھتے تھے اور بعض تکبیر تشریق، نہ تلبیہ پڑھنے والے تکبیر تشریق پڑھنے والے پر کوئی نکیر کرتے اور نہ تکبیر پڑھنے والے تلبیہ پڑھنے والے پر، قرآن مجید کی کتابت میں بھی اس کو ملحوظ رکھا گیا، مصحف عثمانی کی اس طور پر کتابت کی گئی کہ اس میں تمام قرائتیں شامل ہوجائیں اور اختلاف قراءت کے ساتھ پڑھنے کی گنجائش باقی رہے؛ لیکن کبھی اس طرح کے اختلاف نے امت میں نزاع پیدا نہیں کیا، اختلاف رائے کے باوجود لوگ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے، ایک دوسرے سے تعلیم وتعلم کا تعلق رکھتے، ایک دوسرے سے بیعت وارشاد کا ربط رکھتے؛ کیوں کہ ان کا اختلاف اخلاص پر مبنی تھا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے منی میں قصر نہیں کیا، چار رکعت نماز پڑھی، یہ ان کا اجتہاد تھا، اس کا جو سبب تھا، وہ دوسرے صحابہ کو معلوم نہیں تھا؛ اس لئے بہت سے صحابہ کو ان کے اس عمل سے اختلاف ہوا اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کسی قدر سخت لب ولہجہ میں اس اختلاف کا اظہار بھی کیا؛ لیکن سبھوں نے نماز ان ہی کی اقتداء میں ادا کی اور جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: "**الخلاف شرٌ**" یعنی اختلاف رائے میں تو حرج نہیں؛ لیکن اس اختلاف کو جھگڑے کا باعث بنادینا شر کی بات ہے، صحابہ کے سوچنے کا یہی انداز تھا!

سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں جو اختلاف ہوا، یہاں تک کہ جنگ کی نوبت آگئی، وہ معلوم ہے؛ لیکن دونوں ہی کے بارے میں مروی ہے کہ شہنشاہ روم نے فریق مخالف کے مقابلہ میں مدد کی پیشکش کی اور اکسانے کی کوشش کی؛ تو دونوں ہی نے جواب دیا کہ تم کو ایسا خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہئے، اگر تم نے دوسرے فریق پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو میں اس کی فوج کا پہلا سپاہی رہوں گا، یہی شعور، ملی غیرت، دینی حمیت اور اختلاف کے باوجود دشمن کے مقابلہ میں اتحاد، فروعی اختلاف کے معاملہ میں تحمل اور ایک دوسرے کا احترام وہ طریقۂ کار تھا، جس کی بنا پر صدیوں سے یہ امت علمی اور فکری اختلاف رائے کے باوجود قدم سے قدم اور دوش سے دوش

ملائے کھڑی رہی اور ایشیا وافریقہ سے لے کر یورپ تک اپنی فتحمندی کے جھنڈے نصب کرتی رہی، یہی اس امت کی کامیابی کا راز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اے ایمان والو! جب (دشمن کے) کسی گروہ سے تمہاری مڈبھیڑ ہوتو ثابت قدم رہو اور خوب اللہ کا ذکر کرو؛ تاکہ تم کامیاب ہوسکو، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، آپس میں جھگڑے نہ کرو کہ تم کمزور پڑ جاؤ گے، تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، اور صبر کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں'' (انفال: ۴۵-۴۶)

ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ ہر حال میں اور خصوصاً جب تم جنگ کی حالت میں ہوتو چار باتوں کا خیال رکھو، اول یہ کہ اپنے دین پر ثابت قدم رہو، نہ دشمن کا خوف تم کو متأثر کرے اور نہ طمع وحرص اور مفادات کی طلب کی غرض سے تمہارے قدم پھسل جائیں، دوسرے یہ کہ ہر حال میں تمہارے اندر رجوع الی اللہ کی کیفیت ہو، اللہ سے مانگنے کی اور اللہ کے سامنے رونے کی توفیق ہو، تیسرے: اپنی زندگی میں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو قائم رکھو، مسلمانوں کی زندگی میں کوئی تقسیم نہیں ہونی چاہئے کہ کچھ افکار کتاب وسنت پر مبنی ہوں اور کچھ دوسری قوموں سے برآمد کئے ہوئے ہوں، زندگی کے کچھ معاملات میں اسلام پر عمل ہو اور کچھ معاملات میں اپنی خواہشات پر، چوتھی بات جس کو قرآن نے خاص اہمیت دیتے ہوئے آخر میں ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ آپسی لڑائی جھگڑے سے بچ کر رہو، آپسی جھگڑے کے دو بڑے نقصانات ہیں: ایک یہ کہ تمہیں ناکامی اور شکست سے دوچار ہونا پڑے گا، دوسرے: تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، یعنی اعداء اسلام پر تمہاری جو دھاک ہے، وہ ختم ہوکر رہ جائے گی، پھر اخیر میں صبر کی تلقین فرمائی گئی؛ کیوں کہ ان تمام باتوں کے لئے اور خاص کر لڑائی جھگڑے سے بچنے کے لئے بہت زیادہ صبر وبرداشت کی ضروری پیش آتی ہے، انسان ملت کے مفادات کے لئے اپنے ذاتی مفادات کی قربانی برداشت کرلے اور دین کی سربلندی پر اپنی انا نچھاور کرنے پر آمادہ ہوجائے، یہ معمولی بات نہیں ہے، اس کے لئے صبر، قوت برداشت، اخلاص اور تقویٰ کی ضرورت ہے، اس وقت امت مسلمہ مسلسل ایک جنگ سے دوچار ہے، جو عسکری میدان سے لے کر فکری وتہذیبی میدان تک ہر جگہ برپا ہے؛ اس لئے ان باتوں کی اس کو پہلے سے بڑھ کر ضرورت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی اجتماعیت کو بڑی عمدہ مثال سے سمجھایا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے عمارت کی طرح ہے، جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو قوت دیتا اور مضبوط کرتا ہے: **"المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضہ بعضًا"** (بخاری، عن ابی موسی الاشعری، حدیث نمبر: ۲۴۴۶) اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اجتماعیت کا باعث قوت ہونا اللہ اور رسول کا حکم بھی ہے اور اس دنیا میں اللہ کی طرف سے جاری قانون فطرت کا تقاضہ بھی، جیسے بکھری ہوئی اینٹیں انسان کے قدموں سے پامال ہوتی رہتی ہیں اور ٹھوکروں میں رہنا ان کا مقدر ہوتا ہے اور جب یہی اینٹیں مل کر دیوار بن جاتی ہیں تو آندھی، طوفان ہو یا سیلاب بلاخیز، وہ ان سب کا مقابلہ کرتی ہیں، یہی حال قوموں کا ہے، اگر وہ بکھری ہوئی اینٹیں بن کر رہیں گی تو دشمن ان کو روندتے رہیں گے اور جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہیں گے تو ایک مضبوط دیوار بن جائیں گے۔

دنیا کی دوسری قوموں میں مسلمانوں سے کہیں بڑھ کر مذہبی اختلافات ہیں اور بنیادی عقائد میں بھی وہ ایک دوسرے کے ساتھ متفق نہیں ہیں، ہندو مذہب میں دیکھئے کہ ایک خدا کو ماننے والے بھی ہیں، تین خدا پر یقین رکھنے والے بھی ہیں اور بے شمار دیوی دیوتاؤں کے پجاری بھی ہیں، مورتی پوجا کرنے والے بھی ہیں اور مورتی پوجا کے مخالف بھی، وہ بھی جو رام کو پوجتے ہیں اور وہ بھی جو رام کو برا بھلا کہتے ہیں؛ لیکن مسلمانوں کے مقابلہ میں سب ایک ہیں، عیسائیوں کے یہاں دیکھئے کہ کیسے بنیادی اختلافات ہیں، کچھ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں اور کچھ وہ بھی ہیں جو اس کے قائل نہیں ہیں؛ لیکن عالم اسلام کے مقابلہ میں ان سب کا موقف ایک ہے، لیکن افسوس اور صد بار افسوس کہ مسلمان معمولی معمولی اختلاف کی بناء پر ایک دوسرے سے کٹے ہوئے اور ان کے ہاتھ اپنے ہی بھائیوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں، نیز وہ تھوڑے تھوڑے مفادات کے لئے اسلام کے کھلے ہوئے دشمنوں کے آلۂ کار بن جاتے ہیں۔

مصر میں جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے، وہ ایسی ہی عاقبت نااندیشی، مفاد پرستی اور نفاق کی ایک تازہ مثال ہے، مصر کی حالیہ تاریخ میں پہلی بار وہاں جمہوری نظام کی بنیاد پڑی؛ ورنہ ۱۹۵۲ء تک شاہی حکومت تھی اور اس کے بعد سے فوجی ڈکٹیٹروں کا دور شروع ہوا، مصر کے انتخاب میں اخوان المسلمین کی سیاسی بازو جسٹس پارٹی کے امیدوار محمد مرسی صدر منتخب ہوئے، انہوں نے عوامی ریفرنڈم کے ذریعہ عوام

کی امنگوں کے مطابق پہلا دستور دیا، سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں مناسب اضافہ کیا، توانائی، زراعت اور صنعت کو ترقی دینے کے لئے منصوبے بنائے اور ان منصوبوں میں ترکی، قطر، چین اور سعودی عرب سے سرمایہ کاری کرائی، وہ چاہتے تھے کہ مصر کو خود مکتفی بنائیں اور امریکہ واسرائیل پر اس کا انحصار نہ رہے، اسرائیل جو کوڑیوں کے دام میں مصر سے گیس خریدتا ہے، محمد مرسی نے کہا کہ وہ از سرنو اس کی قیمت متعین کریں گے، انہوں نے مصر کی طرف سے غزہ کی ناکہ بندی ختم کرائی اور انہیں اسرائیلی مظالم سے نجات دلانے کی کوشش کی، انہوں نے مسلم ممالک خاص کر پڑوسیوں سے اپنے تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے جدوجہد کی، اگر انہیں پانچ سال کی مدت پوری کرنے کا موقع دیا جاتا تو یقین ہے کہ وہ مصر کے طیب اردوگان ثابت ہوتے اور اپنے ملک کو نہ صرف اسلامی رنگ میں رنگ دیتے؛ بلکہ معاشی ترقی کی طرف بھی لے جاتے۔

لیکن یہی بات امریکہ اور اسرائیل کو گوارا نہیں تھی، انہیں اول دن سے صحیح طور پر کام کرنے کا موقع نہیں دیا گیا، ۳؍جولائی ۲۰۱۳ء کو بالکل غیر قانونی طور پر جبراً فوجیوں کے ذریعہ ان کی حکومت ختم کردی گئی، یہ سب کچھ امریکہ اور اسرائیل کے اشارہ پر ہوا، محمد مرسی کو ہٹائے جانے کے بعد اسرائیل میں شادیانے بجائے گئے اور بے حد خوشی ومسرت کا اظہار کیا گیا، پھر جو حکومت آئی، وہ اس طرح کہ عدلی منصور صدر بنائے گئے، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ یہودی ہیں اور محمد البردعی نائب صدر بنائے گئے، جنہوں نے ماضی قریب میں مسلم ملکوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے، یہی شخص ہے جس نے عراق پر حملہ کرانے میں مدد کی، اس نے اسرائیل کے نیوکلیئر پروگرام کے بارے میں کبھی ایک حرف نہیں کہا؛ لیکن کسی عرب ملک کو نیوکلیئر پاور بننے نہیں دیا، اس ناجائز حکومت نے آتے ہی جو اقدامات کئے ہیں، ان سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مصر کو بد دینی اور معاشی بدحالی کی طرف واپس لے جانا چاہتے ہیں اور مصر کو ہمیشہ امریکہ اور اسرائیل کا محتاج بنا کر رکھنے کی مہم پوری کر رہے ہیں۔

مصر کی عوام پہلے بھی محمد مرسی کے ساتھ تھی اور اب پہلے سے بڑھ کر ان کے ساتھ ہے، محمد مرسی کے خلاف جو ناز یبا اور غیر قانونی احتجاج ہوا، اس کے شرکاء میں یہودی، قبطی، عیسائی اور ملحد قسم کے لوگ پیش پیش تھے؛ لیکن اس احتجاج کو مؤثر بنانے کے لئے انہیں مسلمانوں کے کسی مذہبی گروہ کی ضرورت تھی، اس کے لئے انہوں نے ''جماعۃ النور'' (جو مصر کے سلفی الفکر لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے) کو آلۂ کار

بنایا، اس سیاسی ومذہبی جماعت نے انتہائی منافقت اور نہایت بے ضمیری کا رویہ اختیار کرتے ہوئے اسلام دشمن قوتوں کے ساتھ ہاتھ ملالیا اور اپنے بعض ارکان کے اختلاف کے باوجود اس احتجاج میں شامل ہوگئے، اس سے مخالف اسلام قوتوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ ہماری یہ تحریک متفقہ تحریک ہے اور مذہبی حلقے بھی اس میں شامل ہیں، اس پورے معاملہ میں سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہی ہے کہ کچھ لوگوں نے مسلکی وفکری اختلاف کو اتنی اہمیت دے دی کہ ان کو ایک اسلام پسند جماعت کے مقابلہ صہیونی اور نصرانی طاقتوں کا آلۂ کار بننے میں بھی تأمل نہیں رہا، اس غیر جمہوری عمل پر تمام مسلم اور عرب ممالک کو سراپا احتجاج ہوجانا چاہئے؛ لیکن لوگوں نے حیرت کے کانوں سے سنا کہ بعض مسلم حکومتوں نے اس پر مبارکباد پیش کی:

چوں کفر از کعبہ می خیزد کجا ماند مسلمانی

خبریں آرہی ہیں کہ اس غیر جمہوری جبری حکومت کے آنے کے بعد نمازیوں کا قتل ہورہا ہے، اسلام پسندوں کی جانیں لی جارہی ہیں، غزہ سے مصر جانے والی جتنی زیر زمین سرنگیں تھیں جو فلسطینی مسلمانوں کے لئے اشیاء ضرورت کے حاصل ہونے کا واحد ذریعہ ہیں، اسرائیل کی خوشنودی میں انہیں بند کردیا گیا ہے، اب وہاں بچے دودھ کو اور بڑے روٹی کو ترس رہے ہیں، پٹرول پمپ بند ہیں اور لوگ ناقابل بیان تکلیف سے دوچار ہیں، نہ معلوم ان بچوں کی سسکیاں، مظلوموں کی آہیں اور بے قصوروں کا لہو کن کن لوگوں اور حکومتوں کے نامۂ اعمال میں درج ہورہا ہے اور نہ جانے وہ اللہ کو کیا منہ دکھائیں گے؟ — کاش ہم وسیع تر مفاد کے سامنے ایسے اختلافات کو نظر انداز کرنا اور دشمنوں کے مقابلہ اپنی صفوں کو متحد رکھنا سیکھ سکیں!!

ہوا ہے کام جو اپنوں سے، بیگانوں سے کیا ہوگا!

(مصر کی منتخبہ حکومت کے خلاف اہل نفاق کی چیرہ دستیاں)

اگر پتھر کو جگر ہوتا تو شاید وہ بھی شق ہو جاتا، قلم کو آنکھیں میسر ہوتیں تو وہ بھی خون کے آنسو بہاتیں اور ظلم وجور کا یہ منظر درندوں نے دیکھا ہوتا تو وہ بھی شرمسار ہو جاتے اور انسان کی سفاکی کے آگے اپنا عجز تسلیم کر لیتے، اس واقعہ پر جو ۲۷ جولائی ۲۰۱۳ء کو قاہرہ میں پیش آیا، جس میں سینکڑوں نہیں ہزاروں لوگ تہہ تیغ کر دئے گئے، جس میں جوانوں کو ہی نہیں بوڑھوں اور بچوں کو بھی نہیں بخشا گیا، جس میں مردوں ہی پر نہیں خواتین پر بھی شجاعت اور بہادری کا مظاہرہ کیا گیا، اور جس میں صحتمندوں ہی کو نہیں مریضوں کو بھی نشانہ بنایا گیا، اور علاج کے لئے قائم کیمپوں کو اس طرح نذر آتش کیا گیا جیسے لکڑیوں کی جگہ انسانوں کو ایندھن بنایا جا رہا ہو، مگر افسوس کہ جس منظر سے درندوں کے دل بھی دہل جائیں انسان جب سفاکی پر اتر آتا ہے تو اس کے دل میں اس سے کوئی ٹیس نہیں اٹھتی، انسانوں کی جلتی ہوئی آبادی سے اسے وہی لطف آتا ہے جو خنک وسرد ہواؤں اور یخ بستہ فضاؤں کے درمیان آگ کی تپش سے محسوس کیا جاتا ہے اور انسانی خون کا لالہ زار اسے ایسا ہی خوبصورت لگتا ہے جیسے قوس وقزح کی خوبصورت اور خوش منظر لکیریں، یہ وہ صورت حال ہے جو اس وقت دریائے نیل کے کنارے مسلسل دہرائی جا رہی ہے۔

افسوس کہ مصر ایک ایسا مسلم ملک ہے جہاں نوے فیصد سے زیادہ مسلمان آباد ہیں، لیکن عوامی رائے کی بنیاد پر نہیں بلکہ جبر وقہر کے زیر سایہ 'عدلی منصور' کو صدر بنایا گیا ہے جس کے بارے میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہودی ہے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قبطی عیسائی ہے اور کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ یہ ملحد ہے اور ''منصور'' بھی ''ناصر'' کے نقش قدم پر ہے اور ایک ایسے شخص کو ملک کی حفاظت اور دفاع کا قلمدان دیا گیا ہے یعنی سیسی جسکی ماں یہودی ہے ۔

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے لئے
اسی عطار کے بیٹے سے دوا لیتے ہیں

محمد مرسی کا قصور صرف اس قدر ہے کہ وہ سچ مچ مسلمان ہیں، انہوں نے مصر کو معاشی اعتبار سے

خود مکتفی بنانے کی کوشش کی، انہوں نے مصر میں سرمایہ کاری شروع کرائی، وہ چاہتے تھے کہ مصر کو معاشی اعتبار سے ایک ترقی یافتہ ملک بنایا جائے، نہر سوئز کی گزرگاہ کو بڑے پیمانہ پر معاشی فوائد کے لئے استعمال کیا جائے، ملک میں کرپشن کو روکا جائے، ایک سادہ اور ایماندار شخص کی حیثیت سے انہوں نے اپنی حکومت کی شروعات کی، عالم اسلام میں ایک مثالی قائد کی حیثیت سے ان کی حیثیت ابھر رہی تھی، وہ عالم عرب کے مقبول ترین شخص بن گئے تھے اور پوری دنیا کے مسلمان انہیں پر امید نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، انہوں نے نہایت اعتدال کے ساتھ پھونک پھونک کر قدم اٹھایا اور مصری معاشرہ سے رضا کارانہ طور پر اس بے حیائی اور فحاشی کو دور کرنے کی کوشش کی جو جمال عبدالناصر کے دور سے حسنی مبارک کے دور تک ایک سیاہ گھٹا کی طرح مصر پر چھائی رہی، انہوں نے اسلامی اخوت کو فروغ دیا، اور اسرائیل کی خواہش کے علی الرغم غزہ کے محصور و مجبور مسلمانوں کے لئے راستے کھولے، یہی خوبیاں ان کا جرم بن گئیں اور صہیونیوں، صلیبیوں اور ان کے اشارہ پر کام کرنے والے عرب حکمرانوں کی آنکھوں میں وہ چبھنے لگے، سب سے زیادہ افسوس ان عرب حکمرانوں پر ہوتا ہے جو اسرائیل کے خلاف تو ایک حرف کہنے کو تیار نہیں ہیں، وہ اسرائیل کے خلاف قدم اٹھانے کے بارے میں شاید خواب میں بھی نہ سوچتے ہوں اور جنگی بے ضمیری کا حال یہ ہے کہ وہ اس شرط کے ساتھ امریکہ اور مغرب سے ہتھیار خریدتے ہیں کہ اسرائیل کے خلاف ان کا استعمال نہیں ہوگا، ان کو ہم اپنی عوام اور اپنے مسلمان بھائیوں ہی کے خلاف استعمال کریں گے، جو آگ مصر میں یہودیوں، عیسائیوں اور ملحدوں نے سلگائی ان کے پٹرول نے اسے شرر سے شعلہ اور شعلہ سے آتش فشاں بنا دیا، بلکہ انہیں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ امریکہ ان کی ناراض عوام ہی سے حفاظت نہیں کرے گا کہ بلکہ خدا کی پکڑ سے بھی انہیں بچائے رکھے گا۔

قرآن مجید نے جن اعدائے اسلام کا بار بار ذکر کیا ہے، مسلمانوں کو ان کے فتنوں سے آگاہ رہنے کی ترغیب دی ہے اور ان کی اسلام دشمنی کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے، ان میں ایک گروہ ''منافقین'' کا ہے، نفاق سے مراد یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن میں یکسانیت نہ ہو، زبان اور دل کے درمیان رفاقت کا رشتہ ٹوٹ جائے، زبان کچھ کہتی ہو، دل میں کوئی اور منصوبہ چھپا ہوا ہو، زبان کے بول اندرونی سازشوں کے لئے صرف پردہ کا کام کرتے ہوں، مدنی زندگی میں مسلمانوں کو سب

سے زیادہ نقصان اسی گروہ سے پہنچا اور وہ آخر تک مسلمانوں کی صفوں میں گھسے رہے، نیز یہودیوں سے ان کا خصوصی تعلق قائم رہا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں میں بیٹھتی؛ لیکن اس لئے کہ آپ کی ہر بات دشمنوں تک پہنچائیں، وہ مسلمانوں کے سماج میں گھسے رہتے اور باہم شادی بیاہ کا تعلق بھی رکھتے، لیکن اس لئے کہ مسلمانوں میں انتشار پیدا کریں اوران کو آپس میں لڑائیں، وہ بعض اوقات غزوات میں بھی شامل ہوجاتے، لیکن محض معاشی منفعت کے لئے اوراس لئے کہ عین وقت پر کوئی ایسی حرکت کرگزریں کہ مسلمانوں کے حوصلے پست ہوجائیں، وہ مسجد بھی تعمیر کرتے؛ لیکن اس کے پیچھے اس کی نیت اسلام کے خلاف کی جانے والی سازشوں کا خفیہ مرکز قائم کرنا ہوتا، وہ اپنے نفاق کے مرض کواس طرح چھپائے رکھتے کہ شوہر کے حال سے بیوی اور بیٹے کے حال سے باپ بھی بےخبر رہتا، وہ ابلاغ کے ذرائع کواس طرح استعمال کرتے کہ مسلمان رسوا ہوں، جیسا کہ انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر افک (تہمت) کے سلسلہ میں کیا، وہ مخلص مسلمانوں کے اچھے عمل کی بھی ایسی تصویر پیش کرتے کہ وہ برے نظر آئیں، اگر وہ اللہ کے راستہ میں فراخ دلی سے خرچ کرتے تو تبصرہ کرتے کہ یہ دکھاوا ہے، اگر کوئی غریب مسلمان اپنی گنجائش کے مطابق کم اعانت پیش کرپاتے تو کہتے اللہ کواس کی مدد کی کیا ضرورت تھی؟ غرض کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے، بے وزن کرنے اور مسلم سماج کو انتشار میں مبتلا رکھنے کے سلسلہ میں کوئی کسر اٹھانہیں رکھتے تھے۔

منافقین کی اس روش کا حدیث اورسیرت کی کتابوں میں تفصیل سے ذکر آیا ہے، اسی لئے قرآن مجید میں کثرت سے نفاق اور منافقین پر گفتگو کی گئی ہے، کم سے کم قرآن میں ۳۶ مواقع پر مختلف پہلوؤں سے منافقین کے رویہ کا ذکر آیا ہے، مسلمانوں پر یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ مسلمانوں سے انہیں کوئی ہمدردی نہیں ہے، وہ آپس میں ہی ایک دوسرے کے بہی خواہ ہیں: ﴿اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ﴾ (توبہ ۶۷) ان کا مزاج یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے سامنے اپنے آپ کو سچا پکا مسلمان ظاہر کرتے ہیں اور پوری قوت سے اس کا ذکر کرتے ہیں: ﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ﴾ (منافقون:۱) ان کا خاص وصف کذب بیانی اور دروغ گوئی ہوتا ہے: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ﴾ (منافقون:۱) ان کا خاص مشن یہ ہوتا ہے کہ اسلام کے راستہ میں رکاوٹ بن جائیں اور کاروان حق کے لئے سدراہ بن کر کھڑے ہوجائیں:

﴿رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا﴾ (نساء:٦١) وہ مسلمان عوام سے وعدہ وعید تو کرتے ہیں لیکن یہ محض ایک دھوکہ ہوتا ہے (احزاب: ۱۲) ان کا دل ہمیشہ اعداء اسلام سے جڑا ہوتا ہے، اسی لئے آخرت میں ان کا حشر کفار ومشرکین کے ساتھ ہوگا (نساء: ۱۴۰) مسلمانوں کو خاص طور پر تلقین کی گئی ہے کہ وہ منافقین کے فتنہ سے چوکنا رہیں، ان کی بات مانا نہ کریں اور ان کے فتنہ سے بچنے کے لئے جہاں تک ممکن ہو درگزر کا پہلو اختیار کریں، کیونکہ بعض اوقات اس طبقہ سے الجھاؤ پیدا کرنا نقصاندہ بن جاتا ہے اور سادہ لوح مسلمانوں کے لئے غلط فہمی کا باعث ہو جاتا ہے: ﴿وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ (احزاب: ۴۸)

قرآن قیامت تک رہنے والی کتاب ہے اور اس کی تعلیمات ہر عہد کے لئے مشعل راہ ہیں، اس لئے اس میں کسی طبقہ کا ذکر اس بات کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ یہ گروہ کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ موجود رہے گا، اس دور میں مسلمانوں اور خاص کر عالم اسلام میں اس گروہ کو جو فروغ حاصل ہوا ہے، تاریخ میں کم ہی اس کی مثال ملے گی، خلافت عثمانیہ کے سقوط کے لئے یہودی اور نصرانی طاقتوں نے جو منصوبہ بندی کی اور مسلمانوں جیسے نام رکھنے والے لوگوں نے جو کردار ادا کیا، وہ اب کھلا راز ہے اور خاص کر عربوں کو ان کی سادہ لوحی یا اقتدار کی طلب کے تحت جس طرح استعمال کیا گیا وہ اب کوئی راز باقی نہیں رہا، خلافت عثمانیہ کے بکھراؤ کے بعد ہی اسرائیل کا ناپاک وجود ظہور میں آیا اور استعماری طاقتوں نے اسلام کے اہم مراکز پر نہ صرف قبضہ کیا، بلکہ انہوں نے اس کے ساتھ ساتھ دو اور باتوں پر توجہ دی، ایک یہ کہ وہاں کے ایک طبقہ کے دماغ کو بدل دیا جائے، وہ رنگ ونسل کے اعتبار سے مصری، شامی، عربی، ترکی، ایرانی اور ہندی ہو؛ لیکن ان کا دل ودماغ یہودی، عیسائی اور اسلام بیزار ہو، یہ طبقہ پورے عالم اسلام میں موجود ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ خود تو واپس ہو گئے؛ لیکن ان کی فکرونظر کے نقوش اب بھی پوری طرح بیشتر علاقوں میں موجود ہیں، انہوں نے دوسری حرکت یہ کہ مسلمانوں میں زبردست جذبۂ اخوت اور غیر معمولی تصور اتحاد کو ختم کرنے کے لئے نسلی اور علاقائی قومیت کے تصور کو ابھارا، انہیں خوب ہوا دیا اور انہیں اس طرح ٹکڑوں میں بانٹ کر گئے کہ ان کے درمیان سرحدوں کے جھگڑے باقی رہیں، مفادات کا ٹکراؤ ہوتا رہے، نفرت کی آگ سلگتی رہے اور جب ضرورت پڑے تو تھوڑا سا تیل اس پر ڈال دیا کریں، اس مقصد کے لئے آج بھی مغربی طاقتیں

مسلمانوں کی صفوں میں گھسے منافقین کو استعمال کر رہی ہیں، ملت اسلامیہ جتنی جلد انہیں پہچان لے گی اتنی ہی جلد عالم اسلام کی عظمت رفتہ واپس آئے گی۔

اس حقیر کے خیال میں خلافت عثمانیہ ختم کرنے کے بعد اس طرح کی دوسری بڑی سازش الجزائر میں اور تیسری بڑی سازش ترکی میں ایک سے زائد بار منتخب اسلام پسند حکومت کا تختہ الٹنا تھا، ترکی کے مرد بیمار نے بڑی حد تک اس پر قابو پالیا، اللہ ان کی مدد کرے، اوراس سلسلہ کا چوتھا تکلیف دہ واقعہ مصر میں جمہوری طور پر منتخب حکومت کے خلاف فوجی بغاوت ہے، یہ واقعہ اس لئے بڑا اہم ہے کہ مصر اپنی افرادی قوت، قائدانہ صلاحیت، جغرافیائی محل وقوع، بیت المقدس کے جوار اور عوام کی دینی وابستگی کے اعتبار سے ایک نمایاں ملک ہے، تمام عرب ملکوں میں مصر ہی سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اسرائیل سے ٹکر لے سکے، اور ۱۹۷۳ء میں وہ اس کا عملی ثبوت پیش کر چکا ہے، بقیہ عرب حکمرانوں اور مسلم فرمانرواؤں کا حال یہ ہے کہ ان کو عشرت کدے سجانے سے فرصت نہیں ہے، وہ آزاد ہو کر بھی غلام ہیں، وہ اپنے عوام کے جابر حکمرانوں اور مغربی طاقتوں کے فرمانبردار محکوم ہیں، ان کی بزدلی کا حال یہ ہے کہ انہوں نے عملاً مسجد اقصیٰ کو اپنے ایجنڈے سے نکال دیا ہے، انہیں اندازہ نہیں ہے کہ طوفان بہت جلد ان کی سرحدوں میں داخل ہونے والا ہے، اس وقت ان کے اقتدار کا محل تاش کے پتوں کی طرح بکھر جائے گا، وہ نہ خالق کو منہ دکھانے کے لائق رہیں گے اور نہ مخلوق کو۔

گلہ صرف ان سے نہیں ہم لوگوں کو اپنے آپ سے بھی کرنا چاہئے، ہندوستان کے مسلمان گرچہ مصر کے مظلوم مسلمانوں کی منافقین کے ساتھ معرکہ آرائی میں کوئی عملی تعاون نہیں کر سکتے؛ لیکن کیا ہم احتجاج بھی نہیں کر سکتے، کیا ہم اپنے عرب بھائیوں تک ملت اسلامیہ ہند کے جذبات بھی نہیں پہنچا سکتے، رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر ظلم کرتا ہے اور نہ اپنے مسلمان بھائی کو ظالم کے حوالہ کرتا ہے: ' **المسلم اخوا لمسلم لایظلمه و لا یسلمه** ' آپ نے ارشاد فرمایا ' جو کسی مومن کے قتل میں مدد کرے خواہ ایک بول کے ذریعہ کیوں نہ ہو، وہ اس حال میں اللہ تعالیٰ سے ملے گا کہ اس کی آنکھوں کے درمیان لکھا ہوگا اللہ کی رحمت سے ناامید' (سنن ابن ماجہ عن ابی ہریرہ حدیث نمبر: ۲۶۲۰) جو لوگ موجودہ غاصب حکمرانوں کی پیٹھ ٹھوک رہے ہیں اور ان کی اخلاقی یا مالی مدد کر رہے ہیں یا اپنی خاموشی کے ذریعہ ان کو تقویت پہنچا رہے

ہیں کیا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں شامل نہیں ہیں!! یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ ہندوستان کے مسلمان جو اپنی ایمانی حمیت اور دینی غیرت میں ممتاز رہے ہیں، ان کی زبانوں پر بھی مہر لگی ہوئی ہے، یہ ہمارے اسلاف تھے کہ جب ترکی خلافت کا سقوط ہوا تو انہوں نے اس زخم کی کسک کو اپنے سینے پر محسوس کیا اور یہ ان کی بصیرت تھی کہ انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ صرف ترکی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ پورے عالم اسلام کو بے وزن کرنے کا مسئلہ ہے۔

جب ۱۹۶۷ء میں بیت المقدس پر اسرائیل کا ناجائز قبضہ ہوا تو پورے ملک میں آگ لگ گئی اور حکومت ہند مجبور ہوئی کہ تقریباً پچاس سال تک اس نے اسرائیل سے کوئی تعلق نہیں رکھا، یہاں تک کہ اگر کسی حکومت نے اسرائیل سے تعلق قائم کیا تو خفیہ طور پر، کیونکہ انہیں مسلمانوں کے غیظ وغضب اور ناراضگی کا اندیشہ تھا، لیکن آج ملت کی قدر آور شخصیتیں، مذہبی تنظیمیں اور نمائندہ ادارے مصلحت کی دبیز چادر میں اپنا منھ چھپائے ہوئے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمیں اللہ کے دربار میں اس طرح حاضر ہونا پڑے کہ ہماری پیشانی پر رحمت خداوندی کی امید کا نور نہ ہو؛ بلکہ اپنی بے ضمیری کی وجہ سے اللہ کی رحمت سے ناامیدی کا داغ ہو؟

اسامہ بن لادن کی وفات — چند قابلِ توجہ پہلو

یکم مئی ۲۰۱۱ء اب ایک تاریخی اہمیت کی حامل تاریخ بن چکی ہے، جس میں اسامہ بن لادن ذرائع ابلاغ کی اطلاع کے مطابق جاں بحق ہو چکے ہیں، اس حادثہ پر دوہرا ردعمل جاری ہے، مغربی ملکوں میں اس پر خوشیاں منائی جارہی ہیں، یہاں تک کہ رقص کیا جارہا ہے، جبکہ پڑوسی ملک پاکستان میں طالبان اور ان کے ہمدروں نے اس واقعہ پر سخت اندوہ اور غم وغصہ کا اظہار کیا ہے، پاکستان کے علاوہ خود ہندوستان میں بھی بعض لوگوں نے نماز جنازہ غائبانہ ادا کی ہے، یہ دونوں طرح کے ردعمل توقع کے عین مطابق ہیں، تاہم کچھ ایسے لوگ بھی ہیں، جنہوں نے اس عمل کے جواز پر اور بین الاقوامی قوانین کے پس منظر میں اس کے مبنی بر انصاف ہونے پر انگلی اٹھائی ہے، ہندوستان میں متعدد غیر مسلم رہنماؤں نے بھی اس قدم کو امریکہ کی زیادتی قرار دیا ہے، مسلمان ملکوں کے بارے میں یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ امریکہ کے کسی اقدام کے بارے میں انصاف کے اصولوں کے مطابق غور کریں گے؛ کیوں کہ ان حکمرانوں کے دل عام طور پر مغربی طاقتوں کے خوف اور اقتدار کی حرص وطمع سے معمور، اللہ کے خوف سے عاری اور امت کی محبت سے خالی ہیں؛ لیکن منصف مزاج غیر مسلم رہنماؤں خاص کر ہندوستان کے انصاف پسند برادران وطن سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اس کا جائزہ لیں گے اور جرأت کے ساتھ اس صورت حال کا تجزیہ کریں گے۔

اہم بات یہ ہے کہ انصاف کا تقاضا اس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا، جب تک کسی معاملہ میں فریقین کی بات سنی نہ جائے، انہیں اظہار حقیقت کا موقع نہ دیا جائے اور ملزم کے لئے صفائی پیش کرنے کی گنجائش نہ رکھی جائے، یہ اسلامی نقطۂ نظر بھی ہے اور انصاف کا تقاضا بھی، سیدنا حضرت علی ﷛ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تمہارے پاس دو اشخاص کا معاملہ آئے تو جب تک دوسرے کی بات نہ سن لو، پہلے کے حق میں فیصلہ نہ کرو: "**إذا تقاضیٰ علیک رجلان فلا تقض للأول حتی تسمع کلام الآخر**" (**سنن ترمذی، باب ما جاء فی القاضی۔ لا یقضی بین الخصمین الخ**، حدیث نمبر: ۱۳۳۱) — نیز ہر مہذب حکومت اور سماج میں اس بات کو تسلیم کیا گیا

ہے کہ فریقین کی بات سننے کے بعد ہی فیصلہ کیا جائے؛ لیکن اس معاملہ میں صورت حال یہ ہے کہ امریکہ خود مدعی ہے، وہی گواہ ہے، اور اسی نے فیصلہ بھی کیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ پوری طرح انصاف کے تقاضوں کے مغایر ہے اور نہ صرف مسلمانوں کا؛ بلکہ پوری دنیا کے انصاف پسند شہریوں کا فریضہ ہے کہ وہ اس صورت حال کے خلاف آواز بلند کریں۔

اس یک طرفہ فیصلہ کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ملزم کو صفائی کا موقع نہیں ملتا اور وہ فیصلہ ہرگز انصاف کے مطابق نہیں ہوسکتا، جس میں فریق مخالف کو صفائی کا موقعہ نہ دیا جائے، اسلام کی نظر میں یہ معاملہ اتنا اہم ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے خلفاء راشدین کے تنہا استغاثہ کو بھی عدالت نے دعویٰ کے ثبوت کے لئے کافی نہیں سمجھا، اصول کے مطابق عدالت کی کارروائی چلائی گئی اور اپنے مدعا پر ان سے گواہان بھی طلب کئے گئے، یہاں تک کہ ایک مقدمہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی گواہی اس وجہ سے رد کردی گئی اور دعوی خارج کردیا گیا کہ وہ ان کے صاحبزادے ہیں، اور باپ کے حق میں بیٹے کی شہادت معتبر نہیں، فقہاء اسلام نے اس اصول کی ایسی پابندی کی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مدعی علیہ کی موجودگی کے بغیر نہ مقدمہ کی سماعت کی جاسکتی ہے اور نہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے، دوسرے فقہاء کے نزدیک اگر مدعی علیہ لاپتہ ہو یا صفائی کا بار بار موقع دئے جانے کے باوجود حاضر نہ ہوتا ہو تب تو اس کی موجودگی کے بغیر فیصلہ کرنے کی گنجائش ہے، ورنہ مدعی علیہ کی حاضری کے بغیر کسی مقدمہ کی سنوائی اور اس کا فیصلہ درست نہیں۔

ہونا یہ چاہئے تھا کہ بین الاقوامی عدالت میں اس مقدمہ پر بحث ہوتی، اسامہ بن لادن اور ان کے رفقاء کو وضاحت کا حق دیا جاتا، اور اگر ان کا جرم ثابت ہوجاتا تو انہیں قرار واقعی سزا دی جاتی؛ لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا؛ بلکہ امریکہ نے بین الاقوامی منظوری کے بغیر بطور خود افغانستان پر حملہ کیا، ایک منظم حکومت کو بے دخل کردیا اور لاکھوں انسانوں کا خون بہایا، نیز ۱۱ رستمبر کے واقعہ کے سلسلہ میں یہودیوں کے کردار سے متعلق جو شہادتیں پیش کی گئیں، ان کو بالکل نظر انداز کردیا گیا۔

اس واقعہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ مجرم کو ہر شخص اپنے طور پر سزا دینے کا حق نہیں رکھتا، اگر اس طرح کی اجازت دے دی جائے تو سماج میں امن درہم برہم ہوجائے گا اور زور آور افراد کمزوروں کو اپنے لئے لقمۂ تر بنالیں گے، اسلام کا تصور یہ ہے کہ سخت جسمانی سزائیں دینے کا حق سربراہ حکومت کو

ہے اور کوئی شخص قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا؛ اسی لئے حدیث میں ہمیشہ زنا وغیرہ کی سزا نافذ کرنے کی نسبت سلطان کی طرف کی گئی ہے، (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۳۹۷۹) فقہاء نے اس اصول کو بار بار واضح کیا ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیم مصری فرماتے ہیں: "--- **لأن الشرع لما أوجب على الإمام أن يحد هذا الرجل---**" (البحر الرائق: ۵/۴) اس لئے مجرم جہاں ہو یا تو اس کے سردار کو سزا دینے کا حق ہے یا ایسے ادارہ کو جسے بین الاقوامی سطح پر ملکوں اور قوموں کے انتخاب رائے سے، ولی امر تسلیم کیا گیا ہو؛ اس لئے اگر اسامہ بن لادن واقعی مجرم تھے تو یا تو سعودی عرب کو سزا دینی چاہئے تھی، جہاں وہ پیدا ہوئے، یا پڑوسی ملک کو جہاں وہ چھپے ہوئے تھے یا اقوام متحدہ کو جس کو ملکوں اور قوموں کے اتحاد کی وجہ سے ایک حد تک قانونی فرماروائی حاصل ہے، اس کے بجائے امریکہ کا اپنے طور پر دوسرے ملک کی سرحد میں داخل ہو کر حملہ کرنے کا فیصلہ کرنا یقیناً دہشت گردی کو ختم کرنے کے نام پر بدترین قسم کی دہشت گردی ہے، اگر طاقتور قومیں اس عنوان سے کمزور قوموں کو اپنا ہدف بنانے لگیں تو دنیا لاقانونیت کی آماجگاہ بن جائے گی اور پورے عالم میں جنگل راج کی حکمرانی ہو جائے گی؛ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ تمام ممالک کو امریکہ کے اس رویہ کے خلاف احتجاج کرنا چاہئے۔

اس واقعہ میں تیسرا قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ اسامہ بن لادن کی لاش لینے کو نہ پاکستان تیار ہوا اور نہ کسی اور مسلم ملک نے اس پر آمادگی ظاہر کی، یہ بہت ہی قابل افسوس بات ہے، ایک مسلمان چاہے کچھ بھی ہو، اس کے اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان اسلامی اخوت کا رشتہ باقی رہتا ہے اور اس رشتے کے تقاضوں میں سے یہ ہے کہ اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے اور اس کی تدفین عمل میں آئے، شریعت نے اسے فرض کفایہ قرار دیا ہے اور اس کی فرضیت کے لئے صرف اتنا ضروری ہے کہ مرنے والا مسلمان ہو اور پاک ہو یعنی اسے غسل دیا گیا ہو: "**شرطها إسلام الميت وطهارته**" (البحر الرائق: ۱۷۹/۳) بعض دفعہ ایسا ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے کسی بات پر تنبیہ کرنے کے لئے خود نماز جنازہ نہیں پڑھی؛ لیکن آپ نے صحابہ کو اس سے منع نہیں فرمایا اور مسلمان ان کی تجہیز و تکفین میں شریک رہے، جیسا حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا، (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۳۱۸۶، **باب الصلاة على من قتلته الحدود الخ**) اسلام میں مُردوں کے دفن کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس میں اس کا احترام ملحوظ ہے اور سائنسی اعتبار سے یہ ماحولیات سے تحفظ کا نہایت مؤثر ذریعہ ہے؛ اسی لئے تدفین کا اصل طریقہ یہ ہے کہ مردہ کو مٹی میں دفن کیا

جائے؛ البتہ اگر سمندری سفر میں کسی شخص کا انتقال ہوا اور ساحل دور ہو تو چوں کہ لاش کو باقی رکھنے میں تعفن پیدا ہونے کا خطرہ ہے؛ اس لئے بدرجہ مجبوری کوئی وزنی چیز باندھ کر سمندر میں بہادینے کی اجازت ہے؛ لیکن مسلم ممالک کے لئے یہ انتہائی شرم کی بات ہے کہ وہ کسی مسلمان کی لاش کو مغرب کے خوف سے قبول نہ کریں اور اپنے یہاں اس کو دفن کرنے کے روادار نہ ہوں۔

بہر حال اب تک یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی ہے کہ اسامہ بن لادن ۱۱ر ستمبر کے واقعہ میں ملوث تھے، امریکہ کا نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، لوگ اسے بے چوں چرا تسلیم کرلیں، یہ ایسی منطق ہے کہ اگر اقوام عالم ایک قضیہ یا ایک شخص کے معاملہ میں اس طرز عمل کو تسلیم کرلیں تو پھر کسی طاقتور ملک یا گروہ کا ہاتھ تھامنا اور ان کو ظلم و ناانصافی سے باز رکھنا مشکل ہوجائے گا، دنیا میں فوجی طاقت کے ذریعہ امن و امان قائم نہیں ہوسکتا؛ بلکہ انصاف کے ذریعہ امن و امان قائم ہوسکتا ہے، اگر انصاف کے الگ الگ پیمانے ہوں اور طاقتور کو سچا اور کمزور کو جھوٹا اور مجرم سمجھا جانے لگے تو پھر انسانوں کی یہ دنیا درندوں کی دنیا بن جائے گی؛ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ پر اصولِ انصاف اور انسانی تقاضوں کی روشنی میں غور کرنے کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ عالم اسلام اور ملت اسلامیہ کو شعور عطا فرمائے کہ وہ صلیبی اور صہیونی طاقتوں کی دوررس سازشوں کو سمجھیں اور انہیں اس بات کی توفیق عطا ہو کہ وہ اپنے آپ کو ان کے مقابلہ کے لائق بنائیں اور پوری دنیا میں انصاف کے علم بردار بنیں۔

❁

بتانِ رنگ وخوں کوتوڑ کر ملت میں گم ہوجا!

(امت بننے کی ضرورت)

''ام'' کے اصل معنی ''جڑ'' اور بنیاد کے ہیں، اس لئے جس چیز کو بنیادی اہمیت حاصل ہو، اس کو ''ام'' کہا جاتا ہے، جیسے ''لوحِ محفوظ'' جس میں تمام آسمانی کتابیں اور تقدیرات محفوظ کردی گئیں ہیں، اس کو قرآن میں ''ام الکتاب'' سے تعبیر کیا گیا ہے...... ﴿وَ عِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ (الرعد:۳۹) اسی طرح قرآن مجید کی جو آیات واضح ہیں اور ان کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہے، ان کو بھی ''ام الکتاب'' کہا گیا ہے: ﴿مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ﴾ (آل عمران:۷) اس لئے کہ قرآن مجید کا اصل پیغام ان ہی آیات میں ہے، سورہ فاتحہ میں پورے قرآن کا نچوڑ آگیا ہے؛ اس لئے اسے بھی ''ام الکتاب'' سے موسوم کیا جاتا ہے، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جس دنیا میں ہم لوگ رہتے ہیں، اس کے بننے کی ابتداء ''مکہ مکرمہ'' سے ہوئی، اور پھر زمین کا یہ فرش پھیلتا چلا گیا؛ اسی لئے ''مکہ مکرمہ'' کو قرآن مجید میں ''ام القری'' کہا گیا ہے: ﴿وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰي﴾ (الانعام:۹۲، الشوری:۷) ماں کو بھی اسی لئے ''ام'' کہا جاتا ہے کہ وہ تمام اولاد کے لئے جڑ اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔

انسانوں کا ایک بڑا گروہ جو کسی بنیادی فکر وعقیدہ پر متفق ہو اس کو ''امت'' کہا جاتا ہے، قرآن مجید میں ایک نوع کے جانوروں کو بھی ''امت'' کہا گیا ہے (انعام:۳۸) اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے جو قومیں گذری ہیں اور وہ ایک مشترک عقیدہ کی حامل تھیں، انہیں بھی ایک امت شمار کیا گیا ہے (الاعراف ۳۸، انعام:۴۲)، جو لوگ پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ ﷺ کے دامن نبوت سے وابستہ ہوئے اور یہ وابستگی عقیدۂ توحید کے بغیر نہیں ہوسکتی، وہ بھی ایک امت ہیں؛ چنانچہ ارشاد ہے: ﴿اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ﴾ (الانبیاء:۹۲، مومنون:۵۲) جیسے ایک باپ کی نسبت سے چھوٹا خاندان تشکیل پاتا ہے اور خاندان کے مورثِ اعلی سے ایک بڑا خاندان وجود میں آتا ہے، اسی طرح ایک نبی کی نسبت سے ایک امت بنتی ہے اور وہ ان تمام لوگوں کو رشتۂ

اخوت کے بندھن میں باندھ دیتی ہے، جو اس نبی پر ایمان رکھتی ہے، جیسے ایک خاندان کے مختلف افراد کے مزاج و مذاق میں فرق ہوسکتا ہے، ان کی دلچسپیاں الگ الگ ہوسکتی ہیں، ان کا ذریعہ معاش مختلف ہوسکتا ہے اور ان کی تنظیمی وابستگی جدا جدا ہوسکتی ہے؛ لیکن اس فرق واختلاف کی وجہ سے خاندان کا کوئی شخص خاندان سے باہر نہیں ہوجاتا؛ بلکہ سارے لوگ ایک دوسرے سے الفت ومحبت کا تعلق رکھتے ہیں، خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں، غموں کو بانٹنے کی کوشش کرتے ہیں، ایک دوسرے کے انیس وغم خوار ہوتے ہیں اور خاندان کے کسی شخص کو ظلم وستم سہنے کے لئے تنہا نہیں چھوڑ دیتے، یہی حال امت کے مختلف افراد کا بھی ایک دوسرے کے ساتھ ہونا چاہئے، امتی ہونے کے رشتے سے جو اسلامی اخوت قائم ہوتی ہے، وہ اس وقت بھی باقی رہتی ہے جب کہ امت کا کوئی فرد کھلے ہوئے گناہ میں مبتلا ہوجائے؛ اسی لئے قرآن مجید میں مسلمان کے مسلمان قاتل کو بھی مقتول اور اس کے ورثہ کا بھائی قرار دیا گیا ہے (البقرۃ:۱۸) اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی غیبت کرے، اگرچہ یہ بڑا گناہ، کھلی ہوئی برائی اور دوسرے شخص کے ساتھ زیادتی ہے؛ لیکن اس کے باوجود اس سے رشتۂ اخوت ختم نہیں ہوگا؛ اسی لئے قرآن کریم میں کسی مسلمان کی غیبت کو بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔

امتیں ''دین'' سے بنتی ہیں، مسلک ومشرب سے نہیں، ہوسکتا ہے کہ غلبۂ اسلام کے لئے ہماری کوششوں کا طریقۂ کار الگ الگ ہو، ممکن ہے کہ بعض عقائد وافکار میں اختلاف پایا جاتا ہو، بعید نہیں کہ عملی اور فروعی احکام میں ہمارے درمیان بہت سے نقاط پر اختلاف پایا جاتا ہو؛ لیکن ان سب کے باوجود ہم ایک امت کے افراد، ایک درخت کی شاخیں اور ایک عمارت کی اینٹیں ہیں؛ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے اختلاف کو بتاتے ہوئے فرمایا کہ میری امت کے تہتر فرقے ہوجائیں گے، یعنی ان میں اختلاف تو ہوگا؛ لیکن وہ ہوں گے میری امت ہی کے افراد، امت میں طریقۂ کار اور بعض افکار کے اعتبار سے بہت سارا اختلاف ہوسکتا ہے، مگر کلمۂ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' وہ مشترک بنیاد ہے، جو ان کے درمیان رشتۂ اخوت کو استوار رکھے گی، شریعت کے مزاج و مذاق کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کے بارے میں فرمایا تھا کہ جب تک وہ فساد نہیں مچائیں گے اور مسلمانوں پر حملہ نہیں کریں گے، ہم بھی ان پر فوج کشی نہیں کریں گے، یعنی خوارج اگرچہ سیدنا علی کرم

اللہ وجہہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان مصالحت کے بعد دونوں طرف سے شریک مسلمانوں کو کافر قرار دیتے تھے، جن میں اکابرِ صحابہ شامل تھے اور اسی سوچ کے تحت انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ ومعاویہ رضی اللہ عنہ کے خون کو مباح جانتے ہوئے دونوں پر قاتلانہ حملہ کیا تھا، جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بچ گئے، اس کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو امتِ محمدیہ کے دائرہ ہی میں رکھا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ نسبت کتنی وسیع ہے اور یہ ہمارے دینی خاندان کو کتنی آفاقیت اور ہمہ گیری عطا کرتی ہے؟

مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس دورِ زوال وپستی میں ''امت پن' کا تصور مسلمانوں کے ذہن سے نکلتا جا رہا ہے، امتی ہونے کی حیثیت سے جو آفاقیت اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے، ہماری لسانی، نسلی، علاقائی اور مسلکی تنگ نظری اس کو پارہ پارہ کر رہی ہے، اس کی ایک مثال ابھی کچھ عرصہ پہلے مصر میں سامنے آئی، جہاں سلفی بھائیوں کے ایک گروہ نے ان لوگوں سے ہاتھ ملا لیا، جو علانیہ طور پر اسلام سے عداوت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ مصر کی موجودہ حکومت دستور سے ان دفعات کو ہٹا رہی ہے، جن میں اسلام کو مصر کا مذہب اور کتاب وسنت کو دستور کی بنیاد قرار دیا گیا ہے، اس دستور ساز کمیٹی میں حکومت کے لبرل لوگوں کے علاوہ یہودی، قبطی، عیسائی اور جماعت النور کے ایک سلفی نمائندہ کو نامزد کیا گیا ہے، دوسری طرف ہمارے ملک کے مشرقی پڑوسی ''بنگلہ دیش'' کی حکومت جماعت اسلامی کے ذمہ داران اور کارکنان پر ظلم وجور کی قیامت ڈھا رہی ہے، ان کا قصور صرف اس قدر ہے کہ جب موجودہ بنگلہ دیش کے لوگوں نے لسانی بنیادوں پر اس خطہ کو الگ کرنے کا مطالبہ کیا تو انہوں نے لسانی تفریق کے مقابلہ میں اسلامی اتحاد کی آواز بلند کی، انہوں نے زبان پر دین کو ترجیح دی، انہوں نے لوگوں کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ جغرافیائی اور لسانی تنگنائیوں سے نکل کر اسلام کی آفاقیت کی طرف آئیں۔

لیکن بہر حال اللہ کی طرف سے بنگلہ دیش کا وجود میں آنا مقدر تھا، وہ آ گیا، اس میں بنگال کے مسلمان بھائیوں کی لسانی تنگ نظری کے ساتھ ساتھ پاکستان کے اربابِ اقتدار کی شامتِ اعمال بھی شامل تھی؛ لیکن ہر ملک میں ایسا ہوتا رہا ہے کہ جب آزادی حاصل ہو جاتی ہے تو پچھلے زخموں کو کریدا نہیں جاتا، عام معافی کا اعلان کر دیا جاتا ہے اور اگر کوئی قصووار ہو بھی تو اس کے خلاف کارروائی نہیں کی جاتی، ہمارے ملک ہندوستان میں بھی جنگ آزادی کے درمیان بہت سے لوگ انگریزوں کے پشت

پناہ تھے اور وہ ہندوستان کی آزادی کو مناسب خیال نہیں کرتے تھے؛ لیکن جب ملک آزاد ہوا تو ان کے خلاف کوئی داروگیر نہیں ہوئی، مسلمانوں کا تو بدرجہ اولی یہی عمل ہونا چاہئے؛ کیوں کہ ان کے سامنے فتح مکہ کا اسوہ موجود ہے کہ آپ نے نہ صرف دشمنانِ اسلام کو معاف کیا؛ بلکہ ان پر ایک نگاہِ خشمگیں ڈالنے کو بھی اپنی رحمۃ للعالمین کے خلاف سمجھا، بنگلہ دیش میں معاملہ اس کے برعکس ہوا، بنگلہ دیش بننے سے پہلے بنگلہ مسلمانوں کے ساتھ زیادتی ہوئی اور پاکستانی فوج نے بڑی بے رحمی سے کام لیا، پھر بنگلہ دیش بننے کے بعد بنگلہ بولنے والوں نے پاکستانی فوج کا بدلہ اردو بولنے والی عوام سے لیا، ردعمل ہمیشہ عمل سے زیادہ سخت ہوتا ہے؛ اس لئے اس بار ظلم وجور پہلے سے بھی بڑھ گیا، اللہ جزائے خیر دے جنرل ضیاء الرحمان مرحوم کو، کہ وہ ایک اسلام پسند اور مسلمانوں کے خیرخواہ قائد تھے، انہوں نے عالم اسلام سے بنگلہ دیش کا رشتہ استوار کیا اور گذشتہ زخموں پر مرہم رکھنے کی سعی کی، مسلمانوں کے درمیان بہ حیثیت مسلمان جذبۂ اخوت بیدار کرنے اور ملک کو معاشی ترقی کی طرف لانے کی کامیاب کوشش کی اور جو تلخیاں پیدا ہوگئی تھیں، بڑی حد تک لوگوں نے اس کو فراموش کر دیا۔

شیخ حسینہ واجد جو بنگلہ دیش کی موجودہ وزیر اعظم اور بنگلہ دیش کے دین بیزار بانی شیخ مجیب کے خاندان کی تنہا بچ جانے والی خاتون ہیں، جذبۂ انتقام ان کے رگ وریشے میں پیوست ہے اور اسلام پسند لوگوں سے انہیں بڑی نفرت؛ بلکہ الرجی ہے، انہوں نے ہمیشہ اپنے اقتدار کو انتقام اور جبر وظلم کے لئے استعمال کیا ہے اور کر رہی ہیں، مدارس اور علماء پر وقتاً فوقتاً ان کی عنایت ہوتی رہتی ہے، جس کے نتیجے میں متعدد لوگوں کی شہادت ہوئی اور بعض ممتاز اہل علم قید میں ہیں، جماعت اسلامی چونکہ سیاسی جدوجہد بھی کرتی ہے؛ اس لئے ان کے خلاف انتقام حد درجہ بڑھا ہوا ہے، ایسے لوگوں کو پھانسی کی سزا سنائی جا رہی ہے، جن کی عمریں ستر اسی سے متجاوز ہیں، اس کا مقصد اسلام پسند طاقتوں کو اور اپنے سیاسی مخالفین کو کچل ڈالنا ہے، جماعت اسلامی کے بعض افکار سے برصغیر کے علماء کو اختلاف رہا ہے، خاص کر بانیٔ جماعت اسلامی کی بعض تحریریں - کہا جاسکتا ہے کہ - مسلمانوں کی اکثریت کے نزدیک ناقابل قبول رہی ہیں؛ لیکن اس اختلاف کی وجہ سے کسی مسلمان گروہ کو ان لوگوں کے حوالہ نہیں کیا جاسکتا، جو اسلام پسند ہونے کے جرم میں ان پر ظلم کے پہاڑ توڑیں اور جنہیں کچھ خاص مسلمانوں سے نہیں؛ بلکہ اسلامی اقدار سے بغض ہے، ایسے موقع پر پوری امت مسلمہ کا فریضہ ہے کہ وہ

ان کے لئے پشت پناہ بنے اوران لوگوں کے ہاتھ تھامنے کی کوشش کرے، جوظلم پر آمادہ ہیں، اللہ تعالی نے فرمایا: ''تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، اگر ان میں نزاع پیدا ہوجائے تو آپس میں صلح کرانے کی کوشش کرو: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ﴾ (الحجرات: ۱۰) اور اگر صلح نہ ہوسکے تو ظالموں کا ہاتھ تھام لیا جائے؛ چنانچہ آپ نے ایک بار ارشاد فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کرو، چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم، صحابہ نے عرض کیا: مظلوموں کی مدد تو سمجھ میں آتی ہے؛ لیکن ظالموں کی مدد کیوں کر کی جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم ان کا ہاتھ تھام لو یعنی ان کو ظلم کرنے سے باز رکھو۔ (بخاری: عن انس، حدیث نمبر: ۲۴۴۴)

یہ کافی نہیں ہے کہ آدمی خود ظلم کرنے سے بچے؛ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اگر مسلمان بھائی پر ظلم ہو رہا ہو تو وہ خاموش تماشائی بن کر نہ رہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ خیانت کرسکتا ہے، نہ جھوٹ بول سکتا ہے اور نہ اسے رسوا کرسکتا ہے (ترمذی عن ابی ہریرۃ، حدیث نمبر: ۱۹۲۶) ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کی موجودگی میں کسی پر ظلم کیا جائے اور وہ مدد کرنے پر قادر تھا، پھر نہ کرے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو تمام مخلوقات کی موجودگی میں رسوا کریں گے۔ (مجمع الزوائد عن سہل: ۷/ ۲۰۶۷، بحوالہ مسند احمد)

یہ نوشتہ دیوار ہے کہ جو لوگ اسلام کا نام لیتے ہیں اور اپنے طریقۂ کار کے مطابق اسلام کو نافذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اگر تنظیمی اور مسلکی اختلاف کی بنیاد پر اہل دین ان سے منہ موڑ لیں اوران کو ظلم کی چکی میں پستا ہوا چھوڑ دیں تو وہی تجربہ ان لوگوں کے ساتھ بھی دہرایا جائے گا اور ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوگا؛ اس لئے ایسے مواقع پر ہمیں اپنی فکری، مسلکی اور تنظیمی وابستگی سے اوپر اٹھ کر ایک امت ہونے کے نقطہ نظر سے قدم اٹھانا چاہئے۔

ہندوستان کے مسلمان اگرچہ مصر وشام، فلسطین، الجزائر یا بنگلہ دیش میں کوئی بڑا رول ادا نہیں کرسکتے؛ لیکن جمہوری طریقۂ کار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اپنا احتجاج درج کراسکتے ہیں، ان ملکوں کے سفارت خانوں کو خط لکھ سکتے ہیں اور خود اپنی حکومت سے مطالبہ کرسکتے ہیں کہ جیسے حکومت ہندو اور سکھ بھائیوں کے تحفظ کے لئے امریکہ، یورپ، افغانستان اور سری لنکا میں اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کرتی ہے، اسی طرح وہ کم سے کم پڑوسی ملک بنگلہ دیش سے مطالبہ کرسکتی ہے کہ وہ اپنے ہی

شہریوں کے خلاف ظلم وجور کا دروازہ بند کرے، انصاف کے تقاضوں پر قائم رہے اور تمام لوگوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کا احترام کرے، جماعت تبلیغ کے دوسرے امیر حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ نے اپنے آخری خطاب میں ''امت پن'' پر خوب روشنی ڈالی ہے، اور ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان کے ساتھ کیسی محبت ہونی چاہئے؟ اس کو واضح فرمایا، واقعہ یہ ہے کہ خطاب ہر مسلمان کو پڑھنا چاہئے اور بہ حیثیت امتِ مسلمہ امت کے ایک فرد کا دوسرے مسلمان کے ساتھ کیا رویہ ہونا چاہئے، اس کو سمجھنا چاہئے، کاش! ہمارا دل علاقہ وزبان اور مسلک ومشرب کے دائرہ سے اوپر اٹھ کر اسلام کی آفاقی اخوت اور دین کے وسیع دائرہ کی طرف سفر کرنے کو تیار ہو اور ہم اختلاف اپنی حدود میں قائم رکھنا سیکھ لیں۔